



# نور اسرار کھانسان

ایم ایس

# دو شاخہ

ایم الیاس

ایک شخص کا قصہ، وہ اپنے علاقے کی چوکیداری کیا کرتا تھا۔ اس کے حالات بہت ہی دگرگوں تھے، وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اپنے حالات کو سنوار لے..... مگر اس کی کوئی راہ نظر نہ آرہی تھی۔ ایک شخص نے اسے پیش کش کی کہ وہ اگر اس کا ایک معمولی سا کام کر دے تو اس کے بدلے میں وہ ٹھیک ٹھاک معاوضہ دے گا۔ وہ شاید راضی نہ ہوتا..... مگر اس کے سامنے گھر کی مجبوریاں آگئی تھیں.....

اس شمارے کی ایک خوبصورت..... فکر انگیز کہانی.....!

سے ادا کرتا چلا آ رہا تھا۔ وہ اپنی ڈیوٹی کو فرض عبادت کے برابر سمجھتا تھا۔ فجر کی اذان تک اپنی ڈیوٹی سنبھالنے سے انجام دیتا تھا۔ عام چوکیداروں والی عادتیں اسے چھو کر بھی نہیں گئی تھیں۔ اس نے معمول کے مطابق بڑی تیزی کے ساتھ اپنا آخری راؤنڈ مکمل کیا اور مسجد جا پہنچا۔ آج بھی مسجد میں روز کی طرح نمازیوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ جس وقت وہ نماز پڑھ کر مسجد سے باہر آیا

**جیسے** ہی مسجد سے فجر کی اذان ہونے لگی، راجو نے دل میں سوچا کہ وہ جلدی سے اپنے علاقے کا آخری راؤنڈ لگا کر مسجد پہنچے پھر نماز پڑھ کر سیدھے گھر چلا جائے۔ برسوں سے اس کا یہ معمول بن گیا تھا۔ گرمیوں کے دن ہوں یا شدید سردیوں کے، چاہے موسلا دھار بارش ہی کیوں نہ ہو رہی ہو۔ گھر پر کوئی سخت بیمار کیوں نہ ہو، وہ کوئی دس برس سے اپنا فرض بڑی ذمہ داری، خوش اسلوبی اور باقاعدگی



کرنے کی کیا ضرورت پڑی۔ اسے غلط فہمی ہو رہی ہے۔ یہ شخص صبح کی ہوا خوری کے لئے نکلا ہوگا۔ مگر اس نے بھی اس سے پہلے جشید احمد کو جھٹلے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں اور عجیب بھی ہوتی ہیں۔ پھر وہ پلٹنے لگا تو اس نے دیکھا کہ دفعتاً جشید احمد نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کر کے اسے رکنے کا اشارہ کیا ہے پھر بھی اس نے پلٹ کر دیکھا کہ کہیں کوئی اور شخص تو نہیں ہے جسے رکنے کے لئے کہا جا رہا ہو۔ مگر اس کے سوا یہاں کوئی اور شخص نہ تھا۔

پھر راجو اس کی جانب گھوم کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ راجو کو خواب کا سا گمان ہو رہا تھا اس لئے کہ جشید احمد بڑا مضروب اور تیز مزاج شخص تھا۔ اپنی بڑائی کا ضرورت سے زیادہ گھمنڈ تھا۔ یہ تو وہ شخص تھا جسے سلام کرو تو ناگوار سا محسوس ہوتا تھا اور سلام کا جواب دینا بھی پسند نہیں کرتا تھا مگر آج تو جیسے کوئی معجزہ ہو گیا تھا۔ جشید احمد جیسا شخص ایک معمولی چوکیدار کے پیچھے پیچھے نہ جانے کہاں سے چلا آ رہا تھا اور پھر اس نے رکنے کا اشارہ کیا تھا۔ تو کیا آج وہ جشید احمد کی نظروں میں کوئی اہم آدمی ہو گیا ہے؟ وہ ایک حقیر سے آدمی کو کس لئے اتنی اہمیت دے رہا ہے؟ پھر راجو کے ذہن میں ایک خیال بجلی کا کوند بن کر لگا۔ اسے اہمیت دینے کے پیچھے جشید احمد کی کوئی نہ کوئی غرض یقیناً چھپی ہوئی ہوگی۔ ورنہ یہ لوگ تو بغیر مطلب کے اپنے ماں باپ کی خدمت میں بھی نہیں کرتے۔

جشید احمد لمحوں بعد اس کے قریب آ کر رکا تو وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ تیز چلنے کی وجہ سے جشید احمد کا سانس پھول رہا تھا۔

جشید احمد نے جلد ہی اپنی سانس پر قابو پا کر بڑی نرمی سے خوشدلی سے پوچھا۔ ”تمہارا نام راجو ہے؟ تم ہی ایف ایریا کے چوکیدار ہونا۔؟“

جشید احمد کے منہ اپنا نام سن کر کسی احساس کے تحت راجو کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آج اسے معلوم ہوا کہ

تو خاصا اجالا پھیل چکا تھا۔ مشرقی افق خاصا روشن تھا۔ جیسے اب سورج طلوع ہونے ہی والا ہو۔ بڑی خوشگوار افرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ نس نس میں جیسے امرت گھلتا جا رہا ہو۔ ساری فضاں اور کسل مندی ایک عجیب سی فرحت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ اس راستے پر چل پڑا جو پارک کے سامنے سے ہوتا ہوا اس کے گھر کی سمت جاتا تھا۔ چند لمحوں کے بعد اس راستے پر چلتے چلتے معاً اسے احساس ہوا کہ کوئی غیر محسوس انداز سے اس کے تعاقب میں چلا آ رہا ہے اس نے دل میں ایک پل کے لیے سوچا کہ اس کا تعاقب کون کر رہا ہوگا؟ کس لئے تعاقب کر سکتا ہے؟ وہ کوئی دولت مند اور خوش پوشاک تو ہے نہیں۔ جس کی جیب میں کوئی بڑی رقم موجود ہو۔ وہ محض ایک چوکیدار ہے۔ اس کے علاقے میں جتنے مکانات آتے ہیں اس سے اسے ماہانہ آمدنی سات آٹھ سو روپے ہو جاتی ہے۔ اس کی جیب میں اس وقت چار پانچ روپے بڑے ہوئے ہیں۔ یہ اس کا داہمہ ہے، پھر یہ کہ رات کا وقت بھی نہیں ہے اور اندھیرا بھی نہیں ہے۔ دن کا اجالا ہے جو ہر لمحہ روشن ہو رہا ہے۔ مگر سناٹا اور ویرانہ ضرور ہے پھر بھی وہ اپنا شک دور کرنے کی غرض سے رکا اور پلٹا۔ یہ دیکھ کر اسے شدید حیرت ہوئی کہ یہ اس کا وہم نہیں تھا اور اس کا اندازہ درست تھا، ایک خوش پوشاک شخص تیزی سے اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ انداز تعاقب جیسا ہی تھا۔ راجو نے اس شخص کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ اسے پہچانتے ہی وہ چونک گیا اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ بہت بڑا آدمی تھا۔ اس کا نام جشید احمد تھا۔ جو دو ہزار گز کی کٹھی میں رہتا تھا۔ اس علاقے میں اسے ہی بڑا آدمی مانا جاتا تھا جو بڑی کٹھی میں رہتا تھا۔ پھر بڑائی کی دوسری پہچان کاریں ہوتی تھیں۔ جشید احمد کی لال رنگ کٹھی کے وسیع احاطے میں ہمیشہ پانچ چھ ماڈل کی کاریں دو شیرازوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ جن کی خوب صورتی نے اعتباری راہی طرف پھینکتی تھیں۔ راجو دل میں ہنسا۔ اتنے بڑے آدمی کو اس کا تعاقب

صاحب اس کے نام سے واقف ہیں۔ ورنہ اس علاقے میں چوکیدار کا نام..... صرف چوکیدار ہی ہوتا تھا۔ اس نے سر بلایا۔ ”جی جناب میرا راجو ہے اور میں یہاں کا چوکیدار ہوں۔“

”ویری گڈا“ جمشید احمد کا چہرہ دمک گیا اس کے لیوں پر ایک خوشگوار مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”بھئی تم بہت تیز چلتے ہو۔ جیسے ریل گاڑی چلتی ہے۔“

”عادت سی ہوگئی ہے جناب۔“ راجو نے انکساری دکھائی۔ ”رات میں کئی راؤنڈ لگانے پڑتے ہیں۔ اس وجہ سے تیز چلنے کی عادت پڑ گئی ہے۔“

”میں نے تمہارے بارے میں سنا ہے کہ تم اس علاقے کے پرانے چوکیدار ہو کوئی دس بارہ برس سے چوکیداری کر رہے ہو؟“ جمشید احمد کے لہجے میں شگفتگی تھی۔

”جی جناب آپ لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں۔ اگر آپ لوگوں کی عنایت رہی آخری سانس تک خدمت کرتا رہوں گا۔“ اس نے نظریں نیچی کر کے کہا۔

”میں نے تمہاری بڑی تعریف سنی ہے کہ تم بڑے ذمہ دار، غرض شناس اور انتہائی شریف آدمی ہو۔ آج تک ایسا چوکیدار اس علاقے میں نہیں آیا ہے۔“

جمشید احمد جیسے شخص کی زبان سے اپنے بارے میں تعریفی کلمات سن کر اس کے جسم میں ایک عجیب سی خوشگوار مسکرتی دوڑ گئی۔ ایسی مسکرتی آج تک کسی نے اس کے کانوں میں نہیں اٹھ لی تھی۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا اور وہ جیسے کسی کنواری لڑکی کی طرح شرماسا گیا۔ اس کے دل میں جمشید احمد کے خلاف جو کدافت تھی وہ دھل گئی۔

”بھئی راجو!“ جمشید احمد نے بڑی محبت سے اپنائیت کے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”میں کئی دنوں سے تمہیں کہاں کہاں تلاش کر رہا ہوں۔ کئی بار علی اسج تمہاری تلاش میں نکلا تو پتا چلا تم اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گھر جا چکے ہو۔ تمہارے گھر کا پتا معلوم نہ تھا ورنہ

وہاں پہنچ جاتا۔ چلو آج تمہیں پابی لیا۔“

”آپ اپنے کسی ملازم سے کہہ دیجئے تو وہ میرے گھر آکر اطلاع دے دیتا اور میں حاضر ہو جاتا جناب۔“ وہ ایک ہی سانس ہی کہہ گیا۔

”میں کسی وجہ سے ان کے ذریعہ سے تمہیں بلانا نہیں چاہتا تھا۔ میں خود ہی تم سے مل کر بات کرنا چاہتا تھا۔“ جمشید احمد مسکرا دیا۔

”جی!“ نامعلوم خوف سے اس کے سینے میں دل دھک دھک کرنے لگا۔ ”کوئی خاص بات ہے جناب؟“ اس کی آواز گلے میں انگ گئی۔

”ہاں بھئی!“ جمشید احمد نے سر بلایا۔ ”میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں کھڑے کھڑے کب تک باتیں کرتے رہیں گے۔“ اس نے توقف کر کے ادھر ادھر دیکھا اور بولا ”چلو..... پارک میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ وہیں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔“

ایک سرد لہر نے راجو کی ریڑھ کی ہڈی کو چھو لیا تھا اور اس کا چہرہ ایک دم زرد پڑ گیا۔ جمشید احمد تو کہیں اور دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ اس کا چہرہ دیکھ لیتا تو چونک جاتا۔ اس نے جلد ہی اپنے خوف کی کیفیت پر پوری طرح قابو پا لیا۔ اس کا اندیشہ درست نکلا تھا وہ سمجھ گیا کہ جمشید احمد کسی سلسلے میں اس بات کرنا چاہتا ہے کوئی دس پندرہ دن پہلے پہلے والے بنگلے پر پولیس نے دن دھاڑے چھاپہ مار کر منشیات کا بہت بڑا ذخیرہ برآمد کیا تھا جو غیر مماثلک کو بھیجا جا رہا تھا وہ اسی سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوگا۔ کیونکہ اس چھاپے کے بعد محلے میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ اس محلے کے کسی شخص نے پولیس کو اطلاع دی تھی کہ اس بنگلے میں منشیات کا ذخیرہ دافتر مقدار میں موجود ہے وہ شخص محلے کا چوکیدار راجو ہے جب کہ اس نے اس افواہ کی بڑی سختی سے تردید کی تھی۔ وہ حیران تھا کہ یہ افواہ کیسے پھیلی جب کہ اس نے پولیس کو ٹیلی فون کسی دوسرے علاقے سے کیا تھا۔ اس کا ذکر اپنے کسی ملنے والے حتیٰ کہ گھر والوں سے تک نہیں کیا تھا۔ کیونکہ افشائے راز کا



مطلب اس کی موت تھا۔ اس کی بے وقت موت سے اس کا گھر تباہ و برباد ہو جاتا۔ گروہ کے لوگ بدلہ لئے بغیر چین سے نہیں بیٹھے۔ جو شخص گرفتار کیا گیا تھا اس کے محلے کے ہر شخص سے تعلقات تھے۔ جمشید احمد اس شخص کے گھر سے دوستوں میں سے تھا۔ شاید اسی لئے جمشید احمد اس سے مل کر اسے دھمکی دینا چاہتا ہوگا۔ راز اگلا کر اسے سزا دینا چاہتا ہوگا۔ ایسے کتنے مخبر موت کے منہ میں پہنچا دیئے ہوں گے۔ اب اس کی باری ہے۔

راجو کا پریشان چہرہ دیکھ کر جمشید احمد نے بڑی بے تکلفی سے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا، جیسے وہ اس کا بے تکلف دوست ہو۔ ”مجھے تم سے ایک ذاتی کام ہے۔“ اس نے اپنا قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اس سلسلے میں مجھے تمہاری مدد و تعاون کی اشد ضرورت ہے۔ چلو..... ہم پارک میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“

”جی!“ راجو تحیر زدہ ہو گیا۔ اسے لگاداتی کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ ایک اتنا بڑا آدمی ایک اتنے چھوٹے اور معمولی آدمی کی مدد اور تعاون چاہتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ایک چوکیدار اور غیر اہم سا آدمی کس طرح اس کے کام آ سکتا ہے۔ اس کے ذہن میں ایک پچھل سی ہونے لگی۔ آخر ذاتی کام کیا ہو سکتا ہے؟ جمشید احمد نے اسے متذبذب پاکر پوچھا۔ ”کیا سوچ رہے ہو راجو؟ اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ کیا تم میرا کام کرنا نہیں چاہتے ہو؟“

”جی..... جی..... کچھ نہیں۔“ وہ بڑبڑا کر سوچوں سے نکل آیا۔ اس نے مسکرائے کی کوشش کی۔ ”نہیں جی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ ایک ایسا فائدہ جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے ہو۔“ جمشید احمد نے کہا۔ ”میں تمہیں واقعی فائدہ پہنچانا چاہتا ہوں۔“

”میرا فائدہ!“ اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ جمشید احمد آگے بڑھ چکا تھا اس لئے اسی لیے اسے اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔ پھر اس کا ذہن

چکرایا۔ ”میرا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ میری ذات کو کس قسم کا فائدہ پہنچے گا؟ یہ بڑے لوگ بغیر کسی غرض کے کسی کو فائدہ کہاں پہنچاتے ہیں؟ جب کہ میں ایک غیر شخص ہوں۔ یقیناً دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔“

پھر دونوں پارک میں داخل ہو کر ایک خالی بیچ میں بیٹھ گئے، جو کتنے درخت کے نیچے تھی۔ سورج لٹکنے سے اس کی روشنی دیاں پڑ نہیں سکتی تھی۔ جمشید احمد نے جیب سے انتہائی نفیس قسم کا سگریٹ کیس نکال کر اسے کھولا اور اس کی طرف رسی انداز میں بڑھایا۔

راجو نے سر ہلا کر کہا۔ ”میں سگریٹ وغیرہ نہیں پیتا ہوں۔ آج تک سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ دوستوں نے بہت کوشش کی، معلوم نہیں کیوں مجھے سگریٹ پی کر دیکھنے کی خواہش بھی پیدا نہیں ہوئی۔“ وہ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

”اچھا!“ جمشید احمد نے سگریٹ کو منہ سے لگایا۔ ”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ جب ہی تم اس قدر صحت مند اور توانا نظر آ رہے ہو۔“ پھر اس نے سگریٹ سلا کر اس کے دواہن کش لئے اور اس کی طرف دیکھا۔ ”مجھے اپنا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔ تم مجھ سے اچھی طرح واقف ہو گے۔ میں کون ہوں اور کہاں رہتا ہوں۔“

”جی جناب!“ اس نے مودبانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ کو کون نہیں جانتا؟ آپ جمشید احمد خان ہیں اور لال رنگ والی کوٹھی میں رہتے ہیں۔“

”تم مجھے کب سے جانتے ہو؟“ جمشید احمد نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”جب سے آپ اس کوٹھی میں آئے ہیں۔“ راجو بولا۔ ”آپ کوئی تین چار برس سے اس کوٹھی میں ہیں۔ آپ نے یہ کوٹھی فقیر خان سے خریدی تھی۔“

”بہت خوب!“ وہ پر معنی میں مسکرایا۔ ”تم تو بہت کچھ جانتے ہو۔ کیا تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں کیا کرتا ہوں، کتنا بڑا آدمی ہوں، میرے پاس کتنی دولت اور کیا کچھ موجود ہے؟“

”جی نہیں“ راجو بولا۔ ”یہ سب کچھ تو معلوم

نہیں اور نہ ہی کبھی جاننے کی کوشش کی۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔“  
 ”بڑے آدمی سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا میرے گھر کے کسی ملازم نے میرے بارے میں کچھ بتایا؟“

”ہم لوگ تو ان لوگوں کو بڑا سمجھتے ہیں جو بڑے بڑے گھروں میں رہتے ہیں اور ان کے پاس کاریں ہوتی ہیں۔“ اس نے کہا ”آپ کے کسی نوکر نے آپ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

”تم کیوں نہیں بڑے آدمی بن جاتے ہو؟ جیسے میں آج ایک بڑا آدمی ہوں۔“ جمشید احمد کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔

”کون میں!“ راجو ہنس بڑا۔ ”میں کیسے بڑا آدمی بن سکتا ہوں جناب! جس طرح بڑے باپ کا بیٹا بنتا ہے۔ میرا باپ بھی چوکیدار تھا۔ میں بھی چوکیدار ہوں۔ کل میرا بیٹا بھی چوکیدار بنے گا، میری طرح۔“

”تم چاہو تم میری طرح ایک بڑے آدمی بن سکتے ہو۔ میری طرح ایک کو بھی اور ایک کئی کاروں کے مالک ہو سکتے ہو۔ تمہاری قسمت بدل سکتی ہے۔“  
 ”میں بڑا آدمی بن سکتا ہوں؟“ راجو نے ایک دم چونک کے اس کی شکل دیکھی۔ وہ واقعی سنجیدہ تھا۔ پھر وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ ”میں بڑا آدمی بن کر کیا کروں گا جناب؟“

”بڑے آدمی بن کر کیا کرو گے میں بتاتا ہوں“ عیش کرو گے عیش۔ ساری زندگی بڑے اطمینان اور سکون سے گزر جائے گی۔“

”ایسی کوئی لکیر میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ پھر میں جینٹلمین برس کا ایک شخص ہوں مجھ جیسا شخص برسوں میں بھی بڑا آدمی نہیں بن سکتا ہے۔“

”یہ تو وقت جلد ہی بتا دے گا تم ایک دن کیا بنو گے؟“ جمشید احمد نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”تم ماہانہ کتنا کمالیتے ہو؟ کیا اس میں گزر بسر ہو جاتی ہے؟“

”سات آٹھ سو روپے“ راجو نے جواب دیا۔  
 ”خدا کا شکر ہے کہ اس نے کبھی ہمیں ایک دن بھوکا نہیں رکھا۔ کسی کا محتاج نہیں بنایا سوائے اپنے۔“  
 ”تم چاہو اپنی آمدنی میں ایک دم سے ہزاروں روپے کا اضافہ کر سکتے ہو۔ مثلاً ہر ماہ پچاس سے ساٹھ ہزار روپے کماتا پائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔“

”ہزاروں روپے؟“ راجو کے نظروں کے سامنے سے ایک کوندا سا لپکا۔ پھر اس کی نظروں کے سامنے سوسو کے کرارے نوٹ تانے لگے۔

”ہزاروں روپے راجو میاں!“ جمشید احمد نے اس کی حیرت سے محمد آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں ہر ماہ ہزاروں روپے کی سخت ضرورت ہے۔ اس لئے کہ تمہارا خاندان بڑا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارے کندھوں پر بارہ جانوں کی کفالت کا پہاڑ جیسا بوجھ ہے۔ آج کل تمہاری آمدنی کیا حقیقت رکھتی ہے۔“

”آپ کی بات کی سچائی سے مجھے انکار نہیں ہے لیکن میں خود نہیں جانتا ہوں کہ اس رقم کیسے گزر بسر ہو جاتی ہے۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔“

”اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ آمدنی ہے کیا کہیں اور تو ملازمت نہیں کرتے ہو؟“  
 ”رات بھر ڈیوٹی دینے کے بعد اس قابل نہیں رہتا ہوں کہ کہیں اور ملازمت کر سکوں۔ دن بھر گھر پر آرام کرتا رہتا ہوں۔“

”تو گو یا تم انتہائی مفلس اور قلاش شخص ہو؟“ جمشید احمد نے افسوسناک لہجے میں کہا۔  
 ”حیرت ہے اس قلیل رقم میں تمہاری گزر بسر کیسے ہو جاتی ہے؟“

”اپنا اپنا نصیب ہے اور میں اس حالت میں بھی خوش ہوں۔ میں ہر حالت میں اپنے رب کا شکر بجالاتا ہوں۔ کبھی اس سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

”عجیب بات ہے کہ کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ خدا ان لوگوں کو آخر کس لئے نواز رہا ہے جو اسے

”ذرا آپ یہ تو سوچئے کہ میں ایک چوکیدار ہوں جو رات بھر گشت لگا کر گھر چلا جاتا ہے، مجھے کیا معلوم کہ کون کیا ہے؟ کیا کرتا پھرتا ہے۔ اس کے دھندے کیا ہیں؟“

”تم مجھ سے چھپا رہے ہو؟“ جمشید احمد کا لہجہ یکا یک تند ہو گیا۔ ”مجھ سے کوئی بات چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے علم ہے کہ تم اس علاقے میں دس برس ڈیوٹی دے رہے ہو اور ایک ایک گھر کے بارے میں پوری طرح واقفیت رکھتے ہو، کس گھر میں کون رہتا ہے؟ وہ کیا کرتا ہے؟ رات کے اندھیرے میں کیسے کیسے گورکھ دھندے ہوتے ہیں۔“

”مگر صاحب جی، وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”اس محلے میں تو سب ہی معزز شہری رہتے ہیں۔ وہ سب کے سب شرفا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ پھر دولت مند الگ ہیں۔ انہیں کیا ضرورت پڑی کہ گورکھ دھندے کریں۔ آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“

”جو لوگ ایمانداری اور محنت سے دولت مند بننے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں وہ بھی راتوں رات دولت مند نہیں بن سکتے۔“ جمشید احمد نے بلند آواز میں کہا ”ایسے لوگوں کو بڑا آدمی بننے میں بیس پچیس برس کا عرصہ لگتا ہے۔ مگر یہاں جو اکثر لوگ بے ہوئے ہیں وہ راتوں رات امیر بنے ہیں۔ لوگ کس طرح اچانک امیر بن جاتے ہیں یہ تم بھی جانتے ہو گے؟“

”میں نے تو سنا ہے کہ لوگ کالا پیلا دھندا کر کے ایک ہی رات میں دولت مند بن جاتے ہیں۔ مگر میں یہ نہیں جانتا کہ ان لوگوں میں سے کون کس طرح بڑا آدمی بنا؟“

”اس محلے میں رہنے والوں میں سے کوئی بھی سیدھے راستے سے دولت مند نہیں بنا ہے۔“ جمشید احمد نے سگریٹ کا آخری کش لے کر ٹوٹا جوتے سے مسل دیا۔ ”انہیں سبق دینا ایک نیا کام ہوگا۔ اس کام سے خدا بھی خوش ہوگا۔ ثواب بھی ملے گا۔“

”مگر انہیں سبق کیسے دیا جاسکتا ہے ان پر ہاتھ

بھولے سے بھی یاد نہیں کرتے۔۔۔۔۔ تم اسے ہر وقت یاد کرتے رہتے ہو۔ مگر تمہیں اس نے تنگ دست بنا کر رکھا ہوا ہے۔ کیا یہ اس کی نافرمانی نہیں ہے۔“

”شاید اس میں اس کی کوئی مصلحت ہو اور اس حال میں میری کوئی بہتری پوشیدہ ہو۔“

”تم جہالت کی باتیں کر رہے ہو۔“ جمشید احمد نے اس سے کہا۔ ”خدا انسان کو اپنا مستقبل اور زندگی کا بنانے کا ایک موقع دیتا ہے، جو وقت کی قدر کرتے ہیں وہ اپنی زندگی بنالیتے ہیں۔ تم بھی بنا سکتے ہو تمہیں بنانا ہوگا۔ اپنے لئے نہیں اپنے گھر والوں کے لئے، تم جوان لڑکیوں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے باپ ہو۔ کل خدا خواستہ مر جاؤ گے تو تمہاری لڑکیاں اور بچے کیا کریں گے؟“ پھر اس نے دنیا کے نقشب و فراز پر ایک لمبا لیکچر پلایا۔ اسے بھانک مستقبل سے ڈرایا اس نے راجو کے بشرے سے محسوس کیا کہ وہ کسی قدر پریشان اور خوفزدہ ہو گیا ہے۔ جب جمشید احمد نے دیکھا کہ لوہا گرم ہو چکا ہے تب ایک زوردار ضرب لگائی پھر اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے اپنا منصوبہ بتایا جو وہ نجانے کب سے پکار رہا تھا۔

راجو کو ایسا محسوس ہوا کہ فضا میں ایک زبردست دھماکا ہوا ہو اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ پھر اسے ایسا لگا کہ جمشید احمد انسان نہیں شیطان ہے۔ راجو کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ چند محسوس کئے کی ہی حالت میں رہا۔ اس کی زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ جمشید احمد نے اسے گنگ پا کر پوچھا۔ ”کیا سوچتے تھے؟ کیا میرا منصوبہ پسند نہیں آیا؟ اچھی طرح سوچ کر دیکھو یہ منصوبہ تمہیں راتوں رات دولت مند بنا سکتا ہے۔“

”مگر جناب! راجو چونکتے ہوئے اپنا پیچھا خٹرانے کی غرض سے کہا۔ ”آپ جو چاہتے ہیں وہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”تم جاؤ تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اس منصوبے کی کامیابی کی جی تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

ڈالنا آسان نہیں ہوگا۔ اس لئے بڑے لوگ بہت بار سوخ ہوتے ہیں۔“

”میں نے تمہیں ابھی تو اپنا منصوبہ بتایا ہے کہ ان لوگوں کو اپنا غلام بنانا ہے جو کوئی شخص غلام بن جاتا ہے تو وہ کسی کتے کی مانند اشاروں پر چلتا ہے۔“

”مگر انہیں غلام کیسے بنایا جاسکتا ہے؟“ راجو نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔ ”وہ ہمارے غلام کیوں بننے لگے۔“

”ان بڑے آدمیوں کی کوئی نہ کوئی کمزوری ہمارے ہاتھ لگ گئی تو وہ سدا کے لئے ہمارے غلام بنے رہیں گے۔ ان لوگوں کی کمزوری ہی سے فائدہ اٹھا کر ہم بڑے آدمی بن سکتے ہیں۔“

”کیا کسی کی کمزوری فائدہ پہنچاتی ہے؟“

”سیاہ کاروں کی بعض کمزوریاں ایسی ہوتی ہیں جو کسی کے ہاتھ لگ جائیں تو وہ کہیں کے نہیں رہتے ہیں۔ پھر ان کا ٹھکانہ نیل ہوتا ہے۔ ہمیں ایسی کمزوریوں کا پتا چلانا ہے۔ تم ان کمزوریوں کا پتا چلا سکتے ہو؟“

”کون میں؟“ وہ حیرت سے اچھل پڑا ”میں ان لوگوں کی کمزوریاں کیسے معلوم کر سکتا ہوں جب کہ ان لوگوں سے میرا کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔“

”ان لوگوں کی کمزوریوں کا پتا چلانے کی تدبیر مجھے معلوم ہے۔“ جمشید احمد معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”میں تمہیں ایک انتہائی قیمتی اور شاندار قسم کا کیمرہ ویڈیو دوں گا۔ تم اس کیمرے سے ان لوگوں کی تصویریں اتارو گے جو رات کے اندھیرے میں غیر قانونی اور سماج دشمن سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کیمرے کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہلکی سے ہلکی روشنی میں بڑی صاف اور واضح تصویریں کھینچتا ہے۔ بڑا جواب کیمرہ ہے۔“

”آپ ان تصویروں کا کیا کریں گے؟ کیا ان پولیس کے حوالے کریں گے؟“

”پولیس کے حوالے کرنے حماقت کبھی نہیں کروں گا اپنے پاس رکھوں گا۔ یہی تصویریں تو ان

لوگوں کو غلام بنائیں گی۔“

”تو کیا ان تصویروں سے ان لوگوں کو بلیک میل کریں گے؟“

”بھئی تم میری توقع سے کہیں زیادہ ہوشیار اور سمجھدار نکلے۔“ وہ پھپھکی ہنسی ہنسا۔ ”ایسے لوگوں کو بلیک میل کرنا ثواب کا کام ہے جو پورے معاشرے کو بگاڑ رہے ہیں۔“

”مگر جناب! مجھے تو یہ کام بڑا ہی خطرناک اور مشکل نظر آ رہا ہے۔ میں ان لوگوں کی تصویریں کہاں اور کیسے اتاروں؟“

”تم اس محلے کے ہر گھر کے محل وقوع سے خوب واقف ہو۔ لہذا کسی بھی گھر میں آسانی سے اتر سکتے ہو۔ کسی بھی مناسب جگہ کھڑے ہو کر تصویر کھینچ سکتے ہو۔ یہ کیمرہ پردے اور شیشہ پار کی ایسی تصویریں اتار سکتا ہے جو انسانی آنکھ دیکھ سکتی ہے یہ سمجھو یہ کیمرہ نہیں بلکہ انسانی آنکھیں ہیں۔ میں تمہیں چند محلوں میں سمجھا دوں گا کہ نزدیک اور دور کی تصویریں کس طرح کھینچی جاتی ہیں۔“

پھر جمشید احمد نے اپنی جیب سے سگریٹ کیس ساز کا ایک کیمرہ نکالا جو کیسٹ کی مانند نظر آ رہا تھا۔ راجو نے بڑی حیرت سے اس کیمرہ کو دیکھا۔ جمشید احمد نے پانچ سات منٹ میں اس کیمرے کے استعمال کرنے کا طریقہ سمجھا دیا جن کو وہ اچھی طرح سمجھ گیا تو جمشید احمد اس کی ذہانت سے خوش ہو گیا۔

”جناب! انا معلوم کیوں مجھے اس کام کے تصور سے خوف آ رہا ہے۔“ راجو کا لہجہ مرتعش تھا۔ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں؟“

”اگر اس طرح ڈرو گے تو پھر جی نہ سکو گے اور نہ ہی بڑے آدمی بن سکو گے۔“ جمشید احمد نے اس کا شانہ ہتھ پتھپتھایا۔ ”اس کیمرے میں جو فلم رول ہے وہ بیس تصویروں کا ہے۔ ان بیس تصویروں کے عوض میں تمہیں چوتھہ ہزار دوں گا۔ کتنے دوں گا! پورے چوتھہ ہزار روپے، بلکہ اس میں ایک ہزار کا اور اضافہ کر کے پندرہ ہزار دوں گا۔ اب تو خوش ہونا؟“

سنے کون نہیں دیکھتا۔ سننے تو سبھی دیکھتے ہیں۔ اس لئے بہت سے لوگ سببوں جیسی زندگی گزارتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی زندگی کو دیکھتے ہوئے راجو نے سننے دیکھے تھے۔ یہ بہت دنوں کی بات تھی۔ پھر اس نے سننے دیکھے چھوڑ دیئے تھے۔ اس نے سچ حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ اس کا باپ بھی چوکیدار تھا۔ اس لئے وہ بھی چوکیدار بنے گا اور ایک دن اپنے باپ کی طرح چوکیدار بن گیا۔ لیکن وہ اپنے باپ کی طرح خدا سے شاکہ نہیں تھا۔ اسے خدا کی ذات پر پورا بھروسہ تھا کہ زندگی کسی موڑ پر آ کر ایک دم بدل جائے گی۔ اس کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے وہ پینتالیس برس کا ہو گیا۔ خدا نے اس کی سنی۔ مگر آج اچانک اور غیر متوقع طور پر اس کی زندگی میں ایک لمحہ ہوا کے کسی خوش گوار جھونکے کی طرح آیا تھا۔ اس نے ایک بار سوچا بھی تھا، کیا وہ اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ گھر کی جانب تیزی جاتے ہوئے اس کا دماغ سنسنار ہا تھا، طرح طرح کے خیالوں کی ایک پورش تھی جن کے آگے اس کے پیرجم نہیں رہے تھے۔ پھر وہ ایک دوراے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک طرف بدی تھی جو اسے سب کچھ دینے کے لئے تیار تھی جس کے لئے آج تک انسان ترستا ہے۔ دوسری طرف نیکی تھی جو عاقبت میں جزا دینے کا وعدہ کر رہی تھی۔ بات عاقبت کی نہ تھی اس دنیا کی تھی۔ یہ دنیا جو کسی جہنم سے کم نہ تھی اور پھر اس دنیا میں سب بڑا عذاب احساس محرومی تھا۔ تنگ دہلی اور غربت سے بڑھ کر انسان کے لئے کوئی سزا نہ تھی۔

اس نے دوسرے لمحے اپنے ذہن سے عاقبت کا خیال جھٹک دیا۔ خدا کا خوف، انسان کا فرض، نیکی کا تصور، قناعت اور توکل۔ اب سب اس کے لئے بے معنی ہو گئے تھے۔ سب پیچھے رہ گئے تھے۔ اس نے زندگی کے دوسرے راستے پر قدم رکھ دیا تھا۔ اس کی زندگی میں پہلی بار ایک انجانا راستہ آیا تھا۔ وہ اسی راستے پر چلتا جا رہا تھا۔ اسے نہ راستہ بھولنے کا ڈر تھا اور نہ لوٹنے کی فکر۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی

جیب میں کیمرہ نہیں ہے بلکہ پینٹھ ہزار روپے ہیں پھر وہ تصور میں کھو گیا۔ اس تصور میں پہنچ کر اس بے رحم دنیا کو بھول گیا جس میں کبھی اسے راحت نہیں ملتی تھی۔ سکھ نہیں ملا تھا۔ اب وہ اس دنیا کی سیر کر رہا تھا جو بہت خوبصورت تھی اس میں راحیل اور آسانسٹیں تھیں۔ یہاں کوئی دکھ، غم اور کرب نہ تھا اذیت نہ تھی، جہنم نہ تھا، یہ دنیا جنت جیسی تھی۔ اس کا دل عجیب سا سرور محسوس ہو رہا تھا۔

جب اس نے اپنے دروازے پر دستک دی تو اس کی بڑی بیٹی جیلہ نے دروازہ کھولا تھا۔ سفید دوپٹے کی محراب میں ایک حسین سا چہرہ اس کا تھا۔ بہت ہی اداس۔ ایسی ہی اداسی اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ وہ غم و کرب کی تصویر تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جیلہ اتنی اداس کیوں ہے۔ وہ اندر سے ٹوٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا رشتہ ایسی جگہ طے ہو رہا تھا جو اس کے سوا کسی کو پسند نہ تھا، لڑکا موچی تھا، موچی کا بیٹا تھا۔ اس کی شیر شاہ میں بہت چھوٹی سی دکان تھی۔ مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ اپنی بیٹی کا رشتہ وہاں کرنے کے لئے یہ سوچ رہا تھا کہ لڑکے کا کوئی مطالبہ نہ تھا۔ نہ جوڑے کا نہ جہیز کا۔ اس کی بیٹی کے لئے اچھے رشتے بھی آئے تھے۔ مگر وہ منہ کھول کر اتنا مانگ رہے تھے کہ بھی ان کا کوئی مطالبہ پورا نہ کر سکتا تھا۔ جیلہ نے دروازے کے پاس سے ہٹ کر اسے اندر کا راستہ دیا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی بیٹی کے سر پر اپنی چھتری سی نظر ڈالی۔ پھر اس نے دل میں سوچا وہ اس موچی کے لڑکے سے بیٹی کا رشتہ طے نہیں کرے گا بلکہ اچھی جگہ بیٹی کا رشتہ طے کر دے گا۔ اب اس کے پاس لڑکے والوں کا مطالبہ پورے کرنے کے لئے رقم جو ہوگی۔

پھر اس نے گھر میں داخل ہو کر اپنے بوڑھے بیمار اور لاغر باپ کو دیکھا جو نیند کی گولی کھا کر سو رہا تھا۔ جو برسوں سے بیمار تھا۔ سرکاری اسپتال کے علاج سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا بلکہ بیماری میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ موت قریب

ہوتے ہوئے بھی دور تھی۔ اسے جیسے ترسا ترسا کر مارتا چاہتی ہو۔ وہ اپنے باپ کا علاج کسی اچھے ڈاکٹر سے کروانے کے بارے میں سوچ کر رہ جاتا تھا۔ اس کے پاس فیس کی رقم ہی جمع نہیں پاتی تھی۔ فیس کے بعد مہنگی دواؤں کا تصور بھی تو بڑا وحشت ناک تھا۔ وہ اتنی مہنگی دوا میں کیسے خریدتا؟ وہ باپ کے بستر کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے باپ کو دل میں مخاطب کر کے کہا۔ ”تم نے جہاں اتنے برس دکھ درد اور تکلیف سہی ہے وہاں چند دن اور سہ لو۔ میں تمہیں جلد ہی ماہر ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔ اچھا علاج کراؤں گا۔ کسی اچھے اسپتال میں داخل کراؤں گا۔“

راجو محن میں آیا تو ٹھنک کر رہ گیا۔ باورچی خانہ میں ایک گول مٹول اور بھدی سی عورت روٹی پکارتی تھی۔ جس کے چہرے اور جسم میں اب کوئی حسن اور کشش نہیں رہی تھی۔ جو پھول کر رہا ہوئی تھی۔ وقت نے اس کا چہرہ چھلسا دیا تھا۔ یہ اس کی بیوی تھی۔ بیس برس پہلے وہ چیلہ کی طرح تھی۔ آج جیلہ اپنی ماں کی جوانی کا عکس تھی۔ بچے کیا ہوئے انہوں نے اس کے عورت کے حسن اور کشش کو چھین لیا تھا۔ وہ باورچی خانہ میں بچوں سے اچھے رہی تھی۔ کبھی کو مار رہی تھی تو کسی کو ڈانٹ رہی تھی۔ بچے روٹی کے لئے ضد کر رہے تھے۔ جیسے دو وقت کے فاقے سے ہوں ملے چیلے لباس میں یہ بچے فقیروں کے بچوں سے بھی گئے گزر رہے تھے۔

وہ روز ہی کٹھی اور بنگلوں میں رہنے والوں کے ان بچوں کو دیکھتا تھا جو گاڑیوں اور اسکولوں کی بسوں میں پڑھنے اسکول جاتے تھے۔ ان کے جسموں میں صاف سترے لباس ہوتے تھے۔ وہ شگفتہ اور تروتازہ پھولوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ مہکتے ہوئے محسوس ہوتے تھے وہ باوجود کوشش کے اپنے کسی بچے کو اسکول میں پڑھانے نہیں سکتا تھا، سرکاری اسکولوں میں تعلیم مفت تھی لیکن کتابوں کا پیسوں کی خریداری اس کے بس میں نہ تھی۔ اس کے دل میں بڑی حسرت تھی کہ وہ اپنے بچوں کو پڑھا لکھا کر ایک

اچھا انسان بنائے وہ بھی اس کی طرح چوکیداری نہ کرتے پھیریں۔ مگر وہ اپنی کوئی خواہش پوری نہ کر سکتا تھا وہ یہ سوچ کر رہ جاتا تھا کہ اگر اس کے بچوں کو چوکیدار بناتا ہے اور لڑکیوں کو کسی موچی یا بس کنڈیکٹر، یا ڈرائیور کی بیوی ہونا ہے تو قدرت کے اس فیصلے کے آگے وہ کیا کر سکتا ہے۔

مخرومیوں کی ایک لمبی داستان تھی۔ بچے کبھی اس سے آنسکریم اور چاکلیٹ کی فرمائش کرتے تو کبھی ان کھلونوں کے لئے چل جاتے جو دکانوں اور بڑے گھر انوں کے بچوں کے ہاتھوں میں نظر آتے تھے۔ اگر صرف ایک بچہ ہوتا تو وہ اس کی فرمائش پوری کر دیتا۔ پانچ بچوں کو آنسکریم کھلانا اس کے بس میں نہیں ہوتا تھا۔ کھلونے اتنے سستے نہ تھے پھر یہ بچے سستے کھلونوں سے بھلتے نہ تھے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کہیں بیٹھا ہوا ہے کوئی دوست پر تکلف کھانا منگواتا تو گھر والوں کے چہرے اس تصور میں گھوم جاتے تھے۔ پھر نوالے اس کے حلق میں اٹکنے لگتے تھے۔ وہ چند لمحوں سے زیادہ کھانئیں سکتا تھا۔ دل میں سردا بھر کر رہ جاتا تھا۔

بچے اس سے پوچھتے تھے۔ ”ہم لوگ اتنے چھوٹے سے گھر میں کیوں رہتے ہیں۔ آپ بڑا گھر کیوں نہیں خرید لیتے؟“

”کٹھیوں اور بنگلوں میں رہنے والے بچے کتنے اچھے اچھے کپڑے پہن کر نکلتے ہیں، آپ ہمارے لئے ایسے کپڑے کیوں نہیں سلواتے ہیں؟“ ”آپ ہمیں اسکول پڑھنے کے لئے کیوں نہیں بھیجتے۔ ہمیں بھی اسکول کے کپڑے اور کتابیں لے کر دیں اور اسکول میں داخل کرائیں نا؟“

وہ انہیں ٹال دیتا تھا تین لڑکیاں جوان ہو چکی تھیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کے سینے پر چٹائیں رکھ دی گئیں ہوں۔ ان چٹانوں کے پوچھ کے احساس سے بھی کسی اس کا دم سینے میں گھٹنے لگتا تھا۔ لڑکیاں بڑی سمجھدار تھیں۔ ان کی آنکھوں میں درد، صبر اور احساس جھانک رہا تھا۔ گو وہ

اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتی تھیں جو ملا کھالیا اپنے کپڑوں میں بیوند لگا کر اس کا بوجھ جیسے ہلکا کر دیتی تھیں۔ اس لئے کہ انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ باپ کی کمائی اور گھر کا خرچ کیا ہے؟ مگر وہ سمجھتا تھا کہ ان کے سینوں میں کیسے کیسے ارمان لاوا بن کر رک رہے ہیں مگر وہ کیا کر سکتا تھا؟ بیوی تو شادی کے بعد کئی برس تک کسی نہ کسی چیز کی فرمائش کرتی رہی تھی۔ اب تو وہ جیسے اندھی بہری کوئی ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے چند برس سے گھٹا کا مرض تھا وہ گھٹا کا درد سہہ لیتی تھی مگر اس سے دوا کی اور علاج کے لئے نہیں کہتی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے زندگی کاٹ رہی تھی۔ بچے کچھ کہتے تو ان سنی کر جاتی تھی۔ اس نے بھی شکایت نہیں کی کہ یہ زندگی کیسی ہے؟ اس کی زبان سے احتجاج کا ایک لفظ نہیں نکلتا تھا۔ بس وہ اپنے بیمار ساس، سر، شوہر اور بچوں کی خدمت کرتی جا رہی تھی۔ ایک مشین کی طرح، اس پر بے زبان جانور کا گمان ہوتا تھا۔ بھی۔

راجو نے اپنی جیب میں رکھے ہوئے کمرے کو تھپتھپایا۔ اسے لگا کہ اس گھر اور اس کی زندگی پر جو بادل چھائے ہوئے ہیں وہ ایک ایک کر کے چھٹتے جا رہے ہیں۔ جلد ہی سارے بادل چھٹ جائیں گے۔ پھر روشنی ہوگی ایک نیا سورج طلوع ہوگا۔ ان سب کو ایک نئی زندگی ملے گی۔ ایک نئی صبح سے ان سب کی زندگی کا آغاز ہوگا۔

رات دس بج رہے تھے۔ وہ فخر الزماں کے بنگلے میں عقب میں پہنچ کر رکھا۔ اس نے فخر الزماں کے بارے میں سنا ہوا تھا۔ بظاہر تو اس کے کارخانے ہیں اور شہر کے بارون علاقوں میں چپو لری کی بڑی بڑی دوکانیں ہیں۔ مگر وہ بہت بڑا اسمگلر ہے۔ سونا اسمگل کرتا ہے۔ اسے ہیرے جواہرات کے کاروبار کا بادشاہ کہا جاتا ہے پھر وہ بے پناہ دولت مند تھا۔ اس نے اپنی کی شادی کے موقع پر اپنے علاقے کی تمام کوٹھیاں اپنے خرچ پر سجا کر ان تمام گھروالوں کو اپنی خوشیوں میں شریک کیا تھا۔ ہر کوئی کی سجاوٹ پر دس ہزار کا خرچ آیا تھا اپنی لڑکی کی شادی ایک اعلیٰ

درجے کے ہوٹل میں کی تھی صرف مہمانوں کو کھانا کھلانے پر پانچ لاکھ کا خرچ آیا تھا۔ لڑکی کے جہیز پر پچاس لاکھ کی ایک کوٹھی اور دو کاریں دی تھیں۔ ہیرے جواہرات اور دوسری چیزیں لاکھوں روپے کی تھیں۔ راجو نے سوچا جو پیسہ پانی کی طرح بہاتے ہیں وہ پیسہ محنت سے کمایا ہوا نہیں ہوتا۔ فخر الزماں کے پاس بھی کالے دھندے کا روپیہ ہے۔ وہ آج بھی کالا دھندا ہی کرتا ہوگا۔ شاید مجھے اس بنگلے سے کوئی تصویر کھینچنے کا موقع مل جائے جو جمشید احمد کے مطلب کی ہو۔ اس نے یہ سب کچھ سوچتے ہوئے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ ماحول پر قبرستان جیسا سا ناٹا ماری تھا اسے دیوار پر چڑھ کر اندر اترنے میں صرف پانچ منٹ لگے۔ بنگلے کا احاطہ اور برآمدہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بنگلے کے اطراف بھی یہی تاریکی تھی۔ صرف ایک کمرے میں روشنی اور کچھ چہرے نظر آرہے تھے۔ اس کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس کمرے کی کھڑکی سے دو گز کے فاصلے پر ایک درخت تھا۔ یہ درخت اس کے لئے آڑ کا کام دے سکتا تھا۔ وہ دبے قدموں اس درخت کی آڑ میں جا کھڑا ہوا تو اس کے کانوں میں سسکیوں کی آوازیں گونجیں۔ وہ ایک دم سے چونکا جیسے اسے اپنی سماعت پر فتور کا احساس ہوا ہو۔ اس گھر میں سسکیوں کا کیا کام۔ یہاں کی فضا میں تو ایسی سر بن کر گونجتی ہے۔ یہ لوگ رونا کہاں جانتے ہیں۔ رونا تو غریبوں کا مقدر ہے۔ پھر اس کے کانوں کے پردوں سے سسکیاں ٹکرائیں۔ اس نے چونک کر کھڑکی سے اندر جھانکا۔ پلنگ پر فخر الزماں کسی بے جان لاش کی طرح پڑے تھے۔ انہیں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ ان کی بیوی، ایک لڑکی اور ایک لڑکا پلنگ کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ ایک نرس چہرہ ہانے کھڑی تھی۔ بیوی رو رہی تھی۔ لڑکی بے حد ممکن نظر آ رہی تھی۔ لڑکا غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیوی نے سسکیوں کے درمیان پوچھا۔ ”ڈاکٹر کیا کہتے ہیں سچ بتاؤ مجھ سے چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

سامنے کس لئے کر رہے ہو؟“ ماں نے تنک کر جواب دیا۔ ”یہ مایوسی کی باتیں کیوں سنارہے ہو مجھے؟“

”مئی آپ بات سمجھنے کی کوشش کریں۔“ بیٹی نے ماں کے قریب جا کر کہا۔ ”ڈیڈی ایک مرض ہے تو نہیں، انہیں شوگر ہے، ہائی بلڈ پریشر ہے، دل کی شکایت ہے، گردے کی تکلیف، دمہ اور پیچھڑے کا کیفر بھی ہے۔ انہیں اتنی ساری بیماریاں لاحق ہو گئی ہیں۔ آخر کس کس کا علاج کیا جائے؟ اگر ہماری دولت بھی علاج پر خرچ کر دیں تو وہ صحت یاب نہیں ہوں گے۔ ہر دوا بھی بیکار ہو گئی ہے۔“

”تو کیا میں انہیں مرنے کے لیے چھوڑ دوں ان کا علاج نہیں کراؤں؟ اور تم بیٹی ہو کر اپنے باپ کے بارے میں ناامیدی کی باتیں کر رہی ہو؟“ وہ برس پڑیں۔

”ہم ڈیڈی کا علاج کرائیں گے مئی! ان کا علاج یہاں بھی ہو جائے گا آپ فکر نہ کریں عیموں کو دکھائیں گے۔“ لڑکے نے تسلی دی۔

”اب علاج کے ساتھ انہیں دعا کی ضرورت ہے۔“ نرس بولی ”میں نے دیکھا ہے جب دوا کام چھوڑ دیتی ہے تو پھر دعا اپنا اثر دکھاتی ہے۔ آپ لوگ بھی دعا کریں۔ خدا کے حضور گڑ گڑائیں۔ جہاں دوا اور دولت کام نہیں آتی ہے وہاں صرف دعا کام آتی ہے۔“

”دعا۔“ وہ تلخی سے مسکرائیں۔ ”میں اپنی ہی دعاؤں کی سزا بھگت رہی ہوں نرس! جب ہم نبی کراچی کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے تنک دستی تو تھی مگر ایسی بھی فاقے نہیں ہو رہے تھے بس گزر جاتی تھی۔ میں، بچے اورادر شوہر صحت کی دولت سے مالا مال تھے۔ انہیں کوئی بیماری نہیں تھی روکھی سوکھی کھاتے تھے۔ سادگی اور قناعت کی زندگی ہر بیماری کو نکل لیتی ہے۔ ہم لوگ شاذ و نادر ہی بیمار پڑتے تھے۔ دوسروں کی سپنوں کی زندگی دیکھ کر اور دوسروں کے گھروں کے جھانک کر خدا سے شکوہ کرتی، گڑ گڑا کر دعا مانگتی کہ اے خدا تم ہمیں اس جہنم

لڑکی بکلتی ہوئی بولی۔ ”مئی ڈاکٹر نے آج ہی صاف صاف جواب دے دیا ہے کہ اب ڈیڈی کا علاج ممکن نہیں رہا ہے۔ میڈیکل بورڈ کا بھی یہی فیصلہ ہے۔“

”مگر مجھ سے ڈاکٹر ذکا اللہ نے کہا تھا کہ آپ فکر نہ کریں۔ ہم اپنی پوری توجہ سے صرف ان کا علاج کر رہے ہیں۔ وہ جلد ہی صحت یاب ہو جائیں گے۔“ ان کی آواز بھرا گئی۔

”ڈاکٹر نے آپ کو بہت غمگین بہت پریشان دیکھ کر تسلی دینے کی غرض سے کہا تھا۔ میں میڈیکل بورڈ کی رپورٹ لے کر آیا ہوں۔ آپ اسے دیکھ لیں۔“ لڑکا بولا۔

”میں کسی رپورٹ کو نہیں مانتی ہوں۔“ وہ آپ سے باہر ہو گئیں۔ ”علاج ممکن کیوں نہیں ہے۔ میں انہیں یورپ لے جا کر علاج کراؤں گی۔ وہاں تمہارے باپ کا علاج بہت اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ وہاں بڑے بڑے قابل ڈاکٹر اور اسپتال موجود ہیں۔ ان کے علاج سے یقیناً فائدہ ہوگا۔“

”مجھے آپ کی بات سے پورا اتفاق ہے مئی۔“ لڑکے نے ان کی تائید کی۔ ”میں نے ڈاکٹروں سے یہی کچھ کہا تو وہ بولے۔ اگر آپ اپنی تسلی کرنا چاہتے ہیں تو آپ یورپ جا کر علاج کروالیں۔ اس طرح آپ اپنا پیسہ اور وقت برباد کریں گے۔ بلکہ اپنے آپ کو قریب بھی دیں گے۔“

”میں اپنے شوہر کی زندگی بچانے کے لئے وقت اور پیسہ برباد کرنے کے لئے تیار ہوں۔“ وہ تیز لہجے میں بولیں۔ ”آخر یہ بے پناہ دولت کس روز کام آئے گی۔ اس کا اصل حقدار کون ہے؟ تمہارا باپ جس نے رات دن ایک کر کے کمایا ہو کیا میں اس کی ذات پر اس کا کمایا ہوا روپیہ خرچ نہیں کروں؟ میں جلدی اپنے شوہر کو یورپ لے جاؤں گی۔“

”کیا ہمیں اپنے باپ کی زندگی عزیز نہیں ہے؟“ لڑکے نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔

”پھر تو وقت اور پیسے کی بربادی ذکر میرے



نان سنس۔“

”ہم می کو یہ کیوں نہ بتادیں کہ ڈیڈی کی زندگی.....“ بھائی نے پوچھا۔

”ڈونٹ فی سلی۔“ بہن بولی ”یہ دیکھو..... ڈیڈی کی سانسیں اکٹھری رہی ہیں۔ میں جا کر نرس اور می کو بلالائی ہوں۔“

☆.....☆.....☆

راجو کوئی پندرہ دن کے بعد جشید احمد کی کوٹھی پر پہنچا۔ جشید احمد اسے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ ”تم نے بہت دن لگا دیے؟“

”آپ نے میرے ذمے کچھ کام ہی ایسا سونپا تھا“ اس میں دیر تو لگی تھی۔“ راجو نے جواب دیا۔ ”میرے خیال میں یہ بڑا آٹھن کام ہے۔“ جشید احمد نے ملازمین کے سامنے گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا وہ اسے اپنے کمرے میں لے آیا اور بڑی بے تابی سے پوچھا۔ ”کیا تم نے تصویریں اتاریں؟“

”جی ہاں جناب۔“ راجو کہنے لگا۔ ”اس کمرے کا واقعی جواب نہیں ہے۔ بڑا لا جواب کمرہ ہے“ میں نے اپنی زندگی میں ایسے کمرے کا ذکر تک نہیں سنا تھا۔ میں نے جو چند تصویریں اتاری ہیں واقعی وہ بڑی صاف اور واضح آئی ہیں۔ دور سے لی ہوئی تصویریں ہوں یا کھڑکی کے پردے یا شیشے کے پار اتاری ہوئی تصویر ہو اس کمرے نے ہر ایک کا چہرہ اور خدوخال پوری طرح واضح کر دیے ہیں۔ یہ کمرہ انسانی آنکھ سے بددھتھا آگے بڑھ کر ہے۔“

”اس کا اندازہ تمہیں کیسے ہوا؟ کیا تم نے تصویریں اتار کر قلم دھلائی ہے؟“ جشید احمد نے حیرت سے تیر لہجے میں پوچھا۔

”جی جناب!“ راجو گردن ہلاتے ہوئے جب سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکالا۔ ”یہ تصویریں دیکھئے جناب! میری پہلی کوشش۔“ اس نے لفافے سے ایک تصویر نکال کر جشید احمد کی طرف بڑھائی۔ ”یہ ٹیکم صاحبہ چند مردوں اور لڑکیوں کے ساتھ نہ صرف سے نوشی کر رہی ہیں بلکہ جوا بھی کھیل رہی ہیں۔ میز پر

سے نکال دے۔ ہمیں راحت و آسائش کی زندگی دے دے۔ دولت مند بنادے پھر خدا نے جیسے سن لی۔ میرے شوہر نے ایک ایسے کام کا انتخاب کیا جس نے ہمیں راتوں رات امیر بنا دیا۔ پھر ہم بڑے اور بڑے آدمی بننے گئے۔ جیسے جیسے راتیں اور آسائشیں ملتی گئیں ویسے ویسے ایک ایک کر کے طرح طرح کی بیماریاں ملتی گئیں۔ میں بھی کئی امراض کا شکار ہو گئی۔ میرے شوہر سے ایسے امراض چٹ گئے جو جان لیوا ہیں۔ میرے بچوں کی بھی صحت ابھی ٹھیک نہیں رہتی ہے۔ آج جب پلٹ کر دیکھتی ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس مقام پر پہنچ کر میں نے سکون و صحت کی بیش بہا نعمتیں کھودی ہیں۔ یہ وہ نعمتیں ہیں جو دولت سے نہیں خریدی جا سکتیں بلکہ وہ سادگی و وقاحت کی زندگی کا عطیہ ہوتی ہیں۔ صحت بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ صحت نہ ہو تو پھر یہ دولت، راحت و آسائش اور شان و شوکت سب بیکار ہے۔ سب بیکار ہے۔“ پھر وہ سسک پڑیں۔ ”آج وہ دولت بھی کسی کام نہیں آ رہی ہے۔ جس پر بڑا ناز تھا پھر وساتھا۔“

جب ہی ایک ملازم نے اندر آ کر بتایا۔ ”ڈاکٹر کا ٹیلی فون آیا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ وہ چلی گئیں پھر نرس بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ لڑکے نے اپنی بہن سے کہا۔ ”مئی جذباتی ہو گئی ہیں۔ وہ ڈپڈی پر آٹھ دس لاکھ روپے پھونک رکھ دیں گی۔ اب انہیں کون سمجھائے۔“

”تم فکر نہ کرو۔“ بہن نے تسلی دی۔ ”ڈاکٹر دن کا کہنا ہے کہ ڈیڈی صرف ایک ہفتے کے مہمان ہیں۔ انہیں یورپ لے جانے کی نوبت نہیں آئے گی۔ اس لئے کہ کاروائی پوری ہونے دس دن تو لگ جائیں گے۔ یہ رقم خراج جائے گی۔ اب ہمیں حقیقت پسند بن کر حقیقت کا سامنا کرنا چاہیے۔ مئی پرانے زمانے کی ہیں۔ انہوں نے دس برسوں میں کچھ نہیں سیکھا۔ اس نرس کے سامنے بکواس کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم کون ہیں اور کیا تھے؟ یہ تو بھی ابھی بالکل آؤٹ ہو جاتی ہیں۔ واٹ

دیکھئے تاش کے پتے اور سوسو کے نوٹ اور ان کے نمبر کس قدر صاف نظر آرہے ہیں پھر یہ شراب کی بوتل ہے۔ بوتل پر جو لیبل چپکا ہے اس کا نام بھی صاف پڑھا جا رہا ہے اور گلاسوں میں جو شراب بھری ہوئی ان لوگوں کے سامنے رکھی ہے اس کا رنگ بھی کتنا واضح ہے۔ دوسری تصویر میں بیگم صاحبہ نے گلاس منہ سے لگایا ہوا ہے۔ تیسری تصویر میں وہ میز پر سے نوٹ سمیٹ رہی ہیں۔ جیسے انہوں نے بازی جیت لی ہے۔“ اس نے دوسری اور تیسری تصویر کو بڑھا دیا۔

جسٹس احمد نے دونوں تصویریں اس کے ہاتھ سے لے لیں اور انہیں دیکھا تو وہ چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر زردی سی چھا گئی اس کی آنکھیں پٹی پٹی سے ہو گئیں تو راجو نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”ان تصویروں کے ان سب کے چہرے کس قدر واضح ہیں جیسے وہ لوگ ہمارے سامنے بیٹھے ہوں۔ اچھا اب یہ تصویریں دیکھئے میرے فن کا کمال، سرخ رنگ کی ٹیوٹا کس قدر تیزی سے آئی دکھائی دے رہی ہے اور چلانے والے کا چہرہ کس قدر صاف ہے۔ ایک نوجوان لڑکا اس کار کو چلاتا آ رہا تھا میں دور سے کار کی رفتار دیکھ یہ اندازہ لگاتا تھا کہ کوئی شراب پی کر چلا رہا ہے۔ کیونکہ کار بھی دائیں جا رہی تھی، بجلی بائیں بجلی فٹ پاتھ پر چڑھ رہی ہے تو ابھی سڑک کے کنارے کنارے، سائپ کی طرح لہراتی بل کھاتی اور بڑی تیز رفتاری سے آرہی ہے۔ رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔ دن ہوتا تو ایک سیڈنٹ ہو چکا ہوتا۔ میں نے کیمرا سنبھال لیا۔ اس لڑکے اور کار کی بہت ساری تصویریں لینا پڑیں۔ یہ دیکھئے اس تصویر سے صاف پتا چل رہا ہے کہ لڑکا نشے میں دھت ہے اور اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں۔ اس تصویر میں ایک سیڈنٹ کا منظر کس قدر صاف نظر آ رہا ہے۔ ایک راہ گیر کار کے پیچھے کے نیچے پکلا ہوا ہے۔ یہ راہ گیر سیٹھ اختر بھائی کا خانا ماں تھا۔ اس تصویر میں کار، اس کی نمبر پلیٹ پر لکھے نمبر اور کار چلانے والے کا چہرہ

نمایاں ہے۔ یہ ایک اور تصویر ہے جس میں وہ کار پیچھے کر رہا ہے اور اس تصویر میں وہ کار لے کر فرار ہوتا نظر آ رہا ہے۔ اس لڑکے کو بالکل خبر نہیں ہو سکی کہ اس کی تصویریں کوئی دھڑا دھڑاتا رہا ہے۔ میں نے ایسی جگہ چھپ کر یہ تصویریں اتاری ہیں کہ اس کے فرشتوں کی خبر نہیں ہوئی ہوئی۔ اب یہ مجرم لڑکا قانون کے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتا۔ ہر تصویر اس لڑکے کے جرم کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس لڑکے کے نشے نے ایک غریب آدمی کی جان لے لی ہے۔ اس خانا ماں کے کندھوں پر دس افراد کی کفالت کا بوجھ تھا۔ اس غریب کے گھر پر تو قیامت ٹوٹ پڑی ہوگی۔ کیا معلوم اس کے بیوی بچے فاقے کر رہے ہوں۔“

راجو نے محسوس کیا کہ اس کی جذباتی سن کر

جشید احمد کے چہرے پر ناگواری ابھر رہی ہے اور چہرہ تنہا رہا ہے..... راجو نے لفافے سے ایک اور تصویر نکالی اس ایک نظر ڈالی اور اس کی طرف بڑھائی۔ ”یہ اس محلے کے لڑکے اور لڑکیاں معلوم ہوتے ہیں اس کے ساتھ یہ دوسری تصویریں اور ہیں۔ یہاں نشیات کا اڈہ ہے۔ لڑکے لڑکیاں نشہ کر رہے ہیں اور نشے کے انجکشن لگوا رہے ہیں۔ نشہ اور سگریٹ پی رہے ہیں۔ اسی جنگل کی دو کمروں کی تصویریں اور بھی ہیں انہیں بھی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ دیکھئے۔ اس تصویر میں وہ لڑکا بھی نظر آ رہا ہے جس نے وحشیانہ انداز سے کارا سیکرینٹ کر کے خانساں کو چل دیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس لڑکے کو اس غریب کی موت کا کوئی دکھ رنج اور احساس ہی نہیں ہے۔ جب ہی وہ کسی بات دل کھول کر قہقہہ لگا رہا ہے۔ کتنا خوش دکھائی دیتا ہے کیا جناب ان لوگوں کے پاس ضمیر نام کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔ اگر میں اس لڑکے کی جگہ ہوتا تو ایک دن بھی چین و سکون سے نہیں رہ پاتا اور اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیتا۔“

راجو جب لفافے سے تصویریں نکال رہا تھا تب محاس کی نظر جشید احمد کے چہرے پر پڑی۔ اس نے محسوس کیا کہ جشید احمد کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے اور آنکھوں سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ابھی ابھی خون ٹپک پڑے گا۔ جیسے اسے معاشرے پر سخت غصہ آ رہا ہو اور ان لوگوں کو مزہ چکھانا چاہتا ہو پھر اس نے جلدی سے تین تصویریں نکال کر بڑھادیں۔ ”یہ تصویریں بھی کیا لا جواب ہیں ایک تصویر میں آپ اور آپ کی لڑکیاں مل کر ہیر و دن چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں پیک کر کے وزن کر رہی ہیں۔ دوسری تصویر میں آپ اور آپ کی لڑکیاں مل کر سوٹ کیس کے خفیہ حصے میں پیکٹ چھپا رہی ہیں تیسری تصویر میں دونوں لڑکیاں اپنے اپنے پاسپورٹ اور سفری کاغذات کا جائزہ لے رہی ہیں۔ اس کے علاوہ دو ایسی تصویریں بھی جن.....“

”بھاڑ میں گئیں تصویریں۔“ وہ ہذیانی انداز

میں اتنے زور سے چیخا کہ راجو ایک دم سہم گیا۔ ”تم مجھے بے وقوف بنارہے ہو یا بے وقوف سمجھتے ہو۔ میں نے تم سے یہ تو نہیں تو کہا تھا کہ تم میرے خاندان کے پیچھے پڑ جاؤ میرے خاندان کی تصویریں کھینچتے پھرو۔“

”آپ کا خاندان؟“ راجو کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

”یہ میرا نہیں تو تمہارے باپ کا خاندان ہے۔“ وہ دہڑا۔ ”جو عورت مردوں اور عورتوں اور ساتھ ٹیٹھی شراب پی رہی اور جو اکیلے رہی ہے وہ میری بیوی ہے جس لڑکے نے راہ گیر کو چل دیا وہ میرا بیٹا ہے اور وہ کار میری اپنی ہے جو لڑکیاں نشہ کر رہی ہیں ان میں میری بیٹی بھی ہے۔ جو ہیر و دن پیک کر رہی ہیں وہ میری لڑکیاں ہیں جو آج کل یورپ گئی ہوئی ہیں پھر تم نے مجھے بھی نہیں بخشا، ہماری بی بی ہم سے میاؤں.....“

”میں اور کیا کرتا جناب! آپ کسی نہ کسی طرح کارکردگی دکھانا ہی تھی دس بارہ دنوں میں مجھے ایسی کوئی قابل اعتراض بات کہیں نظر نہیں آئی جس کی تصویریں کھینچتا۔ یہ محض اتفاق.....“

”بند کرو یہ بھواس..... ذلیل کہنے۔“ وہ گرجا۔

”اس کے ٹیکو کہاں ہیں؟“

”ٹیکو پولیس کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ انسپکٹر صاحب آپ سب کی گرفتاری کے وارنٹ لے کر پہنچنے والے ہیں۔ ویسے جناب! آپ کا منصوبہ بڑا شاندار تھا۔ مگر بد قسمتی سے آپ نے غلط آدمی کا انتخاب کیا۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے۔ جو شخص ہر حال میں اللہ توکل ہوتا ہے اسے کسی قیمت پر خرید نہیں جاسکتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے توکل پر بڑی سے بڑی ناجائز دولت کو قربان کر دیتا ہے اور پھر آپ سب تو مجرم ہیں۔ مجرموں کو کبھی گرفتار تک پہنچانا.....“

راجو نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی کیونکہ انسپکٹر اپنے ماتحتوں کے ساتھ اندر داخل ہو رہا تھا۔

﴿.....﴾

## اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

گوپال نے تشویش ناک لہجے میں جو کہا گوتم نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ کیوں کہ اس کی بات غلط نہ تھی۔ دور اندیشی کی بات تھی۔ جس طرح تیر گوپال کی ہتھیلی کی پشت میں پیوست ہوا تھا گوتم اس بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا اندازہ گوتم کو اس بات سے ہوا تھا کہ تیر گوپال کے ہاتھ کی ہتھیلی میں پیوست ہوا تھا۔ تیر انداز چاہتا تو تیر گوپال کے سینے میں اتار کر اسے موت کی نیند سلا سکتا تھا.....!



ایم الیاس

## اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

”میں اس وقت بے ہوش ہونے کے موڑ میں نہیں ہوں۔ برسات کی بارش نہیں ہوتی ہے..... دولت ڈکیتی یا غلط طریقے سے آئی ہے۔ کیا خوش خبری ہے میں نے تمہیں پاگل کر دیا ہے۔“ یہ بات ساری دنیا جانتی ہے کہ سیدر کا جنگل، دنیا کا سب سے بڑا جنگل ہے..... وہ چار ستوں تک سینکڑوں میل تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی مغرب سمت جاؤ تو اس کی آخری حد بنگال کا سندھ بن جنگل واقع ہے۔ مشرق کی سمت برما کا جنگل..... شمال میں ملایا کے دلہلی جنگلات اور جنوب میں انڈونیشیا..... ان کے درمیان دریا اور گہرے سمندر ہیں۔“

”اس میں نہ تو نہایت سنسنی خیزی..... نا قابل یقین اور تھیر انگیز امر اور خوش خبری والی کوئی بات دور دور تک مجھے نظر نہیں آئی جو تمہیں خوشی سے بے قابو کر رہی ہے۔“

”میری پوری بات ذرا غور اور توجہ سے تو سن لو۔“ گوپال کہنے لگا۔ ”سیدر کے جنگل میں شمالی جنوب میں کوئی سوسا سوسیل کے اندر ایک قبائلی قوم رہتی ہے۔ گمنام قبیلہ ہے جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا ہے۔ آج تک کسی نے دریافت نہیں کیا اور نہ ہوسکا..... اس لیے ادھر خوف ناک درندوں

”میں ایک نہایت سنسنی خیز، نا قابل یقین اور نہایت تھیر انگیز سچی کہانی لایا ہوں جو کسی بھی طلسمانی دنیا سے کہیں رنگین، حسین اور بے حد دلچسپ ہے۔“ گوپال نے کمرے میں گھستے ہی بغیر کسی تمہید کے کہا۔

”تمہارا دمکتا چہرہ..... چمکتی آنکھیں..... اور سرشاری بتائے دے رہی ہے کہ واقعی تم کوہ قاف سے لوٹے ہو۔“ گوتم نے دل چسپی لیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہیں بھی اپنی زندگی میں اتنا خوش نہیں دیکھا..... ایسا لگ رہا ہے کہ تمہارے نام امریکی ڈربلی لاٹری نکل ہے اور تم راتوں رات کروڑ پتی بن گئے ہو..... تم نے پانچ لکھ خریدے تھے نا.....“ گوتم نے کہا۔

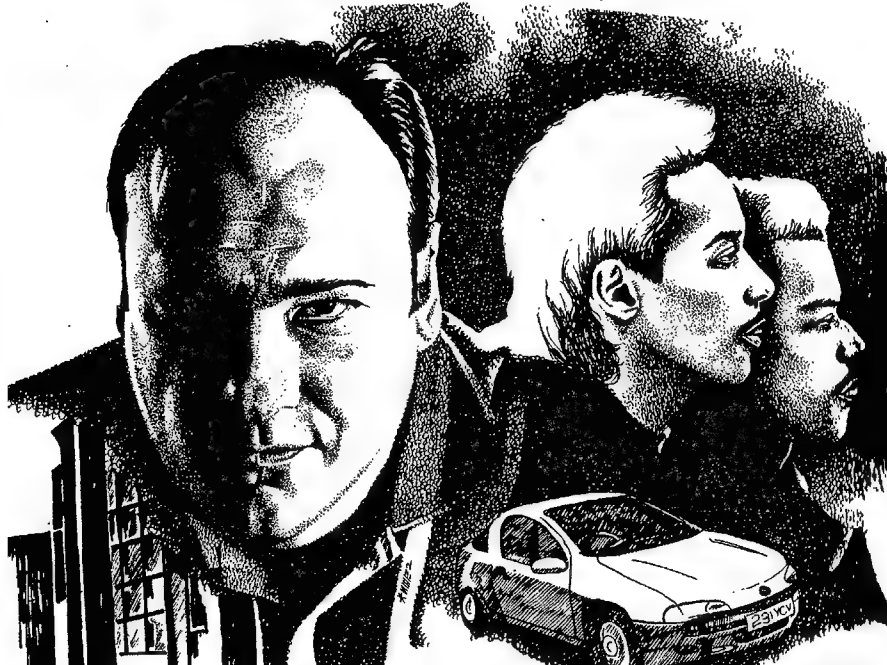
”نہیں..... ڈربلی لاٹری نہیں نکل ہے..... اس سے بھی بڑی لاٹری نکل آئی ہے۔“

”لیکن دنیا میں اس سے بڑی لاٹری کوئی نہیں ہے۔“ گوتم نے تکرار کی۔

”تم سنو گے تو حیرت اور خوشی سے بے ہوش ہو جاؤ گے..... اس خوش خبری کے مقابلے میں ڈربلی لاٹری کچھ نہیں ہے۔“ گوپال کی زبان خوشی سے لڑکھڑاہی تھی۔ ”دولت کی برسات ہونے والی ہے۔“

ہیں جن سے ان کا حسن اور جسمانی کشش قیامت  
خیز نظر آتی ہے..... بال بھی نہایت خوش نما.....  
کالے اور لائے ہیں..... اتنی بڑی سیاہ آنکھیں  
شاید ہی مہذب دنیا کی کسی عورت کی ہو..... ایسی  
لڑکیاں عورتیں کسی خطے میں کیا سپنوں میں بھی نظر  
نہیں آتی ہیں..... یہ سب غیر مہذب، اجڑ گنوار اور  
جنگلی ہیں..... اس قبیلے میں مردوں کی تعداد آٹے  
میں نمک کے برابر ہے..... وہاں صدیوں سے مرد  
بہت کم پیدا ہوتے ہیں..... اس کے برعکس  
لڑکیاں..... ایک ایک عورت کے لطن سے لے کر  
سولہ سولہ لڑکیاں ہیں..... وہ سب کی سب ایک سے  
ایک نایاب، انمول اور تراشیدہ ٹیکنوں اور ہیروں کی  
طرح ہیں..... قدرت نے انہیں حسن و شباب بڑی  
فیاضی سے نوازا ہے..... شاید ہی کسی عورت کا پٹا  
ہو..... جو عورت دو ٹین لڑکوں کی ماں ہو..... اگر ہوئی  
تو اسے اس قبیلے کی ملکہ بنا دیا جاتا ہے۔“  
”یار گوپال..... میں یہ بات جانتا ہوں کہ تم

کی بہتات ہے۔ چوں کہ وہ علاقہ گھٹا، تاریک اور  
دلہل میں ہے اس لیے کوئی ادھر شکار کھیلنے نہیں جاتا  
ہے۔ وہاں ایک جزیرہ ہے جو پہاڑیوں اور  
جنگلات کے حصار میں واقع ہے..... یہ جزیرہ نہ  
صرف نہایت خوب صورت، سرسبز و شاداب اور  
قدرتی نظاروں کے حسین مناظروں سے بھرا ہوا  
ہے جس کی تعریف الفاظ سے ممکن نہیں ہے۔ وہاں  
جانے سے واپسی کو دل کو دل نہیں کرتا ہے..... لیکن  
اس بہتی کی عجیب و غریب بات اور خصوصیت ہے کہ  
وہاں عورتوں کی حکمرانی ہے..... وہاں جو لڑکیاں اور  
عورتیں ہیں نہ صرف بے حد صحت مند..... مردوں  
سے کہیں طاقت ور اور جفاکش ہیں بلکہ سب کی  
سب نہایت حسین، پرکشش اور ان کے جسم متناسب  
چھریرے اور تناسب کے خزانوں سے بھرے  
ہوئے ہیں۔ وہاں کوئی ایک لڑکی یا عورت ایسی نہیں  
ہے جو بد صورت بے کشش..... موٹی بھدی ہو.....  
کوئی پستہ قد یا درمیانہ بھی نہیں ہے۔ بس دراز قد



بہتات ہو کہ وہ راستوں میں پتھروں کی طرح پڑے ہوں۔“

”اس کی ایک وجہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے انہیں ہیروں کی اہمیت اور قدر اس لیے نہیں معلوم اور نہ اندازہ ہے کہ وہ ایک جزیرے پر ہیں جس کا تعلق مہذب دنیا سے نہیں ہے۔ اس لیے وہ انہیں پتھر سمجھتے ہیں۔“ گوپال نے کہا۔

”لیکن اس جزیرے کا ثبوت ..... اور زمر د کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا ..... یہ سنی سنا کی باتیں ہیں۔“ گوتم بولا۔

”میں تمہیں اس کا ثبوت پیش کرتا ہوں .....“ گوپال نے جیب سے زمر د نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ”میں ایک جیولری شاپ پر اسے دکھا کر لایا ہوں۔ اس نے اس کے پچاس ہزار لگا دیے ..... اس کا کہنا ہے کہ یہ بڑا نایاب انمول اور نادر قسم کا ہے۔ ایسے جتنے بھی زمر د ہوں وہ خریدنے کے لیے تیار ہے ..... اب تو تمہیں میری بات کا یقین آئے گا۔“

گوتم نے زمر د کو اٹھا کر اسے الٹ پلٹ کر ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ کیوں وہ خود بھی ایک جوہری تھا اور جیولرز ٹاپ پر ملازمت کرتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا ..... ”تم نے یہ نہیں بتایا کہ جس نے تمہیں یہ زمر د دیا اس نے اور کیا کچھ بتایا۔ جزیرے پر زمر د کثرت سے راستوں پر کیسے پڑے ہوئے ہیں۔“

”اس نے اس کا سبب یہ بتایا کہ جزیرے پر زمر د کی تین کانیں ہیں ..... ان کانوں کو رہائش بنانے کے لیے کھدائی کی گئی تھی ..... ان میں سے جو یہ زمر د نکلے تو انہیں راستوں پر پھینک دیا ..... منوں پتھر پڑے ہوئے جو زمر د ہیں۔“

”یہ شخص وہاں کیوں کر اور کیسے پہنچا .....“ گوتم نے سوال کیا۔

”یہ ایک مفروضہ قاتل تھا ..... وہ پولیس کو کئی جرائم کے سلسلے میں مطلوب تھا۔ اس نے دس قتل

نشر نہیں کرتے ہو ..... کیا تم نے سنا دیکھا ہے۔ ہم دونوں اور ہمارے شکاری دوست چھ سات برس سے شکار کھیلنے جنگل جاتے ہیں۔ ایسے کسی قبیلے اور لڑکیوں عورتوں کے بارے میں سنا نہیں، اگر ایسا ہوتا تو کبھی کا علم میں آچکا ہوتا ..... مثلاً مغرب اور مشرق میں دو تین قومیں نیم برہمن ہی ہوتے ہیں ..... کوئی سیاح یا مہذب دنیا کے کسی آدمی کو دیکھتے ہی وہ اس طرح دہشت زدہ ہو کر جاگ جاتے ہیں جسے کوئی عفریت ہو ..... یار! یہ کہانی تمہیں کس نے سنا ہے۔“ گوتم نے طنز کیا۔ ”اور تم وہاں جا کر شادی کرنا چاہتے اور بھابھی کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو تمہاری چندھیا پر ایک بال بھی نہیں رہے گا۔“

”یہ کہانی ایک حقیقت ہے۔“ گوپال نے سکرار کی۔ ”اصل بات تو میں نے تمہیں ابھی تک نہیں بتائی۔ اس جزیرے کے بارے میں جو بتانے والا ہوں، سنو گے تو اچھل پڑو گے۔ ان لڑکیوں عورتوں کی ہستی ایک جزیرے پر واقع ہے۔ جو تاریک، گنجائش اور گھنے جنگل کے درمیان ہے۔ وہ باہر سے نظر نہیں آتی ہے۔ اس لیے اس کا علم کسی کو نہ ہو سکا اور نہ کسی کو اس کی خصوصیت کا علم ہو سکا اور پھر راستہ خطرناک اور دشوار گزار ہے۔ سانپوں و اژدہوں اور درندوں سے سابقہ پڑتا ہے ..... اس جزیرے پر زمر د کی اس قدر بہتات ہے کہ وہ راستوں اور زمین پر پتھروں کی طرح اس طرح پڑے ہوتے ہیں جیسے بے مصرف ہیں۔ ان کی کوئی قدر نہیں۔“

”یہ تم دور کی کوڑی کہاں سے لائے ہو۔“ گوتم نے کہا۔ ”تم نے جس جزیرے کے بارے میں بتایا کہ وہاں عورت کے حکمرانی ہے ..... وہاں کی لڑکیوں عورتوں کے حسن و شباب کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ..... میں اسے اس لیے قبول کر لیتا ہوں۔ سچ مان لیتا ہوں کہ وہ شاید یقیناً ایسا ہو لیکن میں نہیں مانتا کہ وہاں زمر د کی اتنی

جو حیت جائے گی وہ رانی بنے گی۔

وہاں کی لڑکیاں اور عورتیں کھیتی باڑی اور مردوں کی طرح سخت سے سخت اور بڑے بڑے کام کرتی تھیں۔ وہاں سب اتفاق و محبت سے رہتی تھیں۔ اس لیے اس سے نفرت کی جائے گی کہ وہ ان کی محبت میں نفرت کا بیج بو رہا ہے۔ اس کے مرد بھی سخت دشمن ہو گئے تھے۔ صرف ایک مرد اس کا دوست تھا۔۔۔۔۔ اس نے اسے اعتماد میں لے کر بتایا کہ رانی نے اسے قتل کا منصوبہ بنایا ہوا ہے تاکہ اس کی حکمرانی نہ چھین جائے۔ پھر ایک رات وہ تھیلے میں زمر دھڑ کر اور ایک جیب میں رکھ کر اسے مرد کی مدد سے اس جزیرے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔۔۔۔۔ لیکن جنگل میں اسے بڑی مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔ اس کا تھیلا اس کی غفلت کی وجہ سے دلدل میں جا گر۔۔۔۔۔ پھر اسے جانوروں نے کاٹ کھایا۔ جب وہ سیدر شہر آیا تو وہ شدید زخمی ہو چکا تھا۔ خاردار چھاڑیوں نے بھی بڑی زہریلی اس نے نہ صرف اس کے پیڑے پھاڑ دیے بلکہ جسم میں خراشیں ڈال دی تھیں۔ اس بات کا خوف و خدشہ تھا کہ سیور کی پولیس اسے گرفتار نہ کر لے۔ اس لیے اس نے ایک عورت کو اسٹین گن دکھا کر اس کے زور پر گاڑی چھینی۔۔۔۔۔ یہ دودن پہلے کی بات ہے۔ میں جگھور گیا ہوا تھا۔ میری موٹر سائیکل ویرانے میں خراب ہو گئی تھی۔ اتفاق سے اس کی گاڑی بے قابو ہو کر ایک درخت سے ٹکرا گئی تھی۔ میں نے جا کر اسے گاڑی سے باہر نکالا پھر اس نے اپنی ساری کہانی سنائی اس نے زمر نکال کر میرے حوالے کیا۔ پھر اس نے دم توڑ دیا۔ میں نے اپنی موٹر سائیکل ٹھیک کی۔۔۔۔۔ پھر ایک سیلک ٹیلی فون بوتھ سے پولیس کو اطلاع دے دی۔ یہ کم نام فون تھا۔

”اب تمہارے کیا ارادے ہیں۔۔۔۔۔“ گوتم نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”کیا تم کسی حسین لڑکی سے شادی کرنے جاؤ گے۔۔۔۔۔ یا زمر کے چکر میں جانا چاہتے ہو۔“

کے۔۔۔۔۔ ڈکیتی کے دوران اس نے ایک گھر کی دو عورتوں کی عزت تباہ کی۔۔۔۔۔ پولیس نے اس کا تعاقب کیا تو وہ سیور کے جنگل میں روپوش ہونے کے لیے جنگل میں گھس گیا۔ اس کے پاس ایک اسٹین گن اور دو تین دستی بم اور ریوالتور اور چاقو بھی تھا۔ جب اس نے جنگل میں بھی پولیس کو تعاقب کرتے ہوئے دیکھا تو وہ اس جزیرے کی سمت چل پڑا پولیس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس جنگل کے علاقے میں اس کا تعاقب کر سکے۔ اس کا جدھر منہ اٹھا ادھر بھاگتا گیا۔۔۔۔۔ راستے میں اس کا واسطہ موذی جانوروں سے پڑا تو اس نے اسٹین اور چاقو سے انہیں موت کی نیند سلاتا گیا۔ آخر وہ جزیرے پر پہنچا جہاں مہارانی۔۔۔۔۔ لڑکیاں عورتیں اور مرد بھی بڑے حیران اور خوش ہوئے کیوں کہ یہ مہذب دنیا کا پہلا شخص تھا جو وہاں پہنچا تھا۔ اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔۔۔۔۔ اس نے ایک سے ایک حسین لڑکیاں عورتیں دیکھیں تو وہ یہ سمجھا کہ زمین کے پرستان پر آ گیا ہو۔۔۔۔۔ وہ خواب کی سی حالت میں نہیں دیکھتا رہا۔ وہاں عورت کے معاملے میں ہر قسم کی آزادی تھی۔۔۔۔۔ جس لڑکی عورت سے دل چاہے رہ سکتا تھا۔۔۔۔۔ اس طرح جو لڑکی عورت چاہے اسے ملکیت بنا سکتی تھی۔ وہ وہاں جیسے راجہ اندر بن گیا تھا۔

اس دوران اس نے زمر کو دیکھا۔ اسے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے دریافت کیا تو اسے بتایا گیا کہ یہ پتھر ہیں جو کانوں کی کھدائی سے نکلے ہیں اس جزیرے کی رانی ایک نہایت شاندار مکان میں رہتی تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اس رانی نے تین لڑکوں کو جنم دیا تھا اس لیے اسے رانی بنا دیا گیا۔ اگر اس کے تین چار لڑکے ہوئے تو اسے راجا بھی بنایا جاسکتا ہے۔ اتفاق سے ایک برس کے اندر سے چار لڑکیوں سے اس کے چار لڑکوں نے جنم لیا۔ صرف کوئی ایک لڑکی مہارانی بن سکتی تھی۔ یہ فیصلہ کیا گیا ان چاروں لڑکیوں کے درمیان مقابلہ ہوگا۔

گئے..... ہم ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اور کسی تدبیر سے لے جائیں گے کہ ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوگی۔“ گویا بولا۔ ”ہمارے پاس اسلحہ ہوگا..... ان کے پاس کیا ہو سکتا ہے۔ ہم اسلحہ کے زور پر زمر دے آئیں گے۔“

”یہ کل از وقت کی بات ہے..... جانے کیا حالات پیش آئیں۔“ گوتم نے کہا۔  
”وہ کس لیے.....“

”اس لیے کہ ہم ان کی مدد سے بڑی سے بڑی کشتی لے جائیں گے تو زیادہ مال بھر کر لائیں گے۔“ گوتم نے کہا۔ ”اور پھر انہیں کچھ حصہ دے دیں گے یہ بات پہلے سے طے کر لیں گے، ہم چار آدمی ہوں گے تو ایک طاقت ور گروہ کی شکل میں ہوں گے۔ ہم چاروں مسلح سے وہ عورتیں مقابلہ نہیں کر سکیں گی..... ہم چاروں وہاں پہنچیں گے تو نہ صرف بڑی آؤ بھگت ہوگی بلکہ ہمیں ہر طرح کی آزادی مل جائے گی وہاں عیش و عشرت کے لیے..... کیوں کہ اس جزیرے پر مردوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے..... وہ مردوں کی نسل بڑھانا چاہتی ہیں..... اس مجرم سے چار لڑکوں نے جنم لیا..... ہمارے لیے بیویوں کی کوئی کمی نہیں ہوگی..... ہم راجہ اندر بنے رہیں گے جب ہم ان سے خوب سیر ہو جائیں گے تب انہیں محبت اور اعتماد میں لے کر۔“

”کیا ہم وہاں برس ڈیڑھ برس رہیں گے بچوں کی پیدائش تک.....“ درمیان میں گویا پال نے کہا۔

”پہلے مجھے اپنی بات پوری کرنے دو.....“ گوتم نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”صرف تین چار ماہ..... کیوں کہ معلوم نہیں جو لڑکیاں عورتیں امید سے ہو جاتی ہیں ان کے پاں لڑکے ہوتے ہیں یا لڑکیاں..... عورت کو بے وقوف بنانے اور اس کی محبت اور اعتماد حاصل کرنے کے لیے جو ہتھیار ہیں وہ محبت، والہانہ پن اور وارثی..... اور اس کی

”دل تو بہت کر رہا ہے کہ وہاں جا کر کسی لڑکی کو اپنا کر لے آؤں۔“ وہ شوخی سے بولا۔ ”لیکن ایک مسئلہ ہے۔“  
”وہ کیا.....“

”ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں.....“ گویا پال نے جواب دیا۔ ”ہم وہاں شکار کے بہانے چلتے ہیں۔ وہاں جب تک رہیں گے، بہتی لنگا میں ہاتھ دھو رہیں گے..... پھر کسی دن وہاں سے کسی تدبیر سے زمر دے کر واپس آئے ہیں..... ایک زمر دہ بھی چالیس ہزار سے کم مالیت کا نہیں ہے..... ہم دونوں بیس تیس کلوز زمر دے لے کر آ سکتے ہیں..... کیا ہم کروڑ پتی راتوں رات نہیں بن جائیں گے۔“

”کیا ہمیں وہاں کی مہارانی زمر دھیلوں میں بھر کر لے جانے دے دے گی۔“ گوتم نے خیال ظاہر کیا۔

”کیوں نہیں.....“ گویا پال نے جواب دیا۔  
”کیوں کہ اس کے نزدیک یہ پتھر ہیں۔“

”کیا تمہارے خیال میں مہارانی اور اس بستی کی لڑکیاں عورتیں بے وقوف ہوں گی۔“

”اس لیے کہ وہ ایک پس ماندہ بستی میں رہتی ہیں۔ اس مفروضہ مجرم کے علاوہ کوئی اور جزیرے نہیں گیا..... انہیں کیا معلوم کہ مہذب دنیا میں ان پتھروں کی کیا قدر و قیمت اور اہمیت ہے۔“

”گویا پال.....! عورت چاہے کسی خطے کی ہو..... پس ماندہ ہو..... جاہل و اجڑ اور گنوار کیوں

نہ ہو۔ وہ مہذب دنیا سے نا آشنا کیوں نہ ہو..... وہ بے وقوف نہیں ہوتی ہے..... اس جزیرے کی رانی اور لڑکیاں عورتیں بھی بے وقوف نہ ہوں گی..... جب ہم ان پتھروں کو تھیلوں میں بھریں گے وہ مشکوک ہو جائیں گی کہ ان پتھروں کو ہم کیوں لے جانا چاہتے ہیں..... مزاحمت کریں گی..... وہ شاید لے جانے نہ دیں۔“

”ہم ان کے سامنے تھوڑی لے جائیں



مشورہ تو یہ ہے کہ یہ در فارسٹ کے دفتر سے بھی کشتی لی جائے۔ والہی میں شہر کے مضافات میں اتر کر ٹیکسی کر کے اپنی رہائش پر آ جائیں۔“

☆☆

گوپال اور گوتم نے فارسٹ آفس سے شکار پر جانے کے بہانے ایک کشتی کرائے پر لی اور وہ ندی کے راستے جنگل کے اندر کی طرف روانہ ہو گئے۔ صرف دس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد انہیں ندی کنارے اترنا پڑا۔ اس لیے کہ ندی بل کھائی جس سمت جاری تھی اس سمت ان کا راستہ نہیں تھا۔ وہ کشتی اڑائے تین گھنٹے چلتے رہے تھے۔ کیوں کہ ابھی وہ گھٹا تاریک اور خطرناک جنگل نہیں آیا تھا۔ ابھی ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ ان کے پاس چاقو، ریو اور گولیاں..... بندوق اور درانتیاں بھی تھیں تاکہ جھاڑیاں اور درختوں کی کٹائی کر سکیں..... اس کے علاوہ طاقت ور نارنج بھی ہے کروڑوں کے زمرہ کے تصورات نے ان میں بڑا حوصلہ طاقت اور عزم بھردیا تھا۔

چار گھنٹے کی طویل مسافت طے کرنے سے پہلے انہوں نے کشتی کو ندی کنارے ایسی جھاڑیوں میں چھپا دیا تھا کہ کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ اس لیے کہ یہاں شکاری آتے تھے اور ابھی سکتے تھے۔ کیوں کہ وہ ساتھ میں نہیں لے جا سکتے تھے۔ کیوں کہ راستہ دشوار تنگ اور جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ کیڑے کوڑوں اور چھوٹے بڑے زہریلے سانپ اور دو تین گز لمبی موٹی اور حملہ آور قسم کی چھپکلیاں بھی تھیں جن سے وہ مقابلہ بھی کر رہے تھے۔ پھر وہ اس گھنے اور تاریک جنگل کے اندر میل بھر کی مسافت طے کر چکے تو ایک کھلی جگہ پر آ گئے۔ وہاں درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ دائیں جانب ایک جھیل تھی۔ وہ دونوں ایک دم سے ٹھک کر رک گئے۔ وہاں انہیں ایک ایسا دل کش رنگین اور ہوش ربا نظارہ آیا کہ ان کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی..... انہوں نے ایسا نظارہ صرف انگریزی

تعریف جو عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے ہم کسی دن موقع پا کر فرار ہو جائیں گے..... غیر محسوس انداز سے زمرہ تھیلوں میں کسی بہانے بھر کر ایک طرف رکھ دیں گے..... تاکہ عین وقت پر انہیں لے جانے میں کوئی دشواری نہ ہو۔“

”تمہاری بات سے انکار نہیں..... لیکن تم نے ایک اور پہلو سے غور نہیں کیا..... ہمارے ساتھیوں کی آنکھیں پھٹ جائیں گی اس قدر دولت دیکھ کر..... ان کی نیت میں فتور آ سکتا ہے۔ وہ ہمیں دولت کے لالچ میں شاید قفل بھی کر سکتے ہیں۔ چاہے وہ دوست کیسا ہی قابل بھروسہ کیوں نہ ہو..... اگر ہم وہاں سے فرار خیریت سے یہاں پہنچ گئے بھی تو اس دولت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ ایک زمرہ بھی ہاتھ نہیں لگے گا۔“

”وہ کس لیے.....“ گوتم نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔

”میں اور تم اس خزانے کو لا کر چھپا کر رکھ سکتے ہیں..... لیکن اپنے دوستوں کے بارے میں کچھ نہیں سکتے ہیں..... اگر یہ راز طشت از بام ہو گیا تو حکومت اس خزانے کو تحویل لے لے گی۔ اس لیے کہ جنگل کی ایک ایک اچھڑ زمین اس کی ملکیت ہے۔ اس کے تمام وسائل پر..... وہاں شکار پر جانے کے لیے اجازت لینی پڑتی ہے اور میں بھی دینا ہوتی ہے..... کالا ہرن اور دوسرے ہرنوں، تیتروں اور ٹیڑوں کے شکار پر بھی پابندی ہے، صرف مرغابیاں اور بطنیں شکار کی جا سکتی ہیں..... جن درندوں کا شکار کیا جائے ان کی کھالوں کے حق شکاری ہوتے ہیں..... ایک زمرہ بھی وہ ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔“

”ہاں..... میں یہ بات تو بھول گیا تھا.....“ گوتم بولا۔ ”ہم دونوں بھی چلتے ہیں..... کشتی ساتھ لے جانے کی اجازت تو ہوتی ہے..... ویسے ہم اس کشتی سے ندی کے راستے سے بھی جنگل میں جا سکتے ہیں..... جو شہر کے مضافات میں واقع ہے۔ میرا

جا کر سر پرانیز کرنا چاہیے۔“

”ہاں..... تمہارا مشورہ مناسب ہے۔“  
گوپال نے سر ہلایا۔ ”یار.....! اس قدر حسین ہیں..... ایسا لگ رہا ہے کہ ایشور نے انہیں فرصت میں بنایا ہو..... میں نے بھی کسی بھی فلمی اداکارہ کا ایسا حسن و شباب..... تن، تناسب اور خند و خال اور جسمانی نشیب و فراز اور چہرہ نہیں دیکھا..... یہ سب کی سب چودھویں کا چاند لگ رہی ہیں..... ایشور نے انہیں صرف جنگل میں کیوں جم دیا..... اگر ایسی حسین لڑکیاں دنیا میں ہوتیں تو ایک حشر پھا ہو جاتا۔“

”کیا ایسا نہیں لگ رہا ہے کہ یہ زمر نہیں ہیں جو کان سے نکلی ہوئی ہیں۔“ گوتم نے کہا۔  
”ہاں.....“ گوپال نے سر ہلایا۔ ”انہوں نے جیسے پانی میں آگ لگا دی ہے۔“  
”وہ دل پر بجلی بن کر گر رہی ہیں۔“ گوتم نے ایک سر دسائیں بھر کر دل تھام لیا۔ ”میرے خیال میں باتیں کرنے کی بجائے ان حسین، سنسنی خیز اور دل کش نظارے سے لطف اندوز ہوتے رہنا چاہیے لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ہم نے اب تک پچاس میل کی مسافت طے کی ہے۔ وہ جزیرہ سومیل کے فاصلے پر واقع ہے..... وہ یہاں آ کر کیا کر رہی ہیں..... کیا نہانے اور تیرنے کے لیے وہاں کوئی جھیل یا تالاب نہیں ہے..... جبکہ وہ ایک جزیرہ ہے..... ایک ندی یا دریا پروان فہ ہو گا۔“

”میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ گوپال نے کہا۔ ”ہمیں آم کھانے سے مطلب ہے۔ پیڑ گھسنے سے نہیں۔“

پھر وہ دونوں بڑی محویت سے یہ نظارہ دیکھنے لگے جس نے انہیں دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر دیا تھا۔ حسن و شباب کی ایسی کرشمہ سازیاں تو انہوں نے کسی انگریزی فلم میں نہیں دیکھی تھی۔ ہندوستانی فلموں میں، ابھی بے حجابی اور بے حیائی بڑھ گئی اور بڑھتی جا رہی تھی لیکن اس حد کو چھوٹی نہیں تھی۔ اس

فلموں میں دیکھا تھا..... آسمان سے جیسے کہکشاں اتر آئی تھی۔ ستاروں کا جھرمٹ سا تھا..... انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ کوہ قاف کی پریاں ہوں۔ وہ اس جھیل میں نہا رہی تھیں۔ تیر رہی تھیں، شوخیاں شرارت کر رہی تھیں۔ یہ سات نوجوان لڑکیاں تھیں..... واقعی اتنی حسین تھیں کہ انہوں نے آج تک نہیں دیکھی..... ایک سے ایک بڑھ کر مثالیہ تھیں۔ ان میں کسی بھی لڑکی کی عمر کم از کم چودہ اور سولہ برس کے درمیان تھیں۔

وہ کیمرے بھی ساتھ لائے تھے لیکن یہ موقع نہیں تھا کہ وہ ان کی تصویریں اتارتے جو جل پریاں لگ رہی تھیں۔ اس لیے بھی کہ ان کے کیمرے سفری بیگوں کے اندر تھے..... وہ نامناسب لباس میں تھیں..... ان کا اور غیر ملکی عورتوں کے پیرا کی لباس میں کوئی فرق نہیں تھا..... فرق تھا درختوں کے بے حد بڑے بڑے پتوں سے انہوں نے ستر پوشی کی ہوئی تھی۔ تن کیا نیم عریانی سے شعلہ مجسم بنایا ہوا تھا۔

”اوہ بھگوان!“ گوتم اس کے منہ کے پاس لے جا کر کان میں سرگوشی کی۔ ”واقعی اس شخص نے تم سے سچ کہا تھا..... یہ لڑکیاں کتنی حسین ہیں۔ دنیا کے کسی خطے میں کیا..... کوہ قاف میں بھی ایسی پریاں نہیں ہوں گی۔ میرے دل اور جذبات کی کیا حالت ہو رہی ہے میں بیان نہیں کر سکتا۔“

”میرے دل میں آ رہا ہے کہ کیوں نہ ہم ان کی طرف پیش قدمی کریں۔“ گوپال بولا۔ ”وہ ہمیں دیکھ کر خوف زدہ نہیں بلکہ خوش ہو جائیں گی۔ حیرت اور خوشی سرشار ہو کر ہم سے محبت اور جذباتی طور پر پیش آئیں گی۔“

”ہمیں ابھی جلد بازی اور عجلت سے کام نہیں لینا چاہیے۔“ گوتم نے اسے مشورہ دیا۔ ”اس ریلوے اور ہوس ربا نظارے سے محفوظ ہونے دو۔ جب یہ نہا کر اور تیر کر تھک کر پانی سے نکل کر کنارے آ کر لیٹ جائیں گی تب ہم ان کے سامنے اچانک

ترنگ کی طرح سے کھٹک رہی تھی وہ آہستہ آہستہ محروم ہوتی گئی تو گوتم نے کہا۔ ”وہ شاید بہت دور نکل گئیں اس لیے ان کی ہنسی سنائی نہیں دے رہی ہے۔“

”ہاں۔“ گوپال بولا۔ ”جلدی کرو..... کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دسترس سے نکل جائیں اور ہم بھٹک جائیں۔“

ابھی انہوں نے چند قدم طے کیے تھے کہ ایک دم سے ٹھٹک کر رک گئے۔ چاروں طرف سے نہ صرف عجیب و غریب بلکہ خوف ناک قسم کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایسی آوازیں تھیں جو انہوں نے پہلے بھی سنی تھیں۔ وہ برسوں سے شکار کے لیے آتے تھے۔ جنگل میں ایسی جگہوں پر جہاں گھنے جنگلات تھے اور خوف ناک آوازیں..... خوں خوار درندے انسانی ہوسوگھ کر نکالتے اور شکاریوں کو شکار کرنے کے لیے غراتے ہوئے آئے تھے..... لیکن یہ آوازیں قدرے مختلف سی تھیں۔ وہ سراسیمہ سے ہو گئے۔

”یہ کیسی آوازیں ہیں گوتم.....“ گوپال نے کہا۔ ”ہم نے کبھی سنی نہیں۔“ وہ خوف زدہ پریشان سا ہو رہا تھا۔ ”درندے تو ایسی آوازیں نہیں نکالتے ہیں..... درندوں کی آوازوں کو تو ہم خوب پہچانتے ہیں۔“

”مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ جنگل میں جو بلائیں ہیں وہ ہمیں محسوس کر کے چلی رہی ہیں۔“ گوتم بھی خوف زدہ سا ہو رہا تھا۔

”کہیں وہ ان حسین اور نو جوان لڑکیوں پر تو نہیں..... تاکہ انہیں اٹھا کر لے جائیں۔“ گوپال بولا۔ ”یہ بلائیں تو چڑیل ہیں ہوتی ہیں نا..... میں نے سن رکھا ہے کہ یہ انسانی خون کی پیاسی ہوتی ہیں۔ ان کا سارا خون ٹپ جاتی ہیں۔ ایک قطرہ خون تک جسم میں نہیں رہنے دیتیں ہیں..... شاید وہ ان لڑکیوں پر ٹوٹ پڑی ہیں۔ اس لیے یہ شور ہو رہا ہے۔“

لے ان پر نشہ ساطاری کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ تیز نشہ حسن و شہاب کا تھا جو کسی بھی نشہ آور میں نہیں ہوتا تھا۔

یہ نظارہ آدھا گھنٹہ جاری رہا۔ پھر وہ جمیل سے نکل کر خشکی پر کھڑی ہو گئیں ان دونوں کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ پانی نے ان کے سراپا آتشیں بنا دیے تھے..... ان لڑکیوں اور ان کے درمیان خاصا فاصلہ تھا لیکن ان کے ہتھکڑوں نے سوندھی سوندھی سی خوشبو کی مہک محسوس کی جو بالوں اور جسموں سے اٹھ کر فضا میں پھیل رہی تھی۔ ان کے انگ انگ سے مستی ابل پڑنی تھی..... ان لڑکیوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے ہنسی ہوئی جھڑپوں کی سمت بڑھیں تو ہنسی ہوئی جاری تھیں۔ انہیں ایسا لگا کہ شہنائیاں بج رہی ہوں۔ ان کی چال میں مستی اور سبک خرامی تھا جس نے انہیں اور تو بہ شکن بنا دیا تھا۔ وہ جھڑپوں کی اوٹ میں چلی گئیں تو ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا کہ اتنی دیر تک نہانے سے تھک کر سستانے کے لیے خشکی پر لیٹ جائیں گی۔

”اب کیا کریں.....“ گوپال نے کہا۔ ”کیا ان کا تعاقب کریں اور انہیں جلدی سے جالیں.....“

”ہاں۔“ گوتم نے سر ہلایا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ کسی شارٹ کٹ راستے سے آئی تھیں تفریح کرنے کی غرض سے..... یہ خوب صورت جمیل دیکھ کر نہانے لگیں..... اور شاید اس راستے واپس بھی جا رہی ہیں۔ کیوں نہ ہم غیر محسوس انداز سے ان کے تعاقب میں جزیرے تک چلیں۔“

”میرے خیال میں یہی مناسب رہے گا۔“ گوپال نے تائید کی۔

لڑکیاں مخالف سمت گئی تھیں۔ اس لیے ان دونوں کو ایک لمبا چکر کاٹ کر ان دونوں کے تعاقب میں جانا تھا۔ ان لڑکیوں کی ہنسی جو فضا میں جل

”لیکن ان ہی لڑکیوں کی کوئی جھج و پکار نہیں ہے۔“ گوتم نے کہا۔ ”شاید وہ لڑکیاں کسی اور سمت نکل گئی ہوں گی۔“

گوتم نے اپنی بندوق کندھے سے نکال کر زمین پر لیٹ گیا۔ گوپال نے گھبرا کر پوچھا۔ ”یہ تم کیا کر رہے ہو۔۔۔۔۔“

”میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ درندوں غراہٹوں کا شور ہے یا بلائیں شور چارہی ہیں۔۔۔۔۔“

”کیا۔۔۔۔۔ تمہیں اس بات کا اندازہ ہو جائے گا۔“ گوپال بے جان لہجے میں بولا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“ اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔ ”اگر درندوں کی چاہیں ہوئیں تو یہ عجیب و غریب اور خوف ناک آوازیں درندوں کی ہوئیں جو ہماری اور ان لڑکیوں کی ہوسوگندہ کراس سمت آرہے ہیں۔۔۔۔۔ ورنہ یہ سمجھو کہ یہ بلائیں ہیں۔“

”ہم نے کبھی بھی کسی بلایا بلاؤں کی موجودگی کے بارے میں سنا نہیں اور نہ ہی دیکھا۔۔۔۔۔ یہ اب کہاں سے آئیں۔۔۔۔۔“

”ویرانوں جنگلوں اور شمشان گھاٹوں اور قبرستانوں میں بھوت پریت یہ دونوں چیزیں اور بلاؤں کا بھرا ہوتا ہے یہ کسی ایک جگہ مخصوص نہیں گھومتی رہتی ہیں۔ اتفاق سے ہمیں بھی سابقہ نہیں پڑا۔ خاموش رہو میں دیکھوں تو سہی۔“

پھر گوتم نے زمین پر کان لگا دیے۔ گوپال نے دیکھا گوتم کے چہرے کے تاثرات بدل رہے ہیں کبھی خوف کبھی چہرے بے ہوش ہو رہے ہیں چہلوں کے بعد وہ کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا دھلی چادر کی طرح ہور ہاتھا۔

”یہ نہ تو انسانوں کے قدموں کی آہٹیں ہیں اور نہ درندوں کی۔۔۔۔۔ یہ بلائیں ہیں جو چنگھاڑتی ہوئی آرہی ہیں۔“ وہ ہنسی ہنسی آواز میں بولا۔ ”اب کیا کیا جائے۔۔۔۔۔“ گوپال کو ایسا لگا جیسے اس کی ہمت دھتی جا رہی ہے۔ ”کیا واپس چلا

جائے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ گوتم نے سر ہلا دیا۔ ”اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کسی اور دن کسی دنیا سی بابا سے تعویذ گنڈے لے کر آئیں گے۔ پھر ان بلاؤں کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔“

”اگر ان بلاؤں نے ہمیں گھیر لیا تو۔۔۔۔۔“ گوپال نے دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔

”ایسا کرتے ہیں کہ آگ جلا لیتے ہیں۔۔۔۔۔ شاید وہ حملہ آور نہیں ہوں گی۔“ گوتم نے جواب دیا۔ ”ہمیں اپنی جانیں بچانے کی جلدی سے ٹہنیاں توڑلوں۔۔۔۔۔ جمع کرلو۔“

یہ صورت حال دہشت ناک لگی۔ ابھی وہ دونوں تیزی سے ٹہنیاں چٹنے لگے تھے کہ۔۔۔۔۔ اچانک نہیں دور سے دھول پٹنے اور کنستروں کے بجانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

”کیا یہ کوئی نئی افتاد ہے۔۔۔۔۔“ گوپال کی آواز میں خوف اور لرزیدگی نمایاں تھی۔

”جب جنگلی کسی درندے کو زندہ پکڑنے یا اسے جال میں پھانس کر مارنے کی کوشش کرتے ہیں تو دھول اور کنستروں بجا کر ہانکا کرتے ہیں تاکہ اسے گھیرے میں لیا جاسکے۔ درندے اس آواز سے گھبراتے ہیں۔ پھر وہ حواس باختہ ہو کر گھیرے میں آ جاتے ہیں۔“ گوتم بولا۔

گوتم کی بات سن کر اس کا خوف کم ہوا۔ وہ گوپال اور کچھ شکاری دوست سال میں دو ایک مرتبہ شکار پر ضرور آتے تھے۔ اس لیے اس کی چپے سے واقفیت تھی۔ اس کے دھڑ ایک فارست آئیسروں سے دوستی تھی۔ وہ اکثر و بیشتر اس کی دکان پر آتے تھے اس لیے اسے شکاریوں کی آمد کی خبر رہتی تھی۔ خصوصاً غیر ملکی شکار یولہ کی۔۔۔۔۔ امریکی یورپی اور روس کے بعد شکاری صرف قفقاز آتے رہتے تھے۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کوئی شکاری ٹیم یا پھر کوئی جنگلی بستی والے کسی درندے کو گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ اس جانور کی کھال دیدہ

زیب حاصل کی جاسکے۔ غیر ملکی سیاح اس کھال کے عوض سگریٹ، شراب کا میٹکس اور ایکی میٹکس زیورات دیتے تھے۔ یہ جنگلی بستیوں کے باشندوں کی پسند اور کم زوری تھی۔

”گوتم! گوتم!“ گوپال حواس باختہ ہو کر بولا۔ ”یہ جو ڈھول اور کنستروں کا جو شور ہو رہا ہے کسی درندے کو گھیرنے کے لیے نہیں بلکہ ہمیں گھیرنے کے لیے۔۔۔۔۔ یہ آدم خور جنگلی ہیں۔ کیا تمہیں اندازہ نہیں ہو رہا ہے۔“

”جنگلی یہاں کہاں آ گئے۔۔۔۔۔ کیسے آ سکتے ہیں۔“ گوتم نے جواب دیا۔

”کیا تم یہ محسوس نہیں کر رہے ہو کہ ڈھول اور کنستروں کا شور کس تیزی سے لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتا جا رہا ہے اور یوں لگ رہا ہے جیسے سر پر آ پہنچے ہوں۔ وہ دیکھو۔۔۔۔۔ وہ دیکھو۔“ وہ ایک سمت اشارہ کر کے ہڈیانی لہجے میں پوری قوت سے چیخا۔ ”پتھروں اور ڈھیلوں کی بارش۔“

گوتم نے متوحش نظروں سے دیکھا۔ گوپال نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس سمت سے پتھروں اور ڈھیلے برق رفتاری سے آ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی درخت کے عقب میں جا چھپتے، چاروں سمتوں سے نہ صرف شور بہت قریب ہو گیا تھا۔ بلکہ مٹی کے ڈھیلے اور پتھروں کا برسا شروع ہو گیا۔ اگر وہ درخت کے نیچے اور تنے کی آڑ میں نہ ہوتے تو ان کا شدید زخمی ہو جانا یا موت سے ہم کنار ہونا یقینی ہو جاتا۔

ان کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔۔۔۔۔ ایک بات جو بڑی سنگین اور پریشان کن تھی کہ یہ پتھروں کی بوچھاڑ کون کر رہا ہے۔۔۔۔۔ چاروں سمتوں میں سے کوئی ایک بھی دکھائی نہیں دیا۔ گوپال نے سہم کر پوچھا۔ ”کہیں یہ بلائیں تو بوچھاڑ نہیں کر رہی پتھروں کی۔“

”نہیں۔۔۔۔۔“ گوتم نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بلاؤں کو کیا ضرورت ہے دہشت زدہ کرنے کی

پتھروں کی برسات سے۔۔۔۔۔ سیدھے سیدھے آ کر وہ حملہ آور ہو جائیں گی۔۔۔۔۔ یہ آدم خور جنگلیوں کی حرکت ہے جو ہمیں گھیر رہے ہیں کہ کہیں بھاگ نہ جائیں۔“

”اب کیا کیا جائے۔۔۔۔۔“ گوپال نے پوچھا۔ ”ہم بھاگ کھڑے ہوں۔ جان کے کالے پڑ گئے ہیں۔“

”ان پتھروں اور ڈھیلوں کی برسات میں ہم کیسے ان سے بچ کر بھاگ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ زخمی ہو جائیں گے اور مرجھ سکتے ہیں۔ اب صرف بچنے کی ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔۔۔۔۔ ہم دونوں اپنی اپنی پوزیشن لے کر چاروں طرف فائرنگ شروع کر دیں۔“ گوتم نے کہا۔

پھر ان دونوں نے بندوقوں کے دہانے کھولنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کی۔۔۔۔۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔۔۔۔۔ فائرنگ کی وجہ سے پرندوں نے اور شور مچانا شروع کر دیا۔ ان کے نشانے خطا گئے تھے۔ کوئی بھی زد میں نہیں آیا تھا۔ اس لیے ایک بھی انسانی جتن سنا نہیں دی تھی۔

پھر تھوڑی دیر بعد کسی سمت سے ایک تیر سنسناتا ہوا آیا اور اس نے گوپال کو زد میں لیا تو وہ چیخا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ کر دور جا گری۔ وہ درد سے تڑپنے لگا۔ پھر وہ بولا۔ ”اپنی رائفل پھینک دو۔۔۔۔۔ لگتا ہے کہ ہماری فائرنگ نے انہیں مشتعل کر دیا ہے۔“

گوپال نے تشویش ناک لہجے میں جو کہا گوتم نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ کیوں کہ اس کی بات غلط نہ تھی۔ دور اندیشی کی بات تھی۔ جس طرح تیر گوپال کی پھیلی کی پشت میں پیوست ہوا تھا گوتم اس بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا اندازہ گوتم کو اس بات سے ہوا تھا کہ تیر گوپال کے ہاتھ کی پھیلی میں پیوست ہوا تھا۔ تیر انداز چاہتا تو تیر گوپال کے سینے میں اتار کر اسے موت کی نیند سلا سکتا تھا۔۔۔۔۔ دوسرے لمحے گوتم کو خیال آیا کہ بندوقیں پھینکنا

جس سے اس کا بدن ابولہبان ہو چکا تھا۔ مضبوط جال کے پھندوں نے اسے اپنے گھٹنے میں اس بری طرح جکڑ لیا تھا، اس کے لیے کھڑا ہونا تو کجا جنبش کرنا تک بھی محال ہو گیا تھا۔

”الحق آدمی.....! خاموش!“ اچانک ایک کرخت نسوانی آواز گونجی تو وہ سراپہ سا ہو گیا۔

گوتم نے اس آواز کی سمت نظریں اٹھائیں سامنے چوں سے سر اور بالائی حصہ ڈھانپے قبائلیوں لڑکیوں کا ایک نیزہ بردار لشکر موجود تھا۔

ان کی عمریں چودہ سے سولہ سترہ کے درمیان ہوگی۔ نہایت حسین اور پرشباب..... جوانی تو ان سب پر ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ ان سات لڑکیوں کی مانند جو اس نے جھیل میں نہاتے اور تیرتے دیکھا تھا۔ ان سب کی صراحی دار گردنوں کتر لٹک رہے تھے۔

جنہیں بد وضع چڑیوں سے بخونانہ انداز سے بجا رہی تھیں۔ ان کے شاداب چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ ایک عورت جو بڑے پروقار انداز اور کمکت سے کھڑی ہوئی تھی وہ ان کی مہارانی معلوم دیتی تھی۔ اس کے سر پر تاج تھا۔ اس کی عمر چالیس برس کی تھی..... وہ بلا کی حسین اور بے پناہ پرکشش تھی۔

بدن متناسب اور چھیرا تھا، صحت مند تھی..... شام کے تاروں کی طرح کسا کسا رنگ اس کا لباس میں چوں اور لڑکیوں کی طرح تھا۔ یہ قبیلہ حیران کن تھا۔ اس لیے کہ انہیں انسانیت نے چھوا نہیں تھا۔ وہ آج بھی ابتدائی دور میں تھیں۔

اس مہارانی کے پاس تین عورتیں بھی کھڑی تھیں جن کی عمریں تیس اور چالیس کے درمیان تھیں۔ وہ بھی بے حد حسین، جواں سال اور کشش کے خزانوں سے بھری تھیں۔ صنف نازک تھیں لیکن ان کے چہرے مہرے سے ایسا لگ رہا تھا ان میں ایک ایک بے پناہ قوت کی مالک ہے اور بیک وقت دس مردوں سے بھی مقابلہ کر سکتی ہیں..... ان میں کچھ اور عورتیں بھی تھیں۔ ان میں سے کئی کے خوب صورت سڈول اور مرمریں ہاتھوں میں اتنی قوت

پیروں پر کھڑی مارنے کے مترادف ہے۔ پھر اس نے سچ گزندیانی لہجے میں کہا۔

”نہیں..... نہیں بندوق نہیں پھینکا، بندوق اٹھا کر ادھر سامنے چلتے ہیں۔ وہ جگہ محفوظ سی لگ رہی ہے۔“

پھر گوتم نے اپنی بندوق اٹھائی پھر پھینک دی اور مخالف سمت بھاگا۔ گوپال بھی اپنی بندوق اٹھا کر بھاگنے لگا۔ زخمی ہونے کی وجہ سے اس سے تیز بھاگا نہیں جا رہا تھا۔ اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی اور میرمنوں بھاری ہو رہے تھے۔

گوتم نے سامنے والی جگہ پہنچ کر خاردار جھاڑیوں کے کنبے میں گھسا تھا کہ ایک لسانوکیلا اور تیز کاٹنا جوتے کے تلے سے تیر کی طرح گزرتا ہوا اس کے پیروں میں جا گھسا..... وہ بری طرح جھنجھلا گیا اور اس نے فوراً ہی مڑ کے دیکھا..... گوپال گدھے کے سر کے سینک کی طرح غائب تھا۔ اسے سخت غصہ آیا کہ گوپال کہاں غائب ہو گیا..... کیوں کہ جان پر بنی تھی اس لیے دہائی ایڑی کے سہارے لنگڑا ہوا آگے بڑھنے لگا تاکہ محفوظ جگہ بیٹھ کر کاٹنا نکالے۔ پھر واپس جگہ تلاش کرنے لگا۔

اس نے دو تین قدم طے کیے ہوں گے کہ ناگہاں کسی طرف سے ایک جال اس پر آ پڑا..... ایک دم سے اس کی بندوق ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری گوتم کھینچے ہوئے جال میں بری طرح قید ہو گیا تھا۔ وہ جال کافی دیر تک پونہی کھینچتا رہا۔ وہ جھاڑیوں اور ناہموار زمین پر گھسٹتا بری طرح گوپال کو پکارتا رہا۔ گوپال جانے کہاں تھا کہ اس کی چیخیں سن کر بھی اس کی مدد کو نہیں پہنچا تھا۔ اس دوران کنتروں کا شور اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ انہیں ہانکا کرنے والے بے وقوف نہیں ہیں لیکن بہت چالاک ہیں اور اس کی چیخوں کو بے ہنگم شور و غل میں دبانا چاہتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد گھسٹتا ہوا جال رکا تو زمین کی رگڑ سے اس کے بدن پر جا بجا خراشیں آ گئی تھیں

اور جارحانہ انداز سے اس کی مٹی گم ہو گئی اور جسم کا سارا خون خشک ہو گیا۔ دو نوجوان لڑکیوں کے ہاتھوں میں تیز دھار کے چاقو تھے۔ ان لڑکیوں نے اسے جال کی گرفت سے آزاد کرنا شروع کر دیا۔ ان میں صرف ایک عورت ایسی تھی جس نے درختوں کی چھال سے لباس بنایا ہوا تھا اور اس نے ستر پوشی کی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں زمرہ کی کالا پڑی۔ گوتم نے خیال کیا کہ شاید یہ ان کی سرداری ہے۔

سرداری نے اس کے رو بہ رو کھڑی ہو کر گوتم کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کے نازک خوب صورت اور سڈول ہاتھ میں چاقو جیسے ٹپ رہا تھا۔ اس کی کلائی کے سڈول پن میں اسی دل کشی اور جاذبیت تھی کہ وہ لمبے بھر کے لیے خوف و دہشت بھول گیا۔ سرداری جی نہایت حسین اور پر شباب عورت تھی۔ طرح دار تھی..... اس کی آنکھیں زمرہ جیسی تھیں جس میں وہ ڈوبتا چلا گیا۔ دوسرے لمبے وہ اس سحر سے نکلا۔ یہ عورت قاتل کے روپ میں تھی۔ موت کا فرشتہ تھی..... اس کا قرب آنکس فشاں کی طرح دمک رہا تھا۔ اب اسے زندہ بچ جانے کی ذرہ برابر بھی امید نظر نہیں آئی۔ چاقو کسی بھی لمحے اس کے سینے میں دل کی جگہ گھونسنے والی تھی۔ اگر یہ سنگین صورت حال نہ ہوتی اور موت اس کی آنکھوں میں ڈالے اس پر ہنس نہیں رہی ہوتی تو اس کے جذبات کسی آنکس فشاں کی طرح پھٹ جاتے..... وہ پل بھر کے لیے موت کو بھول چکا تھا۔ جب چاقو والا فضا میں بلند ہوا تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی مزاحمت اور دفاع بے سود ہے۔ اس عورت کو قابو کرنے کی صورت میں اس پر شکاری کتے چھوڑ دیے جائیں گے جو اس کی ٹکا بولی کر دیں گے یہ موت انتہائی دردناک ہوگی۔

اس عورت نے چشم زدن میں اس کی دونوں جبین چاقو سے کاٹ دیں۔ اس کے قریب میں جو دو دیوینگل سیاہ کتے کھڑے تھے اس کے سامنے

اور اس قدر توانائی تھی کہ پتلی کمر والے طاقت ور..... شیر کی سی جسامت کے اونچے شکاری کتے موجود تھے جن کی بے پناہ توانائی کو نگام دینے کے لیے ان کی کمر سے وزنی پتھر باندھے گئے تھے جو زمین پر گھسٹ رہے تھے۔ اس کے باوجود بھی ان شہ زوروں کو روکے رکھنا ان رکھوالی عورتوں کے بے قابو میں رکھنا دشوار لگ رہا تھا۔ کیسا ہی کڑیل اور طاقت ور مرد کیوں نہ ہو ان کتوں کی اس طرح رکھوالی نہیں کر سکتا تھا جیسا یہ عورتیں کر رہی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ صنف نازک نہیں ہیں بلکہ آہنی عورتیں ہیں۔

اس نے ایک کراہ سنی تو اس جانب دیکھا۔ اس سے چند قیدموں پر دو قبائلی عورتیں ایک شخص کو دبوچے ہوئے تھیں۔ ان میں سے ایک عورت اس کی مشکلیں کس رہی تھی۔ اس کے لباس سے گوتم نے فوراً اس شخص کی شناخت کر لی۔ یہ گوپال تھا۔ گوپال نے ان کی گرفت سے نکالنے کی بڑی کوشش اور جدوجہد کی۔ زخمی ہونے کے باوجود اس نے اپنی پوری طاقت صرف کر دی تھی۔ وہ دراز قد اور مضبوط جسم اور بازوؤں کا بھی تھا لیکن اس کی ایک نہ چلی تھی۔ پھر اس نے اپنے آپ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

گوتم کے دل میں ایک خوف دامن گیر تھا کہ ان نوجوان لڑکیوں اور جوان سال عورتوں نے جو بمشکل ان خون خوار شکاری کتوں کو قابو میں کئے ہوئے تھیں ان میں سے ایک کتا بھی رسی چھڑا کر اس پر حملہ آور ہو گیا تھا وہ اسے آن کی آن میں کسی شیر کی طرح چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔ اسے ایک بات کا اندازہ ہو گیا تھا یہ لڑکیاں اور عورتیں کس قدر طاقت ہیں۔ وہ بیک وقت اس جیسے دس مردوں سے نمٹ سکتی ہیں۔

مہارانی کے اشارے پر کئی قبائلی نوجوان لڑکیاں اس کی طرف برتی سرعت سے اس طرح لپکیں کہ جیسے اس کا حشر نثر کر دیں گی۔ ان کے تیور

”اب میرے پاس تم دونوں کے لباسوں کے چھوڑے موجود ہیں جن کی بو پر ہمیں قبروں تک پہنچ نکال لائیں گے..... لہذا تم یہ بھول جاؤ کہ یہاں سے فرار ہو کر چاسکو گئے..... تمہاری کوئی کوشش اور تدبیر کام نہیں آئے گی..... اب تم دونوں ہمارے غلام ہو۔ ہمارے رحم و کرم پر ہو..... تمہیں ہماری ہر بات ماننا ہوگی۔“

سرداری نے جو زبان بولی تھی وہ ہندی اور ملی جلی سنسکرت تھی۔ گوتم کے دل میں یہ خیال آیا کہ اس سے کہہ دے کہ وہ خود اس کے جزیرے پر آ رہے تھے لیکن یہ بات کہنے کی نہیں تھی۔ وہ شک میں پڑ جاتی اور طرح طرح کے سوالات کرتی۔ تاہم اس نے کہا۔

”ہم تو شکاری ہیں..... اتفاق سے ادھر آ نکلے..... ہمارا کیا دوش ہے۔ کیا جرم کیا ہے ہم نے۔“

”تم دونوں کا مقدر تمہارا قصور اور جرم ہے۔“ اس نے گوتم کی طرف اشارہ کیا۔ ”اگر تم دونوں نے ہماری ہر بات مانی تو تمہاری نہ صرف بے حد عزت اور پذیرائی ہوگی بلکہ بے پناہ دولت اور اعزاز سے بھی نوازے جاؤ گے..... لیکن اس بات کا فیصلہ ایک خفیہ مقام پر ہوگا۔ لہذا تم خاموش سے چلو گے۔ راستے میں کوئی شرارت نہیں کرو گے۔“ ان دونوں کے ہاتھ ان کی پشت پر باندھ دیے گئے۔ وہ اور گوپال ان کے قیدی بن گئے۔ پھر یہ قافلہ منزل کی جانب روانہ ہوا۔

”گوپال..... بہت برے بھنے..... لینے کے دینے پڑ رہے ہیں۔“ گوتم نے انگریزی میں کہا۔ ”کیوں کہ یہ ہندی جھجکتی تھیں۔ معلوم نہیں یہ ہمیں قیدی بنا کر کیوں اور کہاں لے جا رہی ہیں..... بھگوان جانے کون سا فیصلہ ہمارا منتظر ہے۔“

”جزیرے پر لے جایا جا رہا ہے۔“ گوپال نے کہا۔ ”واقعہ ہمارے مقدر نے ہمیں پھنسا دیا۔“

ایک جیب ڈال دی۔ دوسری جیب اپنی کمر میں ٹھوس لی۔ دونوں کتے چند ساعتوں تک جیب کے کپڑے کو اس طرح سونگھتے رہے جیسے گوشت سونگھ رہے ہوں۔ پھر اپنا خون آشام دہانے کھولے زمین بھی سونگھتے رہے۔ پھر ادھر ادھر بے قراری سے گھومنے لگے۔ پھر اچانک اس نے جیسے گوتم کی بو پائی۔ جیسے وہ اس کی بو سے واقف ہو چکا ہو۔ پھر دونوں خوارانہ انداز میں غرا کر اس کی طرف جھپٹنے لگا۔ گوکہ اس کی کمر سے ایک من سے زیادہ بھاری پتھر بندھا ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ پہلے جھٹکے میں اپنی رکھوالی کو دو تین قدم پیچھے لایا۔ پھر دو قبائلی جوان سال دو گوربتیں تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی رسی کو تھام کر نہ بھینچیں تو وہ اگلے جھٹکے میں ان کے سمیت کھینچتا اس پر آ پڑتا اور اسے چیر پھاڑ دیتا۔

وہ عورتیں اس کتے کو روکنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ دوسرے کتے کو قابو بھی کیا ہوا تھا۔ جو کتا اس پر حملہ کرنے کے لیے تلا ہوا تھا، گوتم کی طرف نہ اٹھائے غضب ناک ہو کر بھونکے جا رہا تھا۔ اس کے دہانے سے سفید سفید جھاگ اڑنے لگا تھا۔ سرداری نے چند ثانیوں تک گوتم اور اس کتے کو معنی خیز مسکراہٹ اور بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی..... وہ وحشی خوں خوار کتا اتنا طاقت ور تھا کہ ان تینوں قبائلی عورتوں کو گوتم سے دور رکھنے میں دقت پیدا کر رہا ہے۔

سرداری نے ایک پیچھے کھڑی ہوئی لڑکی کو اشارہ کیا جو ایک تھیلہ اٹھائے کھڑی ہوئی تھی۔ سرداری نے اس تھیلے سے ایک بڑا سا مردہ پرندہ جو مرغی برابر تھا نکال کر اس خون خوار کتے کے سامنے اچھال دیا۔ اس کی توجہ گوتم سے ہٹ کر اس پرندے کی طرف ہو گئی۔ پھر وہ دونوں کتے اس پرندے پر ٹوٹ پڑے۔ سرداری نے اس اثناء میں گوپال کی ٹیص کی دونوں جیب کپڑے بھی پھاڑ لیے تھے۔ پھر ان دونوں کتوں کی بھوک غراہٹوں کے درمیان بولی۔



ہمارے سفری بیگ اور بندوقیں بھی ان کے قبضے میں چلی گئی ہیں۔ ہم بے دست و پا ہو کر رہ گئے ہیں۔“

”اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنے آپ کو مقدر اور حالات کے دھارے پر چھوڑ دیں۔“ گوپال بولا۔ ”دیکھیں ہمارے نصیب میں کیا فیصلہ ہونے والا ہے، جو بھی ہوگا اسے قبول کرنا پڑے گا تم نے سچ ہی کہا ہے کہ ہمارے ساتھ کہانی کچھ اور ہی ہو رہی ہے۔“

”کیا اس مفروضہ مجرم نے ان شکاری کتوں اور لڑکیوں اور عورتوں کی فوج کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ ان کے پاس تو بڑے خطرناک ہتھیار نیزہ اور تیر موجود ہیں..... اور ان سے مقابلہ صرف بدوق اسٹین گنوں اور ریولوروں سے ہی کیا جاسکتا ہے۔“ گوتم نے کہا۔

”چوں کہ وہ شدید زخمی تھا اور اس قابل نہیں تھا کہ عورتوں کی خوب صورتی..... زمرہ کی کانوں اور مرد بچوں اور مردوں کے علاوہ کچھ اور بتا سکے۔ ہاں اسے مدت مہلت دیتی تو ان کے بارے میں بھی بتا دیتا۔“ گوپال نے کہا۔

ان حسینوں نے ان دونوں کو نرغے میں لیا ہوا تھا۔ نیزہ باز اور تیر انداز لڑکیاں عورتیں مستعد تھیں۔ پھر وہ گھٹے جنگل سے گزر کر پہاڑوں پر چڑھنے لگے۔ اس سفر میں گوتم اپنے آپ کو بڑی اذیت میں محسوس کر رہا تھا اور اس نے گوپال کے چہرے پر بھی ایسا ہی کرب اور تاثر محسوس کیا..... یہ سفر اس کے لیے بڑا ٹھن اور صبر آزما بن گیا جو ختم ہونے کا نام لے رہا تھا۔ وہ ذرا بھی رعایت دینے کو تیار نہیں تھیں۔ تھوڑی دیر ستانے پر بھی تیار نہیں تھیں۔ سردارن بار بار تشویش ناک نظروں سے ڈھلتے سورج کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو کچھ دیر کا مہمان معلوم دیتا تھا۔ اس کے بشرے اور انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اندھیرا پھیلنے سے قبل کسی خاص جگہ پر پہنچنا چاہتی ہو۔

”اس سردارنی نے جزیرے کا نہیں بلکہ خفیہ مقام کا نام لیا ہے۔“ گوتم نے کہا۔ ”کہیں قتل کی طرف تو نہیں لے جایا جا رہا ہے۔“

”نہیں.....“ گوپال نے سر ہلایا۔ ”اگر انہیں قتل کرنا ہوتا تو ہمیں کر دیا جاتا..... شکاری کتوں کو ہم پر چھوڑ دیا جاتا..... یا پھر نیزہ بردار لڑکیوں عورتوں کو صرف ایک اشارہ درکار ہوتا۔ اس قدر زحمت کی کیا ضرورت پڑتی۔“

”بڑی پراسرار سی بات ہے۔“ گوتم نے کہا۔ ”معلوم نہیں کیا فیصلہ ہوگا۔ جب کہ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔“

”ایک بڑی حیرت ناک بات یہ ہے کہ ان کے ساتھ ایک مرد بھی نہیں۔“ گوپال بولا۔ ”اور پھر کم سن لڑکیوں، نوجوان لڑکیاں اور جو اس سال عورتیں کتنی طاقت ور ہیں..... یہ نیزہ بردار لڑکیاں اور کمان بردار دونوں ہی بڑی مہارت والی لگ رہی تھیں۔ ایک جوان لڑکی اور جو اس سال عورتوں نے ان وحشی شکاری خوں خوار کتوں کو کس قدر قابو میں کیا ہوا تھا۔ پھر سردارنی ایک جاہل، اجڑا اور گنوار عورت نہیں لگ رہی تھی۔“

”لیکن یہ کہانی وہ نہیں ہے جو اس مفروضہ مجرم نے سنائی تھی۔“ گوتم نے کہا۔ ”لیکن یہ کسی اور سمت جا رہی ہے..... اس نے نہ تو خوں خوار کتوں کے بارے میں بتایا اور نہ ہی نیزہ اور کمان بردار لڑکیوں کے بارے میں..... صرف اس کی ایک بات جو سو فیصد درست ہے وہ حسن و شباب کے بارے میں..... واقعی ہر لڑکی اور عورت انتہائی حسین اور بے پناہ کشش والیاں ہیں..... انہوں نے چھال اور چوں سے تیار کردہ ایسا لباس پہن رکھا ہے ستر پوشی ہو رہی ہے..... بھگوان جانے..... اب کیا کیا واقعات پیش آنے والے ہیں۔ کیا کچھ ہونے والا ہے وہ ہمارے بارے میں کیا فیصلہ کرنے والی ہیں..... ہم نے اپنے چاقو، ریولور..... گولیاں اور دیگر سامان سفری بیگ میں رکھ کر بڑی غلطی کی.....

کی مکروہ تھوئیں کے بو سے لیے اور پتھروں کی مالا اس کی نظروں کے سامنے نچانے لگی۔

کتے بڑی بے تابی کے ساتھ اس مالا کو سونگھنے لگے۔ وہ جس انداز میں اپنی دیں ہلا رہے تھے اس سے گوتم نے اندازہ کیا کہ وہ مالا یقیناً کسی ایسے شخص کے جسم پر رہی ہے جس سے وہ خوف ناک کتے بہت مانوس ہیں اور اس کے تابع بھی ہیں۔ ان دونوں کتوں اور ان کی رکھائیوں سمیت سرداری سب سے آگے کھڑی رہی۔ باقی لڑکیوں اور عورتوں نے کسی سے کچھ کہہ بغیر ان کے پیچھے ایک لمبی سی قطار بنائی۔ اسے اور کوپال کو کوئی نیزہ بردار نوجوان لڑکیوں کے کئی فاصلے سے تقریباً درمیان میں لے لیا گیا۔ گوتم کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ لوگ ان گھنے اور خوفناک جنگلات میں ایسی مہمات کے عادی رہے ہوں۔

روشنی کے موہوم سایوں میں گوتم نے ان دونوں خوں خوار شکاری کتوں کو بے تابی اور اضطرابی کیفیت کے ساتھ ساتھ زمین سونگھنے اور ادھر ادھر چکر کھاتے دیکھتا رہا۔ کافی دیر گزر گئی۔ اندھیرا گہرا ہوتا چلا تھا۔ مگر یہ قطار بند قافلہ جوں کا توں کھڑا ہوا تھا اور جنگل کی تم ناک فضا پر چھائے ہوئے سنائے میں کتوں کے تیز سانسوں اور دبی دبی غراہٹوں کا شور سنا کی دے رہا تھا۔ شاید کتے کوئی سراغ نہ ملنے پر ان دبی دبی آوازوں میں اپنی بے بسی کا اظہار کر رہے تھے۔

پھر کتوں کے تاریک ہیولوں نے فضا میں منہ اٹھا کر ادھر ادھر سونگھنا شروع کر دیا جیسے وہ ہواؤں کے دوش پر آنے والی کسی مخصوص بو کی تلاش میں ہوں..... صبر آزما ساعتیں سرکتی رہیں۔ قطار غبار دو شیرائیں اور جوان سال عورتیں بھی اب بار بار پہلو بدل رہی تھیں۔ پھر بیک لخت وہ دونوں کتے پوری شدت کے ساتھ بھونکنے لگے۔ اس کے ساتھ جنگل کی پرسکوت فضا برندوں کے خوف زدہ شور سے گونج اٹھی۔ وہ کتے جوش و خروش سے

کتے پتھروں کو کھینچتے ہوئے بے تکان جا رہے۔ وہ رہ رہ کر اپنے دیں اور لالچ کو ترس رہا تھا کہ زمرہ اور راتوں رات کروڑ ہتی بننے کے سنے دیکھ زمرہ کے حصول کے لیے کوپال کے ساتھ چل پڑا تھا۔ وہ چوہری شاپ میں سیلزمین تھا اور ایسے جو گھنواہلے اتنی بھی کہ گھاٹ سے گزر رہے ہو رہی تھی اور ہر ماہ خاصی محقول رقم پس انداز بھی کر لیتا تھا۔

اب اسے قدر ہو رہی تھی کہ اس نے زمرہ کے حصول اور حسین عورتوں کے چکر میں کیا سنگین خطرہ مول لیا۔ تف ایسے زمرہ اور حسین عورتوں پر لیکن اب پچھتائے کیا ہو سکتا تھا۔ تیرکان سے نکل چکا تھا جو واپس آنے سے رہا تھا۔ جب اوکھلی میں سردے ہی دیا ہے۔ آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔

وہ لوگ سرداری کی رہنمائی میں اتنی تیزی کے ساتھ بار بار راستے بدل رہے تھے کہ اس کے دل میں راہ بھٹک جانے کی قوی شبہات سراہارنے لگے اور ادھر سورج اپنا آخری سفر تیزی سے طے کر رہا تھا..... اور جنگل میں گونجتے ہوئے بے پناہ شور میں خوف ناک درندوں کی آوازیں بھی سنانی دینے لگیں جس سے اس کے دل پر ہیبت طاری ہو رہی تھی۔

سورج غروب ہونے کے بعد جب سرمئی دھند لکا پھیلنے لگا تو وہ سب رک گئے۔ سرداری نے چند ہم عمر عورتوں سے مشورے کیے اور اس نے کسی سے کوئی چیز طلب کی۔ جواب میں چودہ برس کی لڑکی نے جو ایک تھپلا اٹھا رکھا تھا اس نے اس میں ایک پتھروں کی مالا نکال کر سرداری کی طرف بڑھا دی۔ یہ مالا رنگ برنگے پتھروں کی تھی۔

”دو کتے ادھر لاؤ.....“ سرداری نے رک کر اوچی آواز میں کہا۔

دوسرے لمحے فوراً ہی پتھروں سے بندھے دونوں خوار شکاری کتے اس کے سامنے لا کر کھڑا کر دیے گئے۔

سرداری نے محبت بھرے انداز میں ان کتوں

صورت حال پیش آئی ہے۔ موقع ملا تو فرار ہونے میں لمحے بھر کی تاخیر بھی نہیں کرے گا اس وقت ایسی سنگین صورت حال تھی کہ اس نے کوئی تدبیر کی اور نہ ہی کوئی قدم اٹھایا۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ ان ہنگامی لمحات میں بھی وہ پوری طرح منظم اور چوکنا تھے..... آخر کار جنگل میں گونجتے ہوئے شور کے درمیان کسی عقاب کی ایک تیز سی چیخ گونجی تو ایک دم سے وہ سب ہم آہنگ ہو کر چلا اٹھے۔

”ہم سچ راستے پر جا رہے ہیں..... سرداری کا غار قریب آتا جا رہا ہے۔“ میں برس کی خوب صورت آواز نے کہا۔

گوتم کو یہ سن کر قدرے اچنبھا سا ہوا۔ وہ ابھی تک اس عورت کو سرداری سمجھ رہا تھا۔ اب پتا چلا کہ قبیلے کی سرداری تو کوئی اور ہی ہے۔ چوں کہ اس عورت نے کمان سنبھالی ہوئی ہے اس لیے وہ سرداری کی فرائض انجام دے رہی ہے۔ قائم مقام سرداری ہے۔ یہ سرداری ان دونوں کو گرفتار کرنے والوں میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ پھر قائم مقام سرداری نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنے حلق سے بالکل کسی عقاب کی آواز نکالی جو چیخ سے مشابہ تھی۔ بہت تیز تھی۔ پھر کارواں نے اپنی رفتار تیز کر لی۔

اس پر اسرار اور خوف ناک سفر کا اختتام گھنے درختوں سے ڈھکے ہوئے ایک پہاڑی غار پر ہوا جس کے تنگ دہانے سے زرد روشنی خارج ہو رہی تھی اور اس کے سامنے صاف بکٹے پتھر لے جھے پر ایک ادھیر عمر مگر بے حد تندرست اور نہایت حسین عورت باوقار انداز سے کھڑی تھی۔ اس کے خدو خال بڑے تھکے تھے۔ اس کے چہرے پر نرمی اور ملامت تھی۔ اس کی ایسی رنگت گوتم نے آج تک کسی عورت میں نہیں دیکھی تھی۔ اس کے لائے سیاہ بال بے حد چمک دار اور خوشنما تھے۔ جو اس کے سینے اور پشت پر سیاہ بادلوں کی طرح بکھرے ہوئے

بھونکتے..... بار بار ایک جانب بڑھنے کے لیے زور لگا رہے تھے۔ ان سے بندھے ہوئے پتھر اور رکھوالیاں انہیں روکنے میں ناکام ہو رہی تھیں..... ان دونوں کتوں کے شور پر دوسرے شکاری کتے حیرت ناک طور پر خاموش تھے۔ جیسے اپنے ہم نسلوں کے کام میں نہ ڈالنا چاہتے ہوں۔ آخر سرداری نے پر جوش لمحے میں رکھوالیوں سے کہا۔

”چلو بڑھو..... اب یہ کتے ہماری رہنمائی کریں گے۔“

وزنی پتھر زمین پر گھسٹتے وہ دونوں کتے ہوا کو سونگھتے گھنے جنگل کی ڈھلان پر چڑھنے لگے۔ ان کے پیچھے پورا قطار بند قافلہ بھی حرکت میں آ گیا۔ تاریک اور گھنے جنگل میں بھٹکے ہوئے کارواں کا پر اسرار اور ہیبت ناک سفر جاری ہی رہا۔ ہر گزرتے ہوئے ہر لمحے کے ساتھ کتوں کی دیوانگی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ فضا میں بریدوں کا شور اور چوپایوں کی تیز آوازیں گونج رہی تھیں۔ جن کے باعث ماحول خوف آور اور ڈراؤنا بن کر رہ گیا تھا بلکہ رفتہ رفتہ اور دہشت ناک ہوتا جا رہا تھا۔

گوتم کے دل میں کئی بار آیا کہ گولی مارو زمرود اور ان شاداب بدن کی دوشیزاؤں کو جان ہے تو جہان ہے۔ اول تو زمرود ہاتھ لگنے سے رہے اور یہ حسن و شباب کی دیویاں..... یہ قبائلی عورتیں معلوم نہیں کیوں اور کس لیے انہیں قربانی کے جانوروں کی طرح لے جا رہی ہیں..... ایسا تو جانے کیوں اور کس لیے..... وہ ان سے بچ نکلنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا..... لیکن یہ ناممکن سا تھا۔ کیوں کہ ایک تو اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور نوکیلے نیزوں اور ماہر نشانہ بازوں کے خوف سے نہ صرف اس کا حوصلہ پست ہو گیا بلکہ ہمت جواب دے گئی۔ وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا..... زندگی اسے بے حد عزیز تھی..... اور پھر وہ جوان مرد تھا خوب صورت، وجہ اور دراز قد، لڑکیوں کا آئیڈل تھا۔ اس نے سوچا کہ دیکھنا یہ ہے کہ کیا

تھے جس نے اس کے حسن و شباب کو دو آتشہ بنا دیا۔ گوتم نے اپنا دل تھام لیا۔ اس عورت نے جیسے اس پر جادو کر دیا ہو۔ اس نے لمحے بھر کے لیے سوچا کہ یہ عورت جوانی میں کیا ہوگی..... اس کی آنکھیں متناظر تھیں۔ سراپا تھا کہ تنہے جگا رہا تھا۔ اس کا لباس کسی درندے کی کھال کا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ پر ایک بڑا سا عقاب بیٹھا ہوا تھا، اس عورت کے انگوٹھے سے بندھا ہوا تھا جس کا ایک پیر کسی ڈوری کے ذریعے اس عورت کے انگوٹھے سے بندھا ہوا تھا۔

”سردارن..... تیری یہ باندی اور جانثار دو تھیلیوں کا نذرانہ پیش کرنے حاضر ہوئی ہے۔“  
”روفو.....! تو ہمیشہ سے میری اور بستی کی ہر لڑکی اور عورت کی نظروں میں باعزت اور عظیم تر رہی ہے..... اور پھر تو جو آج دو قیدیوں کو شکار کر کے لائی ہے اس نے تیری عظمت، عزت اور مقام میں بلندی عطا کر دی ہے۔“

سردارنی نے آگے بڑھ کر روفو کو اپنی آغوش میں لے کر اس کے ہونٹوں گالوں اور پیشانی کو بڑی محبت اور گرم جوشی سے چوم لیا۔

روفو کا چہرہ اور آنکھیں دمک اور چمک اٹھی تھیں۔ پھر وہ اس کی آغوش سے نکل کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ اس عزت پذیرائی اور خراج تحسین نے اس کے حسن کو اور نکھار دیا۔ وہ بہت ہی زیادہ حسین دکھائی دینے لگی تھی۔

اس کے سردارن کے پاس سے بٹتے ہی کارواں کی رہنمائی کرنے والے کتے سردارن کے چنوں میں لوٹنے لگے۔ اب گوتم کی سمجھ میں آیا کہ درندے کی کھال میں ملبوس سردارن ہی کی بو پر وہ کتے یہاں پہنچے ہیں..... یا پھر ہو سکتا ہے کہ پتھر نیلے موتیوں کی مالا اسی مقصد سے اپنے گلے سے اتار کر روفو کو دی ہو۔ مالا دینے سے اس کے ساتھ جو لڑکیاں عورتیں وہ اس کی تابع ہو گئی تھیں۔ سردارنی جس عورت لڑکی کو یہ مالا دیتی تھی تو گویا وہ اسے

سردارن کے اختیار رات تفویض کر دیتی تھی۔ سردارن اب اسے اور گوپال کو تنقیدی نظروں سے گھور رہی تھی۔ اوپر سے نیچے جائزہ لے رہی تھی۔ غار سے آنے والی روشنی ان کی پشت پر پڑ رہی تھی اور وہ دونوں اس روشنی کی زد میں تھے۔ مگر اس تاریکی میں اس کا چہرہ چودھویں کا چاند معلوم دیتا تھا اور اس کی چمکتی بڑی بڑی نیلی آنکھیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

”ان دونوں کو غار میں پہنچا کر ان کی کمر سے پتھر باندھ دو اور ان تمام لڑکیوں عورتوں کو بستی کی طرف روانہ کر دو۔“ سردارن نے بڑے بے وفا لہجے میں روفو کو مخاطب کیا۔ ”ان دونوں کا فیصلہ ہونے تک میرے ساتھ ہی رہو گی۔“

سردارنی اور روفو کی زبان نے ایک دوسرے سے مقامی زبان میں کچھ کہا۔ پھر روفو کے اشارے پر ان دونوں کو بلا چون و چرا بڑھنا پڑا، ان میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ حکم عدولی کریں۔ گوتم کی نظر غار میں داخل ہوتے وقت معا اس کی نظر درختوں کی اوٹ میں بندھے بہت سے خچروں پر پڑی جس سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان قبائلی حسینوں کی بستی یہاں سے خاصے فاصلے پر واقع ہے۔

پھر سرعت سے کتوں کی ٹکمر سے وہ سب وزنی پتھر کھولے گئے اور آہنی زنجیروں کے ساتھ اس کی اور گوپال کی کمر سے باندھ دیے گئے۔ اس اثناء میں سردارنی غار میں آگئی اور روشن غار میں اس کا حسن و شباب اور وحشی ہو گیا تھا۔ روفو کی نو جوان ساھی دو شیراز میں اور جوان سال عورتیں اپنا اپنا کام انجام دے کر چلی گئی تھیں۔ وہ جو عورت تاج پہنی ہوئی تھی جسے گوتم نے مہارانی سمجھا تھا وہ بھی چلی گئی۔ اس کی اور سردارنی کی شاہت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سردارنی کی بہن ہوگی۔ اس نے تاج شوقیہ پہنا ہوا ہوگا۔ اس نے دوسرے لمحے خچروں کے چہنہانے کی آوازیں اور کتوں کی غرائشیں سیں جن کا مطلب یہ تھا کہ وہ سب سردارنی کے حکم کی

کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ اس کی پرستش کی جاتی ہے۔“

انتا کہہ کر سردارنی تنہائی نے توقف کیا۔ اس کے سینے میں سانسوں کا ایک تلاطم تھا اور اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ کیوں اور کس لیے نہ تو بھرے ظاہر تھا نہ ہی آنکھوں سے سانسوں کے تلاطم کی وجہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ پھر سردار نے اپنی بات جاری رکھی۔

”مجھے کیا..... اس بستی کی ہر لڑکی عورت کو ارمان ہے کہ وہ زینہ اولاد کی ماں بنے..... میرا بھی ارمان تھا..... جو پورا نہ ہو سکا۔ میں نے آج سے تیرہ برس قبل ایک لڑکی کو جنم دیا..... آج وہ تیرہ برس کی ہو چکی ہے۔ میری بیٹی کا پستانا ہے۔ وہ کس قدر حسین ہے، میں بتا نہیں میں اس کا حسن و شباب سراپا کتاب اور خدو خال الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ یہ سمجھ لو کہ چاند بھی اس کے مقابلے میں کچھ خوب صورت نہیں ہے..... دنیا کی کوئی شے بھی نہیں..... رنگین پسینے بھی نہیں دنیا کے زرد جواہرات بھی نہیں، زمین آسمان اور قدرت کے نظاری بھی نہیں۔“ وہ جذباتی ہوئی جا رہی تھی..... ”اس نے نو برس کی عمر میں نوجوان کی دہلیز پر قدم رکھا..... تب سے وہ اپنے کسی دعویدار کے انتظار میں کرب آمیز لمحات کاٹ رہی ہے مگر دو برس گزر جانے کے باوجود میری بستی کا کوئی جوان اس کا نام نہیں لیتا..... اس کا ذکر بھولے سے بھی تو نہیں کرتا ہے۔“

”میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں وہ غور سے اور دھیان سے سنو..... اگر تم دونوں نے اس بات کو ماننے سے انکار کیا انکار کے الفاظ نکلتے ہی یہ نیزے دیکھ رہے ہوتے دونوں کے دلوں میں پوری قوت سے جھونک دیں گی..... اگر تم دونوں نے میری بات مان لی تو تم میں سے صرف کوئی ایک زندہ رہے گا..... کون زندہ رہے گا۔ اس کی زندگی کی ضمانت دینا میرے اختیار میں نہ ہوگا۔“

تعلیل میں کتوں سمیت واپس جا رہے ہیں۔

جب فچروں کے سموں کا شور دور ہوتے ہوئے معدوم ہو گیا تب سردارنی اس کشادہ غار میں پڑے ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ وہ فاس کے قدموں کے پاس آتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ وہ اور گوپال پتھر سے بندھی ہوئی زنجیر مختصر ہونے کے باعث پیٹھے ہوئے تھے۔ یہ مجبوری تھی لیکن گوپال کی زنجیر قدرے لمبی تھی۔ اس لیے اسے دیوار سے کھڑا ہونے کا موقع مل گیا تھا۔

”میرا نام شہنائی ہے۔“ اس کی ریٹھی آواز فضا میں لہرائی تو گوتم کو لگا واقعی شہنائی بج رہی ہو۔ ”میں اس علاقے کی سردارنی ہوں..... اس قبیلے کی ایک خوش نصیبی ہے کہ یہاں جو بھی لڑکی جنم لیتی ہے وہ پری سے بھی زیادہ حسین ہوتی ہے۔ عورت یہاں بھی بوڑھی نہیں ہوتی ہے۔ سدا بہار ہوتی ہے..... یہاں کی آب و ہوا اور ٹھل صرف لڑکیوں عورتوں کو اس آتے ہیں جو انہیں حسین اور پر شباب بدن کی مالک رکھتے ہیں۔ جب کہ مردوں کو اس نہیں آتے ہیں تو ایک عجیب و غریب بات ہے۔ یہ اسرار آج تک سمجھ میں نہیں آیا۔ عورت سو برس سے زیادہ کی عمر کی ہوتی ہے۔ اس عمر میں بھی نہ تو اس کی جوانی اور شباب دھلتا ہے اور نہ ہی جسم..... وہ چودہ برس کی دوشیزہ کی طرح رہتی ہے۔ ایک دو نہیں بلکہ کئی ایک عورتیں جن کی عمریں سمجھیں دھوکا دیں گی وہ چودہ چودہ برس کی دکھائی دیتی ہیں..... وہ سو اور ایک سو میں برس تک ہوتی ہیں..... ایک سو چالیس پچاس برس کی عمر میں طبعی موت مر جاتی ہیں۔ کبھی بیماری یا عارضہ میں مبتلا ہوئے بغیر ان کی جسمانی خوب صورتی کا تم اندازہ کر سکتے ہو لیکن طاقت کا نہیں۔ وہ شہ زور ہوتی ہیں۔ بیک وقت دس مرد بھی ان سے مقابلہ نہیں کر سکتے..... یہاں مرد آٹے میں نمک کے برابر اس لیے ہیں کہ لڑکے برسوں میں جا کر جنم لیتے ہیں..... جو لڑکی عورت اولاد زینہ کو جنم دیتی ہے اس

”تو وہ گویا ایک اہنی اعصاب اور قاتل سے شادی کرنا چاہتی ہے..... ایک عورت کو زیب دیتا ہے۔“

”زیب دیتا ہے یا نہیں.....“ سردارن نے تیز لہجے میں کہا۔ ”میں جو کہہ رہی ہوں اسے سنو..... باہر دوسدھائے ہوئے فخر موجود ہیں..... روفو پہلے تم میں سے کسی ایک روانہ کرے گی اور اس کا فخر اسے سیدھا میری بستی میں پہنچا دے گا..... جہاں میں پہلے سے موجود ہوں گی..... وہ شخص وہاں پہنچ کر سپنا پر اپنی ملکیت کا اعلان کرے گا پھر ایک دن کے وقفے سے روفو بھی تمہارے سہمی کو بستی پہنچائے گی اور وہ بھی سپنا پر اپنا حق جتائے گا..... اگر تم دونوں نے بستی والوں کو زرا بھی بھٹک دی کہ سپنا کی شرط پوری کروانے کے لیے تم دونوں کو جنگل سے جبر و زبردستی سے گرفتار کیا ہے اور تم دونوں جان کے خوف سے اسے اپنانے پر آمادہ ہوئے ہو..... یہ بات اچھی طرح سن لو اور جان لو کہ نہ صرف نادیدہ نیزے بلکہ زہریلے تیر بھی تم دونوں کے جسم چھلنی کر دیں گے۔ لہذا.....“

”لیکن تمہارے ساتھ جو تیر انداز اور نیزہ باز لڑکیاں اور جو لڑکیاں عورتیں تھیں کیا وہ یہ راز افشا نہیں کر دیں گی..... جب کہ وہ سب تمہاری بستی کی ہیں..... وہ کیسے اس بات کو راز رکھ سکیں گی۔“ گوپال نے درمیان میں کہا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ یہ راز افشا کر دیں۔ میرے حکم کے بغیر وہ ایک لفظ بھی بولی اور کسی کو بتا سکیں..... وہ جانتی ہیں کہ اس راز کو ظاہر کرنے سے ان کا انجام عبرتناک موت..... یعنی انہیں شکاری کے سامنے ڈال دیا جائے گا۔“ اس نے توقف کر کے گہرا سانس لیا۔ ”میری دوسری بات سنو..... اگر تم نے رازداری برقرار رکھی تو پھر ایک مقررہ دن پر تم دونوں کے درمیان خونی مقابلہ ہوگا جو اس وقت تک جاری رہے گا جب تک تم میں سے کوئی ایک مر نہ جائے..... یا اپنا چ یا معذور ہو کر

سردارن کے الفاظ سن کر اس کا دل حلق میں آ گیا۔ اس کا لہجہ اٹل تھا، فیصلہ اٹل تھا اس میں تلوار کی کاٹ تھی۔ اس نے سپاٹ اور بے رحمی سے ان کے مقدر کا فیصلہ سنا چکی تھی۔ تیر جیسے کمان سے نکل چکا تھا۔

”میں کچھ سمجھ نہیں سکا ہوں کہ تم کیا چاہتی ہو..... اور تم نے کیا فیصلہ کر لیا جب کہ ہم نہ تو تمہارے ملازم ہیں اور نہ مجرم ہیں۔“ وہ بولا تو اس کی آواز ڈوبنے لگی تھی۔ ”یہ تم ہمارے ساتھ نا انصافی کر رہی ہو۔“

”میں نے جو کچھ کہا وہ پتھر کی لکیر ہے۔“ سردارنی نے ٹھکراری۔

”لیکن تمہاری بات بڑی عجیب و غریب پر اسرار اور ناقابل فہم ہے۔“ گوتم نے حوصلہ کر کے کہا۔ ”تمہاری نو خیز عمر کی بیٹی اس قدر حسین ہے تو گاؤں کا کوئی نوجوان اس سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتا..... کیا ایسا تو نہیں کہ وہ انتہائی بد صورت بھدی اور بے کشش ہو..... تم مجھے اس کی اس قدر تعریف شاید اس لیے کی ہو کہ وہ تمہاری بیٹی ہے..... تمہارا خون ہے۔ تم نے اسے جنم دیا ہے۔“

”نہیں..... اس لیے نہیں..... میری بیٹی سے شادی کرنے کی ایک شرط ہے اس لیے کوئی بھی اس شرط کو پوری کرنے تیار نہیں..... اس شرط کو پوری کیے بغیر نہ میں اسے اپنی بیٹی دینے تیار ہوں اور نہ میری بیٹی بزدل، ڈرپوک اور کم زور مرد سے شادی کرنے تیار ہے۔ وہ ایک بہادر اور غیور مرد کو اپنا جیون سہمی بنانا چاہتی ہے۔“

”کیا شرط ہے تمہاری۔“ گوتم نے پوچھا۔ ”کیا تم بتانا پسند کر سکتی۔“

”وہ یہ چاہتی ہے کہ اس سے شادی کرنے کے امیدوار آپس میں خونی مقابلہ کریں..... جو اس پر فتح یاب ہوگا..... اپنے ہاتھوں سے سفاکانہ قتل کرے گا..... اسے خون میں نہلا دے گا اس سے وہ شادی کرے گی۔“

تمہاری پیش کش منظور ہے..... ہم تمہاری بیٹی کے حصول کے لیے خونی مقابلہ ضرور کریں گے۔“ سردارن کی خوب صورت آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس پر سرشاری کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ وہ فرط مسرت سے بولی۔

”میں جانتی تھی کہ ایک نہ ایک دن سپنا کا ستارہ عروج پر آئے گا..... سپنا کو اس کا سپنا مل جائے گا۔ اب اسے کوئی بھی بدبختی کا طعنہ نہیں دے گا..... کہ اسے جیون سا بھی نہیں ملا۔“

پھر سردارنی نے پاس بیٹھی ہوئی روکو کو آغوش میں لے کر اسے پیار کیا جو خوشی کا بے پایاں اظہار تھا اور دونوں باہر چلی گئیں۔

چند ثانیوں تک وہ دونوں ساکت و جامد اور مہبوت سے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے تھے۔ پھر گوپال نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”ہم زمرہ کے لالچ میں کہاں پھنس گئے.....“

مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ سردارن کی بیٹی یقیناً چڑیل کی طرح نہیں تو کم از کم اس کی طرح بد صورت خوف ناک بھدی اور بے کشش ہوگی..... اسی لیے تو اس کی بستی کا کوئی نوجوان اس سے شادی کے لیے تیار نہیں..... اس نے شادی نہ ہونے کی جو وجہ بتائی وہ جھوٹ معلوم ہوتی ہے..... ہمیں فریب دے رہا ہے..... بے وقوف بنا رہا ہے۔“

”ایسی صورت میں ہم بھی اسے بے وقوف بنائیں گے۔“ گوتم نے کہا۔

”وہ کیسے.....“

”ہم آپس میں اس طرح لڑیں گے..... جیسے واقعی سچ لڑ رہے ہوں اس کا فیصلہ بھی نہیں ہو سکے گا..... اس طرح ہم فرار کا کوئی موقع نکالیں گے..... ایسی تدبیر کہ سانپ بھی مر جائے لالچی بھی نہ ٹوٹے۔“ گوتم نے کہا۔ ”کیا سوچا ہے میں نے۔“

”بہت شان دار.....“ گوتم کی اس تجویز سے گوپال کا خوشی سے دھڑک اٹھا۔ ”تمہاری یہ تجویز

موت آنے تک سسکتا اور اڑیاں رگڑتا رہے اور کسی قابل نہ رہے پر سپنا فارح کی سپنا ہوگی..... اس فارح کی ملکیت ہوگی..... میں ایک بات اور بتا دوں..... اس جزیرے کی مہارانی ہے..... یہ جزیرہ اس کی ملکیت ہے۔ میرے انعامات کا مستحق فارح ہوگا..... انعامات کیا ہیں سن لو..... ان گنت موتی جو ندی کی تہ سے نکالے گئے ہیں..... جو مرغی کے انڈوں سے بھی بڑے ہیں..... اس کے علاوہ اتنا سونا ہے کہ دس چھپرے پر بھی لادا جائے تو بھی کم ہوگا..... یہاں زمرہ کی تین کانوں سے نکالے گئے زمرہ جو ناکارہ پتھروں کی جزیرے کی سرزمین پر پتھرے پڑے ہیں وہ بھی انعامات میں شامل ہیں..... اس کے علاوہ میرے پاس تو ہیرے جواہرات ہیں تم اس کا تصور نہیں کر سکتے ہو..... وہ سپنا سمیت تمہاری ملکیت ہوگی..... اگر تم دونوں اس خونی مقابلہ سے انکاری ہو تو ابھی اور اسی وقت میں تم دونوں کا فیصلہ کر دوں گی۔“

اس کا منصوبہ سن کر گوتم کا چہرہ لگا۔ اس کی رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کیوں کہ انکار کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ جیت پر کروڑوں نہیں اربوں مالیت کا خزانہ تھا..... وہ کسی بہانے سے سپنا کو شہر کی زندگی کے سنے دکھا کر یہاں کی ساری دولت لے جائے گا..... ساری نہ سہی اس دولت کا دس فیصد حصہ بھی کروڑوں سے کہیں زیادہ ہوگا..... لیکن یہ تب نصیب میں ہوگا جب وہ فارح بن جائے گا..... لیکن اسے گوپال کو قتل کرنا ہوگا کیا اس کے لیے ایسا کرنا ممکن ہوگا.....

اس نے گوپال کی طرف دیکھا ان کی بے بس نگاہیں چار ہوئیں۔ سردارنی نے عقاب کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”جلدی سے بتاؤ کہ..... تم دونوں نے کیا فیصلہ کیا..... میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔“ گوتم نے چھٹی پھنسی آواز میں کہا۔ ”ہمیں

بے ضرر اور قابل عمل بھی ہے۔ فرار ہوتے وقت جتنے بھی زمر دے جاسکتے ہیں لے جائیں گے۔“

”اس کے علاوہ ایک اور منصوبہ میرے ذہن میں آ رہا ہے۔“ گوتم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔  
”اگر یہ منصوبہ کامیاب رہا تو اس خونی مقابلے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔“

”وہ کیسے.....“ گوپال نے بڑے اشتیاق اور تجسس سے پوچھا۔

”سردار ان کے جانے کے بعد روفو یہاں اکیلی رہ جائے گی۔“ گوتم نے جواب دیا۔ ”اسے کسی بھانے سے قریب بلا کر دیوبچ لوں گا..... پھر اس کا گلا گھونٹ کر جان سے مار دوں گا۔ اس کی موت کے بعد کسی نہ کسی طرح زنجیر کھولنے کی کوشش کریں گے۔ آزاد ہوتے ہوئے باہر جو پتھر بندھے ہوئے ہیں اس پر سوار ہو کر فرار ہو جائیں گے۔ صبح ہونے تک ہم ان کی دسترس سے بہت دور ہوں گے۔“

”لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو.....“  
گوپال نے کہا۔ ”تمہاری خوش فہمی اور خود فریبی ہے۔“  
”کیا مطلب.....“ گوتم نے پلکیں جھپکائیں۔

”کیا تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ یہاں کی دس گیارہ برس کی عمر کی لڑکی سے لے کر ایک بوڑھی عورت کی اسی برس کی عمر تک کی کیوں نہ ہو وہ صرف حسین ہی نہیں بلکہ مردوں کے مقابلے میں کہیں طاقت ور ہے۔ یہی حال نو جوان لڑکیوں کی عمر کی جو ہیں ان کا ہے۔ اور پھر دونوں کی عمریاں گداز بانہوں سے اندازہ نہیں ہوا کہ ان میں کتنی قوت ہے۔ لہذا یہ حماقت کرو گے تو ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارا حشر نشر کر دے۔“

”پھر میں کیا کروں.....“ گوتم نے بڑی بے بسی سے دریافت کیا۔ ”ایک موقع جو ہے کیا اسے نظر انداز کر دوں اور ہاتھ سے جانے دوں۔“

”ویسے ایک اور تدبیر کی جاسکتی ہے۔“ گوپال بولا۔ ”قسمت آزمانے میں کیا حرج ہے..... کوشش کر کے دیکھا جائے۔“

”وہ کیا.....“ گوتم نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”روفو یہاں اکیلی ہوگی۔“ گوپال کہنے لگا۔  
”اس مفرد مجرم نے مجھے بتایا تھا کہ اس جزیرے پر لڑکیوں عورتوں کو ہر قسم کی آزادی ہے..... مردوں کو بھی..... وہ محبت کی بڑی بھوک پیاسی ہیں۔ یہاں جو مرد ہیں وہ خشک مزاج کے ہیں۔ ان میں رومانیت بالکل بھی نہیں ہے۔ وہ لڑکیوں عورتوں سے محبت بھری باتیں کرتا تو وہ کتنی محبت بھری یا دزدیدہ نظروں سے دیکھتے بھی نہیں ہیں..... یہاں مرد خوب صورت، وجیہہ اور دراز قد بھی نہیں ہیں..... ایک تو تم نے صرف بے حد وجیہہ اور خوب صورت اور دراز قد ہو بلکہ عورتوں لڑکیوں کے آئیڈیل ہو..... مجھے اس بات کا علم ہے اور تم بھی جانتے ہو کہ لڑکیاں عورتیں تمہیں دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتی ہیں۔ تمہارے ایک اشارے کی منظر رہتی ہیں..... روفو بھی آخر ایک بھر پور جوان عورت ہے..... وہ تمہاری طرف مائل ہو سکتی ہے۔ ایک التفات بھری نظر ڈالنے سے..... تم اس سے پریم بھری باتیں کرنا..... لوہا گرم دیکھ کر اسے بازوؤں کے حصار میں لینے کے بھانے اس کا سر بری طرح پتھر سے ٹکرائے گا..... گو ایک ہی چوٹ کافی ہے لیکن ایک چوٹ کافی نہ ہوگی..... تم مسلسل دو تین اس کا سر پتھر پر دے مارنا تاکہ سر کھل جائے۔“

”ہاں..... اس بات کی کوشش کی جاسکتی ہے۔“ گوتم نے کہا۔ ”میں اس تدبیر پر عمل کروں گا..... اور ہاں یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ میری طرف مائل ہو..... تم پر بھی مر سکتی ہے تم بھی پرکشش شخصیت کے مالک ہو۔“

”اگر وہ میرے پاس آئی تو میں اس سے محبت بھری باتیں کروں گا اور اس کا سر پھاڑنے میں



ذرا برا بھی تامل نہیں کروں گا۔“

آ رہی ہے وہ دیکھ کر ادھر آ جائیں..... اس لیے میں باہر جا کر پہرہ دوں گی..... اس وقت تک سورج طلوع نہ ہو..... گھبرانا نہیں..... میں آس پاس ہی موجود ہوں گی۔“

پھر وہ تیز لے کر اور انہیں خوشبو چھوڑ کر چلی گئی۔ جب وہ سردارن کے ساتھ باہر نکلی تو خاصی دیر باہر ہی تھی۔ جہاں شجر بندھے ہوئے تھے وہاں قریب ہی ایک تالاب تھا۔ شاید دونوں نے تالاب میں کھلن اتارنے کے لیے نہایا تھا۔ جب وہ غار میں آئی تھی تو نہ صرف اس کے بال بلکہ جسم بھی غم نظر آیا تھا اور سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک نے غار کی فضا کو معطر کر دیا تھا۔

ان دونوں نے روفو کے جاتے ہی وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب کھپکپ آئے۔ مومی روشنی چاندنی کی طرح بکھری ہوئی تھی وہ دونوں غار کے دہانے کی گمرانی کرتے ہوئے کسی نہ کسی تدبیر سے اپنی پشت سے بندھے ہوئے پتھر کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔

غار کے باہر جنگل کی پرہول رات کسی عفریت کی طرح سنائے پر مسلط تھی۔ جنگل کی پرہول رات دھیمے دھیمے سرکتی رہی لیکن کافی دیر گزارنے کے باوجود انہیں زنجیریں کھولنے میں کامیابی نہ ہو سکی۔ صرف ان کی پشت سے بندھے ہوئے سرے مقل تھے بلکہ پتھروں میں بھی گہرے نشان ڈال کر زنجیریں اسی طرح باندھی گئی تھیں کہ ان کے لیے کھولنا ناممکن نہ ہو سکا۔ اس دوران روفو نے دو تین مرتبہ غار میں چکر لگایا لیکن اسے ان پر کوئی شبہ نہ ہو سکا۔ کیوں کہ اسے دیکھتے ہی وہ ایسے بن جاتے کہ جیسے فرس پڑے سو رہے ہوں۔

وہ جب بھی غار میں آئی ان کے جذبات بھڑک اٹھتے تھے۔ کیوں کہ روفو کا عریاں نرم و گداز بدن جو پر شباب تھا اسے آغوش میں لینے کے لیے تڑپا تھا۔ پتوں سے ڈھکے ہوئے بدن میں کوئی پردہ اور حجاب نہ تھا۔ فطری حالت تھی۔ یہ ستر پوشی کا ہونا

ابھی وہ دونوں روفو کے خلاف منصوبہ بندی کر رہے تھے کہ انہوں نے خچر کے سموں کی آوازیں سن کر ایک دوسرے کو گوپال نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ ”زنجیروں سے اس طرح باندھا ہے کہ اس کا کھلنا آسان نہیں ہے..... کہنے کو تو یہ عورتیں ہیں..... غیر تہذیب یافتہ ہیں ایک اور افتادہ پس ماندہ جزیرے پر رہتی ہیں..... لیکن ان کی عقل و فراست دیکھو۔ گفتگو دیکھو ہماری عورتوں سے بڑھ کر ذہین ہیں۔“

”مایوس نہ ہو۔“ گوتم نے اسے دلاسا دیا۔ ”کوشش کرنے سے کیا کچھ نہیں ہوگا۔“

اس وقت روفو لہرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس نے ان دونوں کو باری باری دیکھا اور مترنم لہجے میں بولی۔

”صبح سویرے تم دونوں میں سے کسی ایک کو پہلے بستی روانہ ہونا ہے۔ لہذا تم دونوں آپس میں فیصلہ کر کے بتاؤ گے کہ کون پہلے روانہ ہوگا۔“

”یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔“ گوپال بولا۔ ”تم جسے جو حکم دو گی وہ اس پر عمل کرے گا۔“

”اچھی بات ہے۔“ روفو نے اسے گداز مٹھلیں شانے اچکا کر شیشی آواز میں بولی۔ ”تم دونوں آرام کر لو سفر نے تھکا دیا ہوگا..... میں بھی تھک گئی ہوں کچھ دیر سستالوں میں بھی..... لیکن ایک بات یاد رکھنا میں تم دونوں کی گمرانی کرنی رہوں گی۔“

پھر وہ گوپال سے چند قدموں پر زمین پر دراز ہو گئی۔ اس نے اپنے خوب صورت سڈول ہاتھوں کو تنکے بنا کر اس پر اپنا خوش نما سر رکھ لیا۔ پھر وہ گوتم کو تنکے نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس سے پہلے کہ گوتم اس سے کچھ کہتا وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی اور پھر اس نے کھڑے ہو کر اپنا تیز ہاتھایا اور بولی۔

”باہر کچھ درندوں کی دور سے غراہٹ سنائی دے رہی ہے..... ایسا نہ ہو کہ باہر غار کی روشنی جو

نہ ہونا ایک ہی بات تھی۔ اس کے بدن کا فرار نہیں ان کے جسم میں خون کی گردش تیز کر دیتا تھا۔ جب وہ تیسری مرتبہ آئی تھی پہلے وہ گوتم کی طرف گئی۔ زمین پر دوڑا ہوا ہو کر بیٹھ گئی۔ نیزہ ایک طرف رکھ دیا۔ پھر بڑے حسرت بھرے لہجے میں بولا۔

”کاش.....! تم دونوں کو زنجیروں سے جکڑا نہ ہوتا اور مجھے اجازت نہ ہوتی تو میں یہ ساری رات تم دونوں کے باری باری نذر کر دیتی۔ انجین! تم دونوں کتنے سندر اور طاقت ہو..... تمہارے جسم اور سینے کتنے کشادہ اور مضبوط ہیں..... یہ بازو فولادی سے ہیں۔ ہماری بستی میں جو مرد ہیں ان میں مردانگی ہے اور نہ جذبات..... وہ پتھر کے جسمے ہیں۔ جنہیں دیکھا جاسکتا ہے..... صرف حیوان ہیں..... جب ان کی غرض ہوتی ہے وہ عورت کو جو ان سمجھ کر پیش آتے ہیں..... میری دلی خواہش ہے کہ میں تم دونوں کے ساتھ وقت گزاروں شاید میں امید سے ہو جاؤں میں لڑکا جن درندوں، لیکن بستی میں تم دونوں ہو گے..... مقابلہ ہونے میں دو تین دن ہوں گے۔ میں رات دن تم دونوں کے ساتھ سوتی رہوں گی۔ بستی میں یہ اجازت اور آزادی ہے کہ تم جس عمر کی لڑکی اور عورت کے ساتھ اپنی غرض پوری کرنا چاہو..... یا جو لڑکی عورت تمہارا قرب حاصل کرنا چاہے وہ کر سکتی ہے، لیکن تم دونوں میرے ساتھ وقت گزارنے کے بعد ان کی طرف مائل ہو گے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن میں یہ اعلان کر دوں گی تم دونوں تین دن تک میرے مہمان اور ملکیت ہو..... لیکن شاید ہی اس پر عمل ہو۔ کیوں کہ اس بستی میں لڑکیاں عورتیں اس قدر حسین، پرکشش اور پرشباب تم ان پر مائل ہو جاؤ گے۔ خیر کوئی بات نہیں..... میرے دل میں کوئی حسد، جلعن یا بغض پیدا نہیں ہوگا..... معلوم نہیں تمہارے دیس میں جو لڑکیاں اور عورتیں ہیں کیا وہ اتنی حسین، جوان اور پرکشش ہوں گی۔ تم نے اس جزیرے کی لڑکیوں عورتوں کے حسن و شباب

مجھے..... سرداری اور نیزہ بردار لڑکیوں سے کیا ہوگا..... یہاں جو ایک شخص جو مجرم اور روپوش تھا اس نے بتایا تھا کہ یہاں جیسی لڑکیاں ہیں وہاں ایک بھی نہیں ہیں..... وہ یہاں جب تک خوب سیراب ہوتا اور عیش کرتا رہا..... معلوم نہیں وہ یہاں سے گیا کیوں۔“

اتنا کہہ کر روفو جذباتی ہو گئی۔ اس نے بڑی وارفتگی، والہانہ پن اور خود سیردی سے ان دونوں کے ساتھ باری باری پیش آئی رہی۔ گوتم نے روفو سے کہا تھا کہ..... وہ ایک جسمے کی حالت میں ہیں..... ہم دونوں کو آزاد کر دوتا کہ یہ رات اور حسین اور رنگین ہو جائے..... ہم تمہیں ایسا خوش کر دیں گے کہ کسی مرد نے نہیں کیا ہوگا..... تم بیک طرفہ اپنے جذبات کی تسکین کر رہی ہو..... روفو بولی کہ میں قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتی..... میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی۔

”لیکن دیکھو نا..... ہمارے ہاتھ اور پیر بندھے ہوئے ہیں..... ہم تو تمہیں بازوؤں میں بھی قید نہیں کر سکتے ہیں..... ہم تمہیں گرم جوشی سے چوم نہیں سکتے ہیں..... تمہاری حرکات و سکنات ہمارے جذبات کو بھڑکا رہی ہے۔“

”لیکن صبح تک کی تو بات ہے۔“ روفو نے جواب دیا۔ ”آخر میں بھی تو صبر اور ضبط سے کام لے رہی ہوں۔ میرے اندر بھی آگ لگی ہوئی ہے..... چوں کہ انجینیوں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا..... وہ اعتبار کے قابل نہیں ہوتے ہیں۔“

”روفو میری جان..... میرے دل کی رانی..... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ خونی مقابلہ نہ ہو.....! ہم یہاں سدا کے لیے رہ جائیں..... تم اتنی حسین، پرشباب اور خوب صورت جسم کی مالک ہو کہ اس زمین پر شاید ہی کوئی عورت ہو۔“ گوتم نے کہا۔ روفو اپنی تعریف سن کر سرخ ہو گئی۔ اس نے گوتم کا جو بوسہ لیا وہ بہت طویل تھا۔ پھر اس نے گوتم کے چہرے پر سے چہرہ اٹھا کر جواب دیا۔

دی۔ آخر کار گوتم کی کوششیں باآورد ثابت ہوئیں۔ وہ گوپال سے لپٹ کر بولا تو اس کے لہجے میں مسرت سے دہی دہی آواز تھی۔ ”میرا پتھر کھل گیا ہے۔“

گوپال نے دیکھا کہ گوتم واقعی اب آزاد تھا۔ اس کی کمر سے لٹکتی ہوئی زنجیر اپنی وزنی نہیں تھی کہ اس کی نقل و حرکت میں رکاوٹ پیدا کر سکے۔ اس میں اٹھنے کا خطرہ ہو وہ آزادی سے سرشار تھا۔ ایک خوف بھی دل میں دامن گیر تھا کہ کہیں رونو نے نہ آجائے۔

”اگر وہ رونو آجائے تو اس پر ٹوٹ پڑنا۔“ گوپال نے پرجوش لہجے میں مشورہ دیا۔

لیکن اس وقت گوتم کا ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا۔ گو کہ رونو ایک جوان سال عورت تھی۔ اس کے پرشباب گداز بدن میں ایک عجیب سی نرمی اور مرمریں پن سامحوس ہوا تھا۔ جب اس نے گوتم کو اپنی آغوش میں لے کر اس کے چہرے اور جسم پر جھلی تھی۔ جسم گھٹا ہوا اور تپش دیتا ہوا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ بدن مرمریں اور گداز ہونے کے باوجود مرد کی طرح توانا اور مضبوط تھا۔ وہ تو بالکل نہتا تھا۔ رونو ایک لمبے اور خطرناک اور زہریلے نیزے سے مسلح تھی۔ ایسی صورت میں اس خطرناک عورت سے لکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس نے سوچا کہ ان حالات میں وہ اپنی زندگی کی بھلا اور آزادی اور رہائی کے لیے یہی مناسب تھا کہ گوپال کو بھول جائے اور اپنی سلامتی کی فکر کرے۔ اگر وہ اپنے خود غرضانہ فیصلے سے گوپال کو آگاہ کرتا تو عین ممکن تھا کہ وہ نفرت غصے اور تپش میں آکر رونو کو آواز دے دیتا۔ پھر اس نے فوری طور پر کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر لیا کہ لمحہ لمحہ قیتمی تھا۔

”تم یہیں رکو۔“ گوتم نے اس کے کان کے پاس منہ بے جا کر سرگوشی کی۔ ”رونو یقیناً کہیں پڑی سو رہی ہوگی۔ میں اسے بے خبری ہی میں دیوبج

”بات صرف اتنی سی ہے کہ..... تم نے یہ سوال سردارن سے کیا تھا کہ آخر اس خونی مقابلے کی کیا ضرورت ہے..... سردارن نے اس وقت اس بات کا جواب نہیں دیا تھا لیکن میں بتاتی ہوں..... دراصل سردارن کی بیٹی ایک ایسے جوان مرد سے شادی کرنا چاہتی ہے جو بہادر ہو..... جوان مرد..... خوب صورت بھی ہو..... اسے بزدل اور نکلے مرد پسند نہیں ہیں۔ سردارن کی بیٹی کی بات یا حکم قانون بن گیا ہے۔“

”کیا سردارن سے یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس قانون میں ترمیم کی جائے۔“

”اس کی ایک صورت ہے۔“ رونو نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”شاید بات بن جائے۔“

”وہ کون سی صورت ہے۔“ گوپال نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”کل دن یا رات کے وقت تم دونوں میں سے کوئی ایک اس کا مہمان ہوگا..... سردارن بھی اولاد دیرینہ کی شدید خواہش رکھتی ہے۔ نشاط انگیز لمحات کے دوران یہ تجویز اس کے سامنے رکھی جائے..... میں بھی اس سے کہوں گی..... پھر وہ اپنی بیٹی سے بات کرے گی۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ تم دونوں رہو تاکہ زیادہ سے زیادہ مرد بچے پیدا ہوں لیکن مجھے اس کی امید نہیں ہے..... سردارن تو شاید مان جائے لیکن اس کی بیٹی کو یہ تجویز پسند نہیں آئے گی اور نہ وہ مانے گی۔ اس لیے کہ وہ بڑی ضدی اور سرکش اور تیز مزاج کی ہے..... جو ایک بات ایک بار کہہ دے وہ پتھر کی لکیر بن جاتی ہے۔“

پھر رونو ان دونوں کا باری باری ہوسہ لے کر نیزہ اٹھا کر غار سے باہر چلی گئی..... وہ دونوں سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد رونو یہ دیکھنے کے لیے آئی تھی کہ وہ کیا کر رہے ہیں..... وہ دونوں اس کی آہٹ سن کر سوتے بن گئے۔ جب وہ چھانک کر چلی گئی پھر نہیں آئی۔ پھر گوتم اور گوپال نے اپنی آزادی کے لیے جتن اور جدوجہد شروع کر

لوں گا..... اس کا نیزہ بھی قبضے کر لوں گا۔ پھر اسے موت کی بھیٹ چڑھا دوں گا۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اسے نیزے کے زور پر قابو میں کر کے غار میں لاؤ اور اس سے میرے پتھر کو نجات دلاؤ۔ پھر ہم دونوں باری باری اس سے فائدہ اٹھائیں..... اس لیے کہ بلا کی حسین اور بے پناہ کشش کی مالک ہے..... پھر اسے موت کی بھیٹ چڑھا کر اس کی لاش کسی گڑھے میں پھینک دیں..... پھر ہم دونوں فرار ہو جائیں۔ پھر راستے کا پتھر ہٹ جائے گا۔“

”ایسا اتنا آسان نہیں ہے اس لیے کہ کوئی نہ آجائے..... لینے کے دینے پڑ جائیں۔“ گوتم بولا۔ ”واقعی وہ اتنی حسین اور پیاسی ہے کہ میرا دل بھی وہی سوچ رہا ہے جو تم سوچ رہے ہو..... میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا اس کے بدن کے سحر میں گرفتار ہو کر..... آزادی عورت سے بڑی نعمت ہے..... تمہاری بیوی بھی اس سے کم حسین نہیں ہے۔ بہر حال میں جا رہا ہوں رو فو کی تلاش میں۔“

”تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔“ گوپال نے کہا

گوپال کی آواز میں ایسی امید اور التجا رچی ہوئی تھی کہ اسے مل بھر کے لیے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوئی لیکن فوراً ہی زندگی کا خوف اس کی شرمساری پر غالب آ گیا۔

وہ بڑی احتیاط کے ساتھ دبے قدموں دہانے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے کان پر سکوت فضا پر جھے ہوئے تھے۔ مجا اسے خیال آیا کہ اس کے دہانے تک پہنچنے سے قبل ہی شمع کی روشنی نیچے دہانے کے باہر پڑے گی اس کا سایہ رو فو کو گڑبڑ کا احساس دلا دے گا اور اسے کسی چوہے کی طرح مار دیا جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے دونوں مومی شمعوں کو گل کر دیا۔ غار میں کھور اندھیرا مسلط ہو گیا۔ اس کے ساتھ باہر کسی کے دوڑنے اور رو فو کے مغلقات

بکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس وقت اس کے

بدن میں نہ جانے کہاں سے اتنی پھرتی عود آئی کہ ایک ہی جھست میں وہ غار سے باہر نکلا چلا گیا۔ اس نے غار سے نکلنے اور روشنی گل کرنے سے قبل ہی راستے کا اندازہ کر لیا تھا۔ اس لیے باہر پہنچنے میں اسے کوئی دقت نہ ہوئی۔

وہ جونہی غار سے باہر پہنچا اسے اپنے داپنے پہلو میں قریب ہی رو فو کے دوڑنے کی قدموں کی آوازیں سنائی دیں..... رو فو نے اندھیرے میں اس کی آئینیں سن کر تاک کر اندازے سے نیزہ پھینکا تھا جو اس کے جسم کے اوپر سے محض چند انچ سنسناتا گزرتا گیا تھا..... شاید رو فو نے اس کے سایہ پر نشانہ لے کر پھینکا تھا لیکن اس کا نشانہ خطا ہو گیا تھا۔ اس کی حاضر دماغی کے سبب ناکام ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے وہاں رکے رہنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ بلکہ کہنوں اور پیٹ کے بل رینگنے لگا۔ وہ اس وقت بری طرح خطرے میں گھرا ہوا تھا اور اس کے ذہن میں ایک ہی دھن سوار تھی کہ آس پاس بندھے ٹخروں کے پاس پہنچ جائے۔

ٹخروں کی بھن بھناہٹ نے اسے سمت کی جانب رہنمائی کی۔ وہ ان کی طرف تیزی سے بڑھتا رہا۔ غار کے دہانے سے آئی ہوئی رو فو کی آواز کی گونج سے اسے پتا چلا کہ وہ گوپال سے باز پرس کر رہی ہے۔ غار کے دہانے سے پھر ایک بار روشنی نظر آنے لگی۔

ٹخروں کے درمیان میں کل تین تھے۔ ان کے اگلے پیر رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ انہیں ایک درخت سے باندھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ تین تھی نہ ہی لگام..... یہ جزئیات اس کے لیے اس وقت تک بے معنی تھیں۔ وہ ہر قیمت پر اس مقام سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس نے تیزی کے ساتھ ایک ٹخرو کو آزاد کیا اور اچھل کر اس پر سوار ہو کر اس کی پشت سے چپک گیا۔ جو تک کی طرح۔

ٹخروں کے درمیان میں ایک بار رہنمائی..... اور پھر بدکا..... اور

یہی گوتم سے سخت لہجے میں کہا۔

”تم نے روڈو اور اپنے دوست کو دھوکا دیا اور فرار ہونے کی کوشش کی۔ جب کہ تم سے کہا تھا کہ خچر سدھائے ہوئے ہیں..... دو ایک گھڑی بعد روڈو اور تمہارا ساتھی بھی آنے والا ہے..... اور سنو یہاں ہر قسم کی آزادی ہے تم جیسے لڑکی اور عورت کے ساتھ چاہے رنگ رلیاں جس وقت چاہے مناسکتے ہو۔ اس دن تک جب خونی مقابلہ ہوگا وہ جو میری بیٹی کو اپنی ملکیت بنائے گا..... اس کے بعد پھر تم کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکو گے..... تم صرف اس کے ہو گے..... تین دن تک عیش کرنے کی اجازت اور مہلت ہے۔“

اتنا کہ کم سرداری نے اسے اپنے مکان میں لے آئی۔ اس کا گھر بڑا عالی شان اور خوب صورت اور کئی کمروں پر مشتمل تھا۔ سرداری نے اسے وہ کمرے دکھائے جس میں ہیرے جواہرات اور موتی بھرے ہوئے تھے اس نے پوچھا۔

”سرداری! تمہاری بیٹی کہاں ہے..... کیا اس کے درس نہیں ہو سکتے۔“

”جس روز تم دونوں میری بیٹی کے حصول کے لیے آپس میں خونی مقابلہ کرو گے اس روز اسے سامنے لایا جائے گا۔“ سرداری نے جواب دیا۔ ”اسے تو بہتی والوں میں سے کسی نے بھی نہیں دیکھا ہے..... اس لیے اسے ان کے سامنے لایا نہیں گیا کہیں اس کے حسن و شباب کو نظر نہ لگ جائے وہ اس قدر حسین اور شعلہ مجسم ہے کہ تم تصور میں اس کا اندازہ نہیں کر سکو گے نہ کر سکتے ہو۔“

پھر سرداری نے اپنا ستر پوشی کا لباس نکال پھینکا۔ ”میں ایک طرح سے اس کا عکس ہوں۔ جیتا جاگتا ہم دونوں میں عمروں کا فرق ہے۔ وہ پندرہ برس کی عمر کی بھی نہیں ہے..... لیکن میرے مقابلے میں جو کشش کے خزانے ہیں اس بہتی کی کسی لڑکی اور عورت میں نہیں۔“

پھر بے تحاشا گھنے جنگل میں گھس پڑا۔ پھر اس نے اپنے کان پیچھے کی آہٹوں پر جھپٹے ہوئے تھے اس کی توقع کے مطابق روڈو نے اس کا تعاقب نہیں کیا..... پھر اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ شاید روڈو نے اپنا ارادہ اس لیے بدل دیا ہوگا کہ گوپال موجود تھا۔ شاید وہ گوپال کو آزاد کر کے مسور کر کے اس کے ساتھ جشن منائے گی۔ گوپال اس کے سحر میں آ گیا ہوگا۔ اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ گوپال اسے آلودہ کر کے موقع پا کر قتل کر دے گا۔

ادھر اس کا خچر وحشیانہ انداز میں دوڑنے کے بعد آہستہ آہستہ اعتدال پر آ گیا اور دشوار گزار پہاڑی جنگلات کے پر پیچ نشیب و فراز پر ہموار رفتار سے دوڑنے لگا۔ خچر جس اطمینان سے چلا جا رہا تھا اس نے گوتم کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا..... اسے سرداری کے الفاظ یاد آئے کہ خچر سدھائے ہوئے ہیں اور اس کی بہتی پر رکیں گے۔

اس نے دو تین مرتبہ خچر کا راستہ بدلنا چاہا لیکن وہ اس بری طرح بھڑکا کہ اس نے دہشت زدہ ہو کر اپنے آپ کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ کیوں کہ وہ خوف ناک گھماٹیوں سے گزر رہا تھا۔ ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں گر نہ جائے۔ خچر کے قدم ہٹکنے کی صورت گرنے کا خوف و اندیشہ تھا۔ اس لیے وہ کوشش ترک کر کے خاموش رہا۔

جب سورج طلوع ہوا۔ اجالا پھیل گیا۔ تب اسے دور کی چیزیں بھی نظر آنے لگیں۔ اسے بہتی بھی نظر آنے لگی۔ وہ دل میں پرارتا کر رہا تھا کہ سرداری کی بہتی نہ ہو..... بہتی سے باہر ہی اسے دو شیرازوں اور عورتوں نے گھیر لیا..... اس میں ایک بڑی تعداد ستر پوشی سے بے نیاز تھیں۔ مرد بھی..... ہر عمر کی لڑکی..... عورت اس قدر حسین و جمیل تھیں کہ اسے ایسا لگا کہ وہ پرستان میں آ گیا ہو۔ مرد تو ان کے مقابلے میں نہایت بد صورت تھے۔

اس وقت سردارن بھی آ گئی۔ اس نے آتے

جائیں۔

اور پھر ایک اور پابندی تھی کہ دن ڈوبتے ہی وہ دونوں سردارن اور دونوں کے ہاں آ کر سو جائیں گے۔ پھر صبح کا اجالا نکلنے کے بعد گھر سے نکل کر کہیں بھی کسی کے ساتھ جا سکتے ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد انہیں ایک ایسا مشروب دیا جاتا تھا کہ اس کے پینے کے بعد تھوڑی دیر بعد ان پر بے ہوشی کی نیند طاری ہو جاتی تھی۔ جب صبح ہوتی تھی تب وہ بیدار ہوتے تھے۔ انہیں یہ مشروب پلا کر کیوں سلا دیا جاتا ہے یہ راز ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ گویا بھی حیران اور پریشان ہوتا ہے۔

یہ بستی اور یہاں کی لڑکیاں عورتیں بڑی پراسرار اور عجیب و غریب سی لگی تھیں۔ جب وہ باہر آئے تو لڑکیاں عورتیں اپنے زرخے میں لے کر پدن کارواں رواں چوستی تھیں۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ اس کی خواہش پوری کر پس۔ دودن تک انہوں نے جی بھر کر رنگ رلیاں منائی تھیں لیکن اب انہیں رنگ رلیاں منانے کی بجائے فرار کا منصوبہ بنانا تھا۔ دودن کٹ گئے تھے۔ اب پانچ راتیں باقی تھیں۔

انہوں نے بستی کی خوب سیر کی نندی کنارے انہوں نے زمر دسونا ہیرے جواہرات موتیوں کے ڈھیر زمین پر پتھروں کی طرح پڑے ہوئے دیکھے تھے۔ وہاں انہیں اٹھانے اور چرانے والا نہیں تھا۔۔۔۔۔ نندی کنارے انہوں نے چھوٹی بڑی سات کشتیاں دیکھی تھیں۔۔۔۔۔ ہر کشتی میں ٹوکریاں تھیں۔ انہوں نے لڑکیوں عورتوں کو نندی سے مچھلیاں پکڑ کر ان ٹوکریوں میں مچھلیوں کو پکڑتے دیکھا تھا۔

یہاں مردوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ وہ عورتوں کے مقابلے میں کمزور اور بوڑھے نظر آتے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں ایک خوفناک سی چمک تھی۔ جس نے اسے لرزادیا تھا۔

سردارنی اور دونوں نے ان کے جسموں پر ایک عجیب سی بوکا مرہم ل دیا تھا جس کی بو پا اور سونگھ کر

سردارنی نے درخت کی چھال سے جو ستر پوشی کی ہوئی تھی اس میں بھی وہ بے نیاز تلواری لگتی تھی۔ یہ دھجیاں تھیں۔ اب وہ بھی سحر زدہ سا ہو کر دیکھے جا رہا تھا۔ اس طرح دیکھے جا رہا تھا جیسے کوئی کتاب پڑھ رہا ہو۔

پھر سردارنی نے اس کے گلے میں اپنی مرمیں عریاں اور سڈول بانہیں حماں کر دیں۔ پھر اس پر جھپتی چلی گئی۔

☆☆

دو گھڑی بعد روفو اور گوپال ایک فخر پر سوار آ گئے۔ روفو اسے سردارن کے ہاں لے آئی تھی۔ وہ سردارن کو قبائلی زبان میں کچھ بتائے گی۔ گوپال نے اسے بتایا کہ اس کے فرار ہونے کے بعد روفو غار میں آئی اور مومی شمعیں روشن کیں۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہوئی روفو نے مشروط طور پر رہائی دلائی کہ وہ اس قید سے نجات پاتے ہی فرار ہونے کی کوشش نہیں کرے گا۔ پوچھنے تک وہ اس کے ساتھ جشن منائے گا۔۔۔۔۔ فرار ہونے سے وہ واپس اپنی دنیا میں جا نہیں سکتا۔ وہ اس کی بستی میں خونی مقابلے میں جیت کر اس بستی کا سردار بن جائے۔ پھر اس کی زندگی حسین رنگین اور پر لطف گزرے گی۔ چوں کہ گوپال کو اس کے پاس پہنچنا تھا اس لیے اس کی ہر بات مان لی۔ روفو اس پر پوٹھنے کے بعد نہایت فیاضی سے مہربان ہوئی رہی۔ ہر طرح سے خوش کیا اور خود بھی خوش ہوئی رہی۔ ایسا اور اتنا خوش اس کے ہاں کی عورت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

خونی مقابلہ سات دنوں کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ کیوں کہ سردارن کی بیٹی کی طبیعت ناساز ہو گئی تھی۔ سردارنی نے ان سے کہا تھا کہ وہ سات دنوں تک جس لڑکی عورت کے ساتھ چاہے رنگ رلیاں منا سکتے ہیں۔ صرف ایک مرتبہ ایک لڑکی کے ساتھ۔۔۔۔۔ دوبارہ نہیں۔۔۔۔۔ کیوں کہ وہ چاہتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لڑکیاں عورتیں امید سے ہو

نہ ہو۔ سب کے سب گدھے کے سینگ کی طرح غائب تھے۔ ندی کے کنارے کشتیاں بھی موجود تھیں۔ پوری بستی ان کشتیوں میں سوار ہو کر کہیں جانے سے رہی تھی۔

یہ بستی اور بستی کے تمام لوگ برا سرار بن گئے تھے۔ ان دونوں نے خوب دماغ ٹوڑا ان کی سمجھ میں نہیں آیا..... نہ یہ معہ ان سے حل ہوا..... صرف یہ بات سمجھ میں آئی کہ انہیں مشروب ملا کر اس لیے بے ہوش کر دیا جاتا ہے کہ کہیں جاتیں لیکن کہاں اور کیوں۔

”ہماری بلا سے کہیں بھی جائیں۔“ گوتم نے کہا۔ ”ہمارے لیے یہ سنہرا موقع ہے کہ ہم رات کو ان کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر دو کشتیوں میں ہیرے جواہرات سونا..... اور زمرہ بھر کر فرار ہو جائیں..... سردار ان کے ایک کمرے میں خالی بوریاں بھری پڑی ہیں اتفاق یہ سارا خزانہ ندی کنارے پڑا ہوا ہے۔“

”ہاں..... ہم کل رات ہی فرار ہو جاتے ہیں۔“ گوپال نے کہا۔ ”میں بھی کوشش کروں گا کہ مشروب نہ پیوں اور اس کی نظر بچا کر پھینک دوں..... اگر ایسا نہ کر سکا تو تم یہ سمجھو کہ میں کامیاب نہ ہو سکا..... تم آ کر مجھے ہوش میں لے آنا۔“

”کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی وجہ سے بستی کے لوگ بستی چھوڑ کر چلے گئے ہوں۔“ گوپال نے کہا۔ ”اس کا تو صبح ہی پتا چل سکے گا۔“ گوتم نے جواب دیا۔

وہ رات بڑی دیر تک جاگتے اور منصوبے بناتے رہے..... دولت مند بننے کے سہانے خواب بھی دیکھتے رہے..... انہیں نیند آنے لگی تو وہ اپنے گھروں میں جا کر سو گئے۔

دوسرے دن انہوں نے دیکھا..... بستی کا ہر فرد موجود ہے۔ انہیں حیرت ہوئی۔ جب ان کی ملاقات باہر ہوئی تو گوپال بہت خوف زدہ تھا۔ ”گوتم یار!“ وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔

بستی میں جو شکاری کتے تھے وہ ان مطیع ہو جائیں اور نقصان نہ پہنچاسکیں۔ اس بستی میں جو بھی کتا تھا انہیں نہ تو بھونکنا تھا اور نقصان پہنچا سکتا تھا اور نہ پہنچایا۔

گوتم کے دل میں بڑا تجسس تھا کہ وہ اس بھید کو جان سکے۔ تیسرے دن سپہر کے وقت سرداری کے ساتھ وہ محبت بھری باتیں کرتا رہا تھا..... جب کھانے کے بعد سرداری اس کے لیے مشروب لائی تو اس پانی مانگا جب وہ پانی لانے گئی تو اس نے مشروب کمرے کے باہر کھلنے والی کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ جب سرداری پانی لے کر آئی تو وہ جھوٹ موٹ ہونٹ لٹیکس کے دامن سے صاف کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بستر پر دراز ہو گئے۔ گوتم تھوڑی دیر بعد جھوٹ موٹ خراٹے لینے لگا۔ جب باہر اندھیرا گہب ہو گیا تب روفو آئی اور بولی کہ گوپال موت کی نیند سو گیا ہے..... یہ بھی چلو اب ہم چلتے ہیں خاصی دیر بعد ان دونوں میں سے کوئی نہ آیا تو وہ باہر نکل آیا۔ اس وقت آسمان پر چاند ابتدائی دنوں کا تھا جس نے تاریکی سینہ چیر دیا تھا۔ وہ روفو کے گھر کی طرف بڑھاتا کہ گوپال کو بیدار کرے۔ اس نے ان دو تین گھروں میں جھانکا جن میں لڑکیاں عورتیں اور مرد ہوتے تھے۔ یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ گھر خالی پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک فرد بھی نہیں تھا۔ روفو کے مکان میں دو لڑکیاں اور تین عورتیں زیریں جیسے میں رہتی تھیں۔ وہ بھی نہ تھیں اور نہ ہی روفو تھی۔ صرف گوپال تھا جو بے ہوشی کی نیند سو رہا تھا۔ گوپال کو بیدار کرنے میں اسے بڑا جتن اور مدد پھر کرنا پڑی۔

اس نے گوپال کو پتایا اور پھر ان دونوں نے مل کر بستی کا ایک ایک گھر چھان مارا..... کسی بھی ایک گھر میں مرد لڑکوں لڑکیوں اور عورتوں کو موجود نہ پایا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس بستی میں کوئی رہتا ہی

”میرا دل دھڑک رہا ہے..... ایک ان جانا سا خوف آرہا ہے ایسا لگ رہا ہے کہ ہم کسی بڑی مصیبت اور حسین بلاؤں میں پھنس گئے ہیں..... تم نے ایک بات محسوس کی۔“  
”وہ کیا.....“ گوتم نے تیز اور سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”تم نے اور میں نے روٹو اور سردارنی سے کیف و سرور اٹھایا۔ اس کے علاوہ ہم نے جتنی کم سن لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ سرفراز ہوئے ان کے جسم خوب صورت، گداز اور پیش دینے والے تھے۔ اور پھر وہ سب کتنی گرم جوش اور خود پردگی سے مہربان ہوتی رہیں لیکن ان کی جسموں میں کیا ایک عجیب سی بو محسوس نہیں کی۔ ان میں خوشبو نہ تھی اور نہ بالوں میں۔“

”ہاں۔“..... گوتم ایک دم سا اچھل پڑا۔  
”لیکن میں نے اس لیے اہمیت نہیں دی کہ نشاط انگیز لمحات میں اس بات کا خیال نہیں رہتا ہے۔ میں نے بھی ایک عجیب اور تفر کر دینے والی بو محسوس کی..... جیسے جانوروں یا خون سے آئی ہے۔“  
”ایک عورت چاہے کئی دنوں سے نہایا ہوا نہ ہو..... میلے چیلے کپڑوں میں کیوں نہ ہو..... اس کے بدن سے خوشبو پھوٹی ضروری ہے۔“ گوپال نے کہا۔

”ہاں..... ہاں۔“ گوتم نے سر ہلایا۔ ”ایک عجیب سی کہانی..... شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ وہ نہائی نہیں ہوگی۔“

”کل کیا ہم نے کتنی ساری لڑکیوں اور عورتوں کو ندی میں فطری حالت میں نہاتے اور تیرتے نہیں دیکھا تھا۔“ گوپال بولا۔

”آج کی رات ہمیں ہر قیمت پر یہاں سے فرار ہونا ہی ہوتا ہے۔“ گوتم بولا۔ ”یہ حسین بلائیں ہیں۔ جادوگر نیاں معلوم ہوتی ہیں۔“

رات کے وقت گوتم نے پھر موقع پا کر سردارنی کی نظر بچا کر مشروب نالی میں بہا دیا۔

پھر جب وہ گھڑی بیت گئی تب سردارنی نے اسے گہری نیند پا کر خوب ہلا کر اپنی چلی کر لی۔ پھر دونوں آ گئی۔ پھر دونوں باہر چلی گئیں۔ کوئی نصف گھڑی بعد گوتم اٹھا اور دونوں کے مکان کی طرف چلا۔ اس نے دیکھا بستی سنسان اور ویران اور پراسرار حالت میں ہے۔ اس نے راستے کے دو ایک مکانوں میں جھانکا۔ ان میں کوئی نہ تھا۔ گوپال اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ پھر ان دونوں نے بستی کا اچھی طرح سے جائزہ لے لیا۔ ایک فرد بھی نہ تھا..... شکاری خوں خوار کتے جانے کیا کھا کر سو گئے تھے۔ پھر اچھی طرح سے اطمینان کرنے کے بعد دس بارہ خالی بوریاں سردارنی کے کمرے سے گوتم اٹھا لیا اور پھر ان دونوں نے ان آٹھ بوریوں میں زمین پر بٹھرے ہوئے خزانے کو بھر دیا۔ پھر چار چار بوریاں دو کشتیوں میں رکھ دیں وہ سینے میں ستر اُبور ہو رہے تھے۔ اس وقت آسمان کے سینے پر چاند مسکرا رہا تھا۔ وہ دونوں بہت خوش تھے کہ ایک تو میدان صاف ملا اور دوسرا خونی مقابلے سے نہا گئے۔ تیسری بات یہ تھی کہ انہوں نے اس بستی میں ہر عمر کی حسین، پرکشش بارہ برس کی عمر کی لڑکی اور تیس برس کی عورت..... سردارنی اور دونوں کے ساتھ جی بھر کے ایسے سیراب ہوئے تھے کہ اب کوئی حسرت باقی نہیں رہی تھی۔ ایسا عیش تو انہیں سپنوں میں بھی نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔

اس وقت پو پھٹ رہی تھی۔ وہ کنارے پہنچے تھے کہ ایک نرم اور میٹھی مردانہ آواز ان کے کانوں میں گونجی۔

”یار کو.....! رک جاؤ۔“

وہ دونوں یہ آواز سن کر ایک دم سے اچھل پڑے۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔

ایک بوڑھا شخص جس کے سر کے بال لمبے لمبے اور داڑھی بھی بہت لمبی تھی، کھنٹی کھنٹی بال دودھ کی طرح سفید تھے..... اس کی عمر سو برس سے زیادہ



دولت نے ان کی بھوک چھین لی ہے۔ اس بستی میں گولڑیاں عورتیں ہیں وہ بلا میں ہیں۔ چڑیلیں ہیں تم دونوں نے جس جس لڑکی کے ساتھ وقت گزارا انہوں نے تمہارا خون پیا ہے۔ اس طرح سے کہ تمہیں احساس تک نہ ہوا۔ نہ پتا چلا۔“

”کیا، کیا وہ حسین لڑکیاں عورتیں چڑیلیں ہیں۔“

”وہ اس وقت اس دیس کے دوسرے شہروں میں گئی ہوئی ہیں وہ خون پینے کے لیے ان کی ابھی کچھ دیر میں واپسی آنے والی ہیں۔ میں تمہیں ان کے اصلی اور گھٹاؤنے چہرے دکھاؤں گا۔“

”کیوں نہ ہم ان کی واپسی سے پہلے ہم یہاں سے یہ خزانہ لے کر نکل جائیں۔“ گوپال بولا۔

”یہ خزانہ پتھروں کا ہے۔ نظر کا فریب ہے۔ سارا کھیل ان بلاؤں نے جادو کا کھیل کھیل رکھا ہے جادو کے زور سے وہ حسین دکھائی دیتی ہیں۔“ وہ بولا۔

”تم دونوں ادھر اس درخت کے نیچے آ جاؤ۔ وہ تمام بلائیں اور مرد بدروہیں بھی آ رہی ہیں۔“

انہوں نے چاندنی میں انہیں دیکھا۔ اس قدر بد صورت، مکروہ اور گھٹاؤنے چہرے تھے کہ وہ کانپ گئے۔ بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئے۔

گوپال نے زمین پر سے ایک زمر داٹھا کر دیکھا۔ وہ پتھر نظر آ رہا تھا۔

”اب تم جاؤ۔ ایک بات یاد رکھو دنیا میں اصل دولت شہرت اور سکون ہے۔ تم دونوں نے نیکیاں نہیں کی ہوئی ہوئیں تو میں تمہیں ان بلاؤں سے بچانے نہیں آیا ہوتا اور تمہاری وہ کشتیاں ڈوب جاتیں جن میں تم نے خزانہ بھرا ہوا تھا اور موت سے ہم کنار ہو جاتے۔“

﴿.....﴾

ہی ہوگی۔ بڑے باوقار اور حکمت انداز سے کھڑا ہوا ان کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اس کے چہرے پر شفقت اور نرمی تھی۔

”ڈرو نہیں..... یہ بتاؤ کہ تم اتنی بے پناہ اور بے اندازہ دولت لے جا کر کیا کرو گے.....“

”ہم..... ہم اپنی زندگی اور مستقبل بنائیں گے..... زندگی سکون، اطمینان اور خوشی سے گزاریں گے۔“

”بچو..... زندگی کو خوشی، سکون اور مستقبل دولت سے نہیں..... یہ دولت موذی سانپ کی طرح ہے جو ہر کسی کو ڈس رہی ہے اس دولت نے انسان کی ساری خوشیاں چھین لیں..... دنیا میں آج کل جو بد امنی اور دہشت گردی ہے وہ صرف دولت کی وجہ سے ہے۔ سچی مسرت سادگی اور قناعت سے زندگی گزارنے میں ملتی ہے۔“

”آپ ہیں کون.....“ گوپال حیرت سے بولا۔

”ہم نے آپ کو کبھی اس بستی میں نہیں دیکھا..... کہاں سے گئے اور کس راستے سے آئے ہیں۔“

”میں اوتار ہوں..... میں تمہاری نیکیوں کا صلہ دینے آیا ہوں اور تمہیں بلاؤں سے بچانے آیا ہوں۔“

”میں نے کیا نیکی کی ہے۔“ گوتم نے پوچھا۔

”تم نے تین دنوں تک مین بھوکے آدمیوں کو کھانا کھلایا تھا۔ کسی بھوکے کو کھانا کھانا بہت بڑی نیکی ہے۔“

”میں نے کیا نیکی.....“

”تم نے اپنا خون دے کر دو زندگیاں بچائیں..... نیکی بھی ضائع نہیں جاتی.....“

”آپ اس نیکی کا کیا صلہ دے رہے ہیں۔“

”ایک مسئلہ تو یہ کہ..... یہ بتاؤں دنیا میں جتنے بھی دولت مند ہیں انہیں سچی خوشی اور سکون نہیں..... کوئی دل کا مریض ہے تو کوئی بلند پریش کا۔ وہ اچھے کھانے نہیں کھا سکتے پر ہیزی کھانے

# چراغ شب

ایم الیاس

وہ شخص جس کے پاس شہر کے زیادہ تر  
مصور آکر اپنے خونِ جگر سے تخلیق کیے  
ہوئے فن پارے فروخت کیا کرتے تھے، وہ جو  
اپنے فن پاروں کو اپنا لختِ جگر مانا کرتا تھا،  
حالات کی ستم ظریفی کے بعد ایک انتہائی  
قدم اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔

ایک آرٹسٹ کے عروج و زوال کی دلچسپ کہانی

سینے کی بوندیں کانپ سی رہی تھیں۔۔۔ اس کے سینے  
میں سانسوں کا زیر و بم جھکولے کھاتا ہوا پہچان خیز بنا  
رہا تھا۔

وہ شہزاد کو بڑی پریشان اور متوحش سی نظر آئی  
تھی۔۔۔ اس لمحے وہ شہزاد کو کسی بے بس بہری کی  
طرح نظر آئی جو چاروں طرف سے ناامید ہو کر اس  
کے کمرے میں پناہ لینے کے لیے آکھڑی ہو گئی ہو۔

شہزاد کو وہ کسی درد بھرے گیت کی طرح لگ  
رہی تھی اور اس کے دل کا غم اس کی بڑی بڑی آنکھوں  
میں اتن تا اتن کسی بدلی کی طرح چھایا ہوا تھا۔  
آنکھوں کی چمک بھی گہری اداسی میں ڈوب گئی تھی۔

بظاہر نہ تو مسکراہٹ اور نہ ہی اس کی پرچھائیں۔۔۔  
جیسے مسکراتا بھول گئی ہو۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی  
نے اس کی حسین مسکراہٹ ہمیشہ کے لیے اس  
طرح چھین لی ہو جس طرح عصمت چھین لی جانی  
ہے۔۔۔ اور پھر عورت تو مسکراہٹ کے بغیر کسی الم  
ناک نغمے کی طرح محسوس ہوتی ہے۔

شہزاد نے اس کی طرف حیرت اور سوالیہ نظروں  
سے دیکھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ  
نوجوان اور حسین لڑکی اس کے پاس کیوں آئی ہو  
گی۔۔۔ وہ خالی ہاتھ تھی۔ اس کے پاس کوئی تصویر

وہ کسی تیز آمدگی کی طرح اس انداز میں  
آئی تھی کہ جیسے وہ ہر چیز کو نہ صرف تاراج کر  
دے گی بلکہ ہنس لیں۔۔۔ اس نے دروازے پر  
دستک دینے کے بجائے بڑے زور سے دروازے کو  
اندروں کی طرف دھکا دیا تھا کہ جیسے توڑ دینا چاہتی ہو۔  
دروازہ ایک دھماکا کے ساتھ پورا اٹھ گیا تھا۔  
شہزاد آج اندر سے چھٹی لگانا بھول گیا تھا۔ پہلی  
مرتبہ تو ایسا ہوا تھا۔ وہ اس معاملے میں بڑھتا تھا۔  
اس نے چونک کر دیکھا۔ ایک لڑکی اس کے  
سامنے کھڑی ہوئی تھی۔۔۔ اسے ایسا لگا تھا کہ اس  
کی نظروں کے سامنے کوئٹہ سال کا ہو۔

چند لمحوں کے لیے اس کی آنکھیں چند ہی سی گئی  
تھیں۔۔۔ جب آنکھوں کے سامنے سے دھند چھٹی  
تو اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے ایک خوب  
صورت سا مجسمہ کھڑا ہوا ہے۔۔۔ وہ دل میں اس  
ترشیدہ مجسمے کو سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ اس شہابی  
چہرے کی دل کشی میں اس کے تیکھے تیکھے نقش و نگار  
بڑے سہل اور دل فریب تھے جو اس کے دل کے  
نہماں خانے میں نقش ہو کر رہ گئے۔

لڑکی کے چہرے پر ایک دھند سی غالب تھی اور  
انگاریوں کی طرح دھکتے چہرے کے طول و عرض پر

نہ تھی۔ جو اسے بیچنے کے لیے آئی ہو اور نہ ہی اس کی ظاہری حالت ایسی تھی کہ وہ کوئی تصویر خرید سکے۔ یہاں جو کوئی بھی آتا وہ تصویر بیچنے یا خریدنے کے لیے آتا تھا۔۔۔ وہ تو حسرت و افلاس کی ایک زندہ متحرک اور منہ بولتی تصویر تھی۔ شہزاد نے اس کے چہرے پر ایک اچھٹی سی نگاہ ڈال کر کہا۔

”فرمائیے۔۔۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔۔۔“ اس کے لہجے میں مٹھاس سی تھی۔

لڑکی نے میز پر رکھی ہوئی کرسی کی طرف بڑھ کر اس کی پشت کو تھام لیا۔ جیسے وہ اس کا سہارا نہ لیتی تو یقیناً گر پڑتی۔

”میں ایک تصویر بیچنا چاہتی ہوں۔“ اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

”تصویر کہاں ہے۔۔۔۔“ شہزاد نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا، شاید تصویر لائی ہوگی۔ لیکن اس کا کوئی وجود نہ تھا۔

”تصویر میرے گھر پر رکھی ہوئی ہے۔۔۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو میرے ساتھ گھر چل کر اسے دیکھ لیں۔“ اس نے لاجت سے التجا کی۔

”مگر وہ تصویر آپ اپنے ساتھ لے کر کیوں نہیں آئیں۔۔۔۔“ شہزاد کہنے لگا۔ ”بات یہ ہے کہ میرے لیے دفتر چھوڑ کر جانا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ لوگ آتے رہتے ہیں۔ میرے دفتر میں کوئی ملازم نہیں جو میری غیر حاضری میں ان سے بات کر سکے۔“

”اس لیے کہ میرے پاس پیسے نہیں تھے کہ اسے رکشا میں رکھ کر لے آئی۔۔۔ اور پھر میرا گھر یہاں سے اتنی دور ہے کہ تصویر اٹھائے پیدل نہیں آ سکتی تھی۔“ شہزاد اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”آپ کا گھر کہاں ہے۔۔۔؟“

”سرجانی ٹاؤن میں۔۔۔“ اس نے دوپٹے سے اپنی گردن اور چہرے پر جمی گرد کی مہین تہہ کو پونچھا۔

”سرجانی ٹاؤن میں۔۔۔؟“ شہزاد کے چہرے پر ترجم کے جذبات پیدا ہوئے۔ ”آپ سرجانی ٹاؤن سے گلشن اقبال پیدل آئی ہیں؟“

”ایک مجبوری تھی جو مجھے یہاں تک لے آئی۔۔۔۔“ سینہ آواز کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

”کیا آپ میرے ساتھ گھر تک چلیں گے۔۔۔ گیوں نہیں۔۔۔ ضرور چلوں گا۔“ وہ بولا۔

”کیا آپ کے والد بھائی میں سے کوئی یہاں تصویر لانے کے لیے تیار نہیں ہوا۔۔۔؟ حیرت کی بات ہے۔۔۔ انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ آپ اکیلی جا رہی ہیں اور وہ بھی پیدل۔“

”اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہوتا تو آج مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔“ اس کی آواز بھرا سی گئی۔

”اوہ۔۔۔!“ شہزاد کو بہت افسوس ہوا تھا۔ اس نے اپنائیت کے لیے بھی کہا۔ ”آپ اس بھری دنیا میں اکیلی ہیں؟“

”نہیں۔۔۔ میں اکیلی نہیں ہوں۔“ لڑکی نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ”میری ماں زندہ ہیں۔۔۔ وہی میری دنیا ہیں۔۔۔ میرا سہارا اور گھنا سایہ ہیں۔۔۔ میرا سب کچھ ہیں۔۔۔ بھائی بھی ہیں۔۔۔ باپ بھی۔۔۔ بہن اور کھیلی عزیز از جان بھی۔“

تھوڑی دیر کے بعد شہزاد اس لڑکی کے ساتھ اس کے گھر جا رہا تھا۔ اس نے ایک رکشا کر لیا تھا۔۔۔

رکشا اس کی ہدایت پر تیز رفتاری سے اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ لڑکی رکشا کے دوسرے کونے میں دیگی اور سمسٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔۔۔ کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔

اس کے چہرے پر اس کے دل کا درد جاگ رہا تھا۔ تیز ہوا سے اس کی زلفیں اس کی طرح پریشان ہو رہی تھیں۔ دوپٹا ہوا سے اڑا اڑا جا رہا تھا جس کا اسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ دیکھنے والوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا لیکن وہ نہیں اور کھوئی ہوئی سی تھی۔ خالوں میں کپکپی ہوئی اتنی دور چلی گئی تھی کہ دنیا و مافیہا کی خبریں

میں رہی تھی۔ اس کی جیل آنکھوں کی گہرائیوں میں  
 دکھ کا گہرا سمندر نظر آیا تھا۔۔۔ آخر اس لڑکی کو کون سا  
 دکھ ہے۔۔۔ آخر کس نے اسے حالات کے چہنم میں  
 جھونک دیا ہوگا۔ اس کے پاس بس کے پیسے تک نہیں  
 تھے۔۔۔ وہ میلوں پیدل چل کے اس کے پاس آئی  
 تھی۔

اس نے بڑے کرب سے سوچا۔۔۔ ہمارے  
 ملک کے فنکاروں کے لیے یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔ شہزاد  
 خود بھی ایک پایہ کا مصور تھا۔ اس کے وجود میں ایک  
 فن لیا ہوا تھا۔ اس نے یورپ کے طرز پر ایک  
 آرٹ گیلری اپنے گھر میں قائم کی ہوئی تھی۔ وہ مگنام  
 اور مفلوک الحال مصوروں سے تصویریں خرید کے اپنی  
 گیلری میں ان کی نمائش کرتا تھا۔ اس طرح ایک  
 طرف غریب مصوروں کی مالی اعانت ہو جاتی تھی اور  
 انہیں سہارا مل جاتا تھا اور وہ بھوکے نہیں مرتے تھے۔  
 مگر اس نے بھی ان مصوروں کی مجبوریوں سے  
 ناچار فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ وہ چاہتا تو ان کی مجبوریوں  
 سے بڑی آسانی سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ جیسا کہ اس  
 شہر میں بہت سارے دکان دار مجبور مصوروں کا  
 استحصال کر رہے تھے۔ اس کے مزاج میں کاروباری  
 بنیادیں، خود غرضی اور لوٹ کھسوٹ کا جذبہ نہیں تھا۔  
 اس کے برعکس اس کے وجود میں ایک فن کار کا  
 گہرا جذبہ سویا ہوا تھا۔ یہ جذبہ اتنا گہرا تھا کہ کوئی اس  
 کی گہرائی ناپ نہیں سکا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی  
 شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ شہر کے زیادہ تر  
 مصور اس کے پاس آ کر اپنے خون جگر سے تخلیق کیے  
 ہوئے فن پارے فروخت کرتے تھے۔ خریداروں کی  
 بڑی تعداد ملتی آتی رہتی تھی۔

فنون لطیفہ میں اعلیٰ گھرانوں کی لڑکیاں عورتیں  
 بھی دل چسپی لیتی تھیں۔ بطور فیشن اور نام و نمود کے  
 لیے بھی۔۔۔ وہ فیشن پرست تھیں۔ ان کے پاس کسی  
 چیز کی کمی نہ تھی۔ اور پھر ان کا کوئی کردار بھی نہ تھا۔  
 ”شہزاد صاحب۔۔۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس  
 تصویر پر جو آپ کا نام ہے اسے مٹا کے میرا نام لکھ

دیں۔۔۔“  
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔“ وہ حیرت سے  
 جواب دیتا۔ ”یہ میری خون جگر سے بنائی ہوئی تخلیق  
 ہے۔“

”میں اس کے لیے منہ مانگی رقم دے سکتی  
 ہوں۔“ لڑکی کاروباری لہجے میں کہا۔ ”دس  
 ہزار۔۔۔ بیس ہزار۔۔۔ چالیس۔۔۔“

”پلیز۔۔۔۔۔“ وہ درمیان میں کہتا۔ ”آپ دس  
 لاکھ بھی دیں مجھے منظور نہیں۔۔۔ کیا کوئی اپنا بچہ بیچتا  
 ہے؟“

اعلا اور اونچے طبقے کی نوجوان لڑکیوں، عورتوں  
 نے جو نئے ماڈل کی پیش قیمت گاڑیوں میں گھومتی  
 تھیں۔ ان کی بڑی سوشل لائف تھی اور ایسا بے جابانہ  
 لباس پہنتی تھیں کہ وہ بے لباس دکھائی دیتیں۔ انتہائی  
 ماڈرن۔ ان پر امریکی یورپی دوشیزاؤں کا دھوکا ہوتا  
 تھا۔ یہ وہ لڑکیاں، عورتیں تھیں جن کے نزدیک عزت  
 و آبرو کا کوئی تصور نہیں تھا۔ لڑکوں سے دوستی اور  
 آزادانہ میل جول میں آلودہ ہوتی رہتی تھیں۔ وہ نہ  
 صرف اپنی سہیلیوں بلکہ لڑکوں، مردوں کے ساتھ  
 ممنوعہ فلمیں بھی دیکھتی تھیں۔ وہ اپنے نام کی خاطر نہ  
 صرف بڑی رقم کی پیش کش کے ساتھ ساتھ خود کو  
 مہربان کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن شہزاد پران کی رقم اور ان  
 کی نوجوانی اور حسن و شباب کا جادو نہ چل سکا۔ وہ  
 اپنے آپ کو آلودہ ہونے سے بال بال بچائے رکھا  
 اور ان سے اس طرح دور بھاگتا تھا جیسے یہ خوب  
 صورت چڑھیلیں ہوں۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو شو بزنس  
 میں بہت کچھ پانے کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر رہی  
 رہتی تھیں کیوں کہ اس کے بغیر نہ تو انہیں ٹی وی،  
 ڈراموں میں چانس ملتا اور نہ کمرشل ملتے تھے۔۔۔  
 بار اور تیرہ برس کی لڑکیاں بھی شہرت اور پیسے کے لیے  
 اپنا سب کچھ بیچ دیتی تھیں۔ والدین اور بھائی بہنیں  
 بھی انہیں پروڈیوسروں کے پاس لے جاتے  
 تھے۔۔۔ اسی طرح مصوری کا لیبل بکتا تھا۔ بہت  
 سے مصوران سے ہر طرح فائدہ اٹھاتے تھے۔ جن

لڑکیوں اور عورتوں کی آرٹس کونسل میں تصویروں کی نمائش اپنی تھیں۔ وہ فیاض سے مہربان ہونے پر ان کا نام تصویروں پر ہوتا تھا۔

لڑکی نے کھربچہ کر اسے دروازے پر کھڑا کیا اور بڑی سادگیت سے کہا۔

”میں ابھی آئی ہوں، پلیز۔۔۔! کچھ خیال مت کیجئے گا۔“ پھر وہ اندر چلی گئی۔

پھر وہ چند لمحوں کے بعد دروازے پر نمودار ہوئی۔ پھر اس نے دروازہ اتنا کھول دیا کہ ایک طرف ہٹ کر ٹھنڈا ہوا راستہ دے سکے۔ پھر اسے راستہ دیا تو شہزاد اندر داخل ہوا۔ لڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ایک سوئدھی سوئدھی خوشبو کی مہک نے، جہل لڑکی کے بدن سے پھوٹ رہی تھی اسے معطر کر دیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید اسے خود پر قابو پانا مشکل ہوتا اور بہک جاتا۔ لڑکی نے اس کے اندر آنے کے بعد دروازہ بھیڑ دیا۔

لڑکی جو اس کے پاس آئی تھی اس کی شہرت سے متاثر ہو کر۔۔۔ وہ اپنی کوئی تصویر مفلسی اور غربت کی وجہ سے بچتا چاہتی تھی اور وہ کسی ان جانے احساس کے بغیر اس کے ساتھ ساتھ کشاں کشاں چلا آیا تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ آنے کی ایک دوسری وجہ یہ تھی تھی کہ اس کی زندگی میں یہ پہلی لڑکی تھی جس کی موٹی صورت اور دل کشی اور سنسنی خیز سراپا اس کے دل پر نقش ہوئے رہ گیا تھا۔ وہ خیالوں میں اس کا پیکر تراشتا رہا تھا۔

”آئیے۔۔۔“ لڑکی نے ایک قدم آگے بڑھ کے بڑے اس لیے میں کہا اور اسے ساتھ لے کے ایک چھوٹے سے کمرے کی دہلیز پر لے آئی۔ دن کی روشنی میں کمرے انگ دتا رہ گیا تھا۔ شاید ہوا بھی ادھر کا رخ نہیں کرتی تھی۔ اس کنبجے اندھیرے میں ہی اس کا حسن نمایاں تھا۔

”تمہیں سے بچلی کا بل نہیں بھرا تو بچلی کاٹ دی گئی۔“ لڑکی نے بڑے سپاٹ لیے میں صاف گوئی سے بتایا تھا۔

معا اس کی نظر لڑکی کے دائیں ہاتھ پر پڑی تو دیکھا اس کے اس ہاتھ میں ماچس اور موم بتی چبھی تھی۔ لڑکی نے کمرے میں داخل ہو کے دیا سلائی موم بتی کو دکھائی دی تو پہلے دیا سلائی اور پھر موم بتی کی زرد روشنی نے کمرے کی گھب تاریکی کا سینہ چیر دیا۔ کمرہ خالی روشن ہو گیا تھا۔ وہ موم بتی تمام کے اس چارٹ مرلج تصویر کے سامنے کھڑی ہو گئی جو ایک لکڑی کے خوب صورت اور عمدہ فریم میں آویزاں تھی۔ اس تصویر میں ایک خوب صورت جوان بھکارن، ایک شیرخوار بچے کو (جو بھوک سے بلبلاتا نظر آتا تھا) سینے سے لگائے کھڑی تھی۔ بھکارن کے چہرے پر بڑا ہی اذیت ناک کرب چھایا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے جو صاف شفاف موتی کی طرح دکھ رہے تھے اور دوسری اس کے رخساروں پر ڈھلکنے والے تھے۔ عورت خوب صورت تھی بچہ بھی ماں سے خوب صورت تھا۔

اس کمرے میں یہی ایک اکلوتی تصویر تھی۔ موم بتی کی زرد روشنی کا بال اس تصویر پر پڑا تھا۔ شہزاد اس تصویر کو دیکھتے ہی چونک پڑا تھا۔ فن مصوری کے ایسے نادر شاہکار دیکھنے میں نہیں آتے تھے۔ ایسے شاہکار تو صدیوں میں تخلیق ہوتے تھے۔ کرب و اذیت اور موت کے دکھ درد کی جو عکاسی کی گئی تھی وہ ایک مصور کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے تصویر کے قریب ہو کے اور جھک کے تصویر کے کونے میں مصور کے دستخط دیکھے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

یہ شاہکار ذکیہ خانم کا تھا۔ اس کی نظر میں ذکیہ خانم ایک عظیم فنکارہ تھی۔ ایسے فنکار بار بار پیدا نہیں ہوتے تھے۔ اس نے کئی سال پہلے آرٹ کونسل میں ذکیہ خانم کے تصویروں کی نمائش دیکھی تھی۔ وہ اپنی تصویروں سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس نے اس موضوع پر ذکیہ خانم سے خاصی دیر تک فن کے موضوع پر باتیں بھی کی تھیں۔ ذکیہ خانم کی شخصیت نے اسے بے حد متاثر کیا تھا اور وہ ایک طرح سے وہ بھی اس

مے مداحوں میں ہو گیا تھا۔ وہ نہ صرف ایک عظیم فن کارہ بلکہ ایک عظیم عورت بھی تھی۔ اسے آج بھی وہ لمحات اس طرح یاد تھے جیسے کل کی بات ہو۔ مصوری کے دولت مند شائقین ذکیہ خانم کی تصویروں کو خریدنا چاہتے تھے مگر ذکیہ خانم نے ان تصویروں کو بیچنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ان کے اس انکار سے ان لوگوں کا اشتیاق اور بڑھ گیا تھا۔ جب ان لوگوں نے ذکیہ خانم کو بے حد مجبور کیا تھا اور بے حد اصرار کیا تو وہ بولی تھیں

”یہ ساری تصویریں میرے بچے ہیں۔۔۔ کیا کوئی ماں اپنے بچوں کو بیچ بھی سکتی ہے۔۔۔؟“

”کیا یہ تصویر آپ کے والد یا کسی عزیز نے خریدی تھی؟“ لڑکی سے اس نے پوچھا۔

”جی نہیں۔۔۔ یہ تصویر خریدی ہوئی نہیں بلکہ میری امی کی بنائی ہوئی تصویر ہے۔“

”ذکیہ خانم آپ کی امی ہیں؟“ شہزاد نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ ساکت پلکوں اور منہ آ نکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور سر ہلا دیا۔

”ان کی اور تصویریں کہاں ہیں۔“ شہزاد نے گھوم کے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ”مجھے یاد ہے کہ برسوں پہلے میں نے آرٹس کونسل میں ان کی تصویروں کی نمائش میں بہت ساری شاہکار تصویریں دیکھی تھیں۔“

”ان کی ساری تصویریں ایک ایک کر کے بیچ دی گئیں۔“ لڑکی کے سینے میں آواز اٹک گئی تھی۔ اس کی آنکھیں پر غم ہو گئیں۔

”کیا ایک ماں اپنے بچوں کو بیچ دیتی ہے۔۔۔؟“ اس نے کہا۔ اسے ذکیہ خانم کی اس دن کی بات یاد آ گئی تھی۔

”ماں نے نہیں۔۔۔ بلکہ میں نے اپنی ماں کے ان بچوں کو بیچ دیا جو انہوں نے خونِ جگر سے نکلتے کیے تھے۔“

”وہ کس لیے۔۔۔؟ آخر اس کی کیا ضرورت

تھی ماں کی متاثرہ بازار بیچنے کی۔۔۔؟“

”آپ میرے ساتھ آئیے میں آپ کو بتاتی ہوں کہ میں نے ایک ماں کی متاکیوں بیچ دی ہے۔“ لڑکی نے سر دباٹ لہجے میں کہا۔

شہزاد اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ اسے لے کے ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئی۔ شہزاد نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا اسے سنا دینے والا بجلی کا سا جھٹکا لگا۔ وہاں چار پانی پر ذکیہ خانم ویران کھنڈر کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ بیماری نے تو انہیں دیمک کی طرح اندر ہی اندر سے چاٹ لیا تھا۔ انہیں دیکھ کے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ملک کی عظیم مصورہ ذکیہ خانم ہیں۔ وہ منہ کھولے بستر پر پڑی تھیں۔ ان کے جسم کا گوشت سوکھ گیا تھا۔ جس میں سانس نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ بس اب وہ ہڈیوں کا بیجر تھیں۔ کمرے میں دو آؤں کی بو بکسی ہوئی تھی۔۔۔ کمرے میں میز پر دو آؤں کی کتنی ساری شیشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کمرے صاف ستھرا روشن تھا مگر جا بجا چیزوں سے بھرا پڑا ہوا تھا۔ کمرے کی ہر چیز پر مردنی چھائی ہوئی تھی جو کسی خنجر کی ٹوک کی طرح اسے اپنے دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ذکیہ خانم اس حالت میں ہو سکتی ہیں۔

اس نے ذکیہ خانم سے بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اب تو وہ کسی کی بات سننے اور کہنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ اسے یقین نہیں آیا وقت اور حالات نے ایک عظیم مصورہ کو معذور اور اپنا بیچنا دیا ہے۔

وہ چند لمحوں کے بعد شہزاد کو پہلے والے کمرے میں لے آئی جہاں تصویر تھی۔

”آپ نے میری امی اور ان کی حالت دیکھ لی نا۔“ اس کا لہجہ سیاٹ تھا۔ ”ان کی صحت یابی کے لیے میں ان کے ایک ایک بچے کو بیچتی رہی ہوں۔۔۔ بس اب یہ ان کا آخری بچہ بچا ہوا ہے۔ اس کے بعد بیچنے کے لیے کچھ نہیں رہ جاتا ہے۔۔۔ اس بچے کو بیچنے کے بعد کتنی رقم ملے گی اور کتنے دن حلقے کی مجھے نہیں معلوم۔۔۔ اس رقم کے ختم ہو جانے کے بعد مجھے کیا

کرنا ہوگا۔۔۔ اور کیا کچھ بچنا ہوگا۔۔۔ یہ میں بعد میں ہی سوچوں گی۔۔۔ کیوں کہ ماں کی دوائیں بہت ضروری ہیں۔ شاید فاقوں کی نوبت آجائے۔ یہ بتائیے کہ آپ اس بچے کی کیا قیمت لگا رہے ہیں؟“

شہزاد نے اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس تصویر کو خرید نہیں سکتا ہوں۔ اس شاہکار کی کوئی۔۔۔“ وہ درمیان میں اس کی بات کاٹ کے بولی۔ ”آپ اس تصویر کی جو قیمت دینا چاہتے ہیں دے دیں۔ میں کوئی مول تول نہیں کروں گی۔“

”میں تصویروں کی خریداری میں کوئی مول تول نہیں کرتا ہوں کیوں کہ میں کوئی کاروباری نہیں ہوں۔ یہ تصویروں کی اصل قیمت۔۔۔“ لڑکی نے پھر تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ”آپ پانچ سو روپے تو دے سکتے ہیں؟“

”پانچ سو روپے۔۔۔؟“ شہزاد کو اپنی ساعت پر یقین نہیں آیا۔ کہیں یہ اس کا وہم تو نہیں ہے! لیکن لڑکی نے صرف پانچ سو روپے ہی کہا تھا۔ لڑکی کی ضرورت اور مجبوری ایسی تھی کہ وہ تصویر کو کوڑیوں کے مول بیچنے پر بھی تیار تھی۔ جیسی اس کے دل کے کسی کونے میں ایک آوارہ سا خیال آیا کہ۔۔۔ کیوں نہ وہ تصویر کو پانچ سو روپے میں خرید کے دو لاکھ روپے میں فروخت کر دے۔۔۔ دولت مند شائقین اس تصویر کے دو تین لاکھ یا آسانی دے سکتے تھے۔ اس شہر میں تصویروں کے قدردانوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ کچھ لوگ تو ایسے نادر شاہکار کوڑیوں کے مول خرید کے یورپ لے جا کے بیچ دیتے تھے جہاں انہیں بے پناہ منافع مل جاتا تھا۔ دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں تھا جہاں تصویروں کا کاروبار نہ ہوتا ہو۔ اس کے شائقین اور قدردان موجود نہ ہوں۔ اس کاروبار میں لوگ راتوں رات امیر کبیر بن جاتے تھے۔

اس نے اپنے کاروباری خیال کو اس طرح جھٹک دیا جیسے کوئی کن مجبور رہا ہو۔ اس لیے کہ وہ بالآخر ایک فن کار تھا۔ اس کی اپنی

کتنی شاہکار تصویریں گھروں کی نشست گاہوں، ہولوں اور دفاتروں میں زینت بنی ہوئی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک ایک تصویر کی تخلیق کے لیے کیسا پتا مارنا پڑتا ہے۔ خون جلا نا پڑتا ہے۔۔۔ تب کہیں جا کے تخلیق ختم ہوتی ہے۔

پھر اس نے جیب سے بٹوا نکال کے اس میں دو ہزار کی رقم نکال کے اس کی طرف بڑھائی۔ ”یہ لیجئے۔“

لڑکی نے رقم گنی اور پھر اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ ”یہ تو دو ہزار روپے ہیں۔“

”جی ہاں۔“ شہزاد نے جواب دیا۔ ”یہ بیٹگی رقم ہے۔۔۔ میں اس شاہکار کو فروخت کے لیے اپنی دکان پر رکھوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ اس شاہکار کی جو اصل قیمت مل جائے۔ اس کی جو بھی بڑی سے بڑی قیمت ملے گی وہ آپ کی نذر ہوگی۔ اس لیے کہ میں اس بچے کو کوڑیوں کے مول خرید کے ممتا کی تذلیل کرنا نہیں چاہتا ہوں۔“

”جی۔“ لڑکی کی خوب صورت بڑی بڑی آنکھیں بے اختیار چمک پڑیں۔

☆☆☆

کوئی ایک مہینے بعد ذکیہ خانم کی بیٹی عطیہ اس کی زندگی میں بہار کے ایک جھونکے کی طرح آ گئی۔ ذکیہ خانم کی موت کے بعد اس نے عطیہ سے شادی کر لی تھی۔ وہ عطیہ کو پاکے اس طرح سے خوش تھا جیسے اس نے کوئی انمول اور نایاب ہیرا پایا ہو۔ اس کی زندگی میں جو خلا تھا اسے عطیہ نے پر کر دیا تھا۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ عطیہ اتنی بہترین ہم سفر ثابت ہوگی۔

محبت کا ایک دروازہ کیا کھلا خوش قسمتی کے در ایک ایک کر کے کھلتے گئے۔۔۔ اس کے دوست احباب اور ملنے والے ان کی بے مثال محبت پر رشک کرتے تھے۔ شہزاد سے کہتے تھے کہ تم دنیا کے خوش نصیب ترین آدمی ہو جو ہمیں دنیا کی حسین ترین عورت ملی۔ قدرت کے آرٹ شاہکار جس کی جتنی

لا رہا کی جائے کم ہے۔

ان کی زندگی کا سفر جاری تھا اور لوگوں کی نظر میں ان کی ان کو نظر لگ گئی۔

وہ سڑک پار کرتے ہوئے کار کے حادثے کی غلطی اس کی نہیں تھی۔

ہوا یہ تھا کہ ایک کار جس کے بریک فیل ہو گئے تھے وہ اس کی زد میں آ گیا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور ڈاکٹروں کی عدم توجہی اور غفلت کی وجہ سے زخم میں زہر پھیل گیا۔ اس کا صرف ایک علاج تھا کہ ٹانگ کاٹ دی جائے۔ وہ معذور ہو کے رہ گیا۔ اسے مکمل طور پر صحت مند ہو کے بیساکھیوں کے سہارے چلنے کے لیے ایک دو ماہ کا عرصہ درکار تھا۔

شہزاد کے علاج معالجے پر رقم پانی کی طرح بہہ گئی تھی کیوں کہ اسپتال ایک مذبح خانہ کی طرح ہوتا ہے۔ ڈاکٹر تو قصاب سے کہیں زیادہ سفاک اور درندہ صفت ہوتے ہیں۔ جو مریض اسپتال میں داخل ہوتا ہے اس کے گلے پر آہستہ آہستہ چھری پھیرتے ہیں اور ایک ایک قطرہ خون کا پنجوڑے کے بدرجوں کی طرح پی جاتے ہیں۔ ایک قطرہ خون بھی رہنے نہیں دیتے ہیں۔ ٹیسٹ کے بہانے ان سے ہزاروں کی رقم لوٹ لی جاتی ہے۔ دوسری طرف انسانیت کا دعوا کرتے ہیں۔ میڈیا کو جو انٹرویو دیتے ہیں اس میں خوب جھوٹ بولتے، سنسنے والوں کو فریب دیتے اور جھوٹ بولتے ہیں۔

ادھر کاروبار بھی متاثر ہو رہا تھا۔ غریب عطیہ کیا کرتی۔۔۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ یہ ڈاکٹر لٹیرے، رجزن اور چور ہوتے ہیں۔ انیس آٹے میں نمک کے برابر بھی ادا نہیں کرتے ہیں۔۔۔ مریضوں کو لوٹ کے انیس نہ ادا کر کے لاکھوں کروڑوں کماتے ہیں۔ جدید ترین اسپتال اور کمپلیکس بناتے ہیں۔۔۔ سال میں دوسرے گاڑیاں بدلتے ہیں۔۔۔ ان کی اولادیں جو حرام کمائی سے ڈاکٹر بن جاتی ہیں۔ ان کے دل بھی پھر ہوتے ہیں۔۔۔ انہیں صرف اور صرف پیسہ

چاہیے۔ ان کا ایمان پیسہ۔۔۔ خدا۔۔۔ مذہب ہوتا ہے۔۔۔ خیر کیا ہوتا ہے وہ جانتے نہیں ہیں۔۔۔ کیوں کہ وہ بے ضمیر ہوتے ہیں۔۔۔ ایک روز اس نے سرجن ڈاکٹر سے کہا۔ ”سر! میں دو ماہ سے آپ کے اسپتال میں اپنے شوہر کا علاج کروا رہی ہوں۔ آپ کی وجہ سے کیس بگڑ گیا۔ پھر آپ نے دوبارہ اس کیس کو لیا اور اس کے نام اخراجات بشمول ٹیسٹ وغیرہ مجھ سے ہی وصول کئے۔ مجھے اپنی ماں کا مکان فروخت کرنا پڑا اور آپ لوگ ہر سال عمرہ اور حج وغیرہ پر بھی جاتے ہیں۔۔۔ آپ کے دوا اسپتال زیر تعمیر ہیں۔ اللہ آپ کو خوب نواز رہا ہے۔۔۔ آپ کے اکاونٹنٹ فرما رہے ہیں کہ میں پچاس ہزار روپے جمع کرواؤں ورنہ مریض کو لے کر جائیں۔۔۔ اب تو ہمارے پاس گزارہ کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔“

عطیہ نے ڈاکٹر کو لاؤنچ میں روک کے کہا تھا۔۔۔ ڈاکٹر کو ایسا لگا تھا کہ عطیہ نے اسے سرعام جوتے مارے ہوں۔ سب کے سامنے جوتے مارے ہوں۔۔۔ وہاں مریضوں کے لواحقین کھڑے سن رہے تھے۔ لیکن ڈاکٹر پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔۔۔ کیوں کہ وہ بے شرم اور بے غیرت تھا۔ نادام اور شرمسار ہونے کے بجائے رعوت سے بولا۔

”یہ خیراتی اسپتال نہیں ہے۔۔۔ کیس میری وجہ سے خراب نہیں ہوا ہے۔ زخم ہی ایسا تھا۔ آپ رقم جمع کرادیں یا مریض کو لے جائیں۔۔۔ میں ایک روپے کی بھی رعایت نہیں کر سکتا۔۔۔ آپ چوں کہ ایک خاتون اور ایک آرٹسٹ کی اہلیہ ہیں اس لیے آپ کی بکواس سن لی۔ آپ نے میری توہین کی ہے اور ذلیل بھی کیا ہے۔“

یہ سچ ہے کہ خدا کی لالچی بے آواز ہوتی ہے۔ عطیہ شہزاد کو اسپتال سے ڈسچارج کروا کے لے آئی تھی۔

اس کے بعد دو واقعات پیش آئے۔ اس کے تیسرے دن اس ڈاکٹر کے بیٹے کے ایک اسپتال کا افتتاح ہونے والا تھا۔ جو انتہائی جدید ترین اور غیر ملکی



اندر ہی اندر خوشی منا رہا تھا کہ قدرت نے آپ سے بھی ایک اور عبرت کا انتقام لیا۔ آپ یہ سوچیں کہ آپ نے ہماری بددعا میں لے کے کیا پایا، کیا کھو یا۔ آپ کبھی بھی خوش نہیں رہیں گے۔ آپیں آپ کو زہریلے سانپوں کی طرح ڈستی رہیں گی۔

☆☆☆

عطیہ نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ حالات سے لڑنا جانتی تھی۔ اس میں ایک عزم اور حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ شہزاد کی بیساکھی بن گئی تھی۔ اس نے گراؤ نہ فلور پر رہائش اور اوپر آرٹ گیلری قائم کر دی تھی۔ کوئی تصویر کی خرید و فروخت کے لیے آتا تو عطیہ نے نیچے بیچ کر اس سے صلاح مشورہ کرنی۔ تفصیل بتاتی، کہوں کہ اسے کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ عطیہ کی دلچسپی اور توجہ سے کاروبار پھر سے جنم لگا۔

انہی دنوں شیرازی بھی آیا اور نوآموز آرٹسٹوں کی تصویریں خرید کے لیے گیا۔ اس روز سے شیرازی کی آمد و رفت بڑھتی گئی تھی۔ شیرازی نہ صرف دولت مند شخص تھا بلکہ خوش پوش، وجہہ اور اسماٹ بھی تھا اور نفیس ذوق کا مالک بھی تھا۔ شیرازی نے دو ایک بار تصویریں خریدی تھیں وہ بے حد معمولی سی تصویریں تھیں۔ شیرازی عام تصویریں خریدنے کا سرے سے ہی قائل نہ تھا مگر اس نے یہ تصویریں خرید کے اسے شدید حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ شیرازی کی آمد و رفت بڑھنے لگی اور وہ عام سی تصویریں خرید کے لے جانے لگا تو شیراز کا شک و شبہ یقین میں بدل گیا کہ شیرازی یہ سب کچھ اس کی حسین بیوی کے قریب آنے کے لیے کر رہا ہے۔ اس لیے بھی کہ اس کی بیوی عطیہ نہ صرف نہایت حسین اور پر شاب گداز بدن کی ہے بلکہ عطیہ کی دل فریب جوانی مردوں کو پہلی ہی نظر میں متوجہ کر سکتی ہے۔ اس کا دل کش اور ہیجان خیز سراپا آنکھوں کو متوجہ کرتا ہے اور پھر چہرے اور متناسب جسم کے باعث وہ سولہ برس کی کنواری

ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ یہ اسپتال اس کے باپ نے ایک سال کے اندر ایک لیرے کی طرح لوٹ کھسوٹ کے بنایا تھا۔ وہ لاپٹی گاڑی میں اپنی ماں ڈاکٹر اور بڑی بہن لیزی ڈاکٹر کو اسپتال میں لا رہا تھا کیوں کہ اس اسپتال کا افتتاح تھا جس میں وزارا اور اراکین اسمبلی کی بھی شرکت تھی۔ وزیر اعلا اس کا افتتاح کرنے والے تھے۔ راستے میں ایک ڈمپر نے (جس کا ڈرائیور نشے میں تھا) اس گاڑی کو مار کے چل دیا تھا۔ موقع پر جوان بیٹا ہلاک۔۔۔ ماں اور بہن شدید زخمی ہو گئیں لیکن وہ معذور اور اپانچ ہو گئیں۔

دوسرا واقعہ یہ تھا کہ اس اسپتال کے کچن میں گیس کے چولہے میں بج جھوٹی۔ ایک ملازم نے گزرتے ہوئے سگریٹ کچن میں پھینکی تو ایک زبردست دھماکا ہوا۔ اسپتال میں آگ لگ گئی۔ اسپتال کی عمارت کا نصف حصہ اور جدید ساز و سامان آگ کی لیپٹ میں آ گیا۔

عطیہ نے ان دونوں حادثوں کے بعد ڈاکٹر کو ایک خط لکھا۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ نے دیکھ لیا۔۔۔ خدا کی لاشی بے آواز ہوئی ہے۔۔۔ متاثرین مریضوں کی آپیں اور بددعائیں تھیں جس نے آپ کو ایک نہیں دو الم ناک حادثوں سے دوچار کیا۔۔۔ آپ کی فرعونیت اور ظالمانہ رویہ کا یہ صلہ ہے۔۔۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔۔۔ آپ نے نہ صرف میرا بلکہ نہ جانے کتنے مریضوں کا دل جلایا اس نے آپ کا دل اور اسپتال جلایا۔۔۔ اور پھر میں نے اسپتال میں اسٹاف سے سنا کہ آپ انہیں علاج معالجے کی کوئی سہولت نہیں دیتے ہیں اور تنخواہ بھی آٹے میں نمک کے برابر۔۔۔ آپ عم زدہ تھے اور اسٹاف

۱۱ فیروز لکھی تھی۔

اس روز سے وہ عطیہ کی حرکات و سکنات کا غور سے جائزہ لینے لگا تھا۔

اس نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا تھا کہ عطیہ بھی تیزی سے شیرازی کی طرف جھکتی جا رہی تھی اور مائل ہونے لگی ہے۔ وہ شیرازی کے آنے سے کچھ دیر پہلے خوب سچ دھج کے اسے ساتھ لے کے اوپر چلی جاتی تھی۔ جب شیرازی آتا ہے تو اس سے خوب گل مل کے باتیں کرتی ہے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے درمیان کوئی دیوار، رکاوٹ اور جھجک نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے بھی کہ ان دونوں کے سوا وہاں کوئی اور نہیں ہوتا ہے۔ تنہائی شاید انہیں بہکا دیتی ہوگی۔۔۔ اس کے دل کے کسی کونے میں شک کا ذہریلا سانپ کنڈلی مار کے بیٹھ جاتا تھا۔ وہ چشم تصور میں دیکھتا تھا کہ شیرازی اس تنہائی سے خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔ والہانہ پن اور وارفتگی سے عطیہ کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔۔۔ عطیہ خود سرورگی سے من مانیاں کرنے دیتی ہے۔۔۔ پھر دونوں بکھتے چپکتے اور۔۔۔ اور ان جانے راستے پر چلے جاتے ہیں۔۔۔ اس لیے بھی شیرازی کسی تصوراتی محبوب سے کم نہیں ہے کہ شیرازی جس طرح سے عطیہ کو خوش کرتا ہوگا وہ معذور ہونے کا سبب نہیں کر سکتا۔۔۔ گو کہ عطیہ اس پر بڑی فیاضی سے مہربان تو ہوتی ہے۔۔۔ لیکن شہزاد کا خیال تھا کہ وہ صرف اداکاری ہے تاکہ اسے شک نہ ہو جائے کہ وہ شیرازی سے ہر طرح سے پیش آتی ہے۔ عورت سے بڑی ریاکار اور اداکارہ کوئی نہیں ہے۔۔۔ یہ سب کچھ سوچ اور چشم تصور میں ان دونوں کو غلاظت کی دلدل میں دیکھ کے دل موس کے رہ جاتا۔

اسے اپنی بے بسی، معذوری اور بے چارگی پر نہ صرف غصہ آتا بلکہ احساس محرومی بڑھ جاتی۔۔۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ عطیہ کے رحم و کرم پر تھا۔ اس احساس سے کڑھتا بھی تھا کہ کہاں جائے۔ اس دنیا میں اس کا کوئی ایسا نہیں تھا کہ جو اسے سہارا

دے سکے۔۔۔ وہ کاغذ قلم لے کے خاکے بناتا تھا۔ جب عطیہ گھر پر نہیں ہوتی اور سودا سلف لانے بازار جاتی تو وہ عطیہ کے بے پردہ خاکے بناتا۔۔۔ بستر پر آدمی ترچھی اور ٹیڑھی کے علاوہ ہیجان خیز زاویے۔۔۔ یا پھر کسی تصوراتی لڑکی یا عورت کے۔۔۔ جانے وہ کیوں ایسا کرتا ہے۔۔۔ اس بات کو سمجھنے سے وہ خود قاصر تھا۔۔۔ کبھی بھی اس کے آلودہ خاکے بنا کے اس کے چہرے اور جسم پر تھوکتا۔۔۔ پھر وہ کاغذ کے پرزے پرزے کر کے کھڑکی سے گلی میں پھینک دیتا۔

شیرازی کو وہ رخصت کرنے دروازے تک آتی تھی۔ جب وہ شیرازی کے جانے کے بعد اس کے پاس آتی تو وہ غیر محسوس انداز سے تنقیدی نظر سے پہلے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا۔۔۔ شاید شیرازی نے اسے دیوبچ کے اس کے ہونٹوں کی مٹھاس اے لیبوں میں تو جذب نہیں کی۔۔۔ لیکن لب اسٹک ٹی تہ جوں کی توں ہوتی تھی۔۔۔ ایسا نہیں لگتا تھا کہ اس نے پھر نفاست سے جمالی ہو۔۔۔ وہ چھپ کے شیرازی کا چہرہ بھی دیکھ لیتا تھا۔ کیوں کہ من مانی کرنے کی صورت میں لب اسٹک کا وجود کہیں نہ کہیں ضرور آ جائے گا۔

پھر وہ عطیہ کے گلابی رخساروں کو بھی دیکھتا تھا۔۔۔ اس کے طول و عرض پر ایسا کوئی سرخ نشان نہیں ہوتا تھا جو چمھر کاٹنے اور ایک مرد کے جذباتی اور ہیجان کی کیفیت میں ابھر آتا تھا۔۔۔ اس کے رخسار صاف شفاف آئینے کی طرح چمکنے لگتے۔ اس پر لکیر تک نظر نہیں آتی۔ بال بھی بے ترتیب نہ ہوتے جو شیرازی کی حرکت کا ثبوت ہوتے۔

پھر وہ اسے اوپر سے نیچے تک اس کا لباس دیکھتا تھا کہ شاید جذباتی کیفیت میں بے ترتیب ہو گیا ہو۔ لیکن عطیہ کی بددیانتی اور ہرجائی کی بات ظاہر نہ ہوتی تھی۔ وہ اس تاک میں ہوتا تھا کہ اسے عطیہ کا ہرجائی پن کا ثبوت تو ملے۔

وہ بستر پر دراز ہو کے اس طرح لوٹا رہتا تھا

جیسے انگاروں پر لوٹ رہا ہو۔

عطیہ کی مستحکم ہنسی جو سات سروں کی طرح ہوتی تھی۔۔۔ سرگوشیوں کی بعض جھنکاہٹ۔۔۔ مترنم قہقہے جو قہقہوں کی طرح ہوتے تھے اس کے کانوں میں گرم گرم سیدہ بن کے پھل جاتے تھے۔ وہ خون کے ٹھونڈے سے رہ جاتا۔ کربھی کیا سکتا تھا۔

عطیہ شاید محسوس کرنے لگی تھی کہ اسے شیرازی کی آمد و رفت کا گوارہ لگتی ہے۔۔۔ اوپر جانا نہ ہر۔۔۔ وہ اس کے شک کے سانپ کا سر کچلنے کے لیے رات جب شہزاد بستر پر دراز ہونے کے لیے چلا جاتا تو وہ غسل خانے میں ٹھس جاتی۔ بڑی آزادی سے دیر تک نہاتی جس سے سارے دن کی تھکن اور کسل مندی دور ہو جاتی۔ بدن میں جستی، تروتازگی اور فرحت سی اتر جاتی۔۔۔ نہانے میں اسے بڑی لذت سی محسوس ہوتی تھی۔ انگ انگ سے مستی اعلیٰ پڑتی اور بدن کی شاد اہمیاں رعنائیاں بن جاتی تھیں۔ وہ غسل خانے سے ایک کونے میں جو قد آدم آئینہ تھا اس کے سامنے کھڑے ہو کے بدن اور بالوں کو خشک کرتی۔۔۔ شب خونی کا لباس کھوئی سے نکال کے پہنتی جو شہزاد نے اس کی گزشتہ سال گرہ پر لاکے تحفے میں دیا تھا۔ پھر اس میں سے اس کا بدن اس طرح چمکتا جیسے کانچ کی صراحی میں شراب چھلکتی ہے۔ وہ اپنے جسم پر نہ تو کوئی خوشبو کا اسپرے کرتی نہ لوشن لگاتی۔

شہزاد اس سے کہتا تھا کہ وہ کسی خوشبو کی محتاج نہیں ہے بلکہ خود ایسی خوشبو ہے جو نہ صرف دل و دماغ معطر کر دیتی ہے بلکہ سارے جسم میں خون کی حرارت تیز ہو جاتی ہے اور سارے بدن میں خون رقص کرنے لگتا ہے۔ جب وہ بستر پر اس عالم میں جاتی تو اس کے بالوں اور بدن سے جھین جھین خوشبو جس میں سوئی سوئی سی مہک ہوتی اور شہزاد بے قابو ہو جاتا۔ لیکن ہر بات اس کے معذور ہونے سے قبل کی تھی۔۔۔ لیکن اب شہزاد اس کی گرم جوش وارفتگی اور دالہا نہ بین اور خود سپردگی کو ریا کاری سمجھتا تھا کہ وہ

شیرازی سے اپنے تعلقات پر پردے ڈالنے کے لیے کرتی ہے۔ اس لیے وہ ایک سرد لاش بن جاتا تھا۔۔۔ جب کہ عطیہ اپنے گرم جوش یوسوں کی بو چھار سے چہرہ اور اس کا سارا جسم مہکا دیتی تھی۔ اس کی سرد مہری کے باوجود عطیہ نے اپنا معمول بنالیا تھا۔ شہزاد بڑا دل گرفتہ ہو کے سوچتا تھا کہ عطیہ اب شیرازی کی ملکیت بن چکی ہے۔۔۔ اس کا پرشاب گداز بدن۔۔۔ اس محبت کو شیرازی آلودہ کر رہا ہے۔۔۔ کاش! اس دنیا میں اس کا کوئی سہارا ہوتا اور وہ عطیہ کے رحم و کرم پر نہ ہوتا تو وہ اپنی بیساکھی سے نیند کی حالت میں اس زہریلی ناگن کو ہلاک کر دیتا۔

آج اس نے عطیہ کو بہت خوش دیکھا تھا۔۔۔ اتنا مسرور اور سرشار بھی نہ دیکھا تھا۔ شادی کی پہلی سہاگ رات بھی نہیں اس نے جو خصوصی سنگھار کیا تھا اس میں کوئی نئی ٹوپی دہن دکھائی دی۔ عطیہ نے بھی ایسا سنگھار نہیں کیا تھا۔ وہ بھورے رنگ کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔۔۔ اس رنگ کا جو بلاؤز تھا وہ بغیر آستینوں کا تھا جس میں اس کی عریاں ممریں گداز اور سڈول بانہیں بے نیام خنجروں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔۔۔ اور پھر مختصر سا بلاؤز تھا جس کا گریبان آگے اور پیچھے اتنا کھلا ہوا تھا کہ بے چارے متوجہ کرنے والی تھی۔ جسم کا فراز اور پشت پیمان خیز نظارہ بن گیا تھا۔ اس عالم میں اس کے حسن کی محبت بڑی قیامت خیز تھی۔ انگ انگ سے ابلی مستی اور پیمان خیز سراپا پڑے فتنے جگا رہا تھا۔ بڑی حشر سامانیاں واضح تھیں۔

شیرازی آیا تو عطیہ اسے لے کے اوپر چلی گئی تھی۔ وہ کچھ دیر کے بعد بیساکھیوں کے سہارے زینے کے پاس جا کے کھڑا ہو گیا۔ عطیہ اور شیرازی کی گفتگو سنا کر دے رہی تھی۔ صاف اور واضح نہ تھیں۔ جملے ادھورے ادھورے سے تھے۔ عطیہ کہہ رہی تھی

”وہ پینٹنگ میری ماں کی ہے۔۔۔ آپ شوق سے لے جائیں۔۔۔ رات گیارہ بجے ساتھ چلوں

گی۔۔۔ آپ آکر مجھے لے جائیں۔۔۔ آپ شہزاد کی فکر نہ کریں۔۔۔ وہ رات دس بجے نیند کی گولیاں کھا کے سوتے ہیں تو۔۔۔ پینٹنگ کے بارے میں کہہ دوں گی کہ وہ چوری۔۔۔ میں بھی لندن چلوں گی۔۔۔

شہزاد نے ذکیہ خانم کی تصویر اس لیے نہیں بنی تھی کہ وہ ایک شاہکار تخلیق تھی۔۔۔ ایسی تخلیق بار بار نہیں ہوتی تھی۔ اس تصویر کی وجہ سے ہی عطیہ اس کے قریب آ گئی تھی۔ شیرازی اور دوسرے شیدائیوں نے اس تصویر کو خریدنے کے لیے بڑے بڑے آخر دیے تھے۔ مگر اس نے محبت کی نشانی کو کسی قیمت پر دینا منظور نہیں کیا تھا۔۔۔ مگر آج عطیہ شیرازی کی محبت میں گرفتار ہو کے اسے وہ شاہکار دے رہی تھی جو اسے اپنی جان سے کہیں زیادہ عزیز تھی۔ اب کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی کہ شیرازی اور عطیہ ان جانی راہ پر لپکتی دور جا چکے ہیں۔

رات دس بجے عطیہ اس کے لیے نیند کی گولیاں لے کے آئی تو اس نے عطیہ کے چاند چہرے کو چودھویں کے چاند کی طرح دکتے دیکھا تھا۔ اس کی خوب صورت بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھوں میں افق تا افق چاندنی دیکھی۔ اس کی یہ کیفیت شادی کی پہلی سہاگ رات کی تھی۔ وہ رات جو اس کی زندگی کی یادگار اور ناقابل فراموش تھی، نفرت میں ڈھل چکی تھی جس کے متعلق وہ سوچتا بھی نہیں۔ عطیہ نے حسب معمول اس کے ہونٹ اور چہرے کو چوما تو ایسا لگا کہ وہ کسی زہریلی ناگن کا پھن ہے۔ شہزاد نے اس کے ہاتھ سے نیند کی گولیاں لے کے منہ میں رکھیں اور کٹے میں ایک طرف کر لیں اور پانی کا گلاس لے لیا۔ اس وقت عطیہ کو کوئی بات یاد آئی تو وہ چلی گئی۔ اس نے فوراً ہی گولیاں منہ سے نکال کر تکیے کے نیچے رکھ لیں۔ پانی پی کے خالی گلاس تپائی پر رکھ دیا۔ وہ اس کے دروازے ہونے کے بعد آئی تو شہزاد نے آنکھیں موند لیں اور اس کا ایک طویل بوسہ اس کے لبوں اور چہرے کا لیا تو اسے لگا کہ ناگن اپنا زہر اس کے

لبوں میں جذب کر رہی ہے۔ اسے ناگوار لگا تو اس نے بے زاری سے ہونٹ چبا کے بولا۔  
”بھئی سونے دو چوں کہ میں دوپہر نہیں سوا تھا اس لیے بڑے زور کی نیند آ رہی ہے۔“ عطیہ نے اس کے جسم پر چادر ڈال دی۔ نائٹ بلب روشن کر کے دوسری بتیاں کل کر دیں۔ پھر گلاس لے کر باہر نکل گئی۔

رات گیارہ بجے شیرازی کی کار کے ہارن کی آواز سنائی دی تو عطیہ جو نشست گاہ میں بیٹھی تھی وہ لپک کے دروازے پر گئی۔ پھر اس آواز سے وہ چونک گیا۔ پھر اس نے دروازہ کھلے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ چند لمحوں تک گہری خاموشی طاری رہی۔ اس نے محسوس کیا کہ عطیہ نے شاید شیرازی کا والہانہ انداز اور خود سپردی سے استقبال کیا اور شیرازی اسے اپنی آغوش میں لے کے چہرے پر جھک گیا ہے۔ وہ دونوں بہک رہے ہیں۔ اس لیے یہ خاموشی طاری ہے۔ پھر اس نے عطیہ کو کہتے سنا۔

”آپ ایسا کریں کل رات آپ کے تصویر لے جائیں تاکہ میں اسے نیچے اتار کے رکھ دوں، کیوں کہ اس وقت اسے اتارنے میں آدھا گھنٹہ لگ جائے گا۔۔۔ ہم کیوں آج وقت ضائع کریں۔ چلیے۔۔۔ آج میرا دل قابو میں نہیں ہے۔“ عطیہ کے کچھ میں سرشاری تھی۔ کچھ دیر بعد عطیہ شیرازی کے ساتھ چلی گئی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ عطیہ اس کی پٹنہ میں چھرا گھونب گئی ہے۔

کیا وہ دونوں کسی ہوٹل میں شب گزاری اور غلاظت کے دلدل میں گرنے گئے ہیں۔۔۔  
لیکن وہ اس گھر میں بھی تو اپنے آپ کو آلودہ کر سکتے تھے۔ کیا چیز مانع تھی۔

لیکن ہوٹل کی بات اور ہوتی ہے۔ شیرازی نے شاید کسی فانیو اشارز میں رات بھر کے لیے کمر لے لیا ہو گا۔۔۔ تاکہ سہاگ کی سی رات گزار سکے۔۔۔ گھر میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ ہوٹل کے کمرے کا ساما حول میسر نہیں آ سکتا۔۔۔ جو کمر اور

نرم و گداز بستر ہوتا ہے اس کے کمر کے کمرے میں کہاں۔۔۔ اور پھر ہوتے کے کمرے میں سکون اور ہر طرح کی آزادی ہوتی ہے۔

وہ بستر پر دراز چشم تصور میں ان دونوں کو ہم آغوشی کی حالت میں مابی ہے آب کی طرح تڑپتا دیکھتا رہا اور جیسے انگاروں پر کر و کش بدلتا رہا تھا۔۔۔ شیرازی اور عطیہ کے چہرے اسے بدروحوں کی طرح تصور میں ناچتے دکھائی دیتے تھے۔ وہ بڑی دیر تک اپنا سینہ دبائے لیٹا رہا۔۔۔ صرف آج ہی نہیں کچھ دنوں پہلے ہی اسے اندازہ اور احساس ہو گیا تھا کہ عورت کس قدر خود غرض اور کیسی منکار اور مڑی کی طرح ہوتی ہے۔ اپنی خوشیوں کے حصول کے لیے اپنے آپ کو میلا بھی کر لیتی ہے۔

شدید حقارت اور نفرت کی مہر میں اس کے دل و دماغ اور رگوں میں سنسنار رہی تھیں۔۔۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ زہریلے ڈنک ہیں جو اس کے وجود کو زخمی کر رہے ہیں اور اپنا زہر سرایت کر رہے ہیں ایسا دردناک عذاب جسے سہنا کتنا مشکل تھا۔ وہ کیا کرے۔۔۔ ایسے گھپ اندھیرے میں کوئی کن بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس کے ذہن میں ایک خیال دفعتاً کوندا بن کے لپکا تو وہ اچھل سا پڑا تھا۔  
”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔۔۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔“

وہ بچن سے ایک بوتل میں کیروسین آئل کے آرٹ گیلری میں پہنچا۔۔۔ بیساکھیوں کے سہارے بچن میں جا کے تیل لینے اور اوپر پہنچنے میں اسے نصف گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا تھا۔ وہ ابھی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ زیادہ دیر تک بیساکھیوں کے سہارے چل سکے۔۔۔ اور پھر سیڑھیاں چڑھنا اس کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ ایسا ہی تھا جیسے ہالیوے کی چوٹی سر کرنا۔ لیکن اس نے ہمت کر ہی ڈالی تھی۔

اس نے سب سے پہلے ذکیہ خانم کی تصویر پر

تیل چھڑکا جو اسے عطیہ کے قریب لے آئی تھی اور آج اس سے دور کر رہی تھی۔

اس نے اپنی تصویروں پر بھی تیل چھڑک دیا جو اس نے مہینوں اور برسوں کی محنت سے بنائی تھیں۔ عطیہ نے کڑے وقت میں بھی ان تصویروں کو بیچنے نہیں دیا تھا۔ وہ تصویریں آرٹ گیلری کی زینت بنی ہوئی تھیں۔ شائقین مرد، لڑکیاں، عورتیں تصویروں کو دیکھ کر عیش عیش کرتی تھیں اور منہ مانگی قیمتیں بھی دینے کے لیے تیار ہوتی تھیں۔

اس نے جیب سے مانوس نکالی۔ اس نے دیا سلائی نکالی اور جلانے کے لیے ڈیپا کے کنارے رگڑ رہا تھا کہ اس نے زینے پر قدموں کی چاپیں سنیں یہ مانوس چاپیں عطیہ کی تھیں۔ عطیہ آ رہی ہے! اس نے ایک پل کے ہزارویں حصے میں سب کچھ سوچا کہ وہ اتنی جلدی اپنا سب کچھ بچھا کر کے آگئی۔۔۔ شاید اپنی ماں کی تصویر لینے آئی ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ عطیہ کے اوپر پہنچنے سے پہلے ذکیہ خانم کی تصویر جل کے خاک ہو جائے۔ پہلی دیا سلائی اس نے عطیہ خانم کی تصویر کو لگا دی پھر دوسری دیا سلائی وہ اپنی بتائی ہوئی تصویروں کو لگا دیں۔ تیسری دیا سلائی نکال رہا تھا کہ عطیہ داخل ہوئی۔ اس نے جو یہ منظر دیکھا تو بھونچکی سی ہوگئی۔ جیسے تصویروں میں نہیں اس کے بچے جل رہے ہوں۔ دوسرے لمحے وہ ہانگوں کی طرح دوڑتی ہوئی اپنی ماں کی تصویر کے پاس پہنچی جس کے فریم کو آگ پکڑ رہی تھی۔ تصویر کے کیڑوں پر ابھی آگ نہیں پہنچی تھی۔ وہ سوتی سا ڈھمی پہنی ہوئی تھی اس نے ساڑھی کے پلو سے کسی نہ کسی طرح آگ بجھا دی۔ آگ بجھ گئی تھی۔ اس کی جگہ دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس نے پلٹ کے دیکھا۔ شیراز کی تینوں تصویریں آگ کی لپیٹ میں آئے ہی والی تھیں۔ شہزاد اپنی چوٹی تصویر کو آگ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے لپک کے ساڑھی نکال کے تصویروں کی آگ کسی نہ کسی طرح بجھا دی۔ صرف ایک تصویر کا فریم متاثر ہوا تھا۔ باقی تصویروں کے صرف فریم جل گئے تھے۔

اس نے شہزاد کے پاس جا کے ماچس چھین لی  
”یہ کیا پاگل پن ہے شہزاد۔۔۔! معلوم ہوتا  
ہے کہ تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔۔۔ تم اپنے  
لخت جگر کو جلا رہے ہو۔۔۔ انہیں بھسم کر رہے  
ہو۔۔۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

”میرا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔“ شہزاد نے  
استہزائیہ انداز سے اپنے آپ سے سوال کیا اور پھر وہ  
عطیہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم میری اس حرکت کو پاگل  
پن کہہ رہی ہو۔۔۔ اگر یہ پاگل ہے تو پاگل پن ہی  
سہی۔۔۔ مجھے مت روکو۔۔۔ میں ایک ایک تصویر کو  
نذر آتش کرنا چاہتا ہوں۔ لاؤ ماچس مجھے دے دو۔“

”آخر کیوں شہزاد۔۔۔! یہ تمہیں بیٹھے بیٹھائے  
اچانک کیا ہو گیا ہے۔ یہ تم پر کیا دورہ پڑا ہے۔۔۔“

عطیہ حیران پریشان ہو رہی تھی  
”مجھے کچھ نہیں ہوا ہے بلکہ آج میری نظروں  
کے سامنے سے اچانک پردہ ہٹ گیا ہے۔۔۔ اب  
مجھے تمہارا اصل چہرہ نظر آ گیا ہے جو نہایت گھناؤنا،  
مکر وہ اور قبیح ہے۔“ شہزاد نے ٹھک کے جواب دیا۔  
عطیہ چکراسی گئی۔ اس کے لیے شہزاد کا روپ  
بالکل نیا تھا۔ اس کے لہجے سے نفرت اور حقارت ٹپک  
رہی تھی۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ شہزاد ایسی باتیں  
بھی کہہ سکتا ہے جو اس کا دل چیر دیں گی۔ وہ حیرت،  
خوف اور صدمے سے کھڑی شہزاد کو دیکھ رہی تھی۔  
”میں نے تم دونوں کی ساری گفتگوں لی تھی۔“

شہزاد نفرت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ ”تم رنج سفر  
باندھ رہی ہو نا شیرازی کے ساتھ اور تم اسے اپنی ماں  
کی تصویر دے رہی ہونا۔۔۔ اب تمہارے دل کے  
کونے میں شیرازی کی شخصیت نے پناہ لے لی ہے  
نا۔۔۔ تم دونوں کی دونوں سے محبت کا ڈرامہ رچا رہے  
ہو۔ تم اپنے حسن و شباب اور اپنی بجلی بھری جھرپور  
جوانی سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہو نا اس لیے کہ آج میں  
معذور ہوں۔ تمہارا دل مجھ سے بھر چکا ہے۔ اب تم یہ  
نہیں چاہتیں کیونکہ ایک لنگڑے لوہے کے ساتھ۔۔۔  
”اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ اس کی عجیب سی

## ہنسی علاج غم ہے

ایک ماہر نفسیات بہت  
زور دے کر رہا تھا۔  
خوبیاں بیان کر رہا تھا۔

”میں کسی بھی شخص پر صرف ایک نظر ڈال کر یہ بتا سکتا  
ہوں کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔“  
”لیکن یہ جان لینے کے بعد آپ کو شرمندگی تو ہوتی ہوگی۔“  
ایک آدمی بولا۔

☆☆☆

سواری (ٹانگے والے سے): ”اسٹیشن کے کتنے لوگ؟“  
ٹانگے والا: ”بھائی! اسٹیشن میری ملکیت نہیں جو اس کے  
پیسے ہوں۔“

جذباتی کیفیت ہو رہی تھی۔

”اوه شہزاد۔۔۔!“ وہ تڑپ کے اس کے  
رو برو آ کھڑی ہوئی۔ ”تم میری محبت پر بہتان لگا  
رہے ہو۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ تم نے مجھے اور  
ہماری باتوں کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ میں نے  
شیرازی سے تمہاری مصنوعی ٹانگ اور علاج کے  
بارے میں بات کی تھی۔ اس نے ایک روز آ کے بتایا  
تھا کہ تمہارا علاج لندن میں ہو سکتا ہے۔ ٹانگ،  
علاج، ڈاکٹر اور سفر کے اخراجات پر دو ڈھائی لاکھ  
روپے کے اخراجات آئیں گے۔ میں یہ بات سن  
کے بہت خوش ہوئی تھی اور جھوم جھوم جانی تھی کہ تم  
مصنوعی ٹانگ کے لگ جانے سے آسانی سے چل  
پھر سکو گے۔ پھر میں نے اپنی ماں کی بتائی ہوئی تصویر  
تین لاکھ میں شیرازی کے ہاتھ بیچ دی۔

شہزاد! اس لیے کہ ایک عورت اور بیوی کے  
لے شوہر سے زیادہ دنیا کی کوئی قیمتی سے قیمتی شے بھی  
عزیز نہیں ہو سکتی ہے نہ ہوتی ہے۔۔۔ یہ تصور کیا چیز  
ہے شہزاد! ایسی ہزاروں تصویریں تم پر قربان کر سکتی  
ہوں۔ کیا ہوا تم معذور ہو گئے۔۔۔ تم آج بھی  
میرے لیے دنیا کے سب سے خوب صورت اور سب  
سے پیارے مرد ہو۔“

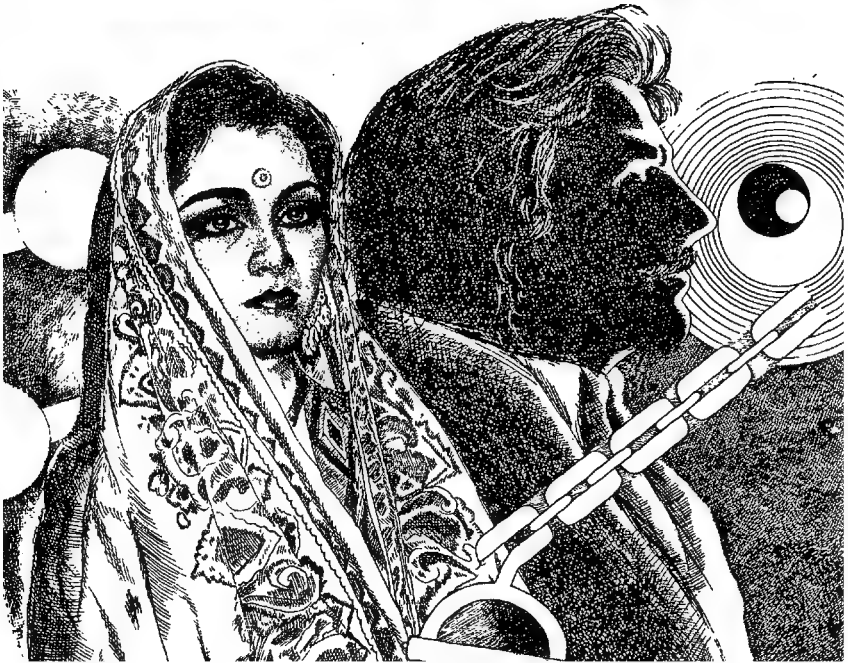
﴿.....﴾

## دام گل

ایم الیاس

بچاس برس کی عمر کو پہنچنے کے باوجود وہ ایک  
تندرست، توانا اور چاق و چوبند شخص تھا۔ نوجوان  
لڑکوں کی طرح سیدھا چلتا تھا۔ دراز قد نے اس کی  
وجاہت میں بھی بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ لندن پہنچ کر  
جب اس کی مالی حالت اچھی ہو گئی اور آمدنی میں بے  
تحاشا اضافہ ہونے لگا تو اس نے عورت اور شراب سے دل  
پھلانا شروع کیا اور اس کے نزدیک اس سے اچھی تفریح  
کوئی نہیں تھی۔ اس میں اس نے بڑا حسن، کشش اور  
سنسنی خیزی محسوس کی تھی۔

غیر متوقع انجام کی ایک خوبصورت کہانی



**کشور آفسند** یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز دولت سے خریدی جاسکتی ہے۔ اس کی اس بات کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ وہ اس بات کی سچائی کو بڑی آسانی سے ثابت کر سکتا تھا کیونکہ اس نے اپنی زندگی میں ہر وہ چیز دولت کے بل پر حاصل کی تھی جو اس نے پسند کی تھی اور جن کی تمنا کی تھی۔ اس نے وہ چیزیں بھی خریدی تھیں جس کے بارے میں کہا جاسکتا تھا کہ بڑی سے بڑی دولت ہی انہیں خرید نہیں سکتی ہے۔ مثلاً عورت، ضمیر اور ایمان وغیرہ..... اس نے دولت سے وہ لڑکیاں اور عورتیں بھی خریدی تھیں جو کسی کی بیویاں اور بہنیں تھیں۔ انہیں بستر کی زینت بنایا۔ اس وقت تک ان سے کھیلا رہا تھا جب تک اس کا جی نہیں بھر گیا۔ ان میں کشش نہ رہی اور اس کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ اس نے لوگوں کے ضمیر اور ایمان خرید کر بے تحاشا دولت کمائی تھی۔ اس دولت کی وجہ سے اسے ساری دنیا کی راحت و آسائش اور بے پناہ حسرتیں ملی تھیں۔ اسے اندازہ تھا کہ دولت میں کتنی بڑی اور حیران کن اور بے پناہ قوت موجود ہے۔ اس میں اتنی بڑی قوت ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی چیزیں اس کے آگے بچھ ہے۔

ایک روز اس پر یہ حیران کن اور ناقابل یقین انکشاف ہوا کہ دنیا میں ہر عورت بکنے، بستر کی زینت بننے، اشاروں پر ناپنے اور دولت کے آگے سر جھکانے والی نہیں ہوتی ہے۔ یہ پہلی ایسی عورت جس سے اس کا واسطہ پڑا تھا اور جس نے اس کی بات کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ وہ عورت جو لین تھی۔ ایک معمولی سی عورت تھی۔ اس کا شوہر جنس بھی ایک عام قسم کا آدمی تھا۔ ان کی زندگی بھی سادہ اور ہلکے سکون تھی۔ ان کا گھر ان کی خوشیوں اور محبت سے ہمسکنار رہتا تھا۔ محبت ان کی خوشیاں تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی ذات کا جزو تھے اور ان کی چاہت مثالی تھی۔

جو لین ایک معمولی گھرانے کی عام عورت تھی لیکن بہت حسین و جمیل تھی۔ وہ اتنی حسین تھی کہ ساری

دنیا جس پر رشک کرتی تھی اور جو لین کی بد نصیبی پر ہر کوئی افسوس کرتا تھا۔ دنیا داری کے خیال میں جو لین کو کسی امیر کبیر شخص کی بیوی ہونا چاہیے تھی۔ جو لین نے بھی اس انداز سے سوچا اور نہ ہی خواب دیکھا، نہ کبھی احساس محرومی کا شکار ہوئی تھی۔ وہ اور لڑکیوں اور عورتوں سے مختلف سوچ رکھتی تھی۔

کشور آفسند نے جب اسے پہلی بار دیکھا تو یقین نہیں آیا کہ کوئی عورت اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی زندگی میں جتنی لڑکیاں اور شادی شدہ عورتیں آئی تھیں، وہ اس کا عشرِ عشر بھی نہیں تھیں۔ جو لین کے بکلی پھرے پر شباب بدن میں ایک ایسی گداز اور کشش تھی کہ اس نے اسے تڑپا دیا تھا۔ اس میں ایک ہجان برپا کر دیا اور وہ اس کے حصول کے لیے بے تاب ہو گیا۔ جو لین کے نشیب و فراز اور خطوط نے نیندیں حرام کر دی تھیں۔ اس نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ جو لین کے بارے میں معلومات حاصل کریں تو اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ معمولی حیثیت کے میاں بیوی ہیں اور ایک عام سی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس میں نہ تو کوئی حسن ہے اور نہ ہی رنگینی..... پھر اس نے سوچا کہ جو لین کا حصول بہت آسان ہو جائے گا کیونکہ ہر عورت کے خواب بڑے سہانے ہوتے ہیں۔ ایک پرعیش زندگی کے ارمان ہوتے ہیں اور کمزوری بھی۔ پھر اس نے جو لین کی تمنا کی تھی اس لیے اسے خریدنے کی کوشش کی۔ اس کے سارے اندازے اور تدبیریں ناکام ہو گئیں پھر اس نے باتو غنڈوں کی مدد سے میاں بیوی کو یرغمال بنا لیا۔ جنس کو ایک ایسے مکان میں قید کر دیا گیا جو بد معاشوں کا ٹھکانا تھا پھر اس نے جو لین سے بیس دیوں تک خوب جی بہلایا۔ وہ ایسا کھلونا ثابت ہوئی تھی کہ اس کا جی نہیں بھرتا تھا۔ ایسا پھول تھا جس کی خوشبو اس نے کسی اور پھول میں نہیں پائی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ تین چار مہینے تک رکتا لیکن اس بیس دنوں میں جو لین نے اسے فریب دے کر فرار ہونے کی کوشش کی تھی پھر اس نے سوچا کہ وہ ہر حال میں



جاذبیت سے بھرپور..... ہندوستان کا حسن ساری دنیا میں مشہور تھا۔ آسام اور بنگال کا گندمی اور روغنی حسن زلف بنگال بھی تو ہے۔

اس نے لندن میں تو پچیس برس رہ کر صرف جوہن اور جیس کے قتل کے سنگین جرم نہیں کیے تھے اس نے اور بھی جرائم کیے تھے۔ یہ شخص ایک اتفاق تھا کہ قسمت کی دیوی اس پر مہربان تھی۔ وہ قانون کے ہاتھوں سے بچتا رہا تھا۔ اس کی بے عیب منصوبہ بندی اور ذہانت نے ہر قدم اور ہر جرم میں ساتھ دیا تھا جس پر وہ بہت خوش نازاں اور ایک فاحش کی طرح مسرور اور سرشار بھی ہو جاتا تھا۔ لندن کی پولیس کے ہاتھوں سے شاید ہی شاذ و نادر کوئی مجرم بچا ہو۔ پولیس جانتی تھی لیکن اس پر ہاتھ اس لیے نہیں ڈالتی تھی کہ اس کے پاس کوئی ثبوت نہ ہوتا تھا لیکن پھر بھی پولیس نے اس پر ٹری نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں رہے گا تو بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

اس لیے ہی وہ ہندوستان پہنچ کر پُر سکون اور شاہانہ زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ وہاں عورت بہت سستی تھی۔ سستی اور مہنگی سے اس کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ اس کی سات پیش بھی پڑتھیں زندگی گزار سکتی تھیں پھر ایک روز وہ اپنی تمام دولت سمیت کرہندوستان آ گیا۔ وہ سال دو سال میں ہندوستان کچھ دنوں کے لیے آتا تھا لیکن اب تو وہ مستقل طور پر آ گیا تھا۔

اس نے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا۔ وہ کسی ایک شہر میں رہ کر زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ وہ جس جس شہر گیا تھا وہاں اس نے راتیں رنگین کی تھیں لیکن اسے ممبئی شہر بے حد پسند آ گیا تھا۔ ممبئی میں جو رونق، چہل پہل، زندگی اور رنگینیاں تھیں وہ دوسرے شہروں میں مفقود تھیں پھر اس نے مستقل طور پر اس شہر میں سکونت اختیار کر لی پھر اس نے ممبئی کے سب سے اعلیٰ علاقے میں ایک نہایت شاندار گلزاری فلیٹ خرید لیا۔ اسے خصوصی طور پر آراستہ کیا پھر ایک شان دار قسم کی گاڑی بھی خرید لی۔ وہ اپنے آپ کو

پولیس کے پاس جائیں گے۔ یہ فلم اور تصویریں اس کا دل بہلائیں گی۔ جب اس کا دل بھر جائے گا انہیں تلف کر دے گا۔ بیس دن کے بعد جوہن اور جیس کی نعشیں جو برہنہ تھیں ویرانے میں پڑی ہوئی پائی گئیں۔ لندن پولیس نے بڑا جھک مارا لیکن وہ دونوں قاتلوں کا سراغ نہ پاسکی۔ وہ خوش تھا کہ قانون کے ہاتھوں سے بال بال بچ گیا۔ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ کاش جوہن اس کی بات مان کر اس کی داشتہ بن جاتی کیونکہ جوہن جیسی عورتیں لاکھوں میں ایک ہوتی ہیں۔ وہ اس کا حسن پر شباب گداز بدن اور کشش کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ یہ بات اس کے علم میں تھی کہ ایڈز کے مریض یوں تو ساری دنیا میں موجود ہیں لیکن سب سے زیادہ امریکا، یورپ اور افریقہ میں ہیں لیکن وہ عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا عورت اس کی سب سے بڑی کمزوری بن چکی تھی۔ وہ ایک ایسا نشہ تھا کہ کسی اور میں بھی اس نے ایسا نشہ محسوس نہیں کیا تھا۔ اس نے دیکھا اور محسوس کیا تھا کہ شراب کا نشہ کیسا ہی تیز کیوں نہ ہو وہ اتر جاتا تھا لیکن شباب کا نشہ نہیں۔ اسے عورت کے شباب کے نشے کی لت پڑ گئی تھی۔ شراب کی طرح چھوٹی ہی نہیں تھی۔ جب وہ رنگین تیلیوں اور ان کے بھڑکیلے جسموں کو دیکھتا تو اس کی ہجوک ایک بھوکے بیٹھریے کی سی ہو جاتی تھی۔ جب تک وہ کسی سے سرفراز نہ ہو جاتا اسے چین نہ آتا۔

آخر اس نے ایک روز فیصلہ کیا کہ اس کا یہاں رہنا بیکار ہے۔ فضول ہے۔ اگر وہ یہاں رہا تو اپنی کمزوریوں پر قابو نہ پاسکے گا۔ اگر ایک ایڈز زدہ عورت غلطی سے اس کی زندگی میں آگئی وہ اس سے کبھی بھی چھکارا نہ پاسکے گا۔ یہ ایک لاعلاج مرض تھا۔ موت ہی اس سے نجات دلائی تھی۔ وہ انتہائی دردناک موت سے لوگوں کو مرتے دیکھ چکا تھا پھر اس نے سوچا کہ عورت کے معاملے میں ہندوستان سے بہتر ملک کوئی نہیں ہے۔ وہاں ہر قوم مذہب اور رنگ و نسل کی عورتیں ہیں۔ بہت حسین، پُرکشش اور

آغاز کیا تھا اور ان کے درمیان مکمل طور پر کاروباری شراکت تھی۔ اشوک مہتا نے اسے مشورہ دیا تھا کہ فنانس کمپنی کی رقم فلم سازی میں لگا دی جائے۔ ان دنوں شمیٹا کا طوطی بول رہا تھا۔ اشوک مہتا کا خیال تھا کہ ان کی فلم میں شمیٹا کو ہیروئن لے لیا جائے تو ان کی فلم ہٹ ہو جائے گی۔ اگر وہ اشوک مہتا کو سمجھاتا تو اشوک مہتا اس کی بات مان لیتا۔ اس نے اشوک مہتا کو کسی قدر جذباتی پایا تو اشوک مہتا کو سمجھانے کا خیال ترک کر دیا۔ وہ خود بھی چاہتا تھا کہ فلمی دنیا میں قدم رکھے اس لیے کہ ایک سے ایک حسین، نوجوان اور کنواری لڑکیاں ہیروئن بننے کے شوق میں گھروں سے بھاگ کر اور گھر والوں کی مرضی، خوشی اور خواہش سے آئی ہیں۔ وہ اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے بڑی سے بڑی خواہش کی خاطر اپنا تین من نچھاور کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر آتی تھیں۔ اس میں مفت کے مزے بھی ہو جاتے تھے۔

آخرا کار انہوں نے ایک ہدایت کو لے کر ایک فلم بنانے کا اعلان کر دیا۔ شمیٹا نے عین وقت پر انکار کر دیا جبکہ تمام معاملات طے ہو گئے تھے۔ وہ ایک رات ہی مفت بھی گزار چکا تھا کیونکہ اس نے کچھ دنوں کے بعد نصف پیشگی رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ معاوضہ چونکہ منہ مانگا تھا اس لیے شمیٹا نے اس رات کو بڑی محبت خود سپردگی اور والہانہ انداز سے خوش کر دیا تھا پھر انہوں نے ایک نئی ابھرتی ہوئی اداکارہ رہنما کو لے لیا۔ فلم کی تکمیل تک سائیڈ ہیروئن اور اس فلم میں چانس لینے کے لیے جو لڑکیاں اور عورتیں آئی تھیں ان سے اور رہنما سے بھی خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ جب کہ اشوک مہتا کو لڑکیوں سے اس کی جیسی دلچسپی نہیں تھی جبکہ وہ منع کرتا تھا کہ معصوم لڑکیوں کی زندگی اور عزت کو تباہ نہ کرے۔ ہاں ہیروئن و سائیڈ ہیروئن اور رقاصاؤں کو آلودہ کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا کیونکہ وہ پہلے سے ہی میلی ہو چکی تھیں۔

ایک برس سے پہلے ہی فلم بن گئی۔ فلم اس بری

مصروف رکھنے کے لیے کاروبار کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ لندن میں ایک کاروباری شخص تھا۔ وہ سارا دن سو کر اور ساری رات رنگینیوں میں کھو کر اپنی زندگی بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس طرح سے آدمی کسی کام کا نہیں رہتا تھا۔ وہ مریض کی طرح ہو کر رہ جاتا تھا۔ ایک روز شیو کرنے کے بعد آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو اسے ایک طرح سے اپنے چہرے پر اطمینان کی لکیریں دکھائی دیں لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل پر ایک چٹان کا سا بوجھ ہے۔ کچھ دنوں سے اس کے اعصاب پر ایک نامعلوم سا اضطراب غلبہ پا رہا ہے۔ ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔ وہ لندن نہیں ہندوستان میں ہے۔ اس سے مل کے علاوہ جو جرائم سرزد ہوئے تھے وہ لندن میں، ہندوستان میں اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہے۔ وہ اتنا پریشان کیوں ہو رہا ہے۔ وہ پچپن برس لندن میں گزار کر آ رہا ہے۔ یہ ایک طویل مدت تھی۔ اس مدت میں زمین و آسمان کی سوا ہر چیز بدل جاتی ہے۔ بچہ جوان ہو جاتا ہے۔ جوان بوڑھا ہو جاتا ہے۔ شہروں کا جغرافیہ بدل جاتا ہے۔ پچپن برس نہیں صدیاں ہوتی ہیں۔ زندگی کی تلخیوں، تشیب و فراز اور ہنگاموں سے بھر پور اپنے ماضی کو کسی حد تک بھول جاتے ہیں۔ یادداشت پر وقت کی گرد کی تہ جم جاتی ہے۔ اس نے اپنا ماضی بھلا دیا تھا۔ اب اسے ماضی سے کیا لینا دینا تھا، لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کا ماضی ذہن کے تاریک گوشوں سے جھانکنے لگا ہے۔ وہ ان گوشوں کو بند بھی نہیں کر سکتا ہے۔ ماضی کی یادیں زہر لیے ناگ کی طرح سے پھنکار رہی تھیں جیسے اسے ڈس لینا چاہتی ہیں۔ اس نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ماضی کی یادیں بے رحم اور سفاک ہوتی ہیں۔

جو کچھ ہوا تھا، اس میں اس کی اپنی کوئی غلطی نہیں تھی کہ سارا جرم اس کے سر منڈھ دیا جائے۔ اگر اس سے قصور سرزد ہوا تھا تو کم از کم وہ اشوک مہتا سے زیادہ قصور وار نہیں تھا۔ ان دونوں نے مل کر کاروبار کا

طرح فلاپ ہوئی تھی کہ اشوک مہتا کے ہوش اڑ گئے اور اس نے جیسے اپنے حواس کھو دیے۔ وہ جانتا تھا کہ فلم کا کیا حشر ہوگا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک دن بھی ضائع نہیں کیا۔ اس نے چار لاکھ روپے کی رقم تجوری سے نکالی۔ انہیں ڈالر میں تبدیل کیا اور دوسرے دن لندن روانہ ہو گیا۔ اشوک مہتا شدید صدمے سے گھر پر بڑا ہوا تھا۔ اس لیے اسے رقم تجوری سے رقم نکالنے کا موقع مل گیا۔ اس نے ہندوستان چھوڑنے میں عافیت بھی تھی۔ اس طرح ساری مصیبت اشوک مہتا کے سر آگئی۔ اگر وہ خود غرضی کا مظاہرہ نہ کرتا تو اس کی خیر نہ ہوتی کیونکہ یہ پیسہ عوام کا تھا۔ اس نے بھی اپنا پیسہ نہیں لگایا تھا۔ اس کے مزے اس لیے تو آگئے تھے کہ وہ فلم مکمل ہونے تک ہیر وئن، سائڈ ہیر وئن اور رقصاؤں سے راتیں کالی کرتا رہا تھا۔

لندن پہنچ کر اس نے سنا کہ اشوک مہتا کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور اس کی تلاش ہندوستان کے شہروں میں کی جا رہی ہے پھر ایک مہینے بعد اس نے ممبئی کے انگریزی اخبار میں جولنڈن آتا تھا اس میں پڑھا کہ اشوک مہتا کو تین سال قید با مشقت کی سزا ہو گئی ہے۔ لندن پہنچ کر اس نے نہ صرف اپنا نام بدل لیا بلکہ حلیہ بھی اور پھر اس نے رقم کو کاروبار میں لگا دیا۔ اس نے ہر وہ کام کیا جس سے اس کی خوش حالی اور دولت میں اضافہ ہو۔ اس کے نزدیک جائز اور ناجائز میں ذرا برابر بھی فرق نہیں تھا۔ بس اسے ہر قیمت پر دولت کی ضرورت تھی۔ پھر اس کا شمار جلد ہی لندن کے سرمایہ داروں اور معززین میں ہونے لگا۔ آج جب کہ وہ ہندوستان واپس آ گیا تھا۔ ماضی اس کے وجود پر کسی کھن کھجورے کی طرح رینگنے لگا تھا پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھاتا تھا کہ بلراج مانیاں کو جانتے ہیں کشور آند کو نہیں۔ شاید بلراج مانیاں کو بھی بھول گئے ہوں۔ آخر انہیں اسے یاد رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہوگی۔ پھر اس نے اشوک مہتا کے بارے میں سوچا۔ اسے پھر پتا نہیں چلا تھا کہ اشوک مہتا پر کیا

گزری ہوگی۔ نہ ہی اسے اشوک مہتا سے اب کوئی دلچسپی رہی تھی۔ اسے دو ایک مرتبہ اپنے دوست اور سابق بزنس پارٹنر کا خیال آیا تھا جسے وہ بیچ منہ ہار میں چھوڑ آیا تھا۔ آج اب وہ اسے شدت سے یاد آ رہا تھا۔ اگر وہ زندہ رہا ہے تو پھر شادی شدہ رہا ہوگا۔ اس کے پانچ سات بچے ضرور رہے ہوں گے۔ ہندوستان میں لوگوں کو بچے پیدا کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ اب وہ کسی گاؤں یا چھوٹے سے شہر میں ملازمت کر کے بیوی بچوں کا پیٹ پال رہا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ زندہ ہی نہ ہو۔ کسی بیماری یا حادثے کی نذر ہو کر اس دنیا سے سدھار گیا ہو۔ اگر وہ مر گیا ہے تو اس کے لیے اچھا ہے۔ اگر وہ زندہ بھی ہے تو اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا اس لیے کہ پاس بے پناہ دولت ہے۔ ہندوستان میں تو دولت سے ہر چیز آسانی سے خریدی جاسکتی ہے اس لیے کہ وہاں غربت و افلاس اور تنگ دستی کا راج ہے۔ ہر کسی کو دولت کی ضرورت ہے۔

وہ دور سے دن اپنی بالکل نئی بے حد قیمتی اور نائی ٹولی دہن جیسی گاڑی میں پونا کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے اخبار میں ایک مویشی فارم کے فروخت کا اشتہار پڑھا تھا۔ وہ اس فارم کو ایک نظر دیکھ کر خریدنا چاہتا تھا۔ وہ بیچپن برس بعد پونا جا رہا تھا۔ پونا سے اس کی خوش گوار یادیں وابستہ تھیں۔ یہ پونا شہر ہی تھا جہاں پہلی لڑکی اس کی زندگی میں آئی تھی۔ وہ زندگی کی رنگینوں سے محظوظ ہونے کے لیے یہاں آتا رہتا تھا۔ ممبئی شہر کے مقابلے میں پونا شہر نسبتاً پرسکون تھا۔ یہاں کی فضا میں اس شہر جیسی آلودگی نہ تھی۔ یہاں گھٹا ہوا پن اور جس نہیں تھا جیسا ممبئی شہر میں تھا۔ پونا شہر میں داخل ہو کر اس نے ایک شخص سے اس مویشی فارم کا پتا اور محل وقوع کے بارے میں پوچھا اور اس کے بتانے پر اس سمت چل پڑا تھا۔ کوئی پانچ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے اپنی گاڑی ایک جگہ روکنا پڑی۔ وہاں سے سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ وہاں ایک سائن بورڈ بھی لگا ہوا تھا۔

دائیں طرف جو سڑک جا رہی تھی وہ جھرنانگر کی طرف جا رہی تھی۔ دوسری طرف کی سڑک پر یم نگر کی طرف..... وہ اس شخص سے یہ پوچھنا بھول گیا تھا کہ مولیٰ فارم کس نگر میں ہے؟ اس نے وقت ضائع کرنے سے یہی بہتر سمجھا کہ جھرنانگر کی طرف چلا جائے۔ یہاں اسے دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ ادھر سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیت تھے۔ فصل تیار کھڑی تھی۔ کسی بھی دن کٹائی شروع ہو سکتی تھی۔

وہ جھرنانگر کے راستے پر چل پڑا۔ اسے یہ علاقہ تو بہت پسند آیا۔ ایک تو یہ سرسبز و شاداب اور خوبصورت علاقہ تھا۔ ہوا بھی بڑی خوشگوار چل رہی تھی۔ قدرتی مناظر بھی بہت حسین تھے جس نے اس کا دل موہ لیا تھا اور نگاہ ان پر سے ہٹتی نہیں تھی۔ وہ یہ علاقہ اچھی طرح سے گھوم پھر کر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ اگر یہاں کوئی فارم ہو تو وہ اسے ہر قیمت پر خریدے گا۔ اسے یہ بھی خیال آیا تھا کہ یہ بڑے سکون جگہ اس کی ہر قسم کی تفریحات کے لیے بہت اچھی ثابت ہو سکتی ہے۔ شہر کے ہنگاموں سے دور رہنے سے اس کی زندگی خوابوں سے کہیں حسین ہو جائے گی۔

کوئی ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ سڑک کے ایسے دو شاخے کے پاس پہنچ گیا جہاں جھرنانگر جانے کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے اپنی گاڑی سڑک پر روک دی۔ وہ پریشان سا ہو گیا تھا کہ اب کس سمت جائے۔ یہاں کوئی ایسا سائن بورڈ بھی نہیں تھا جو جھرنانگر کی نشان دہی کر سکے۔ اس نے سوچا کہ یہاں کھڑے رہنے سے تو بہتر ہے کہ کسی نہ کسی سڑک پر چلا جائے پھر اس نے کچھ سوچ کر دائیں جانب والی سڑک پر جانے کا فیصلہ کر لیا اس لیے کہ یہ سڑک بائیں والی سڑک کے مقابلے میں نہ صرف اچھی حالت میں تھی بلکہ صاف ستھری اور کشادہ بھی لگ رہی تھی۔ سڑک کی حالت سے ایسا لگ رہا تھا کہ اس سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ اس نے اپنی گاڑی کو اس سڑک پر

ڈال دیا۔ وہ گاڑی آہستہ آہستہ چلاتا ہوا جا رہا تھا۔ سڑک کے کنارے جو اونچے اونچے درخت تھے ان کا نظارہ بھی کم دل کش نہیں تھا۔

تھوڑی دور جانے کے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اس لیے کہ یہ سڑک آگے جا کر تنگ اور شکستہ ہونے لگی تھی۔ وہ اس قابل نہیں تھی کہ اس پر گاڑی چلائی جائے۔ اسے نظر آ رہا تھا کہ سڑک آگے سے بند ہی ہے۔ اس نے بائیں طرف دیکھا تو نصف فرلانگ کے فاصلے پر اسے کھیتوں میں بھیر بکریاں چرتی ہوئی نظر آئیں۔ اس کے علاوہ دور دور تک زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے پھر اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا تھا کہ وہ اس سڑک پر آیا کیوں..... اور وہ آگے برابر کس لیے چلا جا رہا ہے؟ اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنی گاڑی روک لی۔ گاڑی کے رکتے ہی اس کا انجن ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ بند ہو گیا۔ اس نے گاڑی اشارت کرنے کرنے کی کوشش کی تو انجن نے اس کا منہ پڑا دیا۔ اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔ اسے جھنجھلاہٹ اس لیے ہو رہی تھی کہ گاڑی بالکل نئی اور قیمتی تھی۔ اس کی جو گاڑی تھی وہ ہندوستان میں سب سے قیمتی تھی۔

بڑے سرمایہ داروں میں وہ فی ستاروں کے پاس کسی کسی کے پاس ہوتی تھی۔ ہر کوئی جب اس گاڑی کو اپنے سامنے سے گزرتا ہوا یا تا تو اس طرح دیکھتا تھا جس طرح ایک نوجوان اور پرکشش دلہن کو دیکھتا ہے اس لیے اس نے اس گاڑی کو خریدا تھا کہ لوگوں کی توجہ گاڑی کی طرف ہو جاتی تھی اور وہ اسے حسد و رشک سے دیکھتے تھے۔ لڑکیاں اور عورتیں لفٹ بھی مانگتی تھیں۔ وہ ایسی گاڑی سے لفٹ مانگنے والی لڑکیوں سے خوب فائدہ اٹھا سکتا ہے جبکہ وہ ماضی میں لفٹ دے کر فائدہ اٹھا چکا تھا۔

وہ اس دلہن جیسی گاڑی کا مالک تھا اور تیس برس سے گاڑی چلاتا آ رہا تھا مگر وہ انجن کے الف بے سے بھی واقف نہیں تھا کیونکہ اسے کبھی گاڑی کے انجن سے واسطہ نہیں پڑا تھا اس لیے کہ اس نے ہمیشہ نئی اور

اوباش شخص تھا۔ آرام و آرائش کا عادی ہو چکا تھا۔ اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ وہ کبھی ایک میل بھی پیدل چلا ہو۔ واپس پیدل جانے کا خیال بڑا روح فرسا تھا اور پھر گاڑی میں بیٹھ کر کسی کا انتظار اس کے لیے اور بھی اذیت ناک تھا۔ اس بات کی کوئی ضمانت بھی نہیں تھی کہ کوئی تیل گاڑی ادھر آ نکلے۔ اس ویرانی میں وہ رات گزارنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے گاڑی سے زیادہ اپنی فکر تھی۔ اس کا بڑا چھوٹے بڑے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی جیب میں بھی ہزاروں روپے موجود تھے مگر اس وقت اس کے کسی کام کے نہیں تھے۔ اگر اسے کوئی شخص نظر آتا تو وہ اس کی ایک نوٹ کی جھلک دکھا کر اس سے کام لے سکتا تھا۔ اس نے پانی تھرموس سے گلاس میں انڈیلے ہوئے گاڑی کو نفرت بھری نظروں سے گھورا جیسے وہ اس کی دشمن ہو۔ اس کی جیب میں میرا پستول ہوتا تو وہ اس کی ساری گولیاں گاڑی پر خالی کر دیتا۔ اسے بھی اتنا غصہ نہیں آیا تھا جتنا اس وقت اس گاڑی پر آ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ حیرت اور خوشی سے اچانک اچھل پڑا۔ اس نے کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنیں جو مخالف سمت سے آرہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے دیکھا کہ سامنے سے ایک ٹریکٹر چلا آ رہا ہے۔ ٹریکٹر دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی اور پھر اس کی نسن میں فرحت دوڑ گئی۔ یہ ایک زرد رنگ کا ٹریکٹر تھا جو اس کی گاڑی سے چند قدم کے فاصلے پر آ کر رکھا تھا۔ اس نے ٹریکٹر والے کی طرف مسکرائی نظروں سے دیکھا جو ٹریکٹر سے کود کر اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ شخص بھی اس کی عمر کا لگ رہا تھا اور اس کی صحت قابل رشک تھی۔ وہ جوانوں کی طرح چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر فریج کٹ نما داڑھی تھی۔ جس نے اسے بارعب اور پُرکشش بنا دیا تھا۔ اس نے قریب پہنچ کر کشور آئندہ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ وہ اپنے لباس سے کاشت کار کا ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی تازگی بھی تھی۔

اچھی حالت کی گاڑیاں استعمال میں رکھی تھیں۔ اسے نہ صرف حیرانی ہو رہی تھی بلکہ غصہ بھی آ رہا تھا کہ اچھی خاصی چلتی ہوئی گاڑی کو کیا ہو گیا ہے۔ اسے پچھتاوا بھی ہو رہا تھا کہ وہ اس سڑک پر کیوں آیا۔ اس نے گاڑی سے باہر نکل کر باسکٹ باہر نکالا۔ وہ دور دراز سفر پر جاتا تو باسکٹ لے کر نکلتا تھا تا کہ راستے میں ضرورت پڑے تو اس میں اسٹیک اور پینے کی چیزیں استعمال کر سکے۔ باسکٹ میں بسکٹ سینڈوچز، کافی کا تھرماس اور وہسکی کی بوتل بھی رکھی تھی۔ اس نے باسکٹ گاڑی کے بونٹ پر رکھی اور اس میں سینڈوچز نکال کر کھانے لگا۔ اسے بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ وہ سینڈوچز کھاتے ہوئے سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس اچانک افتادنا گہائی سے کس طرح نمٹنا چاہیے۔ اس کے نزدیک ایک راستہ تو یہ تھا کہ وہ واپس پیدل چلتا جائے۔ آگے شاید وہاں کوئی گاڑی یا آبادی تو ہوگی بلکہ ہونا بھی چاہیے۔ کسی دیہاتی کو معاوضہ دینے سے وہ اپنی تیل گاڑی سے اس کی گاڑی کو باندھ کر شہر کے کسی بھی ورکشاپ تک پہنچا دے گا یا پھر دوسری صورت یہ ہے کہ وہ یہاں تیل گاڑی کا انتظار کرے۔ ممکن ہے دن ڈھلنے تک کوئی تیل گاڑی مخالف سمت سے آ جائے۔ اسے اس لیے کسی تیل گاڑی کے آنے کی امید تھی کہ اس نے سڑک پر تیل گاڑی کے پھیپوں کے نشانات دیکھے تھے جو تاحد نگاہ موجود تھے۔

پچاس برس کی عمر کو پہنچنے کے باوجود وہ ایک تندرست توانا اور چاق و چوبند شخص تھا۔ نوجوان لڑکوں کی طرح سیدھا چلتا تھا۔ دراز قد نے اس کی وجاہت میں بھی بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ لندن پہنچ کر جب اس کی مالی حالت اچھی ہو گئی اور آمدنی میں بے تحاشا اضافہ ہونے لگا تو اس نے عورت اور شراب سے دل بہلانا شروع کیا اور اس کے نزدیک اس سے اچھی تفریح کوئی نہیں تھی۔ اس میں اس نے بڑا حسن کشش اور سنسنی خیزی محسوس کی تھی اس لیے اس نے بیوی بچوں کا جھجھٹ بھی نہیں پالا تھا۔ طبعاً وہ ایک

ہوگا۔“

”کیا کوشش کی جائے، کیا مکینک کو یہاں نہیں لایا جاسکتا۔؟“ کشور نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”میں اسے منہ مانگا معاوضہ دوں گا، میں اپنی گاڑی کی وجہ سے اس ویرانے میں چھوڑنا نہیں چاہتا ہوں کیونکہ یہ بالکل نئی گاڑی ہے اور قیمتی بھی ہے۔“

”اگر مکینک یہاں کسی طرح آ گیا تو وہ یہاں کام کس طرح کر سکے گا؟“ اس دیہاتی نے کہا۔

”کیوں کہ اس کے یہاں پہنچتے پہنچتے شام ہو جائے گی اور پھر اندھیرا پھیلنے لگے گا..... اور پھر یہاں روشنی کا انتظام تو نہیں ہے؟ وہ کیسے کر سکیں گے؟“

”اوہ..... اب میں کیا کروں؟“ کشور آئندہ پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

”اس گاڑی نے تو مجھے بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔“ وہ اپنی بے بسی پر چڑچڑاسا ہو گیا۔

”آپ کو یہ کرنا چاہیے کہ گاڑی کو سڑک کے کنارے کر دیں تاکہ میں اپنا ٹریکٹر لے جا سکوں۔ چلیے ہم دونوں مل کر گاڑی کو ایک طرف کیے دیتے ہیں۔“

”کیا آپ مجھے کسی ایسی جگہ پہنچا سکتے ہیں جہاں کہیں ہوٹل وغیرہ ہو۔“ کشور آئندہ نے کہا۔ ”تاکہ میں رات وہاں گزار سکوں؟“

”آپ کو اتنی دور جا کر رات گزارنے کی خدمت کیا ہے؟“ وہ کہنے لگا۔ ”اگر آپ کچھ خیال نہ کریں اور مناسب کہیں تو رات گزارنے کے لیے میرا غریب خانہ حاضر ہے جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے آپ رات میرے ہاں گزار لیں۔ صبح ہم شہر جا کر کسی اچھے مکینک کو لے آئیں گے اور اسے گاڑی دکھادیں گے۔ وہ اپنی گاڑی میں یہاں آ بھی جائے گا۔ اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں ہے۔“

کشور آئندہ نے ایک ہل میں سوچا کہ اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔ اس شخص کے ہاں رات گزارنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اسے ایک طرح سے اطمینان ہوا۔ پھر ان دونوں نے مل کر سوچا کہ اس کے سوا چارہ نہیں

”کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟“ اس نے بڑے پُر غلوص لہجے میں کہا اور کشور آئندہ پر ایک تنقیدی نظر ڈالی۔

”میں یہاں کسی کی مدد کے لیے کھڑا انتظار کر رہا تھا۔“ کشور آئندہ نے جواب دیا۔ ”اگر آپ نہیں آتے تو شاید رات اس ویرانے میں بسر کرنی پڑتی۔“

”خیریت تو ہے۔“ اس نے گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا آپ کی گاڑی میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے؟“

”جی ہاں۔“ کشور آئندہ نے اپنا سر اثباتی انداز میں ہلا دیا۔ ”معلوم نہیں اس میں کیا خرابی ہو گئی ہے کہ اس کا انجن اچانک ایک گڑگڑاہٹ سے بند ہو گیا۔ کیا آپ انجن کے متعلق کچھ جانتے ہیں؟ اگر جانتے ہو تو پلینڈر آدکھ لیں۔“

”گو میں مکینک تو نہیں ہوں، البتہ تھوڑی بہت شد بد ضرور رکھتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”آپ باسکٹ ہٹائیں تو اس کا انجن ایک نظر دیکھ لوں۔“

کشور آئندہ نے اپنی باسکٹ اٹھا کر نیچے رکھ لی۔ وہ گاڑی کے انجن کا چند لمحوں تک جائزہ لیتا رہا پھر اس نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”گاڑی کے انجن میں ایسی کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے جس کا پتا تو ایک موٹر مکینک ہی چلا سکتا ہے۔ اسے کسی گیراج تک لے جانا ہو گا یا پھر کسی مکینک کو لا کر دکھانا ہوگا۔ میں اسے ہاتھ لگانا اس لیے نہیں چاہتا کہ کہیں کوئی نئی خرابی پیدا نہ ہو جائے۔“

”گیراج یہاں سے کتنی دور ہے؟“ کشور آئندہ نے بے بسی سے پوچھا اور وہ ایک میلے کچیلے لباس میں ملبوس دیہاتی کے سامنے کڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں بھی ایسے کم تر لوگوں کو منہ نہیں لگایا تھا۔ مگر آج تو یہاں سے بہت دور اور شہر کے اندر ہے۔“ اس نے سر کھباتے ہوئے بتایا۔ اسے لے جانے یا وہاں سے مکینک کو لانے میں رات ہو جائے گی اور پھر مکینک تو اس وقت کسی قیمت پر بھی نہیں آئے گا۔ اور پھر وہاں نیچے تک گیراج میں بند ہو چکا

ہونٹوں پر بدستور معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔  
”میں تمہیں سو برس کے بعد بڑی آسان سے پہچان  
سکتا ہوں۔“

”حیرت ہے بلراج؟“ اس کے چہرے پر گہرا  
استعجاب چھا گیا۔

”تم نے مجھے نہیں پہچانا؟ اپنے گہرے دوست  
اشوک مہتا کو.....؟“

”اشوک مہتا؟“ وہ اچھل سا پڑا۔ اس پر جیسی  
کوئی بجلی بھی آگری ہو۔ پھر اس پر سکتہ سا چھا گیا  
کہیں اس کی سماعت کا تصور نہیں ہے؟

اس نے سوچا۔ اس نے خواب و خیال میں نہیں  
سوچا تھا کہ اس کی اشوک مہتا سے اس ڈرامائی انداز  
میں ملاقات ہو جائے گی۔ وہ اس کا مجرم تھا۔ وہ  
قانون اور ان لوگوں کا بھی مجرم تھا۔ جن کی رئیس ان  
کی کمپنی میں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے لندن جا کر  
دولت مند بن جانے کے باوجود اپنے دوست کی خبر  
نہیں لی تھی۔ آج وہی دوست اس کی مصیبت میں  
کام کر رہا تھا۔ جب کہ وہ اپنے دوست کو مصیبت میں  
ڈال کر چلا گیا تھا۔

”کیا سوچنے لگے دوست؟“ اشوک مہتا نے اس  
کا شانہ تھپ تھپایا۔

”پرانی باتیں بھول جاؤ اور ایک اچھے دوست کی  
طرح غلط لگ جاؤ۔“

وہ ایک دم سے چونکا اور بڑی گرم جوشی سے  
اشوک مہتا سے بغل گیر ہو گیا۔ پھر اشوک مہتا نے اس  
سے الگ ہو کر اس کی ندامت بھری آنکھوں میں  
جھانکتے ہوئے کہا۔

”میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ تمہیں نظروں کے  
سامنے دیکھ کر اور میں برسوں کے ایک طویل عرصے  
بعد تم سے مل کر کتنی مسرت ہو رہی ہے۔ مجھے ایسا لگ  
رہا ہے جیسے مجھے بہت بڑی دولت مل گئی ہو۔ ایک اچھا  
اور پرانا دوست کسی دولت سے کم نہیں ہوتا ہے۔ تم  
میرے بہت اچھے دوست رہے ہو۔“

”تم مجھے جتنا چاہو ذلیل کر لو دوست!“ کشور

ہے۔ پھر ان دونوں نے مل کر گاڑی کو سڑک سے ایک  
طرف ہٹایا۔ کشور آنند کی سانس ڈرا سی پھول گئی تھی۔  
اس لیے کہ وہ اس مشقت کا عادی نہیں تھا۔ اس نے  
اپنی سانس پر قابو پانے کے بعد اس دیہاتی سے کہا۔  
”آپ تو میرے لیے فرشتہ بن کر آئے ہیں۔  
میں آپ کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں، سمجھ میں  
نہیں آ رہا ہے۔ آپ نے مجھے ایک بہت بڑی  
افزیت اور کرب سے نجات دلادیا۔ ورنہ کون ہے جو  
اس دور میں کوئی ایک اجنبی شخص کے لیے اس قدر  
مخلص اور سہارا دینے اور اس کی مصیبت میں کام  
آئے۔“

”تم سچ کہتے ہو دوست“ اچانک اس دیہاتی کا  
لہجہ اور انداز مخاطب بدل گیا۔ اس نے کشور آنند  
کے لباس کی پروا کیے بغیر اپنے دونوں ہاتھ اچانک  
اس کے شانے پر رکھ دیئے اور گہری نظروں سے اس  
کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ کشور آنند کو سخت ناگوار  
لگا۔ اگر وہ اس وقت اس شخص کا محتاج نہ ہوتا تو اس  
کے ہاتھ بری طرح جھڑک دیتا۔ اس دیہاتی کے  
ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔

”اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو تم بلراج  
سانیاں ہو.....؟“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔  
”یہی میں کسی کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرتا ہوں۔“

”کیا.....؟“ وہ اس اجنبی دیہاتی کی زبان  
سے اپنا نام سن کر ششدر رہ گیا۔ پھر اس نے کہا۔  
”میرا نام کشور آنند ہے۔ بلراج نہیں ہے۔ غلطی ہوئی  
ہے کسی سے معمولی مشابہت ہو تو آدمی پہچاننے میں  
غلطی کر جاتا ہے۔“

کشور آنند کا ذہن تیزی سے پچیس برس پیچھے چلا  
گیا تھا اسے خیال آیا تھا کہ شاید اس دیہاتی نے اس  
کی تصویر تب اخبارات میں دیکھی ہوگی۔ شاید پولیس  
نے اسے اشتہاری ملزم قرار دے کر اس کی تصویر  
اخبارات میں چھاپی ہو۔ لندن میں شاید وہ اخبار اس  
کی نظر سے گزرے۔

”مجھے کیسے غلط فہمی ہو سکتی ہے۔“ دیہاتی کے

آنند نے اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے کہا۔  
 ”مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میں نے.....“  
 ”نہیں دوست!“ اشوک مہتا نے بڑی تیزی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تو اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ ”نہیں دوست.....! تم اس انداز سے بھولے سے بھی نہیں سوچنا۔ یہ دوستی کی اور اس کے جذبے کی توہین ہے۔ تم نے جو کچھ بھی کیا، وہ بہت اچھا کیا تھا۔ میں ان تمام باتوں کو بھلا چکا ہوں مجھے صرف تم یاد رہے..... اور یاد بھی آتے رہے تھے۔ میں سوچتا رہتا تھا کہ معلوم نہیں میرا دوست کیا ہے اور کن حالات میں ہے۔“

”میں تمہاری تلاش میں ہندوستان آیا ہوں تاکہ ماضی کی اس تلخ کلاہی کی تلافی کر دوں۔ تم میری وجہ سے اس حالت کو پہنچ گئے۔ تمہاری یہ حالت دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے کہ تم ایک مشکل ترین زندگی گزار رہے ہو اور تمہارے حالات نامساعد ہیں۔ میرے پاس آج اتنی دولت ہے کہ تمہارے دن پھیر دوں گا تاکہ تم ایک پرسکون اور خوش حال زندگی گزار سکو۔“ وہ ریاکاری سے بولا۔

”مجھے تمہاری دولت کی نہیں بلکہ دوستی اور محبت کی ضرورت ہے۔ چلو گھر چلتے ہیں“ اشوک مہتا نے کہا۔ ”مجھے تمہاری خدمت کر کے بہت خوشی ہوگی۔“ وہ دونوں ٹریکٹر پر سوار ہو گئے۔ چند لمحے تک ان دونوں کے درمیان گہری خاموشی طاری رہی۔ آخر کشور نے خاموشی کو توڑا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ کشور آنند بولا۔  
 ”مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم کسی زمین دار کے پاس ملازم ہو۔“

”آج میں نہ تو بزنس کر رہا ہوں اور نہ ہی کسی کی ملازمت.....؟“ اشوک مہتا نے مسکرا کے جواب دیا۔

”ایک کسان بن گیا ہوں۔ کھیتی باڑی کرتا ہوں“ میرا ایک چھوٹا سا ناریل کا باغ بھی ہے۔ ایک چھوٹا سا گھر بھی ہے۔ شہر میں ایک اسکول ہے جہاں دن

میں جا کر دوپہر تک پڑھاتا ہوں، میری بیوی بھی اسکول ٹیچر ہے۔ ہماری تین بچے ہیں۔ تین دن ہوئے میری بیوی بچوں کو ساتھ لے کر تعطیلات گزارنے میکے گئی ہوئی ہے۔ میں نے ایک نوکر رکھا ہوا ہے جو کھانا پکاتا ہے۔ ایک ملازمہ ہے جو صفائی وغیرہ کر جاتی ہے۔“

کشور آنند کو اس کا مکان بہت پسند آیا۔ یہ ایک منزلہ مکان تھا۔ نیچے اوپر تین کمرے تھے وہ دونوں رات کے کھانے کے بعد بڑی دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے تھے۔ اشوک مہتا نے اسے بتایا تھا کہ اس نے جیل سے رہا ہونے کے بعد اپنی ماں کے تمام زیورات بیچ کر یہ باغ اور کھیت خرید لیے۔ ایک اسکول میں جزوقی ملازمت کر لی۔ اس کی بیوی بھی اس اسکول میں پڑھاتی تھی۔ ان دونوں نے محبت کی شادی کی ہے۔ اشوک مہتا نے اسے اپنی بیوی اور بچوں کی تصویر دکھائی اس کی بیوی ایک قبول صورت عورت تھی۔ البتہ اس کی دو جوان لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ دوتیوں بہت خوب صورت اور پیارے پیارے سے تھے۔

رات گیارہ بجے اشوک مہتا سونے کے لیے چلا گیا۔ اس کے لیے بالائی منزل کے ایک کمرے میں بستر لگا دیا تھا۔ نیند اسکی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ بڑی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا ہوا سونے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ پروہ بے زار سا ہو کر اٹھا اور کھڑکی میں جا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ آسمان پر چاند اپنی تمام تر لطافتیں اور نرمائیں لیے مسکرا رہا تھا۔ چاندنی رات کا اجالا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ وہ کھڑکی میں کھڑا بڑی دیر تک چاندنی کی سندرتا دیکھتا رہا تھا۔ اس کی نظریں اس کمرے کے چھوٹے سے گھر پر پھیں جو باغ کی ایک کونے میں بنا ہوا تھا اس کے گرد خاردار تاروں کی ایک باڑھنچی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا کہ اسے نیچے جا کر اس مکان تک پہنچ کر آنا چاہیے۔ شاید اس طرح نیند آجائے۔ یہ سوچ کر وہ نیچے آیا۔ گھر سے باہر نکلا آہستہ آہستہ چلتا رہا، اس مکان کی طرف



بڑھا۔

## کتوفی

دہشت

”میں نے سنا ہے کہ تمہاری بیوی بہت خطرناک ڈرائیونگ کرتی ہے۔“ ایک دوست نے دوسرے کہا۔  
”درست ہے“ دوسرے نے اطمینان سے کہا۔

”جس وقت وہ ڈرائیونگ کرتی ہے چوراہے کی سرخ بتی بھی اسے دیکھ کر زرد پڑ جاتی ہے۔“

☆

آہستہ بولو

چارڈاکوریل کے مسافروں کو لوٹ رہے تھے۔ ایک ڈاکو نے ایک مسافر سے پوچھا۔  
”تمہارے پاس کیا ہے؟“  
مسافر نے جلدی سے کہا۔ ”بھائی! آہستہ بولو“  
میرے پاس تو ٹکٹ بھی نہیں ہے۔“

آئین قدرت

قدرت کا یہ مسلمہ آئین ہے کہ جو لوگ قدرت کے آئین کے مطابق اپنی زندگی بنی نوع انسان کی فلاح اور بہبود کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ قدرت ان کے نام کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیتی۔

میں جل ترنگ کی طرح۔

”جی ہاں.....“ کشور آئند نے اثباتی انداز میں سر ہلادیا۔ ”میں آج شام ہی شہر سے ان کے ہاں آیا ہوں۔ وہ میرے دیرینہ دوست ہیں۔“

”جب آپ ان کے مہمان ہیں تو آپ میرے بھی مہمان ہیں۔“ وہ ریلی آواز میں شوخی لہجے میں

اس مکان کے عقبی حصے میں پہنچا تھا کہ چونک کر اور ایک دم سے ٹھٹھک کے رک گیا۔ اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ لیکن اسے ایسا لگا کہ وہ جیسے کوئی سندرسینا دیکھ رہا ہو۔ لیکن یہ پسنا نہیں تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی۔ وہ کوئی عورت تھی جو سفید براق لباس میں ملبوس تھی۔ وہ باڑھ کے پاس کھڑی چاندکی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا انگ انگ اس دھلی ہوئی چادر کے دریا میں نہا رہا تھا۔ اس کے کھلے لمبے لمبے ریشمی سیاہ بالوں میں جیسے چاندنی چمک گئی تھی۔ اس نے اچانک اپنے لمبے سیاہ بال لہرا دیئے تو کشور آئند کو ایسے لگا کہ چاندنی کا بہتا دریا منجمد ہو گیا ہو۔

اس عورت نے کشور آئند کی چاپیں سن کر اس کی طرف مڑ کے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ ٹھٹھکی اور پھر بے خوف سی ہو کر اس کی طرف بڑھی اور اس سے چند قدم پر رک گئی۔ کشور آئند نے اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھا تو ششدر سا رہ گیا۔ وہ جتنی حسین تھی اتنی ہی پرکشش بھی تھی۔ اس کے پر شباب گداز بدن میں بڑی جاذبیت اور دلکشی تھی۔ انگ انگ سے مستی ابلی بڑنی تھی۔ اس کے حسن جہاں سوزنے اس کے دل پر چلی گرا دی تھی۔ اس کا مہین لباس بھی شعلے کی طرح آج دے رہا تھا۔ اس کے لمبے سیاہ بالوں اور بھرے بھرے گداز اور سیلے ہونٹوں اور کالی آنکھوں کے بے پناہ حسن اور گہرائیوں نے اسے اسیر بنالیا تھا۔ اس سفید لباس نے اسے بے نام تلوار کی طرح کر دیا تھا اور اس کی کمان کی طرح نئی ہوئی گردن نے اس کے دل میں ایک کھلبلی سی مچا دی تھی پھر اس نے کشور آئند کو ایسی نظروں سے دیکھا جس میں ان جانی دعوت تھی۔ جسم کے تناسب اور نشیب و فراز نے اسے لیون کی یاد دلادی تھی۔ اسے دیکھ کر جرمین یاد آگئی تھی وہ کسی خیال کے زیر اثر رک گیا۔ اشوک مہتا کی رشتہ دار سمجھ کر اس نے خود پر بدقت تمام قابو پایا تھا۔

”کیا آپ اشوک مہتا کے مہمان ہیں۔.....؟“  
اس کی آواز بھی اس کی طرح ریشمی تھی۔ خاموش فضا

بولی۔

”آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائیں تاکہ میں آپ کی کچھ سیوا کر سکوں“ اس نے مکان کی طرف اشارہ کیا۔ ”شاید آپ کو نیند نہیں آرہی ہے؟“

”آپ کے ساتھ کون رہتا ہے؟“ کشور آئند کو اس دعوت کی توقع نہیں تھی۔

”کوئی بھی نہیں..... میں اکیلی ہی رہتی ہوں۔“

اس نے کشور آئند کو تکیسی نظروں سے دیکھا۔

”میں نے کسی وجہ سے شادی نہیں کی۔ ایک کنواری عورت ہوں۔“ کشور آئند کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس کی باتوں میں جہان خیزی تھی۔ اسے کسی وجہ سے تامل سا ہوا تھا۔

”نیند آپ کو بھی نہیں آرہی ہے اور مجھے بھی نہیں۔“ وہ اس کے قریب آ کر بولی۔

”کافی بنا کر پلا دوں گی۔ جب تک نیند نہیں آتی باتیں کرتے رہیں گے۔“ وہ اس کے قریب کھڑی کسی آتش فشاں کی طرح دھک رہی تھی۔ اس پر کسی پرانی شراب کا سا خمار چھانے لگا۔

جب وہ اس عورت کے ساتھ اس کے مکان کی طرف بڑھا تو اس کے سارے جسم میں اس خیال سے خون کی گردش تیز اور اس کی حدت بڑھ گئی کہ یہ اس مکان میں اکیلی رہتی ہے اور غیر شادی شدہ بھی ہے۔ یہ کوئی سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی نہ تھی۔ چوبیس پچیس برس کی تھی۔ اس کے لیے یہ بڑی حیرت کی بات تھی کہ وہ ابھی تک غیر شادی شدہ اور کنواری بھی تھی۔ ایسی حسین عورت نے شادی کیوں نہیں کی جو لاکھوں میں ایک ہے۔ وہ بڑے اعتماد سے اسے اپنے گھر لے جا رہی تھی۔ شاید اس بات کا اندازہ تھا کہ چونکہ وہ اشوک مہتا کی جان ہے اس لیے اس پر کوئی آج نہیں آئے گی۔

وہ ایک کمرے کا مکان تھا۔ کمرہ بہت بڑا تھا۔ اس مکان کے اندر ایک چراغ جل رہا تھا۔ ایک کونے میں بستر تھا۔ کرسی وغیرہ کوئی نہیں تھی۔ اس لیے اسے بستر پر بیٹھنا پڑا تھا۔ کمرے کے ایک کونے

میں کیروسین آئل کا چولہا تھا۔ ریک پر برتن قریب سے رکھے ہوئے تھے کھانا پکانے کے لوازمات وغیرہ بھی تھے۔ وہ کافی بنانے لگی تو اس عورت کو دیکھتا رہا۔ اس میں کپکپھل جیسا رسیلا پن تھا۔ وہ اس سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ ایک طرح سے اس پر ریشہ طبعی ہو گیا تھا۔ پھر وہ دو کپ کافی بنا کر لے آئی۔ ایک کپ اسے اور دوسرا کپ لے کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

اس نے عورت کے ہاتھ سے کپ لینے کے بعد پوچھا۔ ”شیرینی جی! آپ کا نام کیا ہے؟“

”میرا نام.....؟“ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور پھر بولی۔ ”پورنیا“

”جس طرح آپ کا نام ہے اسی طرح آپ حسین بھی ہیں۔“ اس نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے جانا چاہا تو وہ جانہ سکا۔ تنہائی میں پورنیا کے سحر نے اسے جکڑ لیا تھا۔ اس میں جو خود سپردگی اور وارفتگی تھی وہ اس نے آج تک کسی عورت میں نہیں پائی تھی۔ اسے ہر طرح خوش کیا تھا۔ اس کی کسی بھی من مانی پر اف تک نہیں کیا تھا۔ جب وہ رات کے آخری پہر جانے لگا تو اس سے بولی۔

”دیکھیں گے..... مجھ سے ملاقات کا ذکر آپ بھولے سے بھی اشوک مہتا سے نہ کریں۔ وہ نہیں چاہتے ہیں کہ میں کسی سے ملوں۔ آپ کل رات میں آئیں گے نا.....؟“

”ضرور آؤں گا۔“ وہ شونی سے بولا۔

”بلکہ میں جب تک یہاں رہوں گا میں اشوک مہتا کے فرشتوں کو بھی ہوا لگنے نہیں دوں گا۔“

کشور آئند مختلف حیلے بہانے سے ایک ہفتہ تک اشوک مہتا کے پاس رکا۔ وہ پورنیا کے پاس رات کے وقت جاتا اور سورج نکلنے سے پہلے چلا آتا تھا۔ اشوک مہتا کو ایک روز بھی شک نہیں ہوسکا تھا کہ اس کا دوست رات کو کیا کھیل کھیل رہا ہے۔ وہ پورنیا کو یہاں سے لے جانے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ پورنیا نے اسے بتایا تھا کہ اشوک مہتا اور اس کی بڑی بہن نے

اس کی گاڑی ٹھیک ہو کر پانچ دن پہلے ہی آ گئی تھی۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ اشوک مہتا کسی کام سے شہر جائے اور وہ پورنیا کو لے اڑے۔

ایک رات رات کے کھانے سے فراغت پانے کے بعد اشوک مہتا اس سے بولا۔

”میں تمہیں ایک زحمت دینا چاہتا ہوں۔ جس روز تم بمبئی جاؤ اس روز پورنیا کو اپنے ساتھ.....“ اس نے درمیان میں اشوک مہتا سے انجان بن کر حیرت سے پوچھا۔

”یہ پورنیا کون ہے.....؟ کہاں رہتی ہے.....؟ اس کا نام یہی بار سن رہا ہوں۔“

”پورنیا میری ماں ہے اور باغ میں بنے ہوئے کھل کے مکان میں رہتی ہے۔“

وہ کہنے لگا۔ ”وہ بے حد حسین جوان اور پر شاب ہے۔ وہ اپنے حسن جہاں سوز سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے بمبئی گئی تاکہ فلم کی ہیر وئن بن سکے۔ وہ

ہیر وئن نہ بن سکی۔ اس لیے کہ وہ ایک عیاش اور بدکار فلم ساز کے ہتھے چڑھ گئی۔ پھر ایک روز وہ فلم ساز

در دناک موت مر گیا۔ مرتے مرتے اس نے پورنیا کو ایک عذاب ناک تحفہ دے دیا۔“

”کیا تحفہ.....؟“ کشور آنند نے چونک کر پوچھا۔

”ایڈز کا..... وہ ایڈز کی مریضہ ہے۔ اس نے یہ

تحفہ کئی مردوں کو دیا جو یقیناً اس دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ ساری دنیا کے مردوں کو یہ تحفہ دے کر ان سے انتقام لینا چاہتی ہے اور..... اور.....“

وہ اس سے آگے ایک لفظ بھی سن نہ سکا، اس کا سر چکرایا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندیرا چھانے

لگا۔

☆.....

اسے ایک طرح سے قید کر رکھا ہے۔ اس کے گھر سے نکلنے پر سخت پابندی عائد کر رکھی ہے۔ گھر کے نوکر سارا دن اس کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اشوک مہتا نے قرب وجوار کے لوگوں سے یہی کہہ رکھا تھا کہ اگر اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تو اسے پکڑ کر یہاں لے آئیں۔ اس نے تنگ آ کر دو ایک مہینہ فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن وہ پکڑی گئی تھی۔ میاں بیوی نے مل کر اس کی ایسی زبردست پٹائی کی تھی کہ وہ تین دن تک بستر سے لگی رہی تھی۔ پکڑے جانے اور پٹائی کے خوف سے اس نے فرار ہونے کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔ اس لیے اب وہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہیں کرتی ہے۔ اس پر ظلم و ستم اس لیے روا رکھا ہے کہ وہ اشوک مہتا کی بیوی کی سوتیلی بہن ہے۔ اس کی بہن اس کے حسن و شباب سے جلتی ہے۔ ایک طرح سے وہ اس سے کسی بات کا انتقام نہیں لے رہی ہے۔ اسے ناکردہ باپ کی سزا مل رہی ہے۔ پورنیا اس کے قدموں پر گر پڑی تھی۔ گڑ گڑائی تھی اور وہ اس سے منت سماجت بھی کرتی تھی وہ اسے اس جہنم سے نکال لے جائے۔

اس نے پورنیا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے یہاں سے ہر قیمت پر نکال کر لے جائے گا۔ بمبئی پہنچ کر وہ

دونوں لو میرج کر لیں گے۔ اس نے یہ فیصلہ اس لیے

کیا تھا کہ اس کی زندگی میں آج تک ایسی بھرپور عورت نہیں آئی تھی۔ کسی عورت نے اسے اتنا خوش

نہیں کیا تھا جتنا پورنیا نے کیا تھا۔ اب وہ اسی لا جواب عورت کی رفاقت میں زندگی گزار دینا چاہتا

تھا۔ اسے ایسی حسین اور جوان عورت اس عمر میں نہیں مل سکتی تھی۔

پھر حالات نے اسے ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا

کر دیا کہ جہاں وہ اشوک مہتا کو دھوکا دینے پر مجبور ہو رہا تھا۔ اب اس کے سوا چارہ ہی نہیں رہا تھا کہ

اپنے دوست کی آنکھوں میں دھول جھونک سکے اور

پورنیا کو یہاں سے نکال کر لے جائے اس کے لیے

پورنیا کو یہاں سے لے جانا ایسا مشکل ہی نہیں تھا۔

## اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر



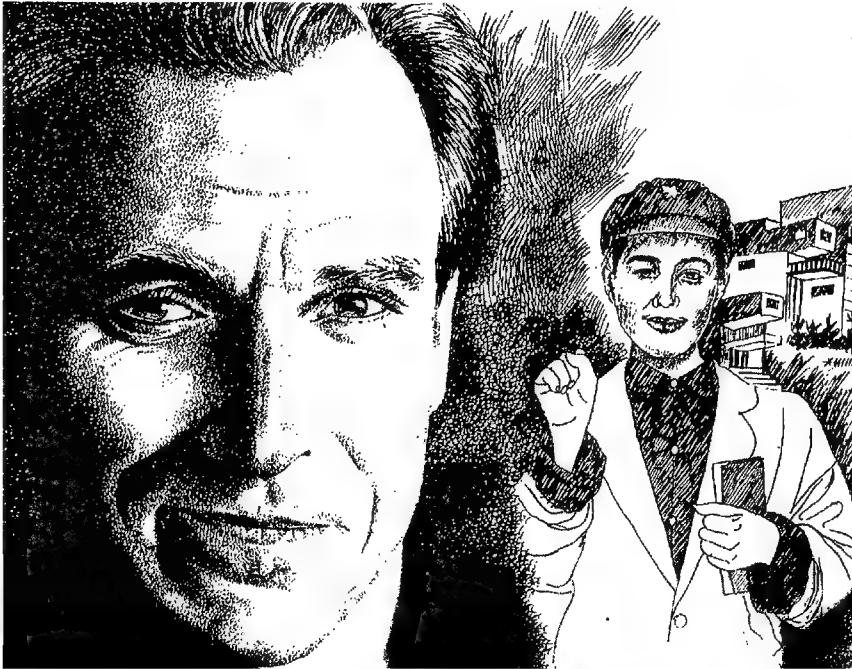
ایم الیاس

اور میں سوچ رہا تھا آخر وہ اتنے انوکھے انداز سے پیش کیوں آرہی تھی۔ وہ نقاب الٹ کر میری طرف کیوں نہیں دیکھتی..... میں نے قصداً اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ اگر وہ انوکھے انداز میں پیش آسکتی تھی تو میں بھی جواباً ایسا کر سکتا تھا۔ پھر اس نے کچھ دیر کے بعد پھر گفتگو شروع کی۔

## اس شمارے کی ایک دلگداز کہانی

اور بظاہر بے خطر نظر آنے والے خوف ناک دلی علاقوں کے قریب مجھے جانا پڑتا تھا۔ وہاں بڑی غربت اور افلاس بھی تھا لیکن وہاں کے ملائی حسن نے مجھے بڑا مسحور کیا تھا۔ حسن کہاں نہیں ہے۔ ہر

**اقوام** متحدہ کی جانب سے مجھے ملایا میں تعینات کیا گیا۔ میں نے وہاں چھ ماہ کا عرصہ اس طرح سے کاٹا جیسے وہ کالا پانی ہوا اور صدیوں کی طرح ہوں۔ وہاں کے ہرے بھرے جنگوں



جگہ ہے ان کی اپنی الگ رادیت ہے میں اس قماش کا ہرگز نہیں تھا کہ ان کے حسن و شباب اور گداز جسم کی رعنائیوں نے مسحور کیا تھا کہ فائدہ اٹھاؤں۔ انہیں مجبور کروں۔ میں نے جھوٹ سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں سوچا نہیں تھا لیکن میں پھر بھی ان کے مہربان ہونے اور فیاضی سے بچ نہ سکا تھا۔ اس لیے کہ مٹی کا تودہ نہ تھا۔

جب مجھے دفتر سے اچانک بلاوا آ گیا۔ وہ شاید مجھے کسی اور جگہ تعین کرنا چاہتے تھے تب میں نے دل میں شکر ادا کیا..... مجھے سنگاپور سے بحری جہاز میں سوار ہونے کے لیے کہا گیا۔ اس لیے کہ کسی بھی جہاز میں سفر کرنے کے لیے دو مہینے کی تاخیر کا اندیشہ تھا..... پھر مجھے ایک جہاز میں جگہ مل گئی۔ میں جو کہانی سن رہا ہوں وہ تیس برس قبل کی ہے۔ ان دنوں جو جہاز تھے وہ آرام دہ نہ تھے اور نہ ہی جدید کم کے بلکہ ان سے سفر کرنا قدرے غیبت تھا۔ دیکر دوسری سہولتیں جو وہ گئی گذری نہ تھیں۔

میرا کیمین تنگ و تاریک ہونے کے علاوہ انجن روم سے متصل تھا جس کے باعث کمرے میں انجن کا شور اس طرح سے گونجتا تھا جیسے وہ انجن روم میں ہو..... اس کے علاوہ گرمی اور جس ایسا تھا جیسے بواکرم میں ڈال دیا گیا ہو۔ اس لیے میں اپنے کیمین سے نکلا اور عرشے پر آ گیا۔ یہاں تیز تازہ ہوا تھی جس نے میرے سارے بدن میں فرحت کی لہر دوڑادی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں عرشے پر بہتر ڈال رات گزار دوں۔ دن کی فکر نہ تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح کٹ جائے گا۔ عرشہ اتنے کنڈیشنڈ کمرے کی طرح لگا تھا۔

کھلی فضا اور سمندر کے بدلنے ہوئے رنگ دیکھتا رہا۔ یہاں ایک حسین شام کا سیاسیاں تھا۔ بڑی رنگین تھی۔ عرشے پر جو گہما گہما تھی۔ مسافر ایک دوسرے سے گفتگو میں منہمک تھے۔ کرسیوں پر براجمان حینوں کے مترنم اور ہلکے ہلکے تھپتھپانے

میں جیسے موسیقی بکھر رہے تھے اور پھر مرد مسافروں کے عام شور و غل اور بے ہنگم اور بھونڈے قہقہے جس نے ایک عجیب ہنگامہ برپا کر دیا تھا اور گوشوں میں مرد اور عورتیں چپک اور بہک رہی تھیں..... ”تم سے مبر نہیں ہوتا..... کسی نے دیکھ لیا تو..... چلو..... کیمین میں۔“

یہ ایک عورت کی نفرتی آواز میں سرگوشی تھی۔ مرد نے کہا تھا۔ ”جہنمیں اس حالت میں عرشے پر نہیں آنا تھا۔ ورنہ کسی مرد کے ہاتھوں.....“ ایسے ہی جیلے اور سرگوشیاں میری رگوں میں سنسنی دوڑا رہے تھے۔ میرے جذبات میں ہل چل سی ہونے لگی۔ اس وقت مجھے تنہائی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ پھر مجھے وہ گرم جوش لڑکیاں عورتیں یاد آنے لگیں جن کے ساتھ بیٹے لمحات اور دن اور گھڑیاں یاد آنے لگیں۔ پھر مجھے وہ امریکی سیاح جوان لڑکیاں عورتیں یاد آئیں جو اکیلی سفر کر رہی تھیں۔ ان کے ساتھ نہ تو کوئی مرد نہ تھا۔ وہ میرے لیے مسئلہ یہ تھا کہ میرا کیمین ایک عام قسم کا تھا اور دوسرا میں ان کی سے نوشی اور ڈنر اور نفریمات پر خرچ کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔ ان کی دوستی اور فیاضی میرے لیے مہنگی پڑتی۔ اس لیے کہ میں ہر صورت میں ہر صورت میں رقم پس انداز کرنا چاہتا تھا۔ یوں بھی یہ امریکی سیاح لڑکیاں عورتیں گراں نہیں گزرتیں لیکن وہ اتنی حسین پرکشش اور پرشباب نہ تھیں جو میں ان کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ شاید وہ اس لیے تنہا تپاش اور سے نوشی میں وقت گزارتی دکھائی دیتی تھیں۔ گو کہ انہوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ایک ایشیائی عورت سے مجھے دو ایک مرتبہ گفتگو کرتے پا کر میری طرف پیش قدمی نہیں کی تھی۔

میں اسی برس کے عرصے میں براہ اور سیام کے علاقوں میں بھی تعین رہا تھا جو میرے لیے ایک اجنبی دنیا تھی۔ میرا ذہن ہر قسم کے جذبات

تین دن تک میں نے بڑے جبر اور صبر سے کام لیا اور دوسرے مسافروں سے بے پردا سمندر کے نظارے میں محو رہا۔ قمار بازی، شراب، لکی گیم سے دور رہا جس میں جیتنے پر ہزاروں ڈالر ملتے تھے۔ مجھے ہزاروں اور لاکھوں ڈالروں کی خواہش اور ہوس نہ تھی۔ میں جانتا ساحل پر اتروں تو میری جیب میں میکی کا کرایہ بھی نہ ہوگا۔

جہاں تک مسافروں کا تعلق تھا میں اس عرصے میں ان کے چہروں سے اکتا گیا تھا۔ میں ان کے متعلق بہت کچھ جان چکا تھا اور میرا دل ان کی رفاقت تھا..... عورتوں کے مسلسل کھسکھس اور رخصت پر جانے والے فوجی افسروں کی پیمپسی اور اکتا دینے والی میرے لیے انتہائی اذیت ناک تھیں۔ اب میرے پاس سوائے اپنے کمرے کے اور کوئی جگہ نہ تھی۔ میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد لوٹا تو رات کے اور اس کے بعد رقص سے بچنے کے لیے جو رقص کم جسمانی نمائش زیادہ اور عورتیں بھی بڑے ذوق و شوق سے دیکھتی تھیں اور ان کی بے ہودہ اور خوش حرکات سے ابکائی آتی تھی۔ میز کی کچھ بوتلیں ساتھ لے آیا۔ دن کا زیادہ حصہ بے خودی کے عالم میں بارہ گھنٹے سونے کا پروگرام بنالیا۔ اس سے اچھا وقت گزاری کا وقت کوئی اور نہ ہوتا تھا۔

میں جس وقت بیدار ہوا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ میرے کمرے کی ہوا پہلے سے زیادہ کدڑ ہو رہی تھی۔ حالانکہ میں نے دروازہ اور سمندر کی جانب کھڑکی کھلی رکھی تھی۔ پنگھا گرم ہوا دے رہا تھا۔ اس لیے میں نے بند کر دیا۔

لیکن ذرا سی دیر میں شرابور ہو چکا تھا جیسے میں سمندر میں تیر کر نکلا ہوں۔ زیادہ دیر تک سونے سے نہ صرف طبیعت بوجھل ہو گئی تھی بلکہ سرگرمائی محسوس کرنے لگا۔ اس لیے میں نے جہاز کے عرشے کا رخ کیا جو اس وقت سنسان اور

و تاثرات سے معمور تھا میں ان عورتوں کے متعلق سوچتا رہا تھا جنہوں نے مجھے بڑی فیاضی اور وارفتگی سے سرفراز کیا تھا۔ اس لیے مجھے اکیلے ہونے کا احساس محرومی نہ تھا۔ وہ میرے خلا کو پر کرتی رہی تھیں۔ ان میں میری ماتحت لڑکیاں عورتیں نہیں تھیں۔ میں حیران بھی ہوا کرتا رہا تھا کہ جب کہ میں نے بھی پیش قدمی نہیں کی اور نہ ہی اس قماش کا تھا۔ میں نے ان سے جتنا دور رہنے کی کوشش کی وہ اتنا ہی غریب ہوتی گئی تھیں۔ میں نے اس لیے کفران نعمت نہیں کی تھی۔ جب پکا پھل آپ ہی آپ جھولی میں گر پڑے تو اسے کیوں نہ کھایا جائے۔

وہ لڑکیاں اور عورتیں جو میری زندگی میں آئی تھیں وہ عام قسم کی نہ تھیں۔ بیس برس سے تیس برس کی..... میں ان کے متعلق آسودگی اور اطمینان کے ساتھ سوچتا جا رہا تھا کہ ان کی یادوں سے سفر خوش گوار کروں لیکن اس شور و غوغا میں سکون کی تلاش محال تھا۔ میری جوتھائی کی ریفیڈ بنی تھیں ان میں ایک شادی شدہ عورت تھی جس کی اولاد نہ تھی..... اس کا شوہر نہ تو اسے طلاق دیتا تھا نہ دوسری شادی کرتا تھا..... اس کی نصف تن خواہ لے کر عیاشی کرتا تھا۔ اپنی دہشتہ پر خرچ کرتا تھا۔ دوسری جو دو جوان لڑکیاں تھیں اپنے منگیتروں کے ظلم و ستم کا نشانہ بن رہی تھیں۔ وہ بلیک میل کر کے ان کی بھی نصف آمدنی ہڑپ کر رہے تھے۔ ان پر مجھے بڑا رحم آتا تھا۔ میں نے ان سے نجات پانے کی تدبیر بتائی تھی۔ کسی پیرے کو کچھ رقم دے کر ان کے کمروں میں رات کے وقت زہریلے سانپوں کو چھوڑ دو..... انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ ان سانپوں نے انہیں ڈس لیا تھا اور انہوں نے نجات حاصل کر لی تھی۔ اس لیے بھی ان پر کوئی شک نہیں کیا گیا تھا کہ وہاں زہریلے اور مہلک سانپوں کی بہتات تھی۔ ایسے واقعات وہاں اکثر و بیشتر پیش آتے تھے۔

ویران پڑا تھا۔ رات خنک اور روح پرور تھی اور میں دور دراز کے جزیروں سے معطر..... چند لمحوں میں میرا پسینہ اور لباس خشک ہو گیا۔ میں نے اپنے کیبن کے عقب میں اس چالیس برس کی سیاہ امریکی عورت کو ایک جھٹی ملاح کی آغوش میں دیکھا جو بائیس برس کا تھا۔ امریکی کیتا ایک افریقی لڑکے کو ہر طرح سے خوش کر رہی تھی۔ میں ایک طرف ہو گیا کچھ دیر بعد اس امریکی کیتا نے لباس پہننے کے بعد کہا۔

”تم نے دل بہت خوش کر دیا۔ تم کل اس وقت بستر لے کر یہاں آ جانا..... اس لیے کہ میرے بوڑھے شوہر کا ایک دوست بھی اپنی بیوہ کے ساتھ سفر کر رہا ہے..... یہ لوسوڈالر..... میں تمہیں کل بیس ڈالر بخش بھی دوں گی۔“

لڑکا خوش ہو گیا۔ اس نے بستر سے قمیص اٹھا کر جیب میں نوٹ گھونسا اور بولا۔ ”میڈم..... میں کل آپ کا یہاں انتظار کروں گا۔“

امریکی کیتا جنوب کی سمت چلی گئی جہاں بار تھا۔ لڑکا لباس پہن کر خوشی سے گنگنا تا ہوا بستر اٹھا کر زینے کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے امریکیوں سے شدید نفرت تھی۔ ان کے متعلق میری رائے اچھی نہ تھی۔ مرد کیا..... لڑکیاں اور عورتیں بھی بدچلن، فاحشائیں اور داشتادوں سے بھی گھٹیا ہوتی تھیں۔ یہ ڈالر سے ساری دنیا کا امن چین..... سکون..... خمیر اور آزادیاں خرید رہے تھے۔ ان کی عورتوں کا کوئی کردار نہیں تھا۔ انواں متحدہ کے دفتر کی ایک امریکن ڈائریکٹر جو ہائیسبرگ میں تھی تو کوئی دن نہیں جاتا تھا اٹھارہ سے بیس برس کے لڑکے اس کے کمرے میں رات گزارتے تھے۔

میں رات کی آغوش میں لیٹ کر سمندر کا نظارہ کرنا چاہتا تھا۔ ان کے غلامت کے دلدل سے نکل کر جانے کے بعد سکون ہی سکون تھا۔ آرام دہ کرسیاں بند کر کے رکھ دی گئی تھیں اور

میری دسترس سے باہر تھیں۔ ایک کرسی بھی میں نکال نہیں سکتا تھا۔ کوئی ملاح یا ملازم کا گزر ہوتا تو میری مشکل حل، ہو جاتی۔ اس سنسان جگہ پر میرے سونے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ کسی ملازم اور ملاح کے گزر کا کھڈی دور دور تک امکان نہیں تھا۔ اس لیے میں رسوں کو بھلا نکلتا ہوا جہاز کے اگلے حصے پر جا پہنچا اور الوہے کے کٹھن پر سر رکھ کر دیر تک جہاز کو لہروں میں راستہ بناتے ہوئے دیکھتا رہا..... لہروں کی موسیقی سے لطف اندوز ہوتا رہا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر جانے لگتی دیر تک اس حالت میں کھڑا رہا۔ کسی چٹان کی طرح ایستادہ میں وقت کی حرکت سے بے نیاز تھا۔ صرف ایک چیز جس کا مجھے احساس تھا وہ ایک طرب خیز سرور تھا۔ میں خوابوں میں اور سرسبز و شاداب وادی میں کھوسا گیا۔ وہ لڑکیاں اور عورتیں میرے چشم تصور میں تھیں جو میری زندگی میں آئی تھیں لیکن اس سحر آفرین تصور کو چھوڑ کر اپنے لمحہ نما کمرے میں جانے کے لیے میں کسی قیمت پر جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ ایک عفریت سے کم نہ تھا جو کسی ناگ کی طرح ڈستا۔ پھر میں نے اور آگے جانے کی غرض سے قدم بڑھایا..... بمشکل دو قدم چلا تھا کہ میں نے اپنے پیروں کو ایک گانڈھ سے ٹکراتا محسوس کیا تو اس پر بیٹھ گیا اور پھر اپنے آپ کو رات کے شمار آگئیں کیفیت کے سپرد کر دیا۔

پھر میں ان رنگین لمحات کے تصور میں غرق ہو گیا۔ دوسرے لمحے کسی کے کھانسنے کی آواز سن کر بڑے زور سے چونکا۔ یہ آواز میرے قریب سے آئی تھی۔ آنکھیں جب قدرے تاریکی سے مانوس ہو گئیں تو میں نے قریب ہی عینک کے شیشوں کی چمک دیکھی..... عینک سے ذرا نیچے تمباکو کا دھواں دیکھا جو بظاہر بائپ میں سے اٹھ رہا تھا..... وہاں بیٹھنے سے قبل میں سمندر اور کھٹکشاں کا نظارہ بھی دیکھا تھا۔ چوں کہ میں ماضی کے تصور میں غرق تھا اس لیے ہم نشیں سے

سیکنڈ کے لیے دیاسلائی کی روشنی ہوئی اور ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔

اب ایک بالکل اجنبی صورت میرے سامنے تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ جسے میں نے اب تک نہ تو کھانے کے کمرے میں تھا اور نہ ہی فرشتے پر..... اگر میں نے اسے یا کسی بھی مسافر کو ایک نظر دیکھ لیا ہوتا تو وہ اجنبی نہیں لگتا۔ میں نے جو بات محسوس کی اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر وحشت زدہ اور دیران دکھائی دیا۔ اس کی آنکھوں میں سے مردنی جھانک رہی تھی۔

شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے چہرے کے نقوش روشنی کے اس مختصر وقفے میں زیادہ ابھر آئے تھے۔

چوتھراں کے کہ میں اس کے چہرے نقوش بخوبی دیکھ پا رہا تھا روشنی بجھ گئی اور اندھیرا چھایا گیا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ پھر وہ واحد چیز جو مجھے دکھائی دے رہی تھی وہ پائپ کی مدھم روشنی اور اس پر بھی کبھار چھنے والے ہینک کے پیشے تھے۔ ہم دونوں کے درمیان خاموشی کی دیوار تھی۔ ہم دونوں مہربان لب تھے۔ لمحہ بہ لمحہ خاموشی استوائی علاقوں کی طرح گراں اور بوجھل ہو رہی تھی۔

آخر میں کب تک پتھر کے بت کی طرح کھڑا رہتا۔ آخر اسے شب بخیر کہہ کر میں واپس ہونے لگا تو اس فوراً ہی بوکھلا کر جلدی سے کہا۔

”معاف کیجیے گا..... پلیز! اس بات کا کوئی خیال نہ کیجیے گا..... میں آپ کو ایک زحمت دینا چاہتا ہوں۔“ وہ کس لینے رکا..... میں نے اس کی طرف حیرت سے اور سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ دوسرے لمحے قدرے جھجکا۔

”چند ذاتی..... انتہائی وجوہ کی بنا پر میں یہاں چھپا ہوا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ سفر کے دوران میں نے کسی شناسائی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نہ صرف آپ کا انتہائی ممنون اور احسان مند ہوں گا کہ..... آپ کسی سے بھی اس

ہراس کا پرتو اس تمام وقفے میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا ہوگا۔ اس کی موجودگی سے بے خبر رہا۔ اپنے گرد و پیش کا خفیف سا جائزہ لینے کے بعد اپنی جگہ کو اپنی آمد کو اس اجنبی کے لیے بے جا مداخلت تصور کرنے لگا۔ اس کی یہاں موجودگی کو کہ مجھے پراسراری لگی پھر میں نے اپنی زبان میں اس سے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔

”مجھے اس بے جا مداخلت کے لیے معاف کیجیے گا۔ اندھیرے کے باعث میں آپ کو دیکھ نہ سکتا تھا۔“

اس نے اپنی زبان میں ٹھینٹھیری ہی زبان کے لب و لہجے میں جواب دیا۔ ”نہیں..... نہیں..... کوئی بات نہیں۔“

جیسا کہ مجھے اس کی یہاں موجودگی مجھے پراسراری لگی۔ اس وقت رات کی تاریکی میں واقعی اس کا قرب عجیب اور پراسرار محسوس ہونے لگا۔ میری نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں اور میرا اندازہ تھا کہ اس کی نگاہیں کی گرفت میں میرا چہرہ ہے۔ مجھے آنکھیں پھاڑ کر اس طرح سے دیکھ رہا ہے جیسے میرا یہاں آنا پراسرار محسوس ہو رہا ہو۔

کس منظر کی تاریکی کی وجہ سے ہم دونوں کے چہرے ایک دوسرے کو دھندلے خاکے کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔

میں اس کی دھیمی سانس اور دھیمے سس کی آواز تک سن سکتا تھا اور خاموشی پراسراری ہونے لگی۔

پھر میں نے خاموشی کو ناقابل برداشت کیا تو سوچا کہ اب میں یہاں بیٹھ کر کیا کروں۔ کہیں اور جا کر سمندر اور کھلکھلاؤں کے نظارے ماضی کی یاد میں بسریوں نہ ہو جاؤں۔ پھر میں اٹھ کر چلنے لگا تو اس خیال سے رک گیا کہ اب اس سے کئے بغیر چلا جانا بد اخلاقی کے مترادف ہوگا۔ پھر میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ دو ایک



بات کا تذکرہ نہ کریں کہ آپ نے مجھے اس جگہ دیکھا ہے..... میں ایک بار پھر عرض کر دوں کہ کچھ انتہائی ذاتی وجوہ کی بنا پر میں جہاز کی گہمی اور چہل پہل اور رنگینی اور رونقوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر مجبور ہوا ہوں..... اور اگر آپ کسی سے یہ تذکرہ کریں گے کہ میں اتنی رات گئے جہاز کے اس حصے پر موجود تھا تو یہ امر..... میرے لیے انتہائی تباہ کن ثابت ہوگا۔ ایک ہم دماغی کی طرح۔“

اس اجنبی سے اپنی ملاقات کا کسی سے ذکر نہ کرنے کا وعدہ بہر حال پورا کیا..... لیکن اس مسافر کے بارے میں میرا تجسس بڑھتا گیا۔ میں نے جہاز پر سفر کرنے والوں کی فہرست صرف اس خیال سے چھان ماری کہ شاید مجھے کوئی ایسا نام مل جائے جو اس سے مناسبت رکھتا ہو۔ میں ہر مسافر کی طرف تجسس سے دیکھتا تھا کہ شاید کسی کو اس کے بارے میں کچھ علم ہو۔ تمام دن میں بے چین رہا..... رات کا بے تابی سے انتظار کرتا رہا۔ میرا ارادہ رات کو پھر اس سے ملنے کا تھا..... دراصل مجھے نفسیاتی معصوم سے ہمیشہ بڑی دل چسپی رہی ہے۔ کسی پر اسرار آدمی سے ملاقات میں مجھے خاصا لطف ملتا ہے اور میں اس کے اسرار کی تہ تک پہنچنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہوں۔

یہ رات بھی گزشتہ رات کی طرح تاریک تھی۔ سمندر ٹھانڈا تھا۔ پھر میں نے سرگوشیوں میں محسوس کیا کہ امریکی کتیا اس افریقی لڑکے کے ساتھ واپس جا رہی ہے..... مطلع صاف تھا اور آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے۔ وہ کسی نئی نیلی دہن کی مانند دکھائی دیتا تھا۔ پہل رات کی طرح میری طبیعت ٹھنڈا حال نہیں تھی۔ میں تازہ دم سا تھا۔ میرے قدم خود بخود جہاز کے اگلے حصے کی طرف اٹھ رہے تھے۔ ایک تجسس سا تھا کہ وہ اجنبی مسافر وہاں موجود ہوگا

بھی یا نہیں..... اور جب میں اس جگہ کے قریب پہنچا تو جہاں وہ گزشتہ شب ملا تھا۔ مجھے ایک سرخ سی عقی وہاں جلتی ہوئی چیز دکھائی دی۔ یہ اس اجنبی کا پائپ تھا اور وہ وہاں موجود تھا۔

پھر میں وہاں غیر ارادی طور پر رک گیا۔ میں نے وہاں سے واپس جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ وہ بھانپ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے میرے پاس آ کر معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے آپ واپس جا رہے ہوں..... کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ آپ کچھ دیر کے لیے میرے پاس بیٹھ جائیں۔ آج میری طبیعت نہ صرف بڑی مشکل سی ہے بلکہ میں بے قرار سا ہوں۔“

”نہیں..... نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں اس لیے واپس جا رہا تھا کہ میں نے بھانپ لیا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں مداخلت آپ کی ناگواری کا سبب بنے۔ آپ کو تنہائی اور آرام کی سخت ضرورت ہے۔“ ”جی نہیں..... یہ بات نہیں۔“ اس نے فوراً ہی کہا۔ ”کچھ دیر کے لیے کسی رفاقت کا احساس میرے لیے بہت ضرور کن ہے..... اس لیے کہ بہت دنوں سے مجھے کسی سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں ملا..... مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کئی صدیاں گزر گئی ہیں..... میں جس بات کو سینے میں دبائے ہوئے ہوں وہ میرے لیے ناقابل برداشت ہو گئی ہے..... اب میں زیادہ دیر تک اپنے کمرے میں مقید نہیں رہ سکتا..... لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں مسافروں سے مل نہیں سکتا..... یہ لوگ سارا دن پکیں ہانکتے اور تھقبے لگاتے ہیں..... جو اکیلے رہتے ہیں..... ان کی مسلسل گفتگو مجھے بالکل بنائے دیتی ہے..... اس جہاز پر نائٹ کلب کی دو امریکی طوائفیں بھی سفر کر رہی ہیں جو رات کے وقت جانوروں کی حالت میں ناچ اور گاؤں اور خوش حرکات سے ڈال پونڈ اور مختلف

بالاخر اس نے گہرے سکوت کو توڑتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا آپ تھک گئے ہیں۔“  
 ”نہیں..... بالکل نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

اس نے ایک لمبا کش لیا۔ پھر اس نے قدرے جھپکتے ہوئے کہا۔

”میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں..... بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میں آپ کو وہ بتا دوں جو میرے سینے میں ایک خلش ہے جو کسی خنجر کی طرح پیوست ہے..... اور پھر اس حد تک پہنچ چکا ہوں کہ یہ سب کچھ کسی کو بتا دوں۔ اگر میں نے خلش کا یہ خنجر نہیں نکالا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ شاید سمندر میں چلا گیا بھی لگا دوں..... ایسا کیوں ہے..... اس کی وجہ سن لیں گے تو آپ کو معلوم ہوگی۔“

اس کی یہ بات سن کر میرا تجسس اور بڑھ گیا۔ میں حیران بھی تھا کہ آخر ایسی کیا بات جس نے اسے اذیت اور ذہنی غلیان میں مبتلا کر دیا ہے اور پھر وہ خودکشی کرنے کے لیے بھی تیار ہو گیا ہے۔ اس لیے میں نے اس سے کہا۔ ”آپ جو کچھ بھی بتانا چاہتے ہیں بتائیں۔ میں سنوں گا۔“  
 پھر اس نے ایک لمحہ توقف سا کیا۔ اس کے چہرے پر ایک کرب سا چھا گیا۔ وہ افسردہ سے لہجے میں بتانے لگا۔

”میں اس کہانی کا آغاز کرنے سے پہلے اپنا تعارف کرادوں۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور ڈاکٹر کی زندگی میں بسا اوقات ایسے مواقع بھی آتے ہیں جن میں فرض کی ادائیگی اتنی آسان نہیں ہوتی جتنی عموماً سمجھی جاتی ہے۔ بعض اوقات نہ صرف اچانک اور بالکل غیر متوقع بلکہ بہت ہولناک بلکہ انتہائی خطرناک اور جان لیوا بھی..... آپ ایسے کسی بھی ایسے واقعے کو زندگی اور موت کی سرحد سے تعبیر بھی کر سکتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ایسے واقعات میں فرض کی نوعیت نمایاں ہوتی ہے۔

ممالک کی کرنسی وصول کرتی ہیں..... دوپہر میں وہ ان کے ساتھ پاگلوں کی طرح شور مچائے اور نازیبا حرکات کرتے رہتے ہیں..... ان کی آواز مجھے کمرے میں سنائی دیتی ہے..... جسے سن اور محسوس کر کے میں بری طرح جھن جھٹا ہوں اور اپنے کان بند کر لیتا ہوں..... ان لوگوں کو اس کا علم تک نہیں ہوتا کہ میں ان کی باتیں سن سکتا ہوں۔ یا پھر وہ مجھے اس حیلے بہانے مجھے پریشان کرتے ہیں۔ میرا بس چلے تو میں ان سب کو شوٹ کر دوں..... کل کی بات ہے کہ امریکی طوائف زادی میرے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر کمرے میں مھس آئی۔ اس نے کہا کہ عجیب بور اور خشک آدمی ہو۔ میں تمہاری تنہائی کی ریفیقہ دن ڈوبنے تک بن سکتی ہوں۔ صرف سو ڈالر میں..... میں نے کہا کہ میرے پاس دو ڈالر بھی نہیں ہیں..... تم کوئی اور آدمی تلاش کرو۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔“ پھر اس نے اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ میری گفتگو سے بور ہو رہے ہیں..... میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں باتونی بن جاؤں۔“

”نہیں..... نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں آپ کی گفتگو میں دلچسپی لے رہا ہوں..... کیا آپ سگریٹ پیتے گے۔“

اس نے سگریٹ سلگایا اور ایک بار پھر مجھے اس کا چہرہ دیکھنے کو ملا..... اس کی عورت اب کس قدر مانوس سی معلوم ہوئی..... روشنی اس وقتے میں اس نے بھی مجھے غور سے دیکھا تھا۔ اس کی متوحش آنکھوں میں ایک انتہائی جھلک رہی تھی اور لگا ہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ جیسے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن معلوم نہیں کیوں وہ خاموش رہا۔ ہم اسے کی گانٹھ پر منہ کر کے بیٹھ گئے لیکن ہم دونوں درمیان میں خاموش کسی آسپ کی طرح مسلط تھی..... لیکن سگریٹ نوشی جاری تھی۔ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی۔

اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا..... بہت سے فرائض متضاد بھی ہوتے ہیں۔ اگر کسی عمل سے کسی انسان کی جان بچ سکتی ہے تو بلاشبہ ڈاکٹر کو یہ فرض پورا کرنا چاہیے اور یہی وہ واقعہ ہے جس کے لیے ڈاکٹر کو خصوصی تربیت بھی دی جاتی ہے لیکن ایسے اصول صرف ذہن ہوتے ہیں۔ جذباتی نہیں..... کسی عملی طور پر امداد کی حد تک کی جاسکتی ہے..... یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔

رات آپ ایک اجنبی کی حیثیت سے یہاں آئے تھے..... اور اگرچہ آپ نے مجھے پہلے نہیں دیکھا تھا اور میرے آپ پر کوئی قسم کے حقوق نہیں تھے..... لیکن جب میں نے آپ سے یہ استدعا کی کہ آپ کسی سے یہ تذکرہ نہ کریں کہ آپ نے مجھے یہاں دیکھا ہے..... آپ میری یہ بات سن کر خاموش رہے اور پھر آپ نے میری امداد کو ایک فرض سمجھا..... میں نے اس لمحے محسوس کر لیا تھا کہ آپ ایک مخلص اور ہم درد شخص ہیں۔ بے لوث..... اور آج پھر آئے ہیں اور پھر میں نے آپ سے التجا کی ہے کہ آپ بیٹھ کر میری باتیں سنیں۔ جس کی باتیں سننے کے لیے وقت دنیا میں کسی احسان سے کم نہیں ہوتا ہے۔

اگر آج کی رات میری یہ باتیں کوئی نہ سنا تو میں یقیناً شب کے آخری پہر اپنی ذات کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر چکا ہوتا۔ اس لیے اذیت ناک اور کرب انگیز خاموشی اندر ہی اندر میرے دل کو کسی زہر لیے ناگ کی طرح ڈسے جا رہی تھی..... اذیت کیا ہوتی ہے۔ یہ وہی جان سلنا اور محسوس کر سکتا ہے جس پر گزرتی ہے..... آپ اتنے مہربان ہوئے ہیں کہ میری باتیں سن رہے ہیں..... یہ اتنا آسان نہیں ہے..... لیکن آپ اس لیے بڑے مبر اور سکون سے سن رہے ہیں اور میں نے کسی مشکل بات کی کوئی فرمائش نہیں کی..... لیکن ایک لمحے کے لیے فرض کیجئے کہ میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ مجھے سمندر میں دھکا دے دیجیے تو کیا ہوگا!!

ایک طرح سے یہ میرے لیے آپ کی امداد ہوگی اور میں اسے آپ کا یہ احسان عظیم ہوگا مجھ پر..... لیکن آپ میری اس طرح سے مدد کرنا فرض نہیں سمجھیں گے۔ میرا خیال ہے کہ فرض کی بھی ایک حد ہے اور جب کوئی انسان اس حد کو پہنچ جاتا ہے تو پھر وہ مجبور ہو جاتا ہے۔“ گفتگو کرتے ہوئے درمیان میں اس کا لہجہ اچانک تیز ہو گیا۔

”مجھے اپنے لہجے کی کچی کا احساس ہے..... یہ اس لیے نہیں کہ میں نشے میں ہوں۔ اگرچہ میں جب سے جہاز میں سوار ہوا ہوں بہت زیادہ پی رہا ہوں۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ شراب غم غلط کر دیتی ہے..... لیکن میرا خیال اور تجربہ الگ ہے۔ نشہ میں اور اضافہ کر دیتا ہے۔ بہر حال اس وقت میں نشے میں نہیں ہوں اور نہ ہی میں نے ایک گھونٹ جو پیا ہو۔ نہ ہی میں نے نوش ہوں۔ ویسے میں بھی کبھار پی لینے کا عادی ہوں۔ جب سے میں ان مشرقی علاقوں میں آیا ہوں میری زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ ذرا آپ تصور کریں کہ میں گزشتہ سات برسوں سے مقامی لوگوں اور جانوروں کے ساتھ رہتا ہوں۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں کے انسان بھی ہر معاملے میں جانوروں کی طرح میل جول اور ملاپ میں ایک ہی فطرت رکھتے ہیں۔ ان انسانوں کے نزدیک عورت عزت و آبرو کا وہ تصور نہیں ہے جو عموماً دنیا میں اکثر جگہ پایا جاتا ہے۔ عورت بڑی خوشی سے اپنے آپ کو چھاد کر دیتی ہے..... ہاں میں ذرا بہک گیا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب سے میں ان مشرقی علاقوں میں آیا ہوں۔ میری زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ ذرا آپ تصور کریں کہ میں گزشتہ سات برسوں سے جو یوں کسی انسان کا شائستگی کے ساتھ گفتگو کا طریقہ بھول جاتا محض ایک فطری بات ہے۔ اتنی طویل مدت کے بعد جب اسے کسی ہم وطن سے گفتگو کا موقع ملتا ہے تو اس کی زبان فرط جذبات سے قابو میں نہیں رہتی ہے۔ میں آپ

سے ایک سوال کرنے والا تھا کہ..... کیا انسان کے لیے فرض ہے کہ وہ امداد کرے..... خواہ وہ خود کیسے ہی حالات سے دوچار کیوں نہ ہو۔ بالکل ان فرشتوں کی طرح..... معاف کیجیے کہیں آپ بور تو نہیں ہو رہے ہیں۔“

”نہیں.....“ میں نے جواب دیا ”میں بڑے غور اور دل چسپی سے سن رہا ہوں۔“

وہ اپنے پیچھے کوئی چیز ڈھونڈنے لگا۔ میں نے ایک ہلکی سی کھٹک سنی اور سمجھ گیا کہ بوتلوں کی کھٹک کی آواز تھی۔ اس نے ان میں سے ایک گلاس اٹیل کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ وہاں کیسے گئے نا..... اس وقت یہی حاضر ہے..... ویسے مجھے اس کے مقابلے مار ٹینی بہت پسند ہے۔“

اس کے ساتھ دینے کے لیے میں نے اسے چائے کے انداز سے سبب کرنے لگا۔ دوسرا گلاس نہ ہونے کے سبب بوتل کو منہ سے لگایا۔ ایک لمحے کے لیے سکوت طاری..... اس وقت جہاز پر پانچ گھنٹاں بچیں جس کا مطلب یہ تھا کہ رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔

”میں آپ کے سامنے ایک مسئلہ پیش کرتا ہوں..... تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض کر لیا کہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک ڈاکٹر تھا۔ ایک ڈاکٹر جو.....“ وہ کچھ جھجکا اور پھر اس نے از سر نو کہنا شروع کیا۔ ”نہیں..... اس طرح کام نہیں چلے گا۔ مجھے آپ کو سارا قصہ من و عن اسی طرح سنانا چاہیے جیسے میرے ساتھ پیش آیا تھا..... شروع سے آخر تک مکمل سرگزشت..... جس میں ذرہ برابر مبالغہ یا داستان کوئی نہ ہو..... ورنہ آپ اسے بالکل بھی سمجھ نہیں پائیں گے..... میرا خیال ہے کہ آپ مشرق کے شیدائیوں میں سے ایک ہیں..... مجوروں کے جھنڈ اور مندروں کے کلسوں کے دلدادہ ہیں..... اور ان علاقوں کے

رومان سے مخور نظر آتے ہیں۔ جن کی آپ مہینوں سیاحت کرتے رہے ہیں اور ملازمت بھی..... اس میں شک نہیں کہ یہ استوائی علاقہ ان لوگوں کے لیے مسور کن جاذبیت رکھتا ہے جو گاڑی..... کار یا رکشا میں بیٹھ کر اس کا نظارہ کرتے ہیں..... آج سے سات برس قبل جب میں یہاں آیا تھا میں نے ایسا محسوس کیا تھا کہ میں کسی سیارے پر آ گیا ہوں..... یہ جگہ کسی سیارے سے کم نہیں تھی۔ میں یہاں بڑے بلند عزائم لے کر آیا تھا جن کے تصورات سے میرا ذہن مسحور تھا..... مقامی زبان سیکھنا..... مذہبی کتابوں کی قدیم اور اصل زبان پڑھنا..... مقامی باشندوں کی نفسیات کا مطالعہ کرنا..... خصوصاً لڑکیوں اور عورتوں کا جن کے بارے میں میں نے بڑے سنسنی خیز کہانیاں زد و عام تھیں اور وہ بڑی پیمانے پر خیر تھیں..... ان کی استوائی بیماریوں کی تحقیق..... سائنسی معلومات میں اضافہ اور اس پس ماندہ علاقے میں تہذیب کا علمبردار بننا میرے مقاصد میں شامل تھا۔

یہاں دیہات کی زندگی کسی ایسے گرم مکان میں رہنے سے مشابہ تھا جس کی دیواریں نظر نہ آنے والی ہوں ہر چیز قوت کو سلب کرتی ہو..... انسان خواہ کتنی ہی مقدار میں کونین کیوں نہ استعمال کرے۔ بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بخار اس کی تمام تر صلاحیتیں ختم کر دیتا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اسے کسل مندی بنا دیتی ہے۔ یہاں کی لڑکیاں ہوں یا عورتیں مرد کو کسی سیکے کپڑے کی طرح نچوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اتنی داری، والہانہ پن اور گرم جوش اور خود سپردگی جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا..... یہاں کی آب و ہوا کا اثر تھا جو یہاں کی صرف لڑکیوں اور عورتوں کو موافق آتی تھی لیکن مردوں کو اس نہیں آتی تھی۔

یہاں کے مخوس جنگلوں اور دلدلی علاقوں میں رہ کر ایک غیر ملکی اپنے تمام مشاغل اور

تقریبات سے محروم ہو جاتا اور بہت جلد اپنی  
 فکری کوششیں بند کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ مقامی عورت  
 بھی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس سے باز رکھنے کے  
 باوجود بھی باز نہیں رکھ پاتا تھا۔ اس کی وجہ ان کا  
 پرشاپ گداز بدن اور کشش ہوتی تھی۔ مجبوراً اور  
 ان کے رحم و کرم پر ہو جاتا تھا۔ پھر اسے اپنے گھر  
 کی یاد بہت ستاتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ  
 جادوگر نیاں ہیں۔ اس کا اندازہ آپ کو محال ہے  
 کہ یہ دہال کیوں ہیں اور جب گھر واپس جانے  
 کا وقت آتا ہے تو انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ اتنا  
 کامل اور مست ہو گیا ہے اور پھر وہ محسوس کرتا ہے  
 کہ وہ اپنی رخصت سے استغناء دینے کے قابل  
 بھی نہیں رہا لیکن وطن جانے کے حق سے  
 دستبردار ہونا میرے لیے اتنا خود اختیاری معاملہ  
 نہیں تھا جتنا کہ میں نے ظاہر کیا ہے۔ میں نے  
 دنیا کی کون سی ایسی عورت ہوئی جس کے حسن،  
 شباب اور کشش سے واسطہ نہ پڑا ہو لیکن ان کا  
 جادو بھی عجیب و غریب سا تھا۔ یہ حسن کے جادو کی  
 بات کر رہا ہوں۔ اس قدر کالی گلوئی کہ شاید ہی  
 دنیا میں اس قدر کالی چیز کوئی نہ ہوئی ہوگی لیکن  
 جلد میں جو جاذبیت، کشش اور چمکیلا پن سا اس  
 قدر بے پناہ حسن گوری رنگت میں بھی نہ  
 دیکھا۔ یہ سیاہ رنگت ہی تو مرد کو گھائل کر دیتی  
 ہے۔ گو کہ قدرے سائو لی اور گوری رنگت کی  
 بھی تھیں لیکن وہ آٹے میں نمک کے برابر ہوں  
 گی۔ یہ کالا جادو تھا بلکہ کالے جادو سے بھی کئی گنا  
 خطرناک اور اثر انگیز۔

میری پیدائش کا وطن مغربی جرمنی تھا۔ میں  
 نے طب کی تعلیم پائی۔۔۔۔۔ جب میں نے مکمل تعلیم  
 سے فراغت پائی تو میں اور جوانوں اور دوستوں  
 کی طرح بے روزگار رہا اور نہ ملازمت کے  
 حصول کے لیے مجھے مارا مارا پھرنا پڑا تھا۔ مجھے  
 اپنے ہی شہر میں اپنی ملازمت مل گئی۔ اگر آپ کو  
 ان دنوں کے طبی اخبارات دیکھنے کا اتفاق ہوا

ہو تو آپ نے پڑھا ہوگا کہ معمولی امراض میں  
 سے ایک مرض کے لیے میں نے ایک نیا طریقہ  
 علاج تجویز کیا تھا جس سے طبی حلقوں میں بڑی  
 ہل چل مچ گئی تھی اور میری نوعمری کے باعث نہ  
 صرف سراہا گیا بلکہ بڑی تعریف کی گئی تھی۔ پھر  
 ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی کے  
 تمام راستے مسدود کر دیے۔

یہ داخلہ ایک ایسی عورت سے معاشرۂ تھا  
 جس سے میری شناسائی ہسپتال میں ہوئی۔ وہ  
 اسپتال میں ایک ایسے مریض کے ساتھ رہ رہی  
 تھی جو اس کا دیوانہ تھا۔ جس نے خود کشی کی  
 ناکام کوشش کی تھی۔ بہت جلد میں بھی اس عورت  
 پر اتنی فریفتہ ہو گیا جتنا کہ وہ مریض تھا۔ اس  
 کے کردار میں ایک نمبر تھا جو میرے لیے ناقابل  
 برداشت تھا۔ ایسی عورتیں جو تسلط پسند بلکہ گستاخ  
 ہوں چاہیں میرے ساتھ ردا رکھ سکتی ہیں۔۔۔۔۔  
 لیکن اس عورت نے تو مجھے کھلونا بنا دیا۔ میں جیسے  
 اس کے ہاتھوں کٹ پٹی بنا۔ میں نے وہ سب کچھ  
 دیا جس کی اس نے فرمائش کی اور چاہا۔ اس نے  
 جیسے مجھ پر کوئی جادو کر کے غلام بنالیا تھا میں نے  
 اس کی مہربانی اور فیاضی سے بھی جی بھر کے فائدہ  
 اٹھایا تھا۔ بالآخر اس کے لیے مجھ کچھ اسپتال کے  
 خزانے سے رقم چرائی پڑی۔ میری اس حرکت کا  
 راز افشاء ہو گیا اور وہ رقم مجھے واپس کرنا پڑی۔  
 میرے ایک بچانے وہ رقم ادا تو کر دی لیکن میری  
 اتنی بدنامی اور رسوائی ہوئی کہ میں کسی کو منہ  
 دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ نیز اس شہر میں  
 میرے ترقی کی کوئی گنجائش نہ رہی۔

عین اس وقت مجھے میرے ایک ہم جماعت  
 دوست نے مجھے بتایا کہ نوآبادیہات کے لیے  
 ڈاکٹروں کی ضرورت ہے۔ وہ جرمن ڈاکٹروں کو  
 بھی لے رہی ہے تن خواہ بڑی پرکشش تھی اور  
 مراعات بھی بہت اچھی تھیں۔ مجھے شبہ تو ہوا کہ  
 اس بات میں کوئی فریب ہے۔ کوئی چال بھی

گئی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ استوائی علاقوں میں قبر میں اتنی ہی جلدی بنتی ہیں جتنی وہاں سبزہ اگتا ہے..... مگر میں اس وقت جوان تھا اور جوانی میں انسان سمجھتا ہے کہ بخار اور موت دوسروں کے لیے ہوتی ہے اور وہ ان سے بچ سکتا ہے۔

اس عورت نے اسپتال میں مجھے جو آلہ کار بنایا تھا ایک رات اس نے مجھے اپنے ہاں رات کے کھانے پر یہ کہہ کر مدعو کیا کہ اس کے ذہن میں ایک ایسا منصوبہ ہے جس سے دونوں کا مستقبل تاننا ممکن ہو سکتا ہے۔ جب میں نے اس کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی تو اس نے پہلا دستک پر فوراً ہی دروازہ کھول دیا جیسے وہ کڑکی میں کڑی میری راہ تک رہی تھی۔ وہ میرے سامنے جس نا مناسب سے لباس اور حسن و شباب کی کرشمہ سازیوں سے کڑی تھی اور جس حالت میں تھی اس سے اندازہ ہو گیا تھا وہ گھر پر اکیلی ہے۔ مرد کیا کوئی عورت بھی نہیں ہے۔ جب میں اندر داخل ہوا تو اس نے دروازہ بند کر کے بڑی گرم جوشی اور دالہا نہ پن سے میرا استقبال کیا اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے نشست میں لے آئی..... میری اس کے ساتھ متعدد دراتیں بسر ہو چکی تھیں۔ وہ ایسی کتاب تھی جسے میں پڑھ چکا تھا۔ اس نے مجھ سے بغیر کسی تمہید کے کہا کہ میرے وحشی حسن اور میرے حسب و شباب کے کتنے دیوانے ہیں۔ میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔ میری ہر رات کسی نہ کسی کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔ میرے علم میں نشاط انگیز لمحات کے بعد یہ علم میں آ جاتا ہے کہ وہ رقم کہاں رکھتے ہیں۔ میں اس رات ان کی شراب میں بے ہوشی کی دوا ملا دیتی ہوں..... تم مقررہ وقت پر آنا..... ہمیں بدل لینا اور چہرہ شباب میں ہو..... اسے کرسی سے اور مجھے بستر سے باندھ دینا..... رقم ففٹی ففٹی کر لیں گے..... اس وقت تو میں نے آمادگی ظاہر کر دی۔ ساری رات جشن رہا۔ اس نے مجھے کبھی اتنا خوش نہیں کیا تھا..... ہر طرح سے خوش کیا۔ میری خوشی

کی خاطر کسی بات سے انکار نہیں کیا۔ میں نے ایک موقع پا کر کلور و قارم میں بھگا لایا ہوا در مال اس غیر محسوس انداز سے سو گھایا کہ اس کے فرشتوں کو خبر نہ ہو سکی۔ میں نے اس کی الماری کی تلاش لی۔ ایک خفیہ تجوری نوٹوں کی گڈیوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے اس میں سے صرف تین گڈیاں نکالیں۔ میں نے ایک طرح سے اپنی رقم جو میرے چچا نے اسپتال کی انتظامیہ کو ادا کی تھی وہ مع سود ادا ہوئی تھی۔ پھر میں دو پہر تک اس کے ساتھ اس خیال سے رہا تھا کہ یہ اس کی اور میری آخری ملاقات تھی۔ میں اس خزانے کو جی بھر کے لوٹا چاہتا تھا۔ اور مجھے اس سے اس بات کا بھی بدلہ لینا چاہتا تھا جو اس نے میرے دیوانہ پن اور رقم زوریوں سے فائدہ اٹھا کر غلام اور چور بنا دیا تھا۔ جس وقت میں اس کی فلیٹ سے نکل رہا تھا وہ صبح کے چور بستر پر ایسی نڈھال پڑی تھی کہ اس میں حرکت کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ میں نے اس سے رخصت ہوتے وقت آخری کلمات جو کہے وہ یہ تھے کہ..... تم ایک طوائف زادی ہو۔ ڈاکٹر کو چور اور مجرم بنانا چاہتی ہو..... میں تمہارے منہ پر تھوکتا ہوں..... یہ الفاظ اس پر اس طرح گرے جیسے جلتی پر تیل کی دھار..... اس نے بستر سے اٹھنا چاہا تا کہ کسی زخمی ناگن کی طرح مجھے ڈس لے..... اس میں سکت کہاں تھی۔ میں نے اسے جو گیلے کپڑے کی طرح نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔

اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا تھا کہ اس دوسری صورت کو قبول کر لوں۔ میں نے چچا کو ان کی رقم ادا کر دی۔ کیوں کہ مالی حالات اچھے نہ تھے۔ انہوں نے معلوم نہیں کس سے عرض لے کر رقم مجھے دی تھی تا کہ میں جیل کی ہوا نہ کھاؤں۔ لہذا میں نے واٹر ڈیم کا راستہ لیا اور پھر درس برسوں کی ملازمت کا معاہدہ کر لیا۔ اس کے عوض مجھے نوٹوں کی ایک گڈی ملی۔ میں اس کمپنی کے ہاں سے جو تین گڈیاں لایا تھا وہ

بہت اونچا ہاتھ تھا۔ میں نے ایک گڈی اپنی چچی کو دے دی یہ بڑی نیک اور مہربان خاتون تھیں۔ انہوں نے مجھے اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہا اور پالا تھا۔ ان کا احسان اتنا عظیم تھا کہ میں ایسی دس گڈیاں دے کر بھی اتارنا چاہتا تو وہ اتر نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے ایک اور گڈی اس لڑکی کے نذر کی جو صرف اس وجہ سے کہ وہ اس عورت سے بہت مشابہت رکھتی جو میری جانی کی ذمہ دار تھی۔ یہ لڑکی چوں کہ غریب تھی اور تعلیم پر توجہ دے رہی تھی اس لیے وہ سخت بھی تھی۔ میں جہاز میں سوار ہوا تو تہی دامن نہ تھا..... میں نے سنا تھا کہ وہ عورت میری تلاش میں کسی زہریلی ناگن کی طرح میری بوسٹھ رہی ہے۔ اسے شاید اور بھی علم ہو گیا ہو گا میں اس کی کالی راتوں کی ایک بڑی رقم اس کے ہاتھ سے چرائی..... وہ میری گردن بھی نہ پاسکی۔ کیوں کہ میں ایک بحری جہاز میں سوار ہو کر یورپ سے چلا آیا۔ اس نئی زمین پر خوب صورت جنگلوں اور سمجھور کے درختوں کے درمیان تنہائی اور سکون کے سمندر سینے دیکھتا رہا سفر کا لطف لیتا رہا۔ وہ عورت بھی یاد آتی رہی جس کی مہربانی اور فیاضی فراموش کرنے اور بھولنے والی نہ تھی۔

میں تنہائی کی تلاش میں تھا اور میری یہ خواہش جلد ہی پوری ہو گئی۔ حکومت نے مجھے ہٹا دیا اور سریمیا میں تعینات نہ کیا جو کہ ان بڑے شہروں میں سے ہیں۔ جہاں سفید لوگ رہتے ہیں..... اور جہاں کلب..... گاف، کتا ہیں اور اخبار وغیرہ میسر ہوتے ہیں۔ انہوں نے مجھے وہاں بھیج دیا جو خدا کی فراموش کردہ بستی ہے..... وہاں سے قریب ترین شہر تک پورے ایک دن کی مسافت ہے..... اس بستی میری سوسائٹی..... دو تین گاؤں افسروں پر مشتمل تھی۔ ان میں ایک دو نیم یوروپن افسر بھی تھے۔ علاقہ گھنے جنگلوں، کھیتوں اور دلدلوں پر

مشتمل تھا۔ شروع شروع میں تو یہ بات قابل برداشت تھی اور اس میں ایک انوکھے پن کی سی جاذبیت اور کشش تھی۔ چنانچہ میں نے کچھ عرصے تک بڑے انہماک سے مطالعہ کیا..... کچھ عرصے کے وہاں کا وائس ریزیڈنٹ اس ضلع کا دورہ کر رہا تھا کہ اچانک گاڑی کے حادثے میں اس کی ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ کوئی دوسرا ڈاکٹر قرب و جوار میں نہ تھا اور اس کا فوری آپریشن کیا جانا ضروری تھا جو مجھے انجام دینا پڑا۔ اس کی صحت بہت جلد بحال ہو گئی۔ مجھے ایک خاصی بڑی رقم ملی کیوں کہ مریض ایک امیر کیر شخص تھا۔ اس کے بعد میں نے ٹھوس حقیقی کام کیا۔ عہدہ قدیم میں استعمال ہونے والے زہر اور ہتھیاروں کی تحقیق کی..... اور اپنے پہلے جوش و خروش کے سر دھونے سے پہلے میں نے وہ ساری تدابیر اختیار کیں جس سے میرا وقت خوش اسلوبی سے گزر سکے۔

یہ سب کچھ اس وقت تک جاری رہا جب تک وہ قوت و توانائی جو یورپ سے روانہ ہوتے وقت مجھ میں تھی۔ باقی رہی۔ پھر رفتہ رفتہ آب و ہوا کا اثر مجھ پر غالب آ گیا۔ اس علاقے کے سفید فام لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے لگا۔ پھر میں نے اپنے افسردہ خیالات کو تروتازہ کرنے کے لیے میں نے شراب نوشی شروع کر دی اور گہری سیاہ رنگت کی لڑکیاں اور عورتیں تنہائی کی رفیقہ بن کر دل بٹگی کا سامان کرتی تھیں۔ سفید فام عورتوں کے جسموں میں سے ایک عجیب سی بو بھری ہوئی ہے۔ سوز کا گوشت، شراب اور ان کے غذا کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے..... لیکن ان کالی گولٹی مقامی لڑکیوں اور عورتوں میں سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک جو نہانے سے پھوٹتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سور کے گوشت کے مقابلے پر ندوں کا گوشت اور سبزی ترکاریاں تھیں۔ پیڑوں کا گوشت بہت گرم ہوتا تھا۔ جب بھی میں کسی برندے کا گوشت کھاتا تھا میں ایسا محسوس کرتا تھا کہ توانائی لوٹ

تھیں۔ اس لیے میں نے ان سے ترک تعلق کیا ہوا تھا۔ وہ بھی میرے قریب اس لیے نہیں آئی تھیں کہ انہیں میرے خیالات کا علم تھا۔

آخر یہ عورت کون ہو سکتی ہے..... تو یہی سوال میں اپنے آپ سے کرتا اپنے کمرے سے نکلا۔

انجینی عورت نشست گاہ میں بیٹھی تھی اور اس کے پیچھے ایک چینی لڑکا کھڑا تھا۔ جو بظاہر اس کا ملازم تھا۔

جونہی اس نے جو مجھے دیکھا وہ مجھ سے ملنے کے لیے فوراً ہی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی..... میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے چہرے ایک سیاہ دبیز نقاب ڈال رکھا تھا..... اور پیٹرس اس کے کہ میں کچھ کہتا اس نے از خود ہی انگریزی میں گفتگو شروع کر دی۔

”میں ملاقات کا وقت لیے بغیر آپ کے آرام میں خلل ڈالنے اس طرح آنے پر پشیمان ہوں..... بات یہ ہے کہ میں اس علاقے سے گزر رہی تھی کہ مجھے گاڑی کچھ دیر کے لیے روکنا پڑی۔ اس لیے کہ فوراً مجھے خیال آیا کہ آپ یہاں رہتے ہیں۔“

اس کی یہ بات نہ صرف حیران کن اور بے حد پراسرار سی تھی کہ اگر وہ اپنی گاڑی میں سفر کر رہی تھی تو مکان تک کیوں نہیں آئی۔ دوسری بات جو عجیب اور پراسرار یہ تھی کہ اس نے چہرے پر سیاہ نقاب کیوں ڈال رکھا۔

میں کچھ پوچھنے والا تھا کہ اس نے فوراً ہی کہنا شروع کیا۔ ”میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے کہ جب وائس ریڈیوٹ کو وہ حادثہ پیش آیا نے کمال کر دیا۔ میں نے کچھ دن ہوئے اسے چوگان کھیلنے ہوئے دیکھا اور وہ اس طرح سے کھیل رہا تھا جیسے اسے کچھ ہوا نہیں تھا..... آپ کا نام اس علاقے کے ہر شخص کی زبان پر ہے اور ہم اپنے بوڑھے سرجن اور اس کے دونوں کو خیر باد کہنے کے لیے تیار ہیں۔“

آئی۔ صرف ایک دو دن کے لیے..... وہاں وہ پرندے نایاب بھی تھے۔ جو قوت بخش ہوتے تھے۔ آخر وہ وقت آن پہنچا جب مجھے صرف دو برس اس جگہ رہنا تھا۔ پھر میں چٹن پا کر یورپ میں رہائش اختیار کر کے نئے سرے سے زندگی شروع کر سکتا تھا۔ اب میرے لیے سوائے اس کے کوئی کام نہ تھا کہ میں اس عرصے کے ختم ہونے کا انتظار کروں۔ اگر یہ حادثہ پیش نہ آیا ہوتا تو شاید اب تک میں وہاں انتظار کر رہا ہوتا۔

اس کی آواز جیسے گہری تاریکی میں گم ہو گئی۔ میں بھی خاموشی سے گفتگو دوبارہ شروع ہونے کا منتظر رہا۔ کچھ دیر کے لیے سکوت رہا۔ پھر گھڑیال نے تین بجے کے وقت کا اعلان کیا۔ اس نے ذرا سی حرکت کی۔ پھر اس نے دھسکی کی بوتل اٹھائی۔ گویا وہ اپنے آپ کو تازہ دم کر رہا ہو کچھ دیر بعد نئے جوش و خروش کے بعد پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

اب میں اپنے مکان میں مقید ہو گیا تھا۔ مجھے کسی سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ میں ان لڑکیوں اور عورتوں سے کسی نہ کسی بہانے سے ترک تعلق کر لیا تھا جو راتوں کو تنہائی دور کرنے آئی تھیں۔ ان میں ایک عجیب سی بات یہ تھی کہ صرف ایک باری باری آئی تھی۔ ان عورتوں نے جیسے آپس میں کوئی معاہدہ کیا ہوا تھا۔ ایک دن میرے دو ملازم دوڑتے ہوئے آئے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ایک عورت مجھ سے ملنے کے لیے آئی ہے اور وہ سفید فام ہے۔ میں خود حیران رہ گیا۔ میں نے کسی گاڑی یا کار کے رکنے کی آواز نہیں سنی تھی۔ یہ سفید فام عورت کون تھی اور ان دیرانوں میں کیا کرنی پھر رہی تھی۔ میرے لیے اس سفید فام عورت کا آنا اس لیے بھی تعجب خیز تھا کہ میں ان کے لیوں کی محتاس جذب کرنا تو درکنار انہیں بازوؤں میں بھرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا..... بے اس..... بے کیف اور کسی بدذائقہ اور بودار پھل کی طرح ہوتی



ان کی جگہ آپ لے لیں۔“ وہ مسلسل بولے جا رہی تھی۔ اس کا یہ انداز اور رویہ مجھے پریشان کر رہا تھا۔ آخر وہ مجھے کیوں نہیں بتاتی کہ وہ کون ہے۔ اپنے چہرے سے نقاب کیوں نہیں اتارتی۔۔۔۔۔۔ میں وہ بد صورت بے کشش اور داغ دار چہرے کی تو نہیں۔۔۔۔۔۔ شاید کسی نے اس کے چہرے پر تیزاب پھینک کر اس قدر بد نما بنا دیا ہوگا کہ دیکھنے والے کو کراہیت ہو۔۔۔۔۔۔ کیا وہ بخار میں مبتلا ہو۔۔۔۔۔۔ آخر اس کی کی گفتگو چشمہ خشک ہو گیا تو میں نے اسے اوپر آنے کی دعوت دی۔ اس نے چینی لڑکے کو اشارہ کیا کہ وہ وہیں کھڑا رہے اور وہ خود میرے ساتھ بیڑھیاں چڑھنے لگی۔

”یہ بڑی اچھی جگہ ہے۔“ اس نے میرے کرب پر ایک چپٹی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر وہ کتابوں کی طرف بڑھی اور ان کے نام پڑھنے لگی۔ ”واہ کتنی اچھی کتابیں پڑھ کر مجھے کتنی خوشی ہوگی آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔“

جب سے اس نے مجھے سلام کیا تھا اس وقت سے اب تک یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

”کیا آپ چائے پینا پسند کریں گی۔۔۔۔۔۔“ میں نے اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”جی نہیں۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔۔۔ شکریہ۔“

اس نے فنی میں سر ہلایا۔ ”اس لیے کہ میرے پاس وقت بہت تھوڑا ہے۔ یہ فلویر کی کتاب کتنی اچھی ہے۔۔۔۔۔۔ تو آپ فرامیسی بھی جانتے ہیں۔

جرمن حقیقتاً بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ واکس ریڈیلنٹ نے قسم کھائی ہے کہ وہ آپ کے سوا کسی اور سے آپریشن نہیں کرائیں گے۔ ہمارا بڑا

سرجن صرف ایک کام کے لیے موزوں ہے اور وہ ہے یہ بات آج ہی میرے ذہن میں آئی کہ آپ سے مشورہ کر لوں۔ اس علاقے سے

گزرتے ہوئے میں نے سوچا کہ اس سے اچھا موقع اور کب ملے گا۔“ وہ کتابوں کو دیکھتی رہی۔ ”بات دراصل یہ ہے۔“ اس نے ایک کتاب کے صفحے پلٹتے ہوئے کہا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ میری طبیعت کچھ خراب ہے۔ سرگرمی۔۔۔۔۔۔ بے ہوشی کے دورے اور مٹی ہیں۔ آج صبح گاڑی میں اچانک بے ہوش ہو گئی۔ لڑکے نے مجھے سہارا دیا ورنہ شاید میں گر پڑتی۔ اس نے مجھے پانی پلایا جس سے میری طبیعت قدرے بحال ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ شوگر شاید گاڑی بہت تیز چلا رہا تھا۔ ہوا میں اڑتا جا رہا تھا۔ مجھے برق رفتاری سے وحشت ہوتی ہے۔ کیوں ڈاکٹر صاحب! آپ کا کیا خیال ہے۔“

”میں دیکھنے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا۔۔۔۔۔۔ کیا یہ دورے اکثر پڑتے ہیں۔“ میں نے سوال کیا۔ ”یا آج پہلی بار یہ دورہ پڑا تھا۔“

”لیکن اب تک تو ایسا نہیں ہوا تھا لیکن گزشتہ ہفتوں سے زیادہ کثرت سے پڑنے لگے ہیں۔ صبح کے وقت میری طبیعت زیادہ خراب ہوتی ہے۔“ وہ ایک مرتبہ پھر کتاب کے اوراق پلٹنے لگی۔ اس نے کتاب سے نظریں ہٹا کر مجھے دیکھا تک نہیں۔

اور میں سوچ رہا تھا آخر وہ اتنے انوکھے

انداز سے پیش کیوں آ رہی تھی۔ وہ نقاب الٹ کر میری طرف کیوں نہیں دیکھتی۔۔۔۔۔۔ میں نے

قصداً اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ اگر وہ انوکھے انداز میں پیش آ سکتی تھی تو میں بھی جوابی ایسا کر سکتا تھا۔ پھر اس نے کچھ دیر کے بعد پھر گفتگو شروع کی۔

”ڈاکٹر صاحب! یہ تو آپ مانتے ہیں کہ یہ کوئی قابل تشویش ناک بات نہیں اور نہ ہی یہ استوائی بیماریوں میں سے ہے۔“ پھر اتنا کہہ کر وہ کتاب کی ورق گردانی کرنے لگی۔

”مجھے پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ کہیں آپ کو بخار نہیں۔۔۔۔۔۔ مجھے آپ ذرا نبض تو دکھائیے۔“

میں یہ کہہ کر اس کی طرف بڑھا مگر وہ بڑی خوب صورتی سے ٹال گئی۔ ”نہیں ڈاکٹر صاحب! مجھے یقین ہے کہ بخار بالکل نہیں ہے..... جب سے یہ دورے شروع ہوئے ہیں اس دن سے میں باقاعدگی سے اپنا ٹیمپریچر دیکھ رہی ہوں..... کبھی نارمل سے زیادہ نہیں ہوا..... اور پھر میرا ہاضمہ بھی درست ہے۔ محل کر بھوک لگتی ہے قبض لگتی نہیں رہتا۔“

میں کچھ دیر کے لیے جھجکا اجنبی عورت کے اس انوکھے انداز نے مجھے شبہ میں ڈال دیا تھا..... ظاہر ہے کہ وہ مجھ سے کچھ کہلوانا چاہتی تھی۔ وہ یقیناً کئی سوئیل کی مسافت طے کر کے میرے ساتھ قلوبیہ پر بحث کرنے کے لیے نہیں آئی تھی۔ ایک دوغٹ تک اسے انتظار کی کیفیت میں جٹلا رکھنے کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ”کیا آپ سے کچھ سوالات کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں۔“

”جی ہاں..... جی ہاں..... کیوں نہیں آدمی ڈاکٹر کے پاس اس لیے تو آتا ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا لیکن اس نے پھر میری طرف پیٹھ کر لی اور کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

”کیا آپ کے ہاں کوئی بچہ مرا ہے۔“

”جی ہاں.....“ اس نے فوراً ہی اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔ ”ایک لڑکا۔“

”کیا اس وقت بھی جب آپ امید سے تھیں تو پہلے مہینوں میں کس قسم کی علامات ظاہر ہوتی تھیں۔“ میں نے اس سے سوال کیا۔

”جی ہاں.....“ اس کا جواب اس دفعہ تیز اور فیصلہ کن انداز میں تھا۔

”بہتر ہے کہ آپ میرے معائنے کے کمرے میں چلیں..... آپ کے طبی معائنے سے ایک منٹ ہی میں اس بات کا پتا چل جائے گا۔“

بالآخر اس نے اپنی آنکھیں میری طرف کیں۔ اس کی آنکھیں نقاب چہرے محسوس ہوئیں۔

”ڈاکٹر! اس کی کوئی ضرورت نہیں.....

مجھے اپنی حالت کے متعلق ذرا بھی شبہ نہیں ہے۔“

کچھ وقت گزر گیا داستان کو نے بوتل سے ایک گھونٹ لیا اور پھر اس نے داستان کوئی شروع کر دی۔

”آپ خود اس معاملے پر بخیدگی سے غور کریں۔ وہ عورت نہ معلوم کہاں سے ادھر آنکلی تھی۔ اس نے مجھ سے رابطہ کیا تھا اس لیے کہ میں ایک ماہر ڈاکٹر ہوں اور میری بڑی شہرت بھی ہے۔ اس کے رویے سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سرسری گفتگو کر رہی ہیں اور پھر بغیر کسی کے اس نے مجھ سے ایک مطالبہ کر دیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اچانک میرے سینے میں خنجر پھونک دیا ہو۔ کیوں کہ وہ جو کچھ چاہتی تھی وہ ظاہر تھا..... یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی عورت اس قسم کا مقصد لے کر میرے پاس آئی تھی۔ اگر وہ مہربان ہونے کی بات کرتی تو اس میں چونکا دینے یا حیرت والی بات نہ ہوتی۔ اس لیے کہ یہاں کوئی محبوب بات نہ تھی۔ ایسے واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے لیکن ان تمام صورتوں میں عورت کا رویہ منکسرانہ ہوتا تھا۔ اس مصیبت میں وہ اپنی آنکھوں میں آنسو لیے میرے پاس امداد بھیک مانگنے آئی تھیں اور وہ اس کی بڑی سے بڑی قیمت رقم اور زیورات کی شکل میں ادا کرنے تیار ہوتی تھیں لیکن میں نے کبھی ان کی مجبوریوں اور پریشانیوں اور مصیبت سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔

لیکن آج اب مجھے ایک ایسی عورت سے واسطہ پڑ رہا تھا جو ان سب باتوں سے بے نیاز مردانہ عزم کے ساتھ آئی تھی۔ نہ تو کوئی خوف اور نہ ہی خجالت..... اور شرمساری تھی۔ آخر میں ایک ڈاکٹر تھا۔ میں پہلے بھانپ گیا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ باہمت تھی اور مجھے اپنی خواہش کے مطابق باآسانی ڈھال سکتی تھی..... لیکن مجھے اس کے رویے سے ایک گونہ مخموس ہوئی جو اس

کے خلاف بغاوت کے خلاف مترادف تھی۔ میں اسے ایک دکن کی طرح محسوس کرنے لگا۔

میں کچھ دیر تک تو چپ چاپ بیٹھا رہا مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے پس نقاب وہ مجھے آنکھوں سے اشارے کر رہی ہو۔ جیسے وہ لٹکار رہی ہو۔ چیخ دے رہی ہو..... مجھے بولنے کے لیے اسکا رہی ہو لیکن میں اس کے حکم کے لیے کسی صورت سے تیار نہ تھا۔ پھر جب میں نے بولنا شروع کیا تو میری گفتگو اصل موضوع سے بالکل مختلف تھی جیسے میں غیر شعوری طور پر اس کی بے اعتنائی اور انداز گفتگو کی نقل اتار رہا تھا۔ میں نے بہانہ کیا کہ میں اس کا مطلب بالکل بھی نہیں سمجھ سکا ہوں۔ میرے اس طرز عمل کا مقصد اسے اپنا مدعا و اشکاف الفاظ میں کہنے پر مجبور کرنا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میری منت سماجت کرے جیسے کہ دوسری عورتیں کام پر کیا کرتی تھیں۔ وہ میرے پاس خود سرائے انداز میں آئی تھی اور میں اس کی نخوت اور رعونت کے سامنے ناچار اور بے بس تھا۔

بالآخر میں نے معاملے کی تمام تفصیلات کہہ دیں اور اسے بتا دیا کہ وہ علامات بہت معمولی اور عام قسم کی ہیں۔ حمل کے پہلے دنوں میں اس قسم کے دوروں کا ہونا ایک عام سی بات ہے اور کسی بدشگونی کی بجائے یہ اس بات کا پیش خیمہ ہے کہ حالات آئندہ اطمینان بخش رہیں گے۔ میں مسلسل بولتا رہا اور اس انتظار میں رہا کہ وہ مجھے کہیں ٹو کے۔

اس نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے تسلی کے وہ تمام الفاظ فضا میں منتشر کر دیے ہوں۔ اپنی خرد طبی انگلیاں میز کے ساتھ رگڑ رہی تھی۔ وہ اپنا اضمحلال فرد نہ کر سکی اور پھر اس نے دفعتاً کہا۔

”ڈاکٹر..... کیا آپ جانتے ہیں کہ میں آپ سے کیا چاہتی ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ میں نے جو اندازہ کیا

ہے وہ صحیح ہے..... ہمیں واضح طور پر گفتگو کرنی چاہیے۔ آپ اپنی موجودہ کیفیت کو ختم کرنے کی خواہش مند ہیں اور اس چیز کو جو بے ہوشی کے دوروں..... مٹائی اور دیگر تکالیف کا اصل سبب ہے اسے ختم کرنا چاہتی ہیں۔ یہی نا.....۔“

”جی ہاں.....“ اس کے الفاظ ایسے ہی فیصلہ کن تھے جیسے جلاد کے تیغ کی حرکت۔

”کیا آپ کو علم ہے کہ ایسی باتیں دونوں متعلقہ آدمیوں کے لیے کتنی خطرناک ہوتی ہیں۔“

”جی ہاں۔“

”اودہ کیا آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ یہ آپریشن غیر قانونی ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔

”میں جانتی ہوں کہ بعض حالات میں یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری خیال کیا جاتا ہے۔“

”جی ہاں لیکن جب ایسا کرنے کے لیے مناسب طبی وجوہ بھی موجود ہوں۔“

”آپ اس قسم کی وجوہ ڈھونڈ سکتے ہیں۔ آپ آخر ڈاکٹر ہیں۔“ اس نے کسی تذبذب کے بغیر میری طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ حکم آمیز تھا۔ میں اس کے عزم و ہمت پر ششدر رہ گیا لیکن میں نے پھر کچھ مداخلت کی۔ ”انتہائی جلدی نہیں۔“ میں نے اپنے سے کہا۔

”ایک ڈاکٹر ہر وقت مناسب طبی وجوہ نہیں ڈھونڈ سکتا..... پھر بھی میں اپنے ایک ہم پیشہ ڈاکٹر سے مشورہ کرنے میں اپنی چمک محسوس نہیں کروں گا۔“

”میں آپ کے ہم پیشہ لوگوں میں کسی سے نہیں بلکہ آپ سے مشورہ کرنے کے لیے آئی ہوں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ مجھے اس خدمت کے لیے منتخب کرنے کی وجہ کیا ہے۔“

اس نے بڑے روکھے پن سے میری بات کا جواب دیا۔ جیسے میں نے اس کی دھتکی رگ پر

انگلی رکھ دی ہو۔

آپ کس قدر رقم دینے کے لیے تیار ہیں۔“  
”ایک لاکھ گلڈن کا ڈرافٹ جو ایمسٹرڈیم  
کا ہوگا۔“ اس نے بغیر کسی جھجک کے بتایا۔

میں غصے اور حیرت سے کانپ گیا۔۔۔۔۔ یہ کثیر  
رقم وہ مجھے اس شرط پر دے رہی تھی کہ میں اپنی  
حکومت سے اپنا معاہدہ ختم کروں۔۔۔۔۔ اس کا رویہ  
ابانت آمیز تھا جس کے بارے میں میں سوچ بھی  
نہیں سکتا تھا۔ اس کی اس بات نے مجھے مستحل  
کر دیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اس کے منہ پر تھپڑ دے  
ماروں اور نقاب نوچ کر پھینک دوں اور پھر میں  
اس کی بے حاشی بھی کر سکتا تھا۔ جو کہ میرے لیے  
مشکل نہ تھا، لیکن میں ضبط کر گیا لیکن اس کے  
مغرور اور غیر جذباتی چہرے کی ایک جھلک نے  
اس کی پر رعونت نظروں نے میرے وحشی نفس کو  
بیدار کر دیا اور میں یک لخت جیسی ہوس کی آگ  
میں جلنے لگا۔ اس کی بھنویں یوں تن لگیں جیسے کسی  
امیر کی بھنویں ایک بھکاری کی بار بار التجا سے۔۔۔۔۔  
اس لمحے ہم نے ایک دوسرے سے نفرت کی اور  
پھر ہم دونوں کو ایک دوسرے سے نفرت کا احساس  
بھی ہوا۔ وہ مجھ سے تنفر تھی کہ وہ مجھ سے کوئی کام  
لینا چاہتی تھی۔ اور میں اس سے اس لیے نفرت  
کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے امداد کی التجا کرنے کی  
 بجائے مجھے حکم دے رہی تھی۔

خاموشی کے اس وقفے میں ہم لگا ہوں کی  
زبان سے ایک دوسرے سے گفتگو کرتے  
رہے۔۔۔۔۔ لگا یک مجھے جیسے کسی زہریلے سانپ نے  
ڈس لیا ہو لیکن وہ تو اس روز ہی جانور سے بھی کہیں  
خطرناک تھی۔ نہ تو مادہ زیادہ خطرناک اور  
خوں خوار ہوتی ہے۔ ایک خوفناک خیال میرے  
ذہن کے افق پر طلوع ہوا۔ اس کے ناروا سلوک  
نے مجھ میں وہ وحشی بیدار کر دیا اور اسے شیطان  
نے جگا دیا۔ جو ہم سب میں مشہور ہے۔ مجھے اس  
بات کا غصہ تھا کہ وہ میرے پاس ایک معزز اور  
مہذب خاتون کی وجاہت لیے آئی تھی۔ حالانکہ

”میں آپ کو اس کی وجہ بتانے میں کوئی  
قحاحٹ نہیں سمجھتی۔۔۔۔۔ کیوں کہ آپ ایک الگ  
تھلک جگہ پر رہتے ہیں۔ آپ مجھے بالکل بھی نہیں  
جانتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ مسلمہ اہیت کے مالک ہیں  
اور کیوں کہ۔۔۔۔۔ وہ پہلی دفعہ کچھ دیر کے لیے  
رکی۔“ آپ زیادہ سے زیادہ جاوا میں نہیں ٹھہریں  
گے۔۔۔۔۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ آپ کے  
پاس گھر جانے کے لیے کافی سرمایہ ہوگا۔“

مجھے کچھ سی محسوس ہوئی۔ اس کے  
کاروباری حساب کتاب نے مجھے دنگ کر دیا۔  
اس کی خوب صورت اور بڑی بڑی آنکھوں میں  
کوئی آنسو نہ تھا اور اس کے نقاب سے جھانکتے  
ہوئے ہونٹوں پر بھی کوئی التجا نہ تھی۔۔۔۔۔ اس نے  
میرا اندازہ کر لیا تھا۔ وہ نہ صرف میری قیمت لگا  
تھی بلکہ اس نے میرا انتخاب پورے وثوق کے  
ساتھ کیا تھا۔ وہ مجھے اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا  
چاہتی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ میں بالکل مغلوب  
ہو چکا تھا اور نہ میرے پاس کوئی ایسا ہتھیار تھا  
جس سے میں اس سے نبرد آزما ہو سکتا تھا۔

”مگر کس لیے۔۔۔۔۔ کیوں!“ میں نے کہا۔  
”کیوں کہ اس کے بعد آپ کو اس کے بعد  
اس علاقے کو خیر باد کہنا ہوگا۔“

”لیکن آپ یہ بات نہیں جانتی ہیں کہ ایسا  
کرنے کی صورت میں مجھے اپنی ٹینشن سے ہاتھ  
دھونا پڑے گا۔“ میں بولا۔

”لیکن آپ کو پریشان اور فکر مند ہونے کی  
قطعی ضرورت نہیں۔“ اس نے جیسے مجھے دلاسا  
دیا۔ ”میں اس خسارے کی حلائی جو کروں وہ اتنا  
زیادہ ہوگا کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکیں گے۔“

”یہ آپ کی نوازش ہے کہ آپ اتنے واضح  
الفاظ میں مجھ سے معاملہ طے کر رہی ہیں۔“ میں  
نے بھی خالص کاروباری لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں  
اس سے زیادہ اور واضح معلوم کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔

کوئی عورت چوگان کھیل کر یا اس قسم کی دوسری تفریح سے حاملہ ہونے سے رہی۔ میں نے سوچا کہ یہ مفرد عورت جو آج اتنی جذباتی ہو رہی ہے اور جس کے نزدیک پیشہ ورانہ اہلیت سے ہٹ کر میری خاک پا کے برابر بھی نہیں ہے۔ اس وقت کس قدر جذباتی ہو گئی جب آج سے دو تین مہینے قبل وہ اس بچے کا باپ سے ہم آغوش ہو گئی۔ جس بچے کو تلف کرنے پر آج وہ اس طرح تلّی بیٹھی تھی۔ میں اس وقت ان خیالات میں محو تھا۔ جس کا رویہ آمرانہ تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ میں اس کے نامعلوم عاشق کی طرح اپنی مردانہ چابک رسی فرط شوق اور فیضی سے اپنالوں گا۔ گو کہ میری فتوحات کا جو سلسلہ تھا اس میں میرا کوئی دخل عمل نہ تھا۔ کنواں پیاسے کے پاس آتا رہا..... لیکن اس سے پہلے بھی میں نے اپنی ملی کیفیت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور اب میں ایسی کوشش کر رہا تھا وہ اس وجہ سے نہیں کہ ایک درندہ کسی کو اپنی جسی ہوس کا شکار بنانے کے لیے بے تاب تھا۔ یقین کیجیے کہ ایسی صورت ہرگز نہیں تھی۔ میں اس کے تکبر اور رعوت کو نیچا دکھانے اور اپنے آپ کو ایک مرد ثابت کرنے اور اس طرح اس پر اپنی فوقیت ثابت کر کے اپنا جذبہ خود پسندی کو تسکین سے فارغ بنانا چاہتا تھا۔ صرف اتنی سی بات تھی۔

میں ایک عرصے سے راہوں کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس عورت کو دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہوگی جو اس قدر سنجیدہ آتشیں اور کم آ میز تھی..... وہ پراسرار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے رومانی جذبات کا ثمر اٹھائے ہوئے تھی۔ ایک ایسی عورت ان حالات میں اس طرح مجھے ایسے آدمی کے دام میں نذر چلی آئے، ایک ایسے شخص کے پاس جو درندہ صفت، اکیلا، بھوکا اور جس رفاقت سے محروم تھا..... گو کہ مقامی لڑکیاں اور عورتوں نے کچھ عرصہ راہیں کالی کی تھیں..... ان کی جاذبیت اور کشش پاگل

کر دینے والی تھی لیکن میں نے پھر ان سے اپنے آپ کو دور کر لیا تھا۔ جلی نظر نگاہ سے بھی..... اسی لیے کہ ایڈز کا مرض مجھے نہ لپیٹ میں لے لے..... میں یہ سب کچھ آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ بعد کے واقعات کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اس پس منظر کے بغیر آپ اندھیرے میں رہیں گے۔ بہر حال میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

”معاف کیجیے خاتون..... میں یہ کام ایک لاکھ گلڈن میں نہیں کر سکتا۔“

”تو پھر کس قدر رقم طلب کرنا چاہتے ہیں۔“ اس نے پاٹ لہجے میں کہا۔

”ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے بے تکلف ہونا چاہیے۔“ میں نے بغیر کسی جھجک کے بیان کر دیا۔ ”اس لیے کہ میں کوئی بیوپاری نہیں ہوں..... اور آپ کو مجھے ایسا تلاش اور نیم حکیم سمجھنا نہیں چاہیے۔ جو رویہ جو لیٹ میں زہر کی بجائے دولت کو بطور مہلک توڑ زہر حویز کرنا ہے..... اگر آپ مجھے کاروباری کی طرح سلوک کریں گی تو۔“

”تو آپ پھر یہ نہ کریں گے۔“

”کم از کم اس رقم کے لیے نہیں۔“

ایک لمحے کے لیے مکمل سکوت طاری رہا۔ کمرے میں اس قدر خاموشی تھی کہ میں اس کے سانس تک کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر اس نے سکوت کی دیوار گراتے ہوئے پوچھا۔ ”تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں۔“ میرا جواب بڑا واضح تھا۔

اس نے اپنے ہونٹ بڑی سختی سے بھیج کر جواب دیا۔ ”آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی منت ساجت کروں۔“

”جی ہاں.....“ میں نے کہا۔ ”آپ کی گفتگو سے ظاہر ہے کہ آپ اسقاط حمل کا جواز مجھے اس وقت بتائیں گی۔ پھر میں آپ کو جواب دے سکتا ہوں اس

لیے کہ میں اندھیرے میں رہنا نہیں چاہتا۔“

اس نے اپنا سر باغیانہ انداز سے ہلایا۔ پھر تیز لہجے میں بولی۔ ”آپ سے استدعا کرنے کی بجائے مرجانا پسند کروں گی۔“ اس کے جواب نے مجھے برہم کر دیا۔ میں برداشت نہ کر سکا۔ پھر میں نے بگڑ کر درشت لہجے میں کہا۔

”اگر آپ ایسا نہیں کریں گی تو میں اس کے لیے آپ کو مجبور کروں گا۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اب الفاظ کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ آپ پہلے ہی جانتی ہیں کہ میں کیا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ آپ میرا مطلب پورا کر دیجیے تو پھر بھی آپ کی مدد اور تعاون کروں گا۔“

ایک لمحے کے لیے اس کی نظریں مجھ پر جم کر رہ گئیں۔۔۔۔۔ کاش! میں آپ کو اس کی حالت کا احساس دلا سکتا۔ پھر اس کے چہرے اضمحلال دور ہو گیا۔ پھر اس نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔۔۔۔۔ ایک مختار آمیز قہقہہ۔۔۔۔۔ ایک ناقابل یقین دھماکے کی طرح تھا۔ اور مجھ پر اس کا اثر ایسا ہوا کہ میں اپنے آپ کو اس کے سامنے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ میں اس کے پاؤں چومنے کا مشتاق تھا۔ اس کے طہر کی شدت نے مجھ پر بجلی کا سا اثر کیا۔ دوسرے لمحے وہ مڑی اور دروازے کی جانب چل پڑی۔

اس کی قامت۔۔۔۔۔ جسمانی خشیب و فراز۔۔۔۔۔ عضو عضو اور خطوط میں جیسے چراغ جل رہے تھے۔۔۔۔۔ انگ انگ سے مستی الٹی پڑ رہی تھی۔۔۔۔۔ یہ تراشیدہ پیکر تھا جو مجھے دعوت گناہ دے رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ برقی سرعت سے لپک کر اسے دیو بج لوں۔۔۔۔۔ اسے قابو میں کر کے بے بس کرنا میرے لیے ایسا کچھ مشکل نہ تھا لیکن میں سوچتا ہی رہ گیا۔ میں اپنا انجانا ارمان ارمان پورا نہ کر سکا۔ پھر میں نے نادانستہ طور پر اس کا تعاقب کیا کہ کسی بہانے اس سے معذرت کروں۔ فریب اور مٹھاس بھرے لہجے سے اس

شکار کو جال میں پھانس لوں۔ زیر کر لوں۔۔۔۔۔ اس طرح میری خواہش پوری ہو جائے گی۔۔۔۔۔ مجھے اپنی خواہش پوری کرنے کی ضد اس لیے بھی تھی کہ میری روح بھلی جا چکی تھی۔ معائنے والے کمرے سے نکل کر ایک لمحے کے لیے وہ رکی اور مجھے حکم دیا۔ ”سنیے۔۔۔۔۔ میرے تعاقب کی زحمت نہ کیجیے۔۔۔۔۔ اور نہ ہی اس بات کا پتا لگانے کی کوشش کیجیے کہ میں کون ہوں۔“

”اگر آپ نے یہ حرکت کی تو پشیمانی کے سوا کچھ با تھ نہ آئے گا۔ یہ لاحاصل ہوگا۔“ اس نے یہ کہہ کر اور بجلی کی سی سرعت سے باہر نکل گئی۔ وہ دروازے کے راستے گدھنے کے سر کے سینک کی طرح غائب ہو گئی جیسے عفریت موت بن کر اس کے تعاقب میں ہو۔ میں جہاں کھڑا تھا وہاں ساکت و جامد ہو گیا۔ اس نے شاید جادو کر دیا تھا جو میں اس کے متع کرنے پر مسحور ہو گیا تھا۔ میں نے میز میوں سے نیچے اس کے جانے کی آہٹ اور گھر کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی جو گہرے سکوت میں گونجی تھی۔

میں نے یہ سب کچھ سنا۔ میں اس کا تعاقب کرنے کے لیے بے قرار تھا۔۔۔۔۔ کیوں۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی میں ایسا کیوں کرنا چاہتا تھا اسے واپس بلانے کے لیے یا اس کے لیے پر شاب گداز بدن کو کسی کسی پھول کی طرح تسلسل کر پھینکنے کے لیے۔۔۔۔۔ یا پھر اسے زد و کوب کرنے کے لیے۔۔۔۔۔ یا اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے۔۔۔۔۔ میں خود نہیں جانتا تھا کہ کون سے ایسی خواہش جسے پوری کرنے کے لیے میں جیسے پاگل ہو رہا ہوں۔ میں ہر صورت میں اس کا تعاقب کرنا چاہتا تھا لیکن نہیں کر سکتا تھا۔

میری یہ کیفیت چند لمحوں تک رہی اور پھر میں نے جیسے ہی میرے جسم میں ارتعاش کی لہر اٹھی تو وہ طلسم ٹوٹ گیا۔ پھر میں برقی سرعت سے نیچے میز میوں کی طرف بھاگا۔ میں اسے کسی قیمت

پر جانے دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ جان کر رہوں گا کہ آخر وہ کون ہے۔ مگر کے قریب وہ ایک ہی سڑک تھی جہاں سے وہ جا سکتی تھی یہ سڑک تہمتی سے گزر کر شہر جاتی تھی۔

میں سائیکل لینے کے لیے بھاگا۔ جہاں سائیکل رکھی تھی وہاں جا کر یاد آیا کہ میں اس کی چابی اٹھانا بھول گیا تھا۔ اب وقت نہیں رہا تھا کہ میں جا کر چابی لے آتا۔ کیوں کہ لمحہ لمحہ جیتی تھی۔ چوں کہ وہ گاڑی میں آئی تھی اس لیے ہوا ہو جاتی اور لمحوں میں جانے کی نکل جاتی۔ میں چابی لانے کی بجائے اس کمرے کے بالسن کا دروازہ دہلیز سے اکھاڑ پھینکا اور سائیکل اٹھا کر چل پڑا دوسرے لمحے میں پاگلوں کی طرح سائیکل پر اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے ہر صورت میں اسے پکڑنا چاہیے۔ مجھے اسے گاڑی تک پہنچنے سے پہلے جالینا چاہیے۔ مجھے اس سے ضرور بات کرنی چاہیے مجھے اس بات کی امید تھی کہ میں اسے اپنی ندامت اور باتوں کے فریب سے پھلادوں گا۔ یہ پکا جھل میری جھولی میں آ کرے گا۔

جی سڑک میرے سامنے پھیل گئی۔ وہ راستہ جو اسے پانے کے لیے مجھے ملے کرنا پڑا اس پر چلنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اس عورت کے چلے جانے کے بعد میں کتنی دیر تک مسرور کھڑا رہا تھا اور میں یہ لمحات ضائع نہ کرتا تو میں اسے ابھی تک دیوبچ چکا ہوتا وہ تیز قدم اٹھا رہی تھی اور چینی لڑکا اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ جوں ہی میں نے اسے دیکھا اسے میرے تعاقب کا پتا چل گیا۔ کیوں کہ وہ اس چینی لڑکے سے کوئی بات کرنے کے لیے لمحے کے لیے رکی تھی..... اور پھر اکیلی چل پڑی۔ چینی لڑکا وہیں کھڑا ہو گیا۔ وہ اکیلی کیوں گئی..... کیا وہ کسی ایسی جگہ ٹھہر کر مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی جہاں کوئی دوسرا ہماری بات نہ سن سکے ایک انی جانے تصور سے میرے سارے جسم پر سنسنی دوڑ گئی۔ شاید اب اسے اپنی

حفاظت کا احساس ہوا ہو۔ یہاں پر ایک دو جگہ کچھ بھی تھے وہاں کوئی ہماری حرکات و سکنات دیکھ نہ سکتا تھا۔ میں بہت تیز بھاگا جا رہا تھا۔ جوں ہی میں ان خیالات میں غلطیاں لڑکے کے قریب پہنچا وہ سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس سے بچنے کی کوشش کی لیکن توازن قائم نہ رہ سکا۔ گر پڑا۔

ایک لمحے بعد لڑکے کو گالیاں بکتا ہوا میں پھر اپنے پیروں پر تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ مکا مارنے کے لیے اٹھایا لیکن وہ بچ گیا۔ میں نے سائیکل اٹھائی اور سوار ہونے والا ہی تھا کہ وہ پھر آدھمکا۔ پھر اس نے سائیکل کا ہینڈل دیوبچ کر ٹوٹی چھوٹی انگریزی زبان میں کہا۔

”صاحب.....! آپ یہیں رک جائیے..... بیگم صاحبہ کا آپ تعاقب نہ کر سکیں گے۔“

میرا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ میں اسے تھپڑ مار کر ہٹا دیتا۔ چنانچہ میں نے یہی کیا..... وہ لڑکھڑا کر گر پڑا لیکن لڑکے نے سائیکل پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ترجمانی آنکھیں خوف و ہراس سے لبریز تھیں اس کے باوجود اس نے ایک انچ بھی جانے نہیں دیا۔ اس نے پھر کہا۔ ”صاحب ٹھہر جائیے..... آپ اپنا وقت خراب کر رہے ہیں۔“

”کتے کے پلے..... میں کہتا ہوں ہٹ جا راستے سے۔“ میں نے تڑختے لہجے میں کہا۔

اس نے میری طرف دشت زدہ نظروں سے دیکھا۔ وہ انتہائی خوف زدہ ہونے کے باوجود میرے حکم کی نسیل کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ وہ ایک چٹان کی طرح جبارا۔ غصے کی شدت سے میں اس کی ٹھوڑی پر ایک مکا دے مارا تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ سڑک پر گر پڑا۔ سائیکل اس کی اس کی گرفت سے نکل چکی تھی..... جب میں اس پر سوار ہونے لگا تو میں نے دیکھا کہ اس کا اگلا پیہہ میڑھا ہو گیا تھا اور مڑنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ پیہہ سیدھا کرنے کی ناکام ایک ناکام کوشش کے

بعد میں نے سائیکل کو ایک طرف پھینک دیا۔ پھر گاڑی کی جانب بھاگا۔ میں جھونپڑیوں کے آگے ایک پاگل آدمی کی طرح اندھا دھند بھاگا جا رہا تھا۔ ذرا سی ٹھوکر لگنے پر میں توازن قائم نہ رکھ سکتا تھا۔ زمین پر گرنے سے منہ کے بل گرنا اور جانے کتنے دانت باہر نکل آئے اور شاید ہاتھ پھٹ جاتا کیوں کہ زمین ناہموار اور پتھر بلی بھی تھی۔ مقامی باشندے اپنے علاقے کے ڈاکٹر کو اس طرح بھاگتے دیکھ کر حیران تھے کہ ایک سفید قام ایک رکشا قلی کی طرح بھاگا جا رہا تھا۔ میں جب بہی تک پہنچا تو پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ میرا سانس پھولا ہوا تھا۔ میں نے سچی کر کہا۔ ”گاڑی کہاں ہے۔“

جواب ملا۔ ”صاحب ابھی گئی ہے۔ بڑی تیز رفتاری سے۔“

وہ لوگ حیرت سے میرا منہ تک رہے تھے۔۔۔۔۔ پسینے میں شرابور اور دھول سے اٹا ہوا میں ایک پاگل کی طرح لگ رہا تھا۔ میں نے سڑک کی جانب نگاہ ڈالی تو کار کی بجائے اس کے پیچھے اڑتی ہوئی دھول دکھائی دی۔۔۔۔۔ لیکن اسے اس فرار سے چنداں فائدہ نہ ہوا۔ جب وہ میرے پاس آئی تو اس کا ڈرائیور علاقے کے لوگوں کے پاس بیٹھا ہوا گپ شپ کرتا نظر آیا۔ چند لمحوں میں وہ سب کچھ بتا چل گیا جو میں نئی دنوں کی خواری میں بھی معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اس کا نام معلوم ہو گیا۔ وہ دار الحکومت میں رہتی تھی جو وہاں سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر تھا جیسا کہ میں پہلے سمجھ گیا تھا۔ وہ انگریز نژاد تھا۔ اس کا شوہر ایک مال دار ولندیزی تاجر تھا جو گزشتہ پانچ مہینے کا رو باری دورے پر امریکہ گیا ہوا تھا۔ چند دنوں واپس آنے والا تھا۔ اس کی واپسی پر دونوں میاں بیوی انگلستان جا رہے تھے۔

اس کا شوہر چوں کہ پانچ ماہ سے باہر گیا ہوا تھا اور یہ بات مجھ پر عیاں تھی کہ اس کا حمل تین ماہ سے زیادہ نہ تھا۔ اب تک میں نے جو کچھ آپ کو بتایا

آسان تھا کیوں کہ اس وقت تک میرے مقاصد بالکل صورت میں میرے سائے۔۔۔۔۔ ایک ڈاکٹر اور مشاہدہ کرنے والے کی حیثیت سے میں بہ آسانی اپنی کیفیت کی تشخیص کر سکتا تھا۔ میں بالکل بے بس سا ہو گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے افعال کسی قدر احمقانہ تھے لیکن میں پھر بھی ان سے اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکا۔۔۔۔۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس کا پرشاب گداز بدن۔۔۔۔۔ تشہیب و فزاز کے خزانے اور اس کی عریاں سرمریں خجروں جیسی بائیں۔۔۔۔۔ عریاں سڈول چڑلیاں۔۔۔۔۔ مکھن جیسے پاؤں۔۔۔۔۔ وہ پاگل کر دینے سا رہا تھی آپ کا دنیا کا کوئی اور بھی شخص ہوتا تو اس کی کم زوری جان کر اس کے حصول کے لیے پاگل ہو جاتا۔ اس لیے میری نیت میں فتور آ گیا تھا۔ میں اس قدر ذہنی طور پر پست اور گھٹیا آدمی بن جاؤں گا مجھے یقین نہیں تھا۔

میں کسی دوا کے دوانے کی طرح دائیں بائیں دیکھے بغیر اس انگیز عورت کا تعاقب شروع کر دیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ اس کے تعاقب کے روانہ ہونے سے قبل میں نے کیا کچھ کیا۔۔۔۔۔ اس کے نام اور مکان کا پتا چلنے کے ایک یا دو منٹ بعد میں سائیکل لے کر اپنے گوارڈز کی طرف لپک گیا۔ میں نے دو ایک سوٹ اپنے بکس میں رکھے۔ جو رٹم پس انداز تھی وہ جب میں ڈالی اور قریب ترین ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ میں نے اپنے انسرو کو روائگی کی اطلاع دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اور نہ اپنے جانشین کا انتظام کیا تاکہ میری عدم موجودگی میں وہ مریضوں کو دیکھے۔۔۔۔۔ میرے غلام میری روائگی کی خبر پا کر ہدایات کے لیے جمع ہو گئے۔ میں ان کی طرف توجہ کے بغیر اپنے مکان کو اس حالت میں چھوڑ کر چل پڑا۔ اس عورت کی آمد کے ایک گھنٹے بعد میں اپنے ماضی سے قطع تعلق کر چکا تھا اور ایک پاگل کی طرح بھاگا جا رہا تھا۔

عورت بھی کیا شے ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اس کا



مجھے سونے نہیں دیا۔ رات بے خواب گزارنے اور ایک دن مسلسل گاڑی میں سفر کرنے کے بعد میں شام چھ بجے اس جگہ پہنچا جہاں اس کی رہائش تھی مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی گاڑی میں بہت پہلے پہنچ چکی ہوگی۔ وہاں پہنچنے کے دس منٹ کے بعد میں اس کے دروازے پر تھا۔

میں نے اپنا کارڈ بھیجا ملازم نے لوٹ کر بتایا کہ مالکن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ آرام کر رہی ہیں۔ اس حالت میں نہیں ہیں کہ وہ کسی سے بھی ملاقات کر سکیں۔ انہوں نے معذرت کی ہے۔ اس موہوم امید پر کہ شاید وہ بچھڑائے اور بلا بھیجے۔ اس کے لیے کوئی اور چارہ کار نہیں ہے۔ اس وقت وہ غصے میں تھی۔ غصے سے آدمی کو کچھ بھائی نہیں دیتا ہے۔ جب وہ سرد پڑ جاتا ہے تو اسے پشیمانی ہوتی ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ ڈاکٹر کے بس کی بات نہیں۔ جان جانے کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ جب وہ سرد پڑ جاتا ہے تو اسے پشیمانی ہوتی ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ ڈاکٹر کے بس کی بات نہیں۔ جان جانے کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ کسی نا عاقبت اندیش کے پلے نہ پڑ جانا۔ میں ایک گھنٹے تک بلکہ اس سے بھی زیادہ دیر تک اس کے مکان کے گرد گھومتا رہا کہ شاید وہ مجھے دیکھ کر طلب کر لے۔ جب نا امید اور مایوس ہو گیا تو پھر میں نے قریب ایک ہول میں کمرہ کرایہ پر لیا۔ پھر شراب اور سوڈے کی کچھ بوتلیں منگوائیں۔ شراب اور خواب آور دوا کی ایک خوراک سے میں نے اپنے آپ کو مدہوش کر لیا۔ زندگی سے موت تک کی اس دوڑ میں صرف گہری نیند کا ایک وقفہ تھا۔

اس نے توقف کیا تو اس وقت مسلسل آٹھ گھنٹیاں بھیں۔ اس کا مطلب یہ کہ صبح کے چار بج چکے ہیں۔ گھنٹیوں کی آواز نے داستان کو کوچوٹا دیا اور اس نے یکا یک گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

حسن، شباب..... نو جوان..... پر شباب بدن کا گداز اور جسمانی تناسب..... یوں تو میں نے اس سے کہیں حسین اور پرکشش عورتیں دیکھی تھیں لیکن ایسی پاگل کر دینے والی نہ تھیں..... جو پہلی عورت اسپتال میں مجھے ملی تھی جس نے اپنا آلہ کار بنایا..... کھلونا بنایا..... کٹھ پتلی بنایا تھا..... لیکن اس میں اس عورت ایسی رعونت اور فکر نہ تھا۔ اپنی غرض کے لیے وہ محبت والہانہ پن اور بڑی خود سیردی سے پیش آتی تھی۔ بہت خوش کرتی تھی۔ کسی بات سے انکار نہ کرتی۔ میں نے کچھ رقم مانگی تو وہ بغیر کسی تذبذب کے پیش کر دیتیں..... یہ سب کچھ اس نے ایک اونچا ہاتھ مارنے کے لیے کیا تھا مجھے بھگتنا پڑا تھا لیکن میں نے موقع پا کر اور سود و وصول کر لیا تھا..... وہ آج بھی مجھے بھولی نہ تھی۔ یاد تو کرتی ہوگی۔ میں نے اسے جو چوٹ دی اس کا دور اسے آج بھی یقیناً محسوس ہوتا ہوگا۔

جس وقت ریلوے اسٹیشن پہنچا تو دن ڈوب چکا تھا۔ شام کے دھندلے اندھیرے کی آغوش میں مدغم ہو رہے تھے۔ جاوا کے پہاڑوں میں اندھیرا ہو جانے کے باعث حادثوں کے خوف اور ڈر سے گاڑیاں چلتا بند ہو جاتی ہیں۔ ڈاک بنگلہ میں میں نے رات گزارنے کے لیے کمرالے لیا۔ رات کے کھانے سے فراغت کے بعد میں کمرے میں آیا تو بستر پر روانہ ہو گیا۔ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو ڈاک بنگلے کے ساتھ ایک نو جوان لڑکی تھی۔ وہ اسے لے کر اندر آ گیا۔ وہ چودہ برس کی بری بدست لڑکی تھی۔ حالاں کہ وہ ایک نوخیز ترش پھل کی مانند تھی۔ انتہائی زرخیز اور شاداب اور پرکشش تھی۔ اگر اس عورت کا جادو مجھ پر چڑھا ہوتا تو شاید میں اسے روک لیتا۔ میں نے معذرت کر لی۔ پھر دروازہ اور روشنی بند کر کے بستر پر دراز ہو گیا لیکن اس عورت کا تصور اور سراپا نے

تھوڑی دیر خیالات مجتمع کر کی اس نے پھر قصہ سنانا شروع کیا۔

اس کے بعد کے وقت کا بیان میرے لیے بہت دقت طلب، مشکل اور کرب ناک ہے، میرا خیال ہے مجھے بخار ہو گیا ہے۔ بہر صورت مجھ پر چڑھے پن کی سی کیفیت جو دیوانگی کے لگ بھگھی طاری ہوئی۔ میں پاگل ہو رہا تھا۔ اندھا جنون تھا جس نے مجھے بے چین اور اذیت کیا ہوا تھا۔ منگل کے روز میں وہاں پہنچا تھا اور میری اطلاع کے مطابق اس کے شوہر کو سنیچر کے دن وہاں پہنچنا تھا۔ ابھی تین دن باقی تھے جن میں سے اسے میں اس مصیبت سے نجات دلا سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ مجھ سے ملاقات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کی اولاد کی خواہش اور اس سے بڑھ کر اپنے ناروا سلوک کے لیے معذرت کی میرے ذہنی کرب کو شدید تر کر رہی تھی۔ ایک ایک بلی بے حد نازک اور جتنی بھی تھا۔ اسے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ گیا وقت نہیں آتا ہے۔ وقت کسی کا نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی وہ ٹھہرتا ہے۔ میں اس کی امداد کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شاید ابھی تک یہ فرض کیا ہوا تھا کہ میں اپنی غرض اور خواہش کے بدلے اس کی مشکل کروں گا۔ اس کی غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کی مدد کرنے کے لیے کوئی جرم کرنے کے لیے تیار تھا لیکن وہ شس سے مس نہ ہوئی۔

اگلے دن صبح کو جب میں وہاں پہنچا تو وہ چینی لڑکا بھی وہاں برآمدے میں کھڑا تھا۔ جوں ہی اس نے مجھے دیکھا وہ سراپہ سا ہو کر اندر بھاگ گیا لیکن اس مختصر وقفے میں بھی میں نے اس کے چہرے کی خواہش دیکھ لیں جو اسے میرے ہاتھوں آئی تھی۔ شاید اس نے میری آمد کی اطلاع کے لیے اتنی غلت کی تھی اور یہ ایک ایسی بات جو مجھے اب پاگل کیے دیتی ہے۔ ممکن

ہے اسے اس بات کا احساس ہو گیا ہو کہ میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ اور وہ مجھے بلانے پر آمادہ ہو۔۔۔۔۔ لیکن چینی لڑکے کی صورت نے مجھے اپنے جارحانہ اور شرمناک رویے کی یاد دلائی اور میں دروازے سے لوٹ آیا اس وقت میں ایک کرب میں مبتلا تھا۔ وہ بھی اس وقت کچھ کم دکھ میں نہ تھی اور میرا انتظار کر رہی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں اس اجنبی شہر میں وہ پریشان کن لمحات کی طرح بسر کروں۔ یوں تو شراب اور ہر عمر کا شہاب میسر تھا۔ شرط جب سے شروع تھی لیکن اس کے عوض میں امراض خبیثہ کی شکار ہونا نہیں چاہتا تھا کہ اس عذاب سے چھٹکارا پانا ناممکن سا تھا۔ مجھے دفعتاً خیال آیا کہ مجھے ریڈیڈنٹ سے جس کی ٹانگ کا آپریشن کیا تھا ملنا چاہیے۔ وہ گھر پر ہی تھا اور مجھ سے مل کر بہت خوش ہوا۔ میں نے بتایا کہ میں وہاں اس سے اپنے تبادلے کے لیے آیا ہوں۔ اب میرے لیے مزید عرصہ جنگوں میں رہنا مشکل تھا اور میں فوراً دار الحکومت میں آنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے ایک ڈاکٹر مریض کو دیکھتا ہے۔

”اس کے لیے آپ کو کچھ انتظار کرنا ہوگا۔۔۔۔۔ زیادہ نہیں صرف تین چار ہفتے۔۔۔۔۔“ اس نے جواب دیا۔

”تین چار ہفتے۔۔۔۔۔“ میں نے ہڈیانی لہجے میں کہا۔ ”اب وہاں ایک دن ٹھہرنا بھی میرے لیے کسی جہنم میں ٹھہرنے کے مترادف ہے۔“ پھر وہی سوالیہ نگاہ میرے چہرے پر مرکوز ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔۔! میرا خیال ہے کہ آپ کو اتنا تو توقف کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ ہمیں آپ کی جگہ خالی نہیں چھوڑنا چاہیے لیکن میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ آپ کا کام ہو جائے گا۔“ میں کھڑا اپنے ہونٹ کاٹا رہا۔ میرا ارادہ اس کے احکام کی تعمیل سے انکار کر دینے کا تھا لیکن

نے آخر تک اس سے صحیح گفتگو کی۔ اس کی کسی بات اور سوال کا میں نے دھیان اور توجہ سے سنا اور ٹھیک ٹھیک جواب دیا۔ جبکہ میری نگاہیں بار بار داخلی دروازے کی طرف چلی جاتی ہیں لیکن غیر محسوس انداز سے کہ وہ میری غیر اضطرابی کو محسوس نہ کر سکا۔ میں اس طرح سے اس داخلی دروازے کو دیکھ رہا تھا جیسے وہ گہرے بادل ہوں اور اس کی اوٹ سے چودھویں کا چاند طلوع ہونے والا ہو۔ میں نے اس کے ہاتھ مرمریں گوری عریاں گداز بائیں۔ عریاں سڈول پنڈلیاں اور پر شاب گداز بدن کو اس کی فراک میں آج دیتے دیکھا تھا جس نے حسن و جمال کی حشر سامنا یاں واضح کر دی تھیں لیکن چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ کیوں کہ اس نے جو نقاب چہرے پر ڈال رکھا تھا اس بات کا خیال رکھا اور احتیاط کی تھی اس کے نقوش واضح اور نمایاں نہ ہو جائیں۔ پھر یک لخت میری اعصابی کم زوری عود کر آئی اور میں لڑکھڑانے لگا۔ کیوں کہ اس لمحے بادلوں کی اوٹ سے چاند نکل آیا تھا۔

وہ کمرے میں اپنا جلوہ لیے طلوع ہوئی تھی۔ قیمت تھا کہ اس اثنا ریڈیٹ مجھ سے گفتگو ختم کر کے ایک اور مہمان سے باتیں کرنے لگا تھا۔ وہ بے نقاب تھی۔ میں نے ایک بل کے ہزارویں حصے میں اسے پہچان لیا تھا۔ کیسے نہ پہچانتا پنڈلیاں بائیں قامت اور جسم کے نشیب و فراز کو ابھی دے رہے تھے کہ یہ وہی ہے اور پھر حسن کی کرشمہ بازیایں..... اس نے سیاہ اور تو چست پہن رکھی تھی جو جسم کے فراز تک تھی۔ مخملیں گداز سڈول شانے عریاں تھے۔ فراک کی حدود نے فراز کو نہ صرف عریاں بلکہ بے حد نمایاں کر دیا تھا۔ وہ بے لباس سی لگ رہی تھی اور بھی عورتیں جو حسین اور نوجوان تھیں اس پارٹی ڈریس میں نمایاں تھیں لیکن اس کے سہرنے انہیں ماند کر دیا تھا۔ اس کا چہرہ بھڑکیلا بدن شاید ہی کسی

وہ ہشار اور دور اندیش آدمی تھا۔ میرے تلخ جواب کو اس نے نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ ایک سادہ دھڑکی زندگی گزارتے رہے ہیں اور یہ بات کسی شخص کو اعصابی کمزوری میں مبتلا کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ ہم لوگ سب حیران تھے کہ آپ نے کبھی چھٹی نہیں لی۔ آپ کبھی ہمارے پاس نہیں آئے..... گاہے گاہے خوش مذاق لوگوں کو محفل میں شرکت آپ کے لیے بہت اچھی ثابت ہوئی..... اتنا شام گورنمنٹ ہاؤس میں ایک استقبال ہے کیا آپ چلیں گے..... ساری نوآبادی کے معززین وہاں ہوں گے اور ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اکثر آپ کے متعلق دریافت کیا ہے اور آپ سے ملنے کے لیے مشتاق اور بے چین ہیں۔

میں اس بات پر چونکا کہ انہوں نے میرے متعلق پوچھا ہے اور انہیں مجھ سے متعارف ہونے کا امتیاز ہے..... کیا وہ ان میں سے تھی..... اور یہ خیال میرے لیے شراب کی طرف کیف آور تھا..... میں نے اپنے رویے کو یاد کیا اور دعوت کا شکریہ ادا کرتے مل از وقت آنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔ سرور اور شاداں اور فرحت بخش سرور سا تھا۔

اور میں داخلی وقت سے قفل پہنچ گیا۔ میں نے قفل از وقت پہنچ کر اس بات کا ثبوت دیا تھا کہ میرے نزدیک وقت کی اہمیت کیا ہے..... وقت سے پہلے میری بے صبری اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ میں سب سے پہلے ریڈیٹ کی بڑے ڈرائنگ روم میں جا پہنچا۔ پندرہ منٹ تک میں اکیلا اس خاموشی کا مہمان رہا جو اس وقت وہاں پھیلی ہوئی تھی..... پھر کچھ دیر بعد سرکاری مہمان آنا شروع ہو گئے۔ کچھ سرکاری افسر اپنی بیویوں کے ساتھ آئے اور پھر ریڈیٹ میں آ پہنچا۔ اس نے بڑے تپاک کے ساتھ میز استقبال کیا اور مجھ سے طویل گفتگو کرنے میں مصروف ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ میں

عورت کا ہوگا۔ وہ قیامت بن کر آئی تھی اور بجلی بن کر گر رہی تھی۔ اس نے مجھے جیسے خاکستر کر دیا تھا۔ میں دل تھام کر رہ گیا۔

اس میں جو دقار اور حکمت تھی جس سے لگتا تھا کہ وہ کوئی ملکہ ہو وہ ایک طرف کھڑے جوڑوں سے بڑے شوخ و شنگ انداز سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھ سے یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ وہ ہنسنے میں بڑی احتیاط برت رہی ہے اور رات کی رانی کی طرح مہک رہی ہے فضا میں جو سوندھی سوندھی خوشبو بکھیر رہی ہے وہ کسی پرفیوم کی نہیں بلکہ اس کے جسم کی ہے جو پھوٹ کر پھیل رہی ہے۔ میں مہمانوں کے درمیان سے ان سے معذرت کرتا اس کے اور میرے درمیان جو فاصلہ تھا وہ کم ہوتا اور رکاوٹیں جو مہمان نے مجھے پاگل کر دیا کینکھ میں جانتا تھا کہ وہ ہنسی بالکل مصنوعی ہے۔ میں نے لحظہ کے لیے سوچا کہ آج بدھ ہے اور سیچر کو اس کا شوہر واپس آئے گا۔ وہ کس طرح اتنی بے فکری کے ساتھ ہنس سکتی ہے۔

دوسرے کمرے سے سازوں کی آواز آئی۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ رقص شروع ہونے والا ہے۔ ایک ادھیڑ عمر کے مرد نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اسے اپنا سامھی لیا تاکہ کوئی اور اسے ہم رقص نہ بنالے۔ ایسا ہم رقص اسے پوری محفل میں مل نہیں سکتا تھا۔ جن لوگوں سے وہ گفتگو کر رہی تھی ان سے معذرت کرتے ہوئے اس نے اپنے سامھی کا ہاتھ تھام لیا اور رقص کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ رقص کے دوران وہ میرے قریب آ گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑے زور سے چوکی تو لیکن اس کے عشرے سے کسی قسم کے تاثرات ابھرے نہ تھے۔ اسے اپنے آپ پر قابو آنا آتا تھا۔ ہر کوئی اس طرح سے اپنے تاثرات چھپا نہیں سکتا تھا۔

پیشتر اس کے کہ میں یہ فیصلہ کر پاتا مجھے اس سے اپنی واقفیت کا اظہار کرنا چاہیے یا نہیں.....

اس نے مجھے دوستانہ انداز سلام کیا اور میرے قریب سے کسی معطر جھونکے کی طرح گزر گئی لیکن اس کے بدن کی تپش میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا جو آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ کوئی شخص گمان نہیں کر سکتا تھا کہ اس اتفاقی نظر میں کیا کچھ مضر تھا..... حقیقت تو یہ ہے کہ میں خود بوکھلا گیا۔ اس نے کیسے بے باکی سے مجھے پہچان لیا..... شاید اس نے بھی جان لیا ہوگا کہ میں اسے بے نقاب دیکھ کر پہچان چکا ہوں۔

پھر میرے دل کے کسی کونے میں ایک ان جان سا خیال آیا کہ کیا وہ صبح کے لیے پیش قدمی کر رہی ہے۔

اس کا سلام کرتے وقت اس کے سرخ گداز ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ کا ابھر آنا میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ اس میں فکر اور نخوت نام کو نہیں تھی۔ رعوت بھی نہیں تھی۔ اس کا اس انداز سے سوچنا فطری تھا اور ہتھیار ڈال دینے کے مترادف بھی تھا۔ اب فرار کی کوئی راہ نہیں رہی تھی۔ اس کے نزدیک پرواہ جیسے مسدود ہو چکی تھی۔

اور رقص کرنی رہی اور میں اسے بے خود سا ہو کر دیکھتا رہا اس کا گداز شاخ گل کی طرح پلک رہا تھا۔ وہ آڑھی ترچھی ہو کر بل کھا رہی تھی۔ اس کے بجلی بھرے انگ انگ سے مستی ابل پڑ رہی تھی..... زاویے بدل بدل کر جس سے ایک عجیب سی دل کشی اور رہنمائی دل کو چھو رہی تھی۔ دل کر رہا تھا کہ وہ اس انداز سے ناچتی، لپکتی اور ترکتی رہے..... صدیاں بیت جائیں..... میں نے بھی ایسا رقص نہیں دیکھا تھا۔ وہ دھن کا برابر ساتھ دے رہی تھی۔ سازندوں نے جو اس کا رقص دیکھا قرآن میں ایک ہیجان سا آ گیا تھا۔ وہ بڑے پر جوش ہو گئے تھے بہت سے جوڑے اپنا رقص بن کر اسے دیکھنے لگے اور آنکھوں میں آنکھوں میں داد دے رہے تھے۔

”میں تین راؤنڈ رقص کی وجہ سے بڑی تھکن سی محسوس کر رہی ہوں۔ اس لیے ذرا جلدی گھر واپس جاؤں گی اور آپ لوگوں سے معذرت خواہ ہوں۔ شب بخیر۔“ ڈرائنگ روم تیز روشنیوں میں نہا رہا تھا اس کے باوجود وہاں موجود مہمان ایک ایک کر کے کھٹک لیے تھے اس وقت وہ تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ البتہ دوسرے کمرے میں کچھ جوڑے ابھی تک رقص کر رہے تھے۔ اور ایسے لوگ جو رقص سے دل چسپی نہیں رکھتے تھے وہ تاش کھیلنے کے لیے میزوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ جن کے ساتھ ان کی بیگمات نہیں تھی وہ سیاست پر گفتگو کر رہے تھے۔ وہ اس وسیع کمرے سے بڑی تمکنت اور وقار کے ساتھ گزری۔ اور اس کی سبک خرامی نے مجھے کیف و سرور کے جہاں میں پہنچا دیا۔ پہچان خیزی اتنی تھی کہ میرے سارے عجز پر سستی دوڑ رہی تھی۔ وہ دلکش انداز سے مسکراتے ہوئے بھی دائیں جانب الوداع کہتی تو کبھی بائیں جانب اپنا خوب صورت سنگدل اور نازک لہراتے ہوئے۔ یہاں تک کہ وہ کمرے کے آخر تک پہنچا۔

وہ یہاں سے نکلنے والی تھی اچانک اس خیال کے آتے ہی کہ وہ پھر جہانم دے کر فحش نکلے گی۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اس کے تعاقب میں بھاگنا شروع کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا فحش کر نکل جائے۔ جی ہاں بھاگنا۔ میرے چوتے تنگے موزائیک فرش پر بچ رہے تھے۔ ہر شخص نے میری اس غیر مہذبانہ حرکت کو قہر آلود نظروں سے گھور کر دیکھا۔ میں عداوت سے عرق عرق ہو گیا لیکن اس کے باوجود میں رکنا نہیں۔ اس لیے پچھلی کمرے کی دیر سے فائدہ اٹا کر پرواز کرنے والا جوتھا۔

وہ جوں ہی دروازے پر جا پہنچی۔ میں نے اسے جا لیا۔ اس وقت تو یہاں تنہائی تھی۔ ہم دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ میرے دل میں آیا کہ

میں جانتا تھا کہ وہ اس لمحے رقص کے متعلق نہیں۔ بلکہ اپنے مسئلے کے متعلق سوچ رہی تھی جس کے بارے میں خود بھی سوچ رہا تھا۔ وہ ایک خوف ناک راز تھا جو صرف ہم دونوں جانتے تھے۔ اس خیال نے میری پریشانی میں اور اضافہ کر دیا اور میری تنہا اور پریشانی تر ہو گئی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس وقت کوئی اور شخص بھی مجھے دیکھ رہا تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا اشتیاق آمیز جھس اس کی ظاہری بے پروائی کی وجہ سے بہت نمایاں تھا۔ اس کے علاوہ کئی اور جانب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک اور بات یہ تھی کہ جب وہ اس کمرے میں داخل ہوئی تھی اس سے ملحق کمرہ ایک اپ روم تھا۔ اس نے ایک جھلک اور ایک جلوہ دکھا کر اس میں گھسی گھسی۔ جب چند لمحوں کے بعد نگلی تو اس کے چہرے پر نقاب تھا۔ میں نے اس بل اسے دیکھا اور نظروں میں جذب کر کے دل پر نقش کر لیا تھا۔ نقاب میں ہونے کے باعث وہ اس محفل کی اور جان بن گئی تھی۔ میرا دل ابھی بھرا نہیں تھا۔ میں اسے جی بھر کے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس انتظار میں بھی تھا کہ دیکھوں وہ کب یہ نقاب اتارتی ہے۔ لہذا وہ ایک لحظے کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ میری نگاہوں کا اس پر مرکز ہو جانا اسے یقیناً اسے ناگوار گزرا ہے۔ وہ اپنے ماضی کے بازوؤں میں واپس پہنچا۔ اس نے مجھ پر ایک نگاہ ڈالی جو آمرانہ اور خشکیاں ہونے کے ساتھ ساتھ اس حکم کی نماز بھی کہ مجھے اپنے جذبات پر قابو پانا چاہیے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ میں وہاں کتنی دیر تک کھڑا رہا۔ شاید ابد تک میں بالکل مسحور ہو چکا تھا۔ اس کے لیے میری موجودگی ناقابل برداشت ہو گئی تو وہ ڈرائنگ روم میں آ گئی اور مہمانوں سے گفتگو کرنے لگی۔ اس کے لب و لہجہ اور کھڑے ہونے سے اس کی تھکن ظاہر ہو رہی تھی۔ دفعتاً اس نے اپنی گفتگو ختم کر دی اور ایک دل آویز مصنوعی تھکن کے ساتھ کہا۔

چھپا لیا تھا اور میرا خواب ملایا میٹ ہو گیا تھا۔  
میں نے جیب سے ڈائری ڈائری جس میں  
کچھ نسخے تھے نکالی اور اس میں سے ایک نسخہ پھاڑ  
کر اس کی طرف بڑھایا۔ اور اس سے محضرت  
کے الفاظ بھی کہے۔ ایک لطیف مسکراہٹ کے  
ساتھ اس نے کاغذ لٹے ہوئے بڑی ممنونیت سے  
مجھے شب بخیر کہا اور چلی گئی۔

اس نے معاملہ دگرگوں ہونے سے بچا لیا  
تھا لیکن حالات بڑے مایوس کن تھے۔ میں منزل  
کو پالنے کی حد تک پہنچ کر ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اس  
نے آئینہ دل پر تر سے ایسا پتھر دے مارا تھا اس  
کی کرجیاں میرے وجود میں چھب گئی تھیں۔ وہ مجھ  
سے میری حماقت کی وجہ سے متنفر ہو گئی تھی..... اور  
پھر مجھے انتہائی حقارت سے دیکھتی تھی۔ جس دفعہ  
اس کے پاس گیا تھا اس لیے اس نے مجھے کسی کتے  
کی طرح دھتکار دیا تھا میری آنکھوں میں  
شیطانیت ناچ رہی تھی۔ اس کی حرکت سے میں  
اس قدر دل برداشتہ اور غمگین ہوا کہ میز پر جا  
کر میں نے براہی کے یکے بعد دیگرے چار  
بڑے پیگ حلق سے اتار لیے۔ میرے اعصاب  
چھوڑوں کی مانند ہو رہے تھے۔ براہی کی اتنی  
مقدار کوئی شے انہیں بحال نہیں کر سکتی تھی۔ پھر  
میں ایک قریبی دروازے یوں باہر نکل گیا جیسے  
چوروں کی طرح آیا تھا۔

جب میں کھلی جگہ پر آیا تو مجھے اس حماقت کا  
احساس ہوا کہ میں نے غلت سے کام لیا تھا۔ جیب  
وہ پہلی بار مجھ سے ملنے اور مشورہ کرنے آئی تھی  
تب میں اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ میں اس پر  
ظاہر نہیں کرتا کہ میرا ارادہ مذموم اور گھناؤنا ہے۔  
اپنا مطلب اور اپنی غرض ظاہر نہیں کرتا اس  
معائنے کے بہانے سے اسٹریچر لٹاتا۔ پھر میں  
اسے پہلے کھڑو دارم سے بے ہوش کرتا پھر مدوشی  
کا انجیکشن لگاتا۔ اسے ساری رات استعمال  
کرتا..... میں چینی لڑکے کو کسی اور کمرے میں ملا

اسے اپنی آغوش میں لے کر اس کے چہرے پر  
نقاب اتار پھینکوں اور اس کے لب بولیں ان پر  
مہر ثبت کر دوں اور پھر اسے گود میں اٹھا کر برابر  
والے کمرے میں لے جاؤں جس کا دروازہ بند  
تھا اور اس پر وینٹک روم کی تختی لگی ہوئی تھی اور  
دل کے سارے ارمان نکال لوں..... میں یہ کہہ  
کر اسے بلیک میل کر سکتا تھا کہ چیخنے اور مدد کے  
لیے پکارنے کی صورت میں لوگوں کو بتا دوں گا تم  
کس مصیبت میں گرفتار ہو۔ تم بد چلن ہو۔ تم نے  
شوہر کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس کی غیر  
موجودگی میں آشنا کے ساتھ رنگ رلیاں  
منائیں۔ اب اپنے آشنا کی نشانی لیے پھر رہی  
ہو..... پھر وہ ڈر اور خوف سے اپنے آپ کو  
میرے حوالے کر دے گی۔

لیکن یہ سب خیال، خواب اور ریت کا پھاڑ  
تھا جو بکھر گیا۔ اس کی آنکھیں غصے سے سرخ  
ہو کر دھک رہی تھیں۔ تنہے نفرت و حقارت سے  
کانپ رہے تھے..... لیکن اس میں اپنے آپ پر  
قابو پالنے کی وہ قوت موجود تھی جس کا مجھ میں  
افسوسناک فقدان تھا۔ اس نے صرف ایک لمحے  
کے لیے اپنے غصے پر پالیا کیوں کہ اس وقت کچھ  
لوگ باہر نکلنے کے لیے اس طرف آرہے تھے۔  
اس نے چاہیں سن کر بے تحاشا ہنسا شروع  
کر دیا۔ پھر اپنی کمال ذہانت کے ثبوت دیتے  
ہوئے وہ بلند آواز میں کہنے لگی تھی کہ دوسرے  
لوگ بھی سن سکیں۔

”ڈاکٹر صاحب! اب آپ کو میرے بیٹے  
کا نسخہ یاد آیا۔ آخر ڈاکٹروں کو بھی تو کبھی کبھی  
نسیان ہو ہی جاتا ہے۔ کیوں جناب!“ وہ  
آئیڈالے مہمانوں سے مخاطب ہو کر بولی۔

پاس کھڑے ہوئے دو آدمیوں نے اس کی  
بات سن کر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا..... میں فوراً ہی  
سمجھ گیا اور دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی داد  
دی۔ اس نے کتنے سلیقے سے میرے گاؤ دی پن کو

کر کہتا کہ تمہاری مالکن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے..... اسے آرام سکون اور نیند کی سخت ضرورت ہے..... پھر میں شیطانی کھیل جاری رکھتا..... پھر اس سے لاکھ دولاکھ لکھ کا سودا کرتا اور اسے مصیبت سے نجات دلاتا۔ اب یہ تمام خیالات اور تدبیر میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ وہ میرا بال تک بچا نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے پھر کیا کیا..... کچھ بھی تو یاد نہیں..... پھر میں وہاں سے ایک شراب خانے میں گیا اور اپنے آپ کو بے خود بنانے کی کوشش کرتا لیکن کوئی شے بھی میری شدت کا احساس ختم نہ کر سکی۔ میں ابھی تک بھی وہ قہقہہ سن رہا تھا جو چابک بن کر میرے وجود پر لگ رہا تھا۔ جس نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا..... اور وہ مصنوعی قہقہہ بھی جس نے میرے تنواریں کو چھپا لیا تھا۔ میں اپنے آپ پر لعنت بھیج رہا تھا کہ ایک عورت سے مات کھا گیا۔ اس پریشانی اور کرب کی حالت میں ہوٹل کی طرف چل دیا۔

مجھے یہ خیال آیا تھا کہ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے میرے بہت سارے فرائض ہیں لیکن میں ہوس پرست کیوں کر اور کس لیے بن گیا۔ مجھے اس راستے پر ڈالنے والی اسپتال کی نرس تھی۔ میرا فرض صرف اور صرف انسانیت کی خدمت ہے۔ میں ڈاکٹر سے شیطان بن گیا تھا۔ میں فرض کے احساس تلے دبا ہوا تھا..... فرض کا خبیث احساس..... مجھے یہ خیال دیوانہ کیے دیتا تھا کہ شاید اب بھی اسے میری ضرورت ہے۔ اس مصیبت سے اسے نجات دلانا میرا فرض ہے..... وہ ایسی عورت نہیں معلوم دیتی تھی جو شوہر کی غیر موجودگی میں غلاطی کے دلدل میں گر جائے۔ جس نے اسے جس مصیبت سے ہم کنار کیا تھا شاید یہ تھا کہ اس کی کسی کم زوری یا پھر اس کے حسن و شباب نے لٹیرے خواص کی بے حرمتی کرنے پر اکسایا ہو۔ مجھے یقین تھا کہ اسے

میری ضرورت ہے۔ لہذا اس کی کم زوری یا پریشانی یا مصیبت سے فائدہ اٹھانے کی بجائے اس کی بغیر کسی غرض اور مطلب کے مخلصانہ اور انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر مدد کرنی چاہیے۔ آج جمعرات کی صبح تھی۔ دو دن بعد اس کا شوہر آنے والا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مغرور عورت وہ مذاق بھولے سے بھی گوارا نہیں کرے گی جو اس راز کو فاش کر دے۔ میں کئی گھنٹے تک اپنے کمرے میں اس خیال میں غرق رہا اور اپنی بے خبری، شیطانیت اور شدید غلطیوں کو کوستا رہا جن کی وجہ سے میرے لیے اس کی مدد کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ میں کسی طرح اس تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ کس طرح سے اسے یقین دلا سکتا تھا کہ میرا تمام تر مقصد اس کی زندگی بچانا تھا..... لیکن وہ مجھ سے ہر قیمت پر ملنے کے لیے قطعی تیار نہ تھی۔ میں خیال ہی خیال اس کے آتشیں قہقہے سن رہا تھا اور اس کے حقارت و نفرت سے پھڑکتے ہوئے تنھے دیکھتا رہا..... ساری رات کمرے میں ٹھٹھکی گزر گئی..... یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ کچھ دیر بعد سورج کی شعاعیں برآمدے میں چھینکے لگیں اور پھر اپنی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف ہو گئی۔

بالآخر میں نے اسے خط لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ خط انتہائی منکسرانہ تھا۔ یوں تو اس میں دنیا بھر کی باتیں تھیں مگر کوئی خاص بات نہ تھی۔ میں نے اسے صاف کر دینے کی التجا کی..... میں نے اس خط میں اپنے آپ کو ایک جوانی اور بے ہودہ آدمی تسلیم کیا اور پھر اس سے التجا کی وہ مجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو علاج کے لیے میرے سپرد کر دے۔ میں نے خط میں قسم کھائی کہ اس علاج کے بعد میں وہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں نے درخواست کی کہ وہ مجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس نازک ترین وقت میں میری امداد قبول کر لے۔

میں نے بیس صفحے لکھ ڈالے۔ یہ ایک

حیرت انگیز خط تھا۔ میں نے جب خط ختم کیا تو بسنے سے شراپور تھا۔ میں نے خط کو پھر پڑھنے کی کوشش کی مگر الفاظ میری آنکھوں کے سامنے تیرنے لگے۔ میں لفافہ اٹھانے کے لیے اٹھا تو مجھے خیال آیا کہ میں خط میں کسی ایسی بات کا بھی اضافہ کر دوں جس سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک بار پھر میں نے قلم اٹھاتے ہوئے آخری صفحہ پر ان الفاظ کا اضافہ کر دیا۔

میں معافی کے چند الفاظ کے لیے اس ہوٹل میں منتظر رہوں گا اور اگر شام سے قبل مجھے آپ کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوتا تو پھر اپنے آپ کو گولی کا نشانہ بنا دوں گا..... تاکہ کفارہ ادا ہو جائے اور آپ خوش ہو جائیں۔

لفافے میں خط بند کر کے ہوٹل کے ایک ویز کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو اس سے کہا کہ وہ فوراً اس خط کو تحریر کردہ پتے پر پہنچا کر آئے۔ میں نے اسے بخشش بھی پیش کی دے دی۔ اب مجھے خط کے جواب کا انتظار کرنے کی بجائے اور کوئی کام نہ تھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے جب دوبارہ بولنا شروع کیا تو اس کی آواز میں ایک نیا جوش و خروش تھا۔

سیاسیت میرے لیے اپنے معنی کو چکی تھی۔ جنت اور جہنم کی حیرانی روایتیں میرے نزدیک اب کوئی وقت نہیں رکھتی تھیں..... لیکن اگر حقیقتاً کوئی جہنم ہے تو میں اس سے کوئی خوف محسوس نہیں کروں گا۔ کیوں کہ ان گھڑیوں سے زیادہ عذاب وہ وہ کوئی جہنم نہیں ہوگا جن میں انتظار کا وہ وقفہ میں نے گزارا..... تنگ کمرہ دوپہر کی گرمی سے بجٹی کی طرح چپ رہا تھا..... کیا آپ کو بھی استوائی علاقے کے ہوٹل کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے.....! میز پر سوائے میری گھڑی اور پستول کے کوئی اور چیز نہیں تھی۔ میں گھروں کی طرف منٹکی باغیچہ دیکھ رہا تھا۔ کھانے پینے حتیٰ کہ سگریٹ تک سے بے نیاز میں بے حس و حرکت بیٹھا گھڑی کی

طرف دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہیں گھڑی کی دوسری سوئی کو چکر کاٹتے دیکھ رہی تھیں۔ اس حالت میں میں نے سارا دن گزارا۔

میری نگاہیں ابھی تک گھڑی ہی پر مرکوز تھیں۔ وقت تھا کہ گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ کہ سوئیاں وقت کی نپلن کی طرح رک گئی ہیں..... تین بج کر بائیس منٹ پر دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک مقامی لڑکا کاغذ کا تہہ شدہ کلڑا بغیر کسی لفافے کے لیے ہوئے اندر آیا۔ میں نے لپک کر وہ رقعہ اس سے چھین لیا اور نپل اس کے کہ میں اسے کھول کر پڑھتا وہ وہاں سے بخشش لیے بغیر ہی کھسک گیا۔

پہلے پہل تو میں اس مختصر پیغام کو پڑھ نہ سکا۔ یہ اس کا جواب تھا۔ الفاظ میری آنکھوں کے سامنے سے بھاگتے لگے۔ ان کا کوئی مطلب میری سمجھ میں نہ آیا۔ اپنے حواس بحال کرنے اور نپل سے لکھے ہوئے اس رقعے کو کہنے سے قبل اپنے ذہنی انتشار اور سرایسکی کو سکون دینے کے لیے میں نے اپنے سر کو ٹھنڈے پانی سے دھویا۔ اس سے ایسا کھلون اور راحت ملی کہ دماغ ٹھکانے آیا۔

اگرچہ بہت دیر ہو چکی ہے تاہم آپ ہوٹل میں ٹھہر کر انتظار کریں۔ شاید مجھے آخر میں آپ کو بلانے کی ضرورت محسوس ہو۔

اس مڑے تڑے..... رقعے پر کس کے دستخط نہ تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کاغذ کا وہ پرزہ کسی کاغذ یا اشتہار سے بھاڑا گیا ہو۔ تحریر کچھ رواں نہ تھی جو شاید جذبات کی براہ راست سی کی وجہ سے ہو..... یا ہو سکتا ہے کہ رقعہ گاڑی میں بیٹھ کر لکھا گیا ہو۔ بہر حال اس کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ کہا نہیں جا سکتا..... لہذا ایک بات جو میں وہ رقعہ پڑھ کر بھانپ گیا وہ یہ تھی کہ پریشانی، عجلت اور خوف اس تحریر پر دم تھے۔ اس خط نے مجھے انتہائی خوف زدہ کر دیا..... لیکن اس پر بھی



طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھنج گئے اور پھر اس نے ایک لفظ تک نہ کہا..... میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ وہ اب بھی خاموش ہی رہا اور میں سمجھ گیا کہ وہ کسی صورت بھی نہیں بولے گا۔

ابھی ایک تنگ گلی میں ایک بوسیدہ مکان کے سامنے رگ گئی۔ یہ کچھ عجیب دیران سی جگہ تھی۔ سامنے ایک چھوٹی سی دکان تھی جس میں موم بتی جل رہی تھی۔ قریبی عمارت میں ایک غلیظ سا ہول تھا۔ جو ان قمار خانوں، چکلوں اور ناہانیوں کی دکانوں میں ایک تھا جو معمولی درجے کے چینی مشرق کے تمام بڑے بڑے شہروں میں چلاتے ہیں۔

لڑکے نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ ایک دواغ کے برابر کھلا جس کا انداز بڑا براسرار تھا..... اور اندر ایک اکٹا دینے والی غفٹ و شنید شروع ہوگئی۔ بے تابی سے میں گاڑی سے باہر کود پڑا۔ دروازے کو کندھے سے دھکا دے کر کھولا۔ ایک بوڑھی چینی عورت چیخ مار کر میرے سامنے سے بھاگ گئی۔ چینی لڑکا میرے ساتھ چلا آیا۔ ہم دونوں دوسرے دروازے پر پہنچے۔ اسے کھول کر میں ایک تاریک کمرے میں پہنچ گیا۔ جس میں سے براعظمی اور فون کے پھپھکے نکل رہے تھے اور کوئی بڑا کراہ رہا تھا۔ میں اس اندھیرے میں کچھ نہ دیکھ سکا اور میں اس آواز کی طرف اٹھل سے بڑھا۔ وہ وہاں پڑی تھی۔ ایک میلی چینی چٹائی پر پڑی وہ درد سے دہری ہو رہی تھی۔ اور سسکیاں بھر رہی تھی۔ کمر اس قدر تاریک تھا کہ میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ میں نے اپنا ہاتھ پھیلا یا تو میرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر جا پڑا جو حرارت سے تپ رہا تھا۔ اسے بہت تیز بخار تھا۔ جو ہی مجھے احساس ہوا کہ کیا ہو چکا میں لرز اٹھا..... بس خدمت کے لیے اسے مجھ پر اعتماد نہیں رہا تھا..... علاج کے لیے اس نے اپنے آپ کو میرے حوالے کرنے

میں خوش تھا کہ..... چلو اس نے مجھے لکھا تو ہے پتھر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ آخر اسے میری ضرورت کا احساس تو ہوا ہے..... اس مصیبت میں وہ میرا ہاتھ تھامنے پر مجبور ہوئی ہے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ میری مدد کے بغیر کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی..... اس نے نہ صرف مجھے معاف کر دیا بلکہ وہ میری شرط پر شاید تیار ہو..... ایک امید سی تھی کہ آخر لحات میں وہ مجھ سے رجوع ہو سکتی ہے۔ مجھ جیسا قابل ترین ڈاکٹر شاید ہی کوئی ہو..... ذہن طرح طرح کے خیالات کا آماج گاہ بن گیا تھا۔

پھر میں نے زندہ رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس لیے بھی کہ مجھے امید تھی کہ وہ مجھے عین وقت پر امداد کے لیے طلب کرے اور اجازت دے دے پھر میں قیاس اور امید کی دنیا میں کھو گیا..... اگر اس نے عمل سے قبل مجھے اپنی مہربانی سے خوش کرے تو کیا میں آباد کی ظاہر کردوں۔

شام ہونے کو بھی دفعتاً میں چونک پڑا۔ اس وقت کوئی چھ بجے ہوں گے۔ میں نے سراپا گوش بن کر آواز سننے کی کوشش کی۔ اب کے آواز بالکل واضح تھی۔ دستک نہایت مہذب طور پر مگر مسلسل ہو رہی تھی۔ میں بے چینی کے ساتھ دروازے کی لچکا۔ دروازے پر وہ چینی لڑکا کھڑا تھا۔ روشنی اتنی کافی تھی کہ نہ صرف میں ضربات کے نشان بلکہ اس کی سیاہ آنکھیں، زخمی ٹھوڑی اور اس کے چہرے کا خاکستری مائل رنگ بھی دیکھ سکتا تھا۔

”صاحب..... جلدی آئیے۔“ اس نے صرف اتنا ہی کہا۔

میں بیڑیوں سے نیچے بھاگا۔ لڑکا میرے پیچھے تھا۔ ایک بھی ہماری منتظر تھی۔ ہم اس میں سوار ہو کر چل پڑے۔ جوں ہی بھی چلی میں نے کوچوان کو حکم دے بغیر چینی لڑکے سے پوچھا یہ کیا حادثہ ہوا ہے۔

لڑکے نے جواب دینے کی بجائے میری

بات کا کسی کو علم ہونا نہیں چاہیے..... اس کی کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے..... مجھے گھر لے چلو۔

میں سمجھ گیا کہ اسے اپنی زندگی سے عزت زیادہ عزیز تھی۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی تعمیل کی چینی لڑکا ایک پاکی لے آیا۔ ہم نے اسے اس پر اٹھایا اور نیم مردہ حالت میں رات کی تاریکی میں گھر لے گئے۔ پھر ایک کش کش شروع ہوئی موت کے ساتھ زندگی کی طویل مگر بے سود کش مکش۔“ پھر داستان گو نے میرا بازو اس بری طرح بھینچا کہ درد کی شدت سے اپنی چیخ کو روکنا میرے لیے مشکل ہو گیا۔ اس کا چہرہ میرے اس قدر قریب تھا کہ میں تاروں کی روشنی میں اس کے دانتوں کی چمک اور اس کی عینک کے شیشوں کا عکس دیکھ سکتا تھا۔ وہ اتنے جوش اور غصے سے بول رہا تھا کہ مجھے اس کی آواز پھنکارنے اور چیخنے کے مابین کوئی نئی چیز تھی۔

”آپ ابھی ہیں جسے میں نے ان کی روشنی میں بھی نہیں دیکھا..... آپ جو اتنے اطمینان سے جو بحری سفر کر رہے ہیں..... کیا یہ جانتے ہیں کہ کسی کو مرتے ہوئے دیکھنا ہے کیا ہوتا ہے..... کیا آپ نے کبھی کسی کو نزع کے کرب میں دیکھا ہے..... کیا آپ نے کبھی مرنے والے کے جسم کو پکڑتے اور سمیٹتے دیکھا ہے..... کیا آپ نے کبھی کسی قریب المرگ والے شخص کے گلے میں لگی ہوئی آواز سنی ہے..... کیا آپ نے کبھی کسی مرنے والے انسان کی ناقابل خوف دیکھا ہے..... کیا آپ کو کبھی ایسا ہیبت ناک منظر دیکھنے کا کوئی اتفاق ہوا ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ اسے اپنی زندگی سے عزت زیادہ عزیز تھی۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ چینی لڑکا ایک پاکی لے آیا۔ ہم نے اسے اس پر اٹھایا اور نیم مردہ حالت میں رات کی تاریکی میں گھر لے گئے۔ پھر ایک کش کش شروع ہوئی موت کے ساتھ زندگی کی طویل مگر بے سود کش

کی بجائے اس چڑیل کے حوالے کر دیا تھا۔ جسے میں نے دروازے سے داخل ہوتے وقت راستے میں دیکھا تھا۔ اس نے اپنے کو ایک خطرناک اچھڑا دیا کے ہاتھ ہلاک کر لیا تھا۔

میں درشن کے لیے چیخا تو وہ سورن چڑیل ایک بدبودار تیل کا لیپ لے آئی۔ میرا جی چاہا کہ اس کا گلا گھونٹ دوں لیکن اس سے کیا فائدہ ہوتا..... اس نے لیپ میز پر رکھ دیا۔ لیپ کی مدغم روشنی میں اس کا جسم دیکھ سکتا تھا..... ایک دفعہ پھر میں ڈاکٹر بن گیا۔ علم اور تجربے کا پیکر جسے اپنی طرح کے ایک مصیبت زدہ فانی انسان کی بھلائی کے لیے اپنی اہلیت بروئے کار لانے کے لیے پکارا گیا تھا..... میں اپنے ناپاک وجود کو بھول گیا اور اپنی بیدار شدہ ذہانت کے ساتھ تباہی کی طاقت سے نیر دآزما ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔

میں نے اپنا ہاتھ اس کے عریاں بدن پر جس کے لیے کچھ دن پہلے اتنا بور محسوس ہوا تھا۔ رکھ دیا اب یہ میرے لیے مریض کا جسم بن چکا تھا اور اس سے زیادہ کچھ نہ تھا..... میں نے اس کے بدن کو اب زندگی کے ایک ایسے مسکن کے طور پر دیکھا جو موت کے ساتھ بدمر پیکار تھا۔ میں نے ایک ماہر کی طرح خطرے کی شدت کا اندازہ لگایا۔

میں نے دیکھا کہ بازی ہاری جا چکی تھی۔ اب اسے کوئی مجروحہ ہی بچا سکتا تھا۔ الفاظ اس بری طرح اور بے رحمی سے کیا گیا تھا کہ اس کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا..... وہاں کیا تھا جسے میں خون روکنے کے لیے کرتا۔ ہر وہ شے جس پر نگاہ پڑی یا جسے میں چھوٹا خون آلود تھی۔ مجھے وہاں صاف پانی اور تک میسر نہ تھی۔

میں نے کہا کہ..... اسے فوراً اسپتال لے جانا بے حد ضروری ہے..... اس پر اس کے ذہنی کرب نے اس کے جسمانی کرب میں اضافہ کر دیا اور وہ احتجاج کرتی ہوئی چیخ اٹھی۔ ”نہیں“ نہیں، نہیں..... میں مر جانا پسند کروں گی..... اس

میں۔“ پھر داستان گونے میرا بازو اس بری طرح بھینچا کہ درد کی شدت سے اپنی چیخ کو روکنا میرے لیے مشکل ہو گیا۔ اس کا چہرہ میرے اس قدر قریب تھا کہ میں تاروں کی روشنی میں اس کے دانتوں کی چمک اور اس کی عینک کے شیشوں کا عکس دیکھ سکتا تھا۔ وہ اتنے جوش اور غصے سے بول رہا تھا کہ مجھے اس کی آواز پھنکارنے اور چیخنے کے مابین کوئی نئی چیز لگی۔

ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں نے اکثر ایسے دل خراش منظر دیکھے ہیں لیکن ساری عمر میں ایک دفعہ میں نے صحیح معنوں میں موت کا کرب دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ زندگی میں صرف ایک بار ہی کسی کے ساتھ جیتا ہوں اور کسی کے ساتھ میرا ہوں..... اپنی گزشتہ زندگی میں صرف ایک مرتبہ اور اس وقت اس مہیب بیداری میں آج سے کچھ دن پہلے اس کے خون کو روکنے کے لیے اور اس غبار کی بخار کی حدت کو کم کرنے کے لیے جو کہ میری آنکھوں کے سامنے اس عورت کو کھائے جا رہی تھی اور فوری موت کو جو اس کے سر پر منڈلا رہی تھی ٹالنے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔

کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی اور طب اور علم الادویہ میں دسترس رکھنے کے باوجود اپنے ایسے فانی انسانوں کی امداد اپنا اولین فرض سمجھتے ہوئے کسی کے بستر مرگ کے سر ہانے بے بس ہو کر بیٹھنا اور صرف اتنا جانتا کہ اسے کوئی امداد نہیں دی جاسکتی۔ اس خیال سے ساری امیدیں دم توڑ دیتی ہیں۔ دلدل میں تنکے کے سہارے کی امید بھی نہیں ہوتی ہے۔ دل حوصلہ ہارنے لگتا ہے۔ تب یہ بھی ایک احساس ہوتا ہے۔ اور پھر میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں اسے اسپتال میں تو نہیں لے جا سکتا تھا جہاں اسے بچانے کی کوئی صورت بھی کی جا سکتی تھی۔ شاید اسے بنانے والے کو رحم آجائے..... کیوں کہ وہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔ وہ انسان کی زیادہ اور دعا سن لیتا ہے۔ میرے ساتھ

ایک مجبوری یہ بھی تھی کہ میں باہر سے بھی اس کے لیے کسی امداد کا انتظام بھی نہیں کر سکتا تھا..... میں صرف بیٹھ کر اسے مرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا..... امداد کے لیے بے معنی دعائیں پڑھتا رہا اور اس سے کہتا بھی رہا کہ ہمت کرو۔ تم موت کو شکست دے سکتی ہو۔ وہ موت کو شکست دینے کے لیے کوشاں تھی اور شاید جدوجہد بھی کر رہی تھی..... میں ادھر اپنی مٹیوں کو کسی معدوم الوجود خدا کے لیے ہڈیاں انداز سے یہ کہہ کر رہ جاتا کہ..... تو زندگی دینے کے وعدے کرتا لیکن اب کہاں ہے تو..... اسے زندگی کیوں نہیں دیتا ہے..... کیا آپ سمجھتے ہیں..... کیا آپ محسوس کرتے ہیں..... جو میں نہیں سمجھ سکا وہ یہ ہے کہ انسان ایسے لمحات کے زندہ کیسے رہ جاتا ہے۔ ایسی ہستی جس کے لیے میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھا۔ اپنی زندگی غار کرنے کے لیے..... میں نے انسان کو بنانے والے سے کہا کہ تو میری زندگی لے کر اسے دے دے..... تو یہ تو کر سکتا ہے لیکن اس نے سنی ان سنی کر دی..... وہ مجھ سے جدا ہو کر ایسی جگہ جا رہی تھی جہاں سے اسے واپس نہیں بلایا جاسکتا۔ دنیا سے ہر رشتہ ختم ہو جاتا ہے..... ہر راستہ بند ہو جاتا ہے۔ مگر میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا..... مگر خاموشی اور بے بس تھا۔ ایک تماشائی کی طرح۔

اس حالت میں ایک اور دکھ مستزاد ہوا..... جس وقت میں اس کے پاس بیٹھا تھا یہ خیالات میرے دماغ میں پھنکار رہے تھے کہ عورت کتنی بڑی بے وقوف اور ناقص القہر ہوتی ہے۔ اگر وہ میری بات مان لیتی تو اس وقت زندہ تو ہوتی..... جو ان ہوتی اور دنیا کی تمام مسرتیں اس کی جھولی میں ہوتیں۔ ابھی اس نے دنیا دیکھی کہاں تھی..... عزت، عزت..... اگر اسے عزت کا اتنا ہی پاس ہوتا تو پھر اس نے اپنے شوہر سے بے وفائی کیوں کی..... آٹا کی جھولی میں کیوں جاگری..... اگر وہ مجھ پر چہرہ بان ہو جاتی تو کیا بگڑتا..... ہاں اگر وہ پارسا ہوتی تو میرا مطالبہ نہیں ہوتا..... میں نے

اسے غلط پایا تو اس لیے فائدہ اٹھانا چاہا..... اس کی کراہ نے میرے خیالات کو بکھیر دیا اس لیے میں نے اسے مارفین کا ٹیکہ لگا دیا تھا اور اب وہ بالکل خاموشی سے لیٹی ہوئی تھی اور اس کے رخسار کی مانند ہو گئے تھے مجھے اس طرح محسوس ہوا جیسے کوئی جنگلی باندھے مجھے دیکھ رہا ہو۔

”تم نے ان کا مسئلہ بنا کر کیا اپنے پیروں پر کھلاڑی نہیں ماری.....“ میں نے کہا۔ ”میں ملامت کر رہا ہوں نہ لعن طعن یا تمہاری حماقت کا احساس دلا رہا ہوں..... میں نے تمہیں میری بات کی شرط اس لیے رکھی تھی کہ تم نے اپنے شوہر سے بے وفا کی۔ ایک بے وفا کی اور سبھی..... کا ش! تم اتنی حسین اور پرکشش نہ ہوتیں..... اس بوڑھی چینی عورت جو چیل تھی اس نے تمہیں موت سنے ہم کنار کر دیا۔ تمہیں بنانے والا اور تمہارا شوہر بھی اس غلطی کو معاف کرے۔“

ایک لحظہ مجھے احساس ہوا کہ مجھے یہ باتیں جو میرے دل میں ہیں زبان پر نہیں لانا چاہیں تھیں۔ وہ جواب دینے کی حالت میں نہیں ہے..... پھر مجھے یک یک یہ محسوس ہوا کہ میں کسی کی نظروں کی گرفت میں ہوں۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ چینی لڑکا پاؤں پیارے بیٹھا تھا۔ اپنی زبان میں دعا کر رہا تھا..... جب بھی میں اس کی طرف دیکھتا اس کی ملتجیانہ نگاہیں اس شکاری کتے کی طرح جو خاموشی سے موت کا طلبگار ہو میری جانب اٹھ جاتیں..... اس نے اپنے ہاتھ میری طرف اٹھائے جیسے وہ کسی دیوتا کے آگے گڑگڑا کر دعا مانگ رہا ہو۔ میری طرف جو ایک بالکل بے بس اور ناتواں احسان تھا اور جسے یہ بھی معلوم تھا کہ..... وہ ساری تک لاء حاصل تھی اور جسے اس بات پر بھی عرفان تھا کہ اس کی وقت نالی میں رینگنے والے کیڑے سے زیادہ نہیں۔

پہرے پر بٹھائے ہوئے جانور کی طرح وہ میرے پیچھے بیٹھا تھا۔ میں جب کوئی چیز اس سے

مانگتا تو اس خیال سے کہ جو کچھ میں نے مانگا تھا اس کی زندگی بچانے کے لیے کارگر ہو سکتا ہو۔ وہ اس کے لانے کے لیے بے تاب ہو جاتا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی مالکہ کی زندگی بچانے کے لیے اپنا خون تک دے دیتا..... لیکن میری بے بسی کا تو یہ عالم تھا کہ میں اس کے بچتے ہوئے خون کو روکنے سے قاصر تھا جو اسے موت کے منہ میں لے جا رہا تھا۔ میں نے گھر آنے کے بعد صرف ایک بار اور دہلی زبان سے اسپتال چلنے کے لیے کہا اور کہا بھی تھا کہ اس کی جان بچ سکتی ہے لیکن وہ تیار نہ ہوئی تھی۔ میں خود بھی اس چینی لڑکی کی خوشی کے لیے ہر طرح سے تیار تھا اور میں خود بھی..... مگر انتقال خون سے خواہ اس کا سامان بھی میرے پاس ہو تا تو کیا حاصل تھا جب کہ میرے پاس خون روکنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ انتقال خون سے اس کے کرب میں اور اضافہ ہو جاتا..... وہ چینی لڑکا تو اپنی مالکہ کے لیے میری طرح جان تک قربان کرنے کے لیے تیار تھا لیکن میری بے بسی کا تو یہ عالم تھا کہ میں اس کے بچتے خون کو روکنے سے قاصر تھا۔ جو اسے موت کی آغوش میں لے جا رہا تھا۔

سورج طلوع ہونے سے قبل وہ خواب آور دوا کے اثر سے قدرے آزاد ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ اب ان میں وہ تکبر اور سردہری نہیں تھی۔ اس نے کمرے میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو اس کی آنکھیں بخار کی حدت سے چمک اٹھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے کچھ پریشان سی ہو گئی اور یہ یاد کرنے کی کوشش کی کہ میں کون تھا۔ پھر جیسے اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس نے پہلے مجھے دشمن کے طور پر دیکھا اور آہستہ سے اپنا ہاتھ اس طرح ہلایا جیسے وہ مجھے دھتکار رہی ہو اور اپنی حرکات سے یہ ظاہر کیا کہ اگر اس میں کچھ طاقت ہوتی تو وہ مجھ سے دور بھاگ جاتی..... پھر اس نے جیسے اپنے خیالات کو جمع کیا اور کسی قدر سکون کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ اسے

سائنس لینے میں کافی وقت ہو رہی تھی۔ اس نے بولنے کی کوشش کی اور اٹھ کر بیٹھنا چاہا۔ مگر وہ کم زوری کی وجہ سے ٹڈ حال ہو چکی تھی اور نقاہت کا غلبہ تھا۔ اس سے اٹھنے کی کوشش سے بازو لینے کی التجا کی۔ التجا کرنے کی غرض سے میں اس کے قریب جھک گیا تاکہ میں اس کی ٹیف ترین آواز بھی سن سکوں۔ اب میرے ساتھ اس کا سلوک ہم دردانہ اور رحم دلانہ تھا۔ اس کے لبوں میں جنبش ہوئی اور اس نے نہایت ٹیف آواز میں کہا۔

”کسی کو اس بات کی خبر نہ ہو۔۔۔۔۔ کسی کو بھی نہیں۔“

”کسی کو خبر نہ ہوگی۔“ میں نے اسے بڑے اتحاد سے دلاسا دیا اور یقین دلایا۔ ”کسی بھی شخص کیا اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوگی۔“ اس کی آنکھیں اب بھی بے چین اور متوش تھیں۔ اس نے بہ دقت تمام اس نے یہ الفاظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کئے۔

”قسم کھاؤ۔۔۔۔۔ یسوع مسیح کی۔۔۔۔۔ کسی شخص کو اس کا علم نہیں ہوگا۔“

میں نے بہ کمال متانت ہاتھ اٹھایا اور کہا۔

”میں تمہیں دچن دیتا ہوں۔“

اگرچہ وہ بہت کم زور تھی۔ تاہم اس نے مجھے خوش دلی اور فکر سے دیکھا۔ اس تمام دکھ اور اذیت کے باوجود جو میرے ہاتھوں سے پہنچی وہ میری ممنون تھی اور اس نے اس کا اظہار ایک مطمئن مسکراہٹ کے ساتھ کیا۔ کچھ دیر بعد اس نے پھر بولنے کی کوشش کی لیکن بول نہ سکی۔۔۔۔۔ اور پھر آنکھیں بند کر کے سکون کی ابدی نیند سو گئی۔ دن کی روشنی کمرے میں ظاہر ہونے سے قبل سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

بہت دیر تک سکوت طاری رہا۔ اب اس نے جنوں کی اس لہر پر قابو پالیا تھا جس کی وجہ سے اس نے میری کلائی بھیج لی تھی۔ وہ تھک کر بیٹھ گیا۔ تارے ماند پڑ رہے تھے۔ تازہ ہوا

نمودار سحر کی پیام بر بن کرا تھی۔ اس نے اپنی ٹوپی اتار لی تھی اور اس کا چہرہ بالکل عیاں تھا اور اس کے چہرے پر مرقم تھا۔ اس نے اپنی عینک کے شیشوں میں سے بنور میرا جائزہ لیا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا جس کے سامنے اپنی چتا کہہ رہا تھا وہ کس قسم کا آدمی ہے اور پھر اس نے اپنی کہانی بیان کرنا شروع کی۔

اس کے لیے سب کچھ ختم ہو چکا تھا لیکن میرے لیے نہیں۔۔۔۔۔ اس لاش کے پاس اس اجنبی شہر میں اکیلا تھا اور وہ جگہ جہاں خبر آگ کی طرح پھیلتی ہے۔ میں اس کا راز کھنی رکھنے کا دچن دے چکا تھا۔ ذرا آپ صورت حال کا اندازہ کریں۔ ایک عورت جو نوآبادی کی اعلیٰ ترین اور مہذب سوسائٹی میں اٹھتی بیٹھتی تھی اور بالکل تندرست اور ایک شام ٹل گورنمنٹ ہاؤس میں رخصت کرتی رہی تھی اب مردہ تھا۔۔۔۔۔ اور واحد ڈاکٹر جو اس سے متعلق کچھ جانتا تھا اور وہ شخص جو دم مرگ اس کے سرہانے موجود تھا۔ اس شہر میں نو وارد تھا اور اسے نوکر کے ذریعے بلوایا گیا تھا۔۔۔۔۔ ڈاکٹر اور نوکرات کی تاریکی میں اسے پاکی میں لے آئے تھے اور باقی سب لوگوں کو قطعاً اس بات سے بے خبر رکھا گیا ہے۔ صبح تک انہوں نے کسی دوسرے نوکر نہیں بلایا تھا اور نہ یہ بتایا گیا تھا کہ ان کی مالکہ مر چکی ہے۔ ایک دو گھنٹوں میں اس کے انتقال کی خبر سارے شہر میں پھیل جائے گی اور میں ایک دور دراز کا ڈاکٹر کس طرح اس کی موت کی وجوہ بیان کروں گی۔۔۔۔۔ میں انہیں کیا کچھ بتاؤں گا کہ میں نے کیا کچھ انسانیت کے ناطے کیا تھا لیکن میں کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ میں اس ذمے داری کو پورا کرنے کے لیے کسی دوسرے ہم پیشہ ڈاکٹر کو کیوں نہیں بلایا تھا۔ کیوں آخر کیوں۔۔۔۔۔

مجھے ابھی جو کچھ کرنا تھا میں اس سے بے خبر نہ تھا۔ اس کام میں وہ چینی لڑکا میرا واحد مددگار تھا لیکن کچھ بھی ہودہ ایک مخلص اور با اعتماد

خدمت گار تھا جسے اس بات کا مکمل عرفان تھا کہ ابھی ایک اور جنگ لانا باقی تھی..... میں نے اس سے کہا کہ کیا تم چاہتے ہو تمہاری مالکہ آخری خواہش یہ تھی کہ کسی شخص کو یہ ناپتا چلے کہ اصل واقعہ کیا ہوا ہے۔

”جناب مجھے اس بات کا پورا علم ہے اور میں جان گیا کہ اس پر پورا اعتماد کیا جاسکتا ہے۔“ اس نے فرش پر سے خون کے دھبے دھو ڈالے اور ہر چیز ٹھیک ٹھاک کر دی تاکہ کسی کو کسی بات کا شک و شبہ نہ ہو..... اس کے عمل نے مجھے بھی تقویت دی اور دل کو بڑی ڈھارس بندھی۔

مجھ میں نہ تو کبھی پہلے اتنی قوت موجود تھی اور نہ ہی آئندہ کبھی ہوگی۔ دراصل جب انسان اپنا سب کچھ کھو بیٹھتا ہے تو وہ اپنی بچی بچی پونجی کے لیے بڑی بے جگری سے لاتا ہے اور اس کے لیے اپنے سر دھڑکی بازی بھی لگا دیتا ہے۔ وہ آخری پونجی جس کے لیے میں برسرِ پیکار تھا اس کی نشانی تھی اور وہ نشانی اس کا راز تھا۔ میں تقریب کے لیے آنے والے ہر شخص کا استقبال خاموشی اور خود اعتمادی سے کرتا اور اسے وہ کہانی جو میں نے اس کی موت کے متعلق وضع کی تھی سنا دی۔

میں نے انہیں بتایا کہ جب وہ بیمار ہوئی تو اس نے چینی لڑکی کو میرے بلانے کے لیے بھیجا لیکن جب میں لوگوں سے اتنے سکون اور اطمینان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا تو مجھے ایک آدمی کا انتظار تھا اور وہ وہاں کا سینئر سرجن تھا۔ جسے تدفین سے پہلے لاش کا معائنہ کرنا تھا۔ اب جمعرات کی صبح ہو چکی تھی اور سنبھل کی صبح اس کا شو ہر پہنچنے والا تھا۔ تدفین میں غلٹ اس علاقے کی رسم اور رواج تھا۔ اصل مشکل تو ضروری کاغذات پر دستخط کرانے کی تھی جس کا مجاز میں نہیں سینئر سرجن تھا۔ نو بجے اس کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ میں نے ہی اسے بلا بھیجا تھا۔ وہ مجھ سے سینئر تھا اور واکس ریڈیٹ کی ٹانگ کے علاج

سے مجھے جو شہرت حاصل ہو گئی تھی اس کی وجہ سے مجھ سے حذر رکھتا تھا..... یہ وہی ڈاکٹر تھا سوائے برج کھیلنے کے سوا اور کچھ نہیں جانتا تھا۔ مرحومہ نے اس کے متعلق انتہائی حقارت آمیز لہجے میں کہا تھا۔ عام دفتری قاعدے کے مطابق میرے تبادلے کے کاغذات اس کے توسط سے جانے تھے۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ واکس ریڈیٹ منٹ پہلے بھی اس بات کا تذکرہ کر چکا تھا۔

اس دن جب ہم ایک دوسرے سے ملے تو میں نے اس کی دشمنی کا اعزازہ کر لیا لیکن اس بات نے میرے عزم اور زیادہ راسخ کر دیا۔ جوں ہی میں اس کے انتظار کے کمرے میں جہاں وہ بیٹھا تھا پہنچا..... اس نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

”میڈم اسے تھر کا اشتعال کس وقت ہوا۔“

”آج صبح چھ بجے۔“

”انہوں نے آپ کو کب بلوایا تھا۔“

”کل رات کے وقت۔“

”کیا آپ جانتے ہیں کہ میں ان کا مستقل

ڈاکٹر ہوں۔“

”جی ہاں۔“

”پھر آپ نے مجھے کیوں نہ بلوایا۔“

”اس کے لیے وقت ہی نہیں تھا اور پھر

میڈم اسے تھر نے اپنے آپ کو مکمل طور پر میری نگرانی میں دے دیا تھا ج تو یہ ہے کہ اس نے مجھے کسی اور ڈاکٹر کو بلانے سے قطعی طور پر منع کر دیا تھا۔“

اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور اس نے غصے کو دباتے ہوئے اس نے بے پروائی سے مجھ سے کہا۔

”ان کی زندگی تک آپ میرے بغیر بھی ان کا علاج کر سکتے تھے اب مجھے ان کی موت کی وجہ تصدیق کر کے اپنا فرض پورا کر لینے دیجیے۔“ میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا

لہجہ تلخ تھا جس میں نفرت اور ناگواری سی تھی.....  
اور اسے لاش والے کمرے میں جانے دیا۔  
جوں ہی ہم وہاں پہنچے میں نے اس کی لاش  
چھونے سے بل کہا۔

”اب سوال موت کی وجوہ کی تصدیق  
کرنے کا نہیں بلکہ اس کی وجوہ وضع کرنے کا  
ہے..... میڈم اسٹھر نے اسقاط حمل کے سنگین  
نتائج سے بچنے کے لیے مجھے بلوایا تھا..... لیکن یہ  
اسقاط چینی دایہ نے بڑے بھونڈے طور پر کیا.....  
ان کی زندگی بچانا میرے لیے ناممکن تھا لیکن میں  
نے ان کی عزت بچانے کا انہیں وچن دیا ہے۔  
لہذا اس کے لیے آپ کی مدد چاہتا ہوں۔“

اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات  
ابھرے اس نے بڑے تعجب اور دلچسپی میں کہا۔  
”تو آپ نہ صرف یہ مطالبہ کر رہے ہیں  
بلکہ حکم بھی دے رہے ہیں کہ..... میں صوبے کا  
سینئر سرجن ہوتے ہوئے اس جرم کو مخفی رکھنے  
میں آپ کی مدد کروں۔“

”میری کیا مجال کہ میں آپ کو حکم دوں  
بلکہ میں آپ سے عاجزانہ طور پر استدعا کر رہا  
ہوں۔“ چوں کہ معاملہ نازک اور پیچیدہ اور  
مرحومہ کی عزت اور وچن کا تھا اس لیے اس  
ذلیل شخص سے انکساری برتا پڑی۔

میری انکساری اور عاجزانہ استدعا کو اس  
نے سن کر بھی وہ کینہ اور سخت بن گیا۔ کیوں وہ مجھ  
سے جلتا تھا۔ میری ہر دلچیزی نے حسد کی آگ  
میں ڈال دیا تھا۔ اس لیے وہ موقع سے فائدہ اٹھا  
کر مجھے بے عزت کرنے پر تل گیا تھا۔ اس نے  
کسی قدر حقارت سے کہا۔

”دراصل آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس  
جرم کو چھپانے میں آپ کی مدد کروں جو آپ  
نے کیا ہے۔“

اس نے مجھے جو مادا الزام ٹھہرایا تھا اس  
نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ دل میں تو

آیا کہ اس کے چند پر جیسے منہ پر ایک تھپڑ رسید  
کروں۔ بات بڑبڑاتی۔ اگر عزت اور وچن کا  
خیال نہ ہوتا تو اسے گود میں اٹھا کر کھڑکی سے باہر  
پھینک دیتا۔ تاہم میں نے خود پر قابو پایا۔ بڑے  
ضبط اور تحمل سے کہا۔ ”میں نے آپ کو بتایا ہے کہ  
جہاں تک میڈم اسٹھر کا تعلق ہے اور جو کچھ میں  
نے کیا ہے وہ ان کی ناقبت اندیشی اور کسی  
دوسرے شخص کے جرم کے خمیازے سے بچانے  
کے لیے تھا۔ میڈم اسٹھر نے خود بھاری کفارہ ادا  
کیا۔ اس چیل کی جس نے اسقاط حمل کیا ہے  
اس۔ حال میں کوئی اہمیت نہیں..... کیوں کہ آپ  
مرحومہ کی زندگی کو زندہ بچائے بغیر اسے زندہ نہیں  
دے سکتے اور اس کی صورت میں یہ بات گزارا  
کر سکتے ہیں۔“

”آپ یہ برداشت نہیں کریں گے۔“ وہ  
مجھ کو یہی سے کہنے لگا۔ ”آپ مجھ سے اس  
طرح گفتگو کر رہے ہیں کہ جیسے میرے بجائے  
آپ افسر ہوں۔“ پھر اس کے لہجے میں رعوت  
آگئی۔ ”آپ نے مجھے حکم دینے کی کیسے گستاخی  
اور جرات کی ہے۔ مجھے پہلے ہی یہ بات کھل چکی تھی  
کہ آپ کے یہاں بلائے جانے کی ضرورت کوئی  
انوکھی وجہ ہوگی۔ آپ نے اس معاملے میں بے  
جا مداخلت کر کے خوب ابتدا کی ہے۔ اب  
میرے لیے صرف اتنا کام باقی رہ گیا ہے کہ میں  
خود اس معاملے کی تحقیق شروع کروں..... اور  
میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری رپورٹ  
حقیقت پر مبنی ہوگی۔ میں اپنا نام کسی غلط ماریٹی  
ٹیکٹ پر ثبت کرنا نہیں چاہتا۔ آپ کو یہ سوچنا  
چاہیے بھی نہیں چاہیے کہ میں ایسا کروں گا۔“

میں چند لمحوں تک بالکل خاموش رہا اور اس  
کی طرف ٹھوکتا رہا۔ میری رگوں میں لہوا ہلنے  
لگا۔ میں نے حکم آمیز لہجے میں کہا۔

”آپ کو اس مرتبہ تو ایک غلط سارٹی فیکٹ  
پر دستخط کرنے ہی ہوں گے..... اگر آپ نے

دبے الفاظ میں کہا۔

”میں نے عمر بھر کبھی بھی کسی بھی جموں نے سارنی فیکٹ پر دستخط نہیں کیے۔ اگرچہ ایسا سارنی فیکٹ جیسا کہ آپ کہتے ہیں لکھ دینے کے بعد شاید کسی اعتراض کی پیدا ہونے کا امکان باقی نہ رہے تاہم یہ بات مجھ پر عیاں ہے کہ مجھے اس قسم کی بات نہیں کرنی چاہیے۔“

اس کی بات اور منہ رکھنے کے لیے میں نے کہا۔ ”اگرچہ طریقے اور قاعدے کی رو سے آپ کو کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔ تاہم یہ ایک خاص واقعہ ہے اور جب آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انشائے حقیقت ایک زندہ انسان کو دوزخ کے عذاب میں مبتلا کر سکتی ہے اور ایک مرحوم عورت کی تمام شہرت و ناموس کو خاک میں ملا سکتی ہے تو پھر اس میں پس و پیش کرنے سے کیا حاصل ہے۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ہم دونوں ایک میز پر بیٹھ گئے۔ پھر ہم نے ایک سارنی فیکٹ مرتب کیا جو اس واقعے کی ان تفصیلات کی بنیاد بنا جو اگلے روز اخبارات میں شائع ہوئیں۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا اور میری طرف گھوم کر کہا۔

”آپ کو پہلی میں کشتی پر جو یورپ جائے گی روانہ ہونا ہوگا..... کیا آپ جا میں گئے۔“

”جی بالکل..... میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں۔“ میں نے اسے براعتا دلچھے میں جواب دیا۔

وہ مجھے جیسے مشکل کھورتا رہا پھر اپنی سر اسیمبلی کو چھپائے بیک وقت مجھے مطلع کرنے کے لیے مجھ سے مخاطب ہوا۔

”یو کو ہاما سے واپس آنے کے بعد مسٹر بینک اپنی بیوی کے ہمراہ گھر جانے والا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ بے چارہ اس کی تلاش کو اس کے عزیز واقارب کے پاس انگلستان لے جائے گا..... وہ ایک دولت مند شخص ہے۔ میں ابھی تاہوت تیار کرنے کے لیے کہے دیتا ہوں تاکہ اسے سر بھر کیا جاسکے۔ اس طرح ہماری فوری

فہمیں کیا تو اس کمرے سے زندہ سلامت نہیں جا سکیں گے۔“ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پتول اس میں موجود نہیں تھا۔ میں اسے اپنے ہونٹ میں چھوڑ آیا تھا لیکن یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس پر میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور دھمکی اور مصالحت کے طے جے انداز میں کہا۔

”مجھے انتہا تک پہنچنے کا افسوس ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ آپ سمجھنے کی کوشش کریں کہ میرے لیے میری اپنی یا آپ کی زندگی کی وقعت ایک دھڑی کی بھی نہیں..... کیوں کہ میں اس حد کو پہنچ چکا ہوں کہ اب یہاں میرے لیے اس دنیا میں صرف ایک چیز باقی رہ گئی ہے جس کی مجھے فکر اور پروا ہے اور وہ اس وعدے کا ایلنا کرنا ہے جو میں نے مرحومہ سے کیا تھا اور یہ وعدہ ان کی موت کے اصل سبب کو راز میں رکھنے کا ہے۔ میں آپ سے عہد کرتا ہوں کہ اگر اس بات کا سارنی فیکٹ دے دیں کہ اجایک شدید استوائی بخار جو اختلاج قلب پر فوج ہوا اس سے ان کی موت واقع ہوئی تو میں ایک ہفتے کے اندر اس علاقہ کو خیر باد کہہ دوں گا بلکہ اگر آپ چاہیں جوں ہی ان کی میت دفن ہو جائے گی میں خود کشتی کر لوں گا مجھے یقین ہے کہ یہ بات خوب نہج جائے گی اور کوئی بھی اس لاش کا محتاجہ دوبارہ نہیں کروں گا۔ اس بات سے آپ کی تسلی ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ میں غلط بیانی نہیں کر رہا ہوں۔“

میری آواز کی درستی اور صداقت سے وہ سہم گیا۔ میں جب ذرا آگے بڑھتا وہ اس ناقابل خوف کے اظہار کے ساتھ پیچھے ہٹ جاتا جس طرح کہ اس آدمی کو جس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر دیکھ کر بھاگتے ہیں۔ وہ بظاہر کچھ مرعوب ہو گیا اور اپنا لہجہ بدل لیا۔ اب وہ پہلا صدی افسر نہ تھا۔ جس کے لیے اپنا کیا پتھر پر لکیر کے ہم من ہو۔ اور کد کی مرہوم سی کوشش کرتے ہوئے اس نے



مشکلات ختم ہو جائیں گی اور وہ بھی سمجھ جائے گا کہ اس شدت کی گہرائی میں اس کی آمد کا انتظار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اور اگر یہ بھی سمجھے کہ جو ہم نے غلت سے کام لیا ہے۔ تب بھی وہ اس کا اظہار نہیں کرے گا۔“

وہ تھوڑی دیر پھر میرا دشن تھا لیکن اب میرا معاون اور شریک کار۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ بہت جلد مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کر لے گا اور پھر اسے خود کو اپنی نظروں میں بھی حق بجانب ثابت کرنا تھا۔ اس کے بعد اس نے جو کچھ کہا وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ اس نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔“

آخر اس کا مطلب کیا تھا..... کیا میں بیمار تھا..... پاگل تھا..... میں بطور اخلاق اس کے لیے دروازہ کھولا اور اسے الوداع کہا اور اس کے ساتھ میں میری ہمت جواب دے گئی۔ مجھے کمر اکھوتا ہوا محسوس ہوا اور میں اس کے بستر کے قریب گر پڑا..... بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص کوئی کا نشانہ بننے میں ڈر رہتا ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر فرش پر پڑا رہا۔ بالآخر کمرے میں چھل پھل کی آواز سے میں جاگا۔ میں نے آنکھیں کھول کر تو چینی لڑکے کو قریب کھڑا پایا۔ وہ بے چینی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”کوئی آدمی آیا ہے اور وہ مالک کو دیکھنا چاہتا ہے۔“

”کسی کو اندر مت آنے دو۔“

”لیکن حضور.....“ اس نے قدرے تذبذب سے کہا اور مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھا اور بولنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ بے چارہ بھی اس مصیبت میں گرفتار تھا۔ پریشان تھا۔

”یہ شخص کون ہے.....“

اور وہ اس کتے کی طرح جھٹکے سے ڈر

کر کاٹنے لگتا ہے کاٹنے لگا۔ اس نے کوئی نام نہ لیا۔ شائستگی کے ایک ایسے جذبے نے جو مقامی لوگوں میں ناپید ہوتا ہے۔ اسے اس کا نام لینے سے باز رکھا۔ اس نے بڑی سادگی سے مجھے جواب دیا۔

”میڈم اس مرد سے وابستہ تھیں۔“

اسے زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔

میں فوراً سمجھ گیا کہ اس کا کیا مطلب تھا۔ میں یہ سن کر اس نامعلوم شخص کو دیکھنے کے لیے بے

تاب ہو گیا۔ جس کا وجود میں قطعی طور پر فراموش

کر چکا تھا۔ شاید یہ بات آپ کے لیے تعجب کا

موجب ہو لیکن اس وقت سے میں نے اس آدمی

کا خیال اپنے حافظے سے نکال دیا تھا جب سے

مرحومہ اپنے راز سے آگاہ کیا تھا اور میری

نامعقول شرط مسترد کی تھی۔ غلت پریشانی اور پے

درپے واقعات کی وجہ سے میرے ذہن سے یہ

بات اتر گئی تھی کہ اس تمام سائے میں ایک اور

شخص بھی ملوث تھا۔ اور وہ آدمی اس عورت کا

محبوب تھا۔ وہ خوش قسمت تھا جسے اس نے

والہانہ طور پر وہ سب کچھ دیا تھا جس کے لیے اس

نے مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ وہ اس بڑی مہربان تھی

اور فیاض بھی تھی۔ ایک روز پھر شاید میں اس

سے نفرت کرنا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا پسند

کرنا لیکن اب میں اسے دیکھنے کے لیے مضطرب

اور بے قرار ہو گیا۔ کیوں کہ مجھے خود اس

تھا..... ہاں مجھے اس سے اس تھا جسے اس طور چاہا

تھا کہ اپنی جان سے بھی گزر گئی تھی۔

میں ایک ہی جست میں نشست گاہ میں

پہنچا۔ خوب صورت بالوں والا ایک نوجوان خوب رو

افروہاں کھڑا تھا۔ دبلے جسم کا زرد روٹو جوان جو

شکل بھی لڑکپن کی حدود سے نکلا تھا۔ ایک دل

پذیر انداز سے اپنے آپ کو متانتا سنجیدگی کے

ذریعہ جوان ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سلام کرتے وقت اس کا ہاتھ لرز گیا۔ میرا دل چاہا

کہ اس سے بغل گیر ہو جاؤں۔ کیوں کہ وہ بقیہ

”پلنگ! سچ بتائیں اسے کیا ہوا ہے۔ کہیں اس نے خودکشی تو نہیں کی۔“  
 ”نہیں.....“ میں نے جواب دیا۔  
 ”تو پھر کیا اور شخص اس کی موت کا ذمہ دار ہے.....“

”نہیں.....“ میں نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ اگر میرے ضمیر کی آواز گونج اور ہلکورے لے رہی تھی۔ ”میں اور تم..... ہم دونوں اس کی موت کا سبب بنے ہیں۔ ہم دونوں اس کی بد بخت مرعوت۔“ نہیں یہ الفاظ لیوں تک نہیں لایا اور صرف میں کہنے پر قناعت کی ”نہیں، نہیں اس کی موت کے لیے کسی کو بھی مورد الزام ٹھہرایا نہ جاسکتا..... اس کا مقدر یہی تھا۔“

”میں تسلیم نہیں کر سکتا..... یہ بات ناقابل یقین ہے۔ پوسوں رات وہ ایک تقریب میں مدعو تھی۔ مجھے وہاں دیکھ کر مسکرائی۔ اس نے سلام کیا تھا۔ پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے اور باتیں بھی کرتے رہے تھے۔ وہ یکا یک موت کی آغوش میں چا سوئی..... وہ بیمار بھی تو نہیں تھی..... اسے کوئی ایک مرض میں لاحق نہیں تھا۔“

میں نے اسے کچھ خود ساختہ شکایتیں سنائیں۔ کیونکہ مجھے اس کے محبوب سے بھی یہ راز مخفی رکھنا تھا۔ ہم نے وہ دن اگلا دن اور اس سے بھی اگلا دن اکٹھے بردار انہ گفتگو میں گزارا۔ اگرچہ ہم نے ایک دوسرے کے سامنے اس امر کے اظہار سے اجتناب کیا کہ ہم دونوں کی زندگیوں میں مرحومہ سے وابستگی سے ایک رشتے میں مربوط تھیں۔

بار بار یہ محسوس کرنے کے باوجود میرے لیے یہ راز اپنی ذات تک محدود رکھنا مشکل تھا۔ یہ میری بڑی آزمائش تھی۔ میں نے دل پر جبر کر کے اسے یہ علم نہ ہونے دیا کہ وہ میرے پاس اپنی محبت کا غم تلف کرانے کے لیے آئی تھی۔ اور

اس قسم کا آؤمی تھا جس کا خاکہ میں نے اس نازنین کے محبوب کے طور پر اپنے ذہن میں مرتب کیا تھا۔ وہ کوئی ایسا شخص نہ تھا جسے عورتوں کو بہلانے اور رام کرنے میں مہارت ہو بلکہ اس کے برعکس وہ ایک ایسا لڑکا تھا جسے مرحوم نے اپنی محبت کے قابل سمجھا تھا۔ وہ میرے سامنے نادم کھڑا تھا۔ دفعتاً میری آمد اور میری تجسس آمیز نگاہ نے اس کے اضمحلال میں اضافہ کر دیا..... اس کے چہرے پر کچھ اضطراب نمودار ہوا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ابھی رو دے گا۔  
 ”میں مداخلت کرنا نہیں چاہتا تھا مگر ایک مرتبہ میڈم استھر کو دیکھنے کے لیے بے طرح بے تاب ہوں۔“ اس نے کہا۔

اور میں اس کے شانے پر رکھے دروازے کی طرف لے گیا۔ اس نے تعجب اور عقیدت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ اس سے ہم دونوں میں جذبات کی ناقابل یقین یکا گت تھی..... ہم ایک ساتھ اس کے بستر مرگ کی جانب بڑھے۔ وہ وہاں ابدی نیند سو رہی تھی۔ چہرے شانے اور بازوؤں کے سوا اس کا سارا جسم سفید چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ اس خیال سے کہ شاید میری موجودگی اسے ناگوار ہو میں اس سے قدرے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ یک لخت وہ گر بڑا۔ بالکل اسی طرح جس طرح میں گرا تھا..... گھٹنوں کے بل گرتے ہوئے جذبات کے اظہار میں کوئی خفت محسوس کیے بغیر وہ زار و قطار رونے لگا۔

میں اس سے کیا کہہ سکتا تھا..... کچھ بھی نہیں۔ میں کیا کر سکتا تھا کچھ بھی نہیں۔ میں نے اسے اس کے پیروں پر کھڑا کیا اور صوفے کی طرف لے گیا۔ وہاں ہم دونوں بیٹھ گئے۔ اسے تسلی دینے کے لیے میں نے کچھ بھی اس کے بھورے بالوں میں ہاتھوں سے گنگھی کرتا رہا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

ہوئی تھی..... کرین کے ذریعے جہاز پر لا دیا جا رہا تھا اور یہ اس عورت کا تابوت تھا۔ اس کا تابوت میرا تعاقب کر رہا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے میں نے پہاڑ سے ساحل سمندر تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ میں کوئی اشارہ کر سکتا تھا نہ میں کسی چیز پر توجہ مرکوز کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا شوہر بھی وہاں موجود تھا۔ وہ انگلستان جا رہا تھا..... شاید اس کا خیال وہاں جا کر لاش کا پوسٹ مارٹم کرانے کا ہو۔ شاید وہ یہ معلوم کرنا چاہے کہ۔ بہر صورت اس نے مرحومہ کو واپس لے لیا تھا اور ہم سے اسے چھین لیا تھا..... اب وہ ہمارے بجائے اس کی ملکیت بھی واقعہ نے ایک نیا موڑ لیا تھا۔

سنگاپور جہاں میں اس جرمن کشتی پر سوار ہوا وہاں سے وہ تابوت بھی منتقل کیا گیا اور اس وقت مرحومہ کا شوہر یہیں موجود بھی ہے لیکن میں اب بھی اس کی مسلسل نگرانی کر رہا ہوں اور آخر دم تک اس کی نگرانی کرتا رہوں گا۔ اس کے شوہر کو کبھی بھی اس کی موت کا راز معلوم نہ ہوگا۔ میں تادم مرگ اسے اس شخص سے محفوظ رکھنے کی کوشش کروں گا جس سے بچنے کے لیے وہ موت سے ہم کنار ہو گئی ہے۔ اسے ہرگز کسی بات کی خبر نہ ہوگی۔ اس کا راداب اس دنیا میں کسی اور کی نہیں صرف میری ملکیت ہے۔

اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں باقی مسافروں سے الگ کیوں رہتا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے کہ جہاز کے وسط میں جائے کی بیٹیوں اور برازیل کے اخروٹوں سے بھرے ڈبوں کے درمیان اس کی تلاش رہی ہے۔ میں کیوں کر انہیں ہنستے اور خوش گپیاں کرتے ہوئے دیکھ سکتا ہوں..... کیسے ان کے نازخروے برداشت کر سکتا ہوں..... میں اس کے قریب نہیں پہنچ سکتا۔ کیوں کہ نیچے جہاں اس کی لاش رکھی ہے وہاں تک جانے کا راستہ بند ہے لیکن یہاں ہمہ میں دن رات اس کا قرب محسوس کرتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ

پھر میرے انکار پر اس نے وہ قدم اٹھایا تھا جو اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا اور پھر بھی تمام عرصے میں جب میں اس نوجوان کے مکان میں چھپا رہا۔ ہم نے مرحومہ کے علاوہ کسی اور کے متعلق گفتگو نہ کی۔ میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ اس اثناء میں لوگ مجھے ڈھونڈنے لگے تھے۔ اس کا شوہر اس وقت پہنچا جب اس کا تابوت بند کر دیا گیا تھا۔ اسے کچھ مسئلہ ضرور ہوا کیوں کہ کئی طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ مجھ سے اصل واقعہ کی تفصیل سننا چاہتا تھا لیکن میں اس شخص سے ملنے کے خیال کو بھی نہیں لاسکتا تھا جو میرے نزدیک تمام تر ماہیت اور اس کی ہلاکت کی ذمے دار تھا۔ چنانچہ میں روپوش ہو گیا اور چار دن تک مکان سے باہر نہ نکلا۔

مرحومہ کے محبوب نے ایک فرض نام کے تحت پھرے لیے جہاز کے ٹکٹ کا بندوبست کی اور کئی رات گئے میں سنگاپور جانے والی کشتی پر سوار رہا۔ میں نے اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ دیا۔ اپنا تمام تر اثاثہ حتیٰ کہ اپنی سات سالہ ملازمت کے دوران جو تحقیق کی تھی وہ بھی..... میرا گھر ہر اس آدمی کے لیے جو اس میں داخل ہونا چاہیے کھلا ہے۔ ولندیزی حکومت نے میرے نام اپنے افسران کی فہرست سے بلا رفعت غیر حاضر ہونے کے سبب خارج کر دیا ہے۔ پھرے لیے اس گھر اس شہر اور اس دنیا میں رہنا ناممکن تھا جہاں کی ہر شے مجھے اس کی یاد دلاتی۔ اگر میں رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح وہاں سے بھاگا ہوں تو اس کی وجہ یہی تھی کہ میں اس سے بچنا چاہتا تھا اور اسے فراموش کر دینے کو شائ تھا۔ لیکن بچ نکلنے کی یہ کوشش بھی کارگر نہیں ہوئی جب میں رات کو جہاز پر سوار ہونے کے لیے وہاں پہنچا تو مرحومہ کا محبوب بھی مجھے الوداع کہنے کے لیے جہاز تک آیا۔ اس وقت ایک بڑا مستطیل صندوق جس پر تانبے کی چادر چڑھی

وہ میرے بازوؤں کے حصار میں ہے..... میں اس کے پیاسے ہونٹوں کی پیاس بجھا رہا ہوں..... وہ اپنے سارے بدن پر میرے بوسوں کی بوچھاڑ اور تپش محسوس کر رہی ہے..... مہربان ہوگئی ہے بڑی فیاضی اور خود سپردگی سے پیش آ رہی ہے..... میرے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی ہے کہ مجھے معاف کر دو..... میں نے تمہیں بہت تڑپایا، ترسایا اور دور رکھا..... اب ہمارے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں..... پتھر نہیں، دیوار نہیں، تمہارے دل میں جو جو ارمان تھے وہ ایک ایک کر کے پورے کر لو..... چلو ہم بہت دور چلتے ہیں..... پھر واپس نہیں آتے ہیں..... آپ یقین کریں یا نہ کریں..... یقین کرنے والی بات بھی تو نہیں ہے..... میں نے اس کے گداز بدن کا لمس، مہک اور تپش محسوس کی اور کربھی رہا ہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ میری حماقت اور پراگندہ سوچ ہے جو نیند میں..... خواب میں ایک حقیقت بن جاتی ہے۔ ایسا سرور اور کیف..... پرانی شراب کا سانسہ سچ سچ سا محسوس کرتا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی سمندر کی تہہ میں ان گنت لاشیں پڑی ہیں اور زمین پر مردے دفن ہیں..... میں نے بہت ساری پراسرار اور روحوں کی کہانیاں تو بچپن میں سنیں اور جوانی میں پڑھیں کہ روحیں دنیا میں آتی ہیں۔ مرحومہ کی روح بھی ندامت محسوس کر کے آتی ہے اور مجھے ہر طرح سے خوش کر کے چلی جاتی ہے مجھے اس بات کی سچائی کا کوئی سارنی فیکٹ نہیں چاہیے..... وہ کفارہ ادا کر رہی ہے میرے پاس آ کر۔

ان تمام باتوں کے باوجود میں اس جہاز کے مسافروں کا اس لاش کی موجودگی میں گانا اور ناچنا برداشت نہیں کر سکتا مجھے علم ہے کہ اس کی لاش مجھ سے کس بات کی متوقع ہے۔ ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ اس کاراز ابھی محفوظ نہیں۔ جب تک یہ محفوظ نہیں ہو جاتا مرحومہ کے ساتھ کیا ہوا وچن پورا نہیں ہو جاتا اس وقت تک میں سکون سے محروم رہوں

گا۔ جب بھی اس کی روح میری آغوش میں ہوتی ہے مجھ سے پوچھتی ہے میرا راز افشا تو نہیں ہوا ہے نا..... وہ جب بھی میرے بازوؤں میں سناپی ہے اس کا پہلا سوال یہی ہوتا ہے جہاز کے وسط سے باہر چھڑکنے اور صفائی کرنے والے عمل کی چہل چہل سناپی دینے لگی۔ طراح تختہ جہاز کو دھور ہے تھے۔ اس نے آواز پر کان لگائے اور دفعتاً کھڑا ہو گیا۔ پھر بڑبڑایا 'اب مجھے جانا چاہیے۔ مرحومہ سے گل اور رات ملاقات نہ ہو سکی..... لیکن وہ آپ کی موجودگی کے باعث آ کر چلی گئی۔ اصل میں میرے سینے میں راز جو چٹان کا بوجھ ہے اسے ہلکا کرنے بیٹھ گیا تھا۔

مستل شراب نوشی اور کثرت گریہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور اس کا چہرہ بڑا اندوہناک نظر آیا تھا۔ وہ ایک سخت آداب و تہذیب سے بیگانہ ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی کثرت گفتار ہوتا اور اپنے دل کا راز مجھ پر ظاہر کر بیٹھے پر نادم تھا۔ پھر بھی میں نے دوستانہ لہجے میں اس سے کہا۔ ”کیا شام کو آپ مجھے اپنے کمرے میں آنے کی اجازت دیں گے۔“

ایک مسکراہٹ جو طعنتی اور یاس کی حامل تھی اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ ذرا توقف کرنے کے بعد کسی قدر پر زور لہجے میں جواب دیا۔

امداد کرنا ایک انسانی فریضہ ہے۔ یہ آپ کا دل پسند اصول ہے..... چند گھنٹے پہلے جب آپ نے مجھے مصلح پایا تو یہ اصول بتا کر آپ نے میری زبان کھول دی۔ آپ کی ہم دردی کا بہت شکریہ..... میں اکیلا رہنا زیادہ پسند کروں گا۔ آپ یہ خیال نہ کریں کہ دل کا راز آپ سے کہہ دینے کے بعد اور اپنے جذبات کو آپ پر عیاں کر دینے سے میں اپنے آپ کو پیسے کی نسبت ہلکا محسوس کر رہا ہوں۔ میری زندگی کا ہر کین تار تار ہو چکا ہے اور کوئی شخص ان دھجیوں کو سی نہیں سکتا۔ میں نے سات برسوں تک

ولندیزی نوآبادیات میں رہ کر کچھ بھی نہیں کمایا۔ میری پیشین ضبط ہوگئی ہے اور میں مفلس تلاش جرمی لوٹ رہا ہوں..... محبت میں بھی ناکام رہا۔ میں جانتا ہوں کہ میرا انجام قریب ہے۔ مجھ سے دوبارہ ملنے کی پیش کش کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ مجھے تنہائی کا کلفت سے بچانے کے بہترین ساتھی موجود ہیں۔ وہ ہیں عمدہ و ہسکی کی بوتلیں یہ ہے میری نشانی کا سامان ہے۔ دیرینہ رفیق بھی ہے جس کی رفاقت سے افسوس کہ اب تک میں فائدہ نہ اٹھا سکا اور اس سے میری مراد میرا پستول۔ یہ میری روح کے لیے اعتراف کی نسبت زیادہ بہتر ثابت ہوگا۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو یہ ہوں گا کہ آپ میرے پاس آنے کی زحمت نہ کریں۔ دیگر انسانی حقوق میں ایک گریہ و نالہ بھی ہے یہ حق کوئی کسی سے نہیں چھین سکتا۔

اس نے اداسی سے کہا اور وحشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھا مجھے احساس ہوا کہ وہ اپنا راز نہاں کہہ بیٹھنے پر دل ہی دل میں ناداں تھا۔ وہ درجہ نادم..... الوداع کا ایک لفظ کہے بغیر وہ گرتا پڑتا اپنے کیبن کی طرف روانہ ہو گیا۔ اگرچہ اس کے بعد کئی دفعہ نصف شب کے قریب میں ڈیک پر آیا مگر پھر بھی اسے وہاں نہیں پایا۔ وہ کچھ ایسا غائب ہوا کہ میں اپنے آپ کو کسی فریب نظر کا شکار سمجھنے لگا اگر میں جہاز میں ایک ولندیزی مسافر کے بازو پر مائی نشان نہ دیکھ لیتا جس کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ اس کی بیوی کا پچھلے دنوں استوائی بخار سے انتقال ہو گیا تھا۔ وہ شخص سب مسافروں سے الگ رہتا۔ کسی سے گفتگو نہ کرتا اور رنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔ اسے دیکھ کر اس احساس سے مجھے قلق ہوا کہ میں اس کی تکلیف سے واقف ہوں۔ جب میں اس کے پاس سے گزرا تو اس خیال سے کہ وہ میرے چہرے سے یہ نہ بھانپ لے کہ میں اس کے متعلق خود اس سے زیادہ جانتا ہوں۔ ایک روز ایسا ہوا

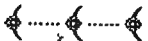
کہ وہ چائے پیتے ہوئے ایک البم دیکھ رہا تھا جس میں پوسٹ کارڈ ساز کی تصویریں تھیں۔ چائے پینے کے بعد جب وہ اٹھا اور البم جیب میں رکھنے لگا تو بے دھیانی میں البم فرش پر گر گئی۔ جس کا اسے احساس نہ ہوسکا۔ چوں کہ فرش پر قالین تھا اس لیے وہ آواز نہ سکا۔ یہ صرف میں نے دیکھا۔ اس لیے میں صرف اس کی طرف متوجہ تھا۔ ڈائنگ ہال تقریباً خالی پڑا تھا۔ صرف گوشوں کی دو تین میزوں پر لوگ تھے۔ میرے دل میں تو آیا کہ اسے بتا دوں لیکن چوں کہ میرے اندر مرحومہ کو دیکھنے کا جس سا پیدا ہوا تھا اس لیے خاموش رہا۔ اس کے ہال سے نکلتے ہی میں نے لپک کر البم اٹھائی۔ اس میں تقریباً دو درجن تصویریں تھیں۔ کچھ تو اس کی شادی کی تھیں۔ مرحومہ عروس لباس میں نہایت حسین لگ رہی تھی۔ کچھ تصویریں اس میں ساحل سمندر کی تھیں۔ شاید ہنی مون کے دنوں کی ہوگی۔ اس میں وہ نہانے کے مختصر سے لباس میں تھی۔ وہ واقعی اتنی حسین تھی کہ میں سحر زدہ سا ہو گیا۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت کم اتنی حسین عورتیں دیکھی ہوں گی۔ واقعی اس کا حسن انمول پرکشش اور پرشباب گداز دیدن تھا کہ اس کے حصول کے لیے دس آدمی کو بھی قتل کیا جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر اس کے حصول کے لیے دیوانہ ہو گیا تھا تو اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ اس کے انگ انگ سے مستی ابلی پڑتی تھی۔ مجھے اس سوال کا جواب بھی مل گیا کہ اس نے اپنی عمر سے دس برس کم افسر کو کس لیے اپنا محبوب بنایا۔ اس لیے کہ اس کا شوہر عمر میں مرحومہ سے پچیس برس زیادہ ہوگا۔ وہ اس کا جوڑ نہ تھا۔

میرے دل میں آیا کہ اس البم کو میں کیوں نہ اسے رکھ لوں اور مرحومہ کے حسن و جمال کے حسن و شباب کو نظروں میں جذب کرتا رہوں۔ معاشری نگاہ کھڑکی سے باہر راہ داری پر پڑی وہ

تفصیل سے بیان کیا تھا۔

مسافروں کو بے آرامی سے بچانے کے لیے کل رات کی تاریکی میں ایک تابوت جہاز سے کشتی میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ اس میں ایک عورت کی لاش تھی جس کا شوہر اسے دفنانے کے لیے وطن لے جا رہا تھا۔ بچے کشتی میں کھڑا تھا۔ جب تابوت کشتی سے گرا تو کشتی الٹ گئی۔ تابوت پر چوں کہ تانبے کی چادر چڑھی ہوئی تھی اس لیے وہ چھم زدوں میں سمندر میں ڈوب گیا۔ خوش قسمتی سے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ کیوں کہ تابوت کسی پر نہیں گرا تھا۔ یہ نصیب شوہر کو دوسرے لوگوں سمیت جو کشتی میں تھے بچا لیا گیا۔ بڑی جدوجہد کرنی پڑی ہمارے نمائندے کی اطلاع کے مطابق ایک پاگل نے جہاز کے اوپر چھلانگ لگا کر تابوت کو رسوں سے علیحدہ کر دیا تھا۔ چھلانگ لگانے والی کی کہانی شاید تابوت ٹھکانے لگانے والوں کی کوتاہی چھپانے کے لیے وضع کی گئی ہے۔ جنہوں نے ایسا کمزور رسد استعمال کیا جو تابوت کا وزن برداشت نہ کر سکا اور ٹوٹ گیا۔ بہر حال متعلقہ افسران اس بارے میں بالکل خاموش ہیں۔ اخبار کے دوسرے صفحے پر ایک مختصر سی خبر تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ ایک چھپتیس سالہ نامعلوم شخص کی لاش نیپلز کی بندرگاہ کے قریب ملی ہے۔ اس کے سر میں گولی لگنے کا نشان ہے۔

کسی نے بھی اس لاش کو اس جادو کے ساتھ منسلک کرنے کی کوشش نہیں کی تھی جو تابوت کو جہاز سے اتارتے ہوئے پیش آیا تھا۔ میں یہ مختصر سطور پڑھ رہا ہوں اس افسردہ آدمی کی ویران اور وحشت زدہ صورت کا عکس میری نظروں کے سامنے آ گیا ہے جس کی کہانی ان صفحات میں رقم کی ہے۔



تیزی سے اس طرف پاگلوں کی طرح آ رہا تھا۔ میں نے وہ الم فور اس جگہ گرا دی۔ اپنی میز پر آ گیا۔ اس نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ الم فرش پر دیکھ کر اس نے فوراً اٹھ لیا اور اسے سینے سے لگا لیا۔ میں کسی اور طرف دیکھنے لگا۔ پھر وہ شوہر نامدار باہر نکل گیا۔ اس کی محبت کی ناکامی کی اسے خبر بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

پھر مجھے ڈاکٹر کا خیال آیا۔ اس کے ڈیک پر رات کو نہ آنے کا سبب یاد آیا۔ رات کو وہ مجبورت پیتا تھا اور نشے کی حالت میں اسے مرحومہ کا خواب یا تصور اور پراگندہ خیالات یاد آئے تھے جس سے وہ خطا اٹھاتا تھا۔ اس لیے کہ مرحومہ اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ سچ مرحومہ کی روح آتی ہے۔

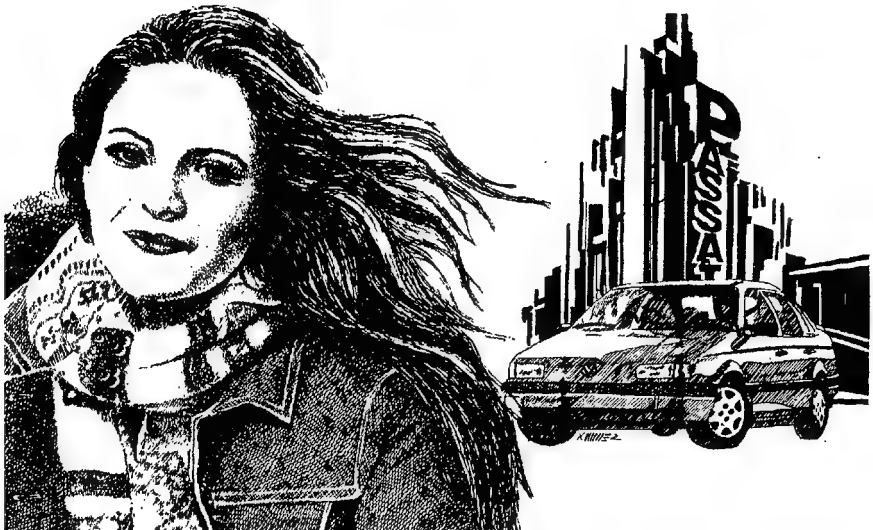
نیپلز کی بندرگاہ پر ایک داغہ ہوا۔ اس اجنبی کی کہانی کی روشنی میں میرے لیے سمجھنا آسان تھا۔ شاید میں نے پہلے بتایا ہے کہ زیادہ مسافر اس وقت ساحل پر موجود تھے۔ میں تماشا گاہ سے ہو کر آیا۔ روما کے ایک خوب صورت ہوٹل میں کھانا کھانے گیا تھا۔ جب جہاز کی طرف واپس آ رہا تھا تب میں نے دیکھا کہ گلیوں میں کھلبلی مچی ہوئی ہے اور بہت سی کشتیاں آگے پیچھے بھاگ رہی ہیں اور لوگ روشنی ڈال کر پانی میں جھانک رہے ہیں اور ڈیک پر بہت سارے سپاہی آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ میں نے ڈیک پر کام کرنے والے کارندوں میں سے ایک کارندے سے دریافت کیا وہ ٹال گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی گئی ہو۔ اگلے روز جہاز جب جینوا کی طرف روانہ ہوا تو بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ یہ بات پراسراری بن گئی تھی لیکن جینوا پہنچ کر میں نے ایک اخبار میں گزشتہ رات کے حادثے کی روداد پڑھی جو بڑے نمایاں طور پر شائع کی گئی تھی۔ اخبارات سارے معاملے کو ان الفاظ میں

آپ وقتاً فوقتاً عمران ڈائجسٹ کے ان صفحات پر جاسوسی، معاشرتی، سنسنی خیز اور دل چسپ کہانیاں پڑھتے رہتے ہیں۔ یوں تو ہر کہانی اپنی جگہ لکھنے والوں کی بہترین کاوش ہوتی ہے۔ آپ نے ایم الیاس کی کہانیاں ہر نئے اور اچھوتے موضوع پر پڑھی ہیں۔ یہ بھی ان کی ایک اچھوتی، سنسنی خیز اور پراسرار طویل کہانی ہے۔ دل کو چھو لینے والی ایسی گداز اور متاثر کہانیاں بہت کم لکھی جاتی ہیں۔ قدم قدم پر چونکا دینے اور تجسس اور اشتیاق آمیز کہانیاں بہت کم آپ کی نظر سے گزری ہوں گی۔ ایسی کہانیوں کی نہ صرف کمی بلکہ فقدان بھی ہے۔ اس کہانی کے متعلق مزید کیا کہا جاسکتا ہے۔ کہانی کی ہر سطر نہایت متاثر کرے گی۔ اس کہانی کی خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ کہانی جوں جوں آگے بڑھتی ہے اس کی روانی اور واقعات میں تیزی اور شدت آتی چلی جاتی ہے جو آپ کی توجہ برقرار رکھے گی۔ جب آپ اس کے اختتام کو پہنچیں گے تو یہ سمجھیں گے کہ اس کا انجام آپ کو ہلا کر رکھ دے گا اور آپ صدمے اور سکتے میں آجائیں گے۔ ایک پولیس آفیسر باپ تھا لیکن اس نے اپنی فرض شناسی سے اپنی وردی کی لاج رکھی۔ یہ کہانی اس قدر متاثر کن ہے کہ جو آپ کے دل و دماغ پر نقش ہو جائے گی (مدیر)

## گیت مرگ

ایم الیاس

ایک شاہکار کہانی جو نذر قارئین ہے



## سیکڑوں میل دور سے آنے والی شور

جاتی ٹرین جنگل میں کم ہو گئی تو اسے یوں لگا جیسے وہ کسی غیر آباد سیارے پر قدم رکھنے والا پہلا آدمی ہو۔ گوٹرین نظروں سے اوجھل ہو گئی تو ہو گئی لیکن انجین کی آواز سنا دیتے دیتے معدوم ہو گئی تھی۔

نادیدہ اور نامعلوم دشمنوں کے قاتلانہ حملے سے جاں برہونے اور تین ماہ تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد وہ صحت یاب تو ہو گیا تھا مگر اس کے اعصاب پر ذہنی صدمے کا اثر باقی تھا۔

اس کے دوست انیل کپور نے اسے مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ جسمانی اور ذہنی طور پر مکمل صحت یاب ہونا چاہتا ہے تو چاند نگر چلا جائے گو یہ ایک دور دراز قصبہ ہے لیکن وہ ایک پر فضا مقام ہے۔ وہاں کا موسم ہر وقت معتدل رہتا ہے۔ وہاں کے لوگ بھی بڑے خوش اخلاق اور منساہر ہیں۔۔۔ لیکن وہاں ہر وہ سہولت موجود ہے جس کی ضرورت ہر شخص کو ہوتی ہے۔ ہوٹل اور شراب خانے بھی ہیں۔ اسے جدید ترین بنانے میں کوئی کسر اس لیے نہیں اٹھارھی ہوئی تھی کہ ایک تو تعلیم یافتہ لوگ ہیں بلکہ اکثریت وطن سے باہر ملازمت کر کے امریکی ڈالر، پونڈ، دینار اور ریال اپنے گھروں کو بھیجتے ہیں اور پھر وہاں بڑی روایتی حسن اور کشش اور دل کشی بھی ہے۔ اس چھوٹے مگر جدید ترین قصبے کی پر بہار فضا ضرور اس آئے گی۔ شملہ، کشمیر، بنگلور اور میسور میں اخراجات بہت ہوں گے۔ تمہاری جیب یہاں کے اخراجات کی شمل ہو جائے گی۔

پھر اس نے اپنے دوست انیل کپور کو نہ صرف لعن طعن کیا بلکہ اس سے زیادہ اپنے دل کو کوسا کہ اس نے آنکھیں بند کر کے اس مشورے کو قبول کیا تھا۔ لیکن اب چچھٹانے سے کیا ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ پھر اس نے آبادی سے اتنی دور اسٹیشن بنانے والوں کو خوب گالیاں دیں۔ یہ ایک ویران اور سنسان جگہ تھی۔ انتظامیہ کی شان میں لمبا چوڑا قصیدہ پڑھنے پر مجبور ہو گیا تھا جو صرف ایک نامکمل فرد پر

مشتمل تھی۔ جو ہاتھ کا اشارہ کرنے کے بعد لنگڑاٹا ہوا دوسری سمت کے جنگل میں روپوش ہو چکا تھا۔

ریلوے لائن عبور کر کے وہ اس امید پر سرسبز میدان میں سو پچاس قدم تک نظر آنے والی پگ ڈنڈی پر ہولیا کہ یہی راستہ چاند نگر پہنچا دے گا۔ کیا وہ واقعی چاند نگر پہنچ چکا ہے۔ اس نے قیاس کیا کہ وہ شاید فرلانگ بھر دور گھٹنے درختوں کے پیچھے نظر سے اوجھل تھا۔ حالانکہ ایسے کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ اب اس سمت چلنے کے سوا چارہ بھی نہیں رہا تھا۔

تقریباً دس منٹ تک مسافت طے کرنے کے بعد اس کا خیال درست ثابت ہوا۔

جنگل کے سکوت میں پرندوں کی صدا تک نہیں تھی اور حریت کی بات یہ بھی کہ ایک بھی کوئی سا بھی پرندہ دکھائی نہیں دیا۔ کیوں کہ یہ جنگل تھا۔ یہ کوئی جدید ترین قسم کا علاقہ نہ تھا۔ بندر جو ہندوستان کے ہر ویرانے میں اور آبادی میں بھی ہوتے تھے۔ وہ بھی دکھائی نہ دیا۔ چنانچہ وہ کسی کے منہ سے سیٹی بجانے کی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔

سیٹی بجانے والا دائیں طرف سے نمودار تھا۔ پھر تقریباً چالیس برس کا بھکاری نظر آنے والا دیوانہ سا شخص تھا۔ اس کا لباس بوسیدہ اور غلیظ ہی نہیں مضحکہ خیز بھی تھا۔ اس کے سر کے بالوں پر گرد بھی ہوئی تھی۔

وہ ایک مشہور لکھی گانے کے بول شروع کرتا۔۔۔ تیسرے مصرعے تک پہنچتا اور پھر پہلے مصرعے کے بول دوہرانے لگتا تھا۔ ہموار زمین پر راستہ صاف ہونے کے باوجود وہ لہراتا ہوا چل رہا تھا۔ اگر وہ چپ ہو تیا نٹے میں دھت ہوتا تو الگ بات تھی۔۔۔ مگر اس علیحدگی میں یہ احقانہ حرکت تھی۔ محض دیوانگی کی ہی علامت تھی۔

دو دس کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا مگر وہ اپنی ہی دھن میں مگن نظر اٹھا کے دو دو دیکھے بغیر گزرنے لگا تو وہ مجبوراً ہی اسے مخاطب کرنا پڑا۔

”اوہ مسٹر۔۔۔ یہ چاند نگر قصبہ ہی ہے نا۔۔۔؟ کیا تم بتا سکتے ہو کہ مسز ساہنکا کا گیسٹ ہاؤس کس



طرف ہے۔“ دُود نے پوچھا۔  
 ”ہاں۔۔۔“ وہ پرسرت لہجے میں فخر سے سر  
 اٹھا کے بولا۔ دُود کی آواز پر وہ لہرانا اور سیٹی بجانا تو  
 بھول گیا۔۔۔ مگر چونکا نہیں تھا۔

”ہاں کا کیا مطلب ہوا۔۔۔“ دُود نے کچھ  
 دیر انتظار کرنے کے بعد چڑ کے کہا۔ ”بتاتے کیوں  
 نہیں ہو؟“

”مگر تم نے تو بتانے کی بات ہی نہیں کی تھی۔“  
 وہ حیرانی سے بولا۔ ”کیا تمہیں نہیں معلوم۔؟ بڑی  
 عجیب سی بات ہے۔ حیرت کی بات ہے۔“

”نہیں۔۔۔“ دُود نے ضبط سے کام لیا۔ کیوں  
 کہ اس نے بڑی بے تکی کہی تھی۔ اگر وہ جانتا ہوتا تو  
 اس الحق سے پوچھتا ہی کیوں۔ ”میں دہلی سے آیا  
 ہوں۔۔۔ پہلی بار۔۔۔ مجھے اس گیٹ ہاؤس میں  
 قیام کرنا ہے۔ تم تو بتاؤ بڑی دیا ہوگی۔“

”اچھا۔۔۔ اچھا۔“ وہ سر ہلا کے بولا۔ ”میں  
 سمجھ گیا۔۔۔ ناک کی سیدھ طے جاؤ۔ آگے دائیں  
 طرف کا چوتھا مکان ہے۔۔۔ مگر سنو! لیکن تم وہاں  
 کیوں اور کس لیے قیام کرنا چاہتے ہو۔۔۔؟“

پھر اس نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا۔  
 ادھر ادھر دیکھ کر پراسرار انداز سے سر گونگی۔

”اور کیا کروں۔۔۔“ دُود نے بھنا کر کہا۔  
 ”کیا اور بھی کوئی اچھی جگہ ہے اس کے علاوہ۔“ اس  
 شخص نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر مایوسی سے

سر ہلا دیا۔  
 ”جگہ تو کوئی اور نہیں ہے۔۔۔ مگر وہاں بھی تم  
 چکر میں آ جاؤ گے۔۔۔ مجبوری ہے۔ اچھا تو جاؤ۔“

یہ کہہ کر اس نے پھر سر ہلایا اور پھر دائیں بائیں لہراتا  
 اور سیٹی بجاتا ہوا چل دیا۔

دُود کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر اس نے طے کیا  
 کہ ایسے ایک جنوبی الحواس شخص کی بات سمجھنے کی کوشش  
 کرنا بھی دقت ہے۔ لیکن گاؤں میں سب ایسے ہی  
 طے تو یہاں سکون کیا خاک ملے گا۔ واپسی پر اس کا

بھی یہی حال ہوگا۔ اگر اسے یہ قصبہ راس نہیں آیا تو  
 دُود نے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر اس نے طے کیا  
 کہ ایسے ایک جنوبی الحواس شخص کی بات سمجھنے کی کوشش  
 کرنا بھی دقت ہے۔ لیکن گاؤں میں سب ایسے ہی  
 طے تو یہاں سکون کیا خاک ملے گا۔ واپسی پر اس کا

بھی یہی حال ہوگا۔ اگر اسے یہ قصبہ راس نہیں آیا تو  
 دُود نے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر اس نے طے کیا  
 کہ ایسے ایک جنوبی الحواس شخص کی بات سمجھنے کی کوشش  
 کرنا بھی دقت ہے۔ لیکن گاؤں میں سب ایسے ہی  
 طے تو یہاں سکون کیا خاک ملے گا۔ واپسی پر اس کا

بھی یہی حال ہوگا۔ اگر اسے یہ قصبہ راس نہیں آیا تو  
 دُود نے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر اس نے طے کیا  
 کہ ایسے ایک جنوبی الحواس شخص کی بات سمجھنے کی کوشش  
 کرنا بھی دقت ہے۔ لیکن گاؤں میں سب ایسے ہی  
 طے تو یہاں سکون کیا خاک ملے گا۔ واپسی پر اس کا

بھی یہی حال ہوگا۔ اگر اسے یہ قصبہ راس نہیں آیا تو  
 دُود نے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر اس نے طے کیا  
 کہ ایسے ایک جنوبی الحواس شخص کی بات سمجھنے کی کوشش  
 کرنا بھی دقت ہے۔ لیکن گاؤں میں سب ایسے ہی  
 طے تو یہاں سکون کیا خاک ملے گا۔ واپسی پر اس کا

بھی یہی حال ہوگا۔ اگر اسے یہ قصبہ راس نہیں آیا تو  
 دُود نے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر اس نے طے کیا  
 کہ ایسے ایک جنوبی الحواس شخص کی بات سمجھنے کی کوشش  
 کرنا بھی دقت ہے۔ لیکن گاؤں میں سب ایسے ہی  
 طے تو یہاں سکون کیا خاک ملے گا۔ واپسی پر اس کا

سیدھے ہاتھ پر چوتھا مکان ہے۔“ وہ نظر اٹھائے  
بولی۔ ”گڈ بائی۔“

”پھر ملاقات ہوگی۔“ وود نے اخلافا کہا اور  
اس مکان کی سمت چل پڑا۔ لیکن اس نے تسلیم کیا کہ  
یہ اس کے دل کی آواز تھی۔

پچاس برس کی دہلی پتلی مسز سادھنا اسے اپنے  
چار کمروں کے گیٹ کے باہر ہی مل گئی۔

وہ خاصی پریشان اور کسی کے انتظار میں تھی۔  
وود کے تعارف پر وہ رسماسا مسکرائی۔ پھر اس نے کھلے  
دروازے کی طرف منہ کر کے چیخ ماری۔

”اینا۔!“ اس کے جواب میں ریل کے  
اسٹیم انجن کی سیٹی سی سنائی دی۔

پھر اسٹیم انجن نمودار ہوا جس کا نام اپنا تھا۔ وہ  
اسے دیکھ کر چونکا۔

وود نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ  
جسامت اور وزن کی سیاہ قوم عورت نہیں دیکھی تھی۔

وہ مدراس دیہات تھی شاید۔۔۔ اس نے وود کا  
سوٹ کیس اٹھالیا اور آگے آگے چلتی ہوئی زینے پر

چڑھنے لگی۔ زینہ خاصا پرانا چنانچہ مضبوط تھا۔ ٹھیکے پر  
بنی ہوئی عمارت ہوئی تو۔۔۔ تیر۔۔۔ اسے دہشت

زدہ کر دینے والے خیالات سے گریز کرنا  
چاہیے۔۔۔ وود نے خود کو سمجھایا۔

کیوں کہ وہ یہاں سکون اور آرام کے لیے آیا  
ہے۔ اپنا نہ کمرے کے دروازے پر پہنچنے سے پہلے

ہانچتے ہوئے وود پر واضح کر دیا تھا کہ وہ ہر سیوا کے  
لیے حاضر ہے۔ مگر اسے حقیر ملازمہ نہ تصور کیا جائے۔

اس کا تعلق ایک اچھے خاندان سے ہے۔ مالی حالات  
اور تنگ دستی نے اسے ملازمت پر مجبور کیا اور مزید یہ

کہ جب گھنٹا بجے تو وود کو سمجھ لینا چاہیے کہ کھانا میز پر  
لگا دیا گیا ہے اور تاخیر کا مطلب یہ ہوگا فاقہ۔۔۔

جب بالآخر وہ اپنی کئی بار سنائی ہوئی تقریر سنا کر  
رخصت ہوئی تو وود نے سکون کا سانس لیا۔ ورنہ اس

کا خیال تھا کہ یہ باتونی جانے کب تک اسے بور کر رہی  
رہے گی۔

مصوری کے لیے۔۔۔ مجھے تو یہاں آ کر دیکھنے پر ایسا  
لگا کہ کائنات کا سارا حسن یہیں سمٹ آیا ہے۔“

”مجھے ایسا لگتا ہے۔۔۔ آپ مصورہ بھی ہیں  
اور شاعرہ بھی۔“ وود نے سر کھجا کر کہا۔ ”چند لمحوں

پہلے میرا خیال تھا کہ یہاں صرف دیوانے بستے  
ہیں۔“ وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی بھی بڑی دلکش اور مترنم

تھی۔  
”آپ کو شاید پرشاد ملا ہوگا۔۔۔ وہ ابھی

یہاں سے گزرا تھا۔۔۔ سیٹی بجاتا ہوا۔۔۔  
چاند کا اک شہزادہ تھا۔۔۔

ایک زمین کی شہزادی۔۔۔  
ایک دن شہزادی نے کہا۔“

پھر اس کی ہنسی فضا میں بکھر گئی۔“ معلوم ہوتا  
ہے کہ اس سے آگے وہ بھول چکا ہے۔۔۔ صرف

بہکی یاد رہ گیا ہے اسے۔۔۔ اس کی سیٹی ہر جگہ سنائی  
دیتی ہے۔“

”آپ نے مجھے اس کے گیت کے بول یاد دلوا  
دئے۔“ وود نے اعتراف کیا۔ ”وہ پاگل ہے

نا۔۔۔؟“  
”نہیں۔۔۔ بس تھوڑا سا کریک ہے۔“ اس

نے جواب دیا۔ ”مگر بچوں کی طرح بے ضرر حرکتیں  
بھی بچوں جیسی ہی کرتا ہے۔۔۔ کچھ لوگ کہتے ہیں

کہ وہ ذہنی طور پر پس ماندہ ہے۔۔۔ بعض کا خیال  
ہے کہ بنتا ہے۔۔۔ اندر سے بڑا گہرا ہے۔۔۔ بعض

کا کہنا ہے کہ کبھی کبھی ایسی عقل کی بات کہہ جاتا ہے  
سب کو حیران کر دیتا اور انہیں یقین نہیں آتا کہ اس

قدر عقل مند بھی ہے۔۔۔ رہتا تو فقیروں کی طرح  
لیکن ہیک نہیں مانگتا۔۔۔ پس جو کسی نے دے دیا

کھالیا۔۔۔ لے لیا۔۔۔ یوں سمجھیں کہ مجذوب ہے  
یا جو چاہیں سمجھیں۔“

”میرا نام وود سنگھ ہے۔“ وود نے کہا۔ ”اس  
نے اس پاگل کا ذکر ختم کر کے موضوع بدلا۔“ میں مسز

سادھنا کے گیٹ ہاؤس میں قیام کروں گا۔“  
”میرا نام پدمنی ہے۔۔۔ پدمنی سیواگ۔۔۔

ابھی اس نے غسل سے فراغت پا کر لباس بدلنے کا سلسلہ شروع ہی کیا تھا کہ گھنٹے کی زبردست گونج نے اسے دہلادیا۔

وہ سمجھ گیا کہ اس بے پناہ قوت سے گھنٹے پر وار کرنے والی خادمہ ہی ہو سکتی ہے۔ مالکن پورا زور صرف کرتی تو گھنٹہ اتنا نہ چلاتا۔۔۔ وارنگ کوڈ بن میں رکھتے ہوئے وود نے بڑی عجلت میں نیچے کارخ کیا۔۔۔ کیوں کہ وہ تفریح کا آغاز فاقہ سے کرنا نہیں چاہتا تھا۔

مہز کے گرد چھ کرسیاں تھیں۔ دو پر مالکن اور خادمہ بیٹھی ہوئی تھیں اور ان میں جو فرق تھا وہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک دن بھی تو دوسرے سیاہ رات۔۔۔ ایک تنکا تھی تو دوسری پہاڑی۔

مالکن بدستور منتظر اور پریشان تھی۔۔۔ خادمہ نے وود کو بتایا کہ تشویش کا سبب مسٹر سوراج کی عدم موجودگی ہے جو گزشتہ رات سے پراسرار طور پر غائب ہیں۔ سوراج کے بارے میں کھانے کے دوران مالکن نے مزید اعشاشاف کیا۔

مثلاً یہ کہ گیسٹ ہاؤس میں وہ کئی برس سے مقیم ہے۔ کیوں کہ دنیا میں نہ تو اس کا کوئی ہے اور نہ ہی وارث۔۔۔ اور یہ کہ بغیر بتائے وہ اس طرح آج تک کہیں نہیں گیا۔۔۔ گھومنے پھرنے کا شکار کا شراب خانے میں بیٹھ کر پینے پلانے اور شغل کرنے۔۔۔ جوئے خانے میں لٹنے لٹانے۔۔۔ یا کسی کے عشق میں خوار ہونے کا اسے قطعی شوق نہیں۔۔۔ وہ خلوت پسند اور اپنا بیشتر وقت کمرے میں ریڈیو سننے اور مطالعے میں وقت گزارنے والا شخص ہے بوڑھا آدمی ہے جس کا دل بیمار قطعی ناقابل اعتبار ہے۔ چنانچہ ایثور خیر کرے۔۔۔ وہ اپنی زندگی میں کسی سے بھی نمی اور نفرت سے پیش نہیں آیا۔

وود نے محسوس کیا لوگ دور افتادہ دیہات کے بارے میں خوش فہمی کا شکار ہیں۔۔۔ تفکرات ہر جگہ ہیں۔ آدمی پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ ہر شخص

اپنے حالات اور مسائل کا شکار ہے۔ یہ سب ہر جگہ موجود ہیں اور سکون آسمان پر ہو تو زمین پر نایاب ہے۔ کھانے سے فراغت پانے کے بعد اس نے مرد واحد کی حیثیت سے خوف زدہ خواتین کے گھر کے اوپر نیچے تمام کمروں میں مسٹر سوراج کو یوں تلاش کرنا شروع کیا جیسے وہ سوئی ہوں جو کہیں بھی فرش پر پڑی ہوئی مل سکتی ہے۔ دوسرے مرحلے میں انہیں گھر کے آس پاس اور پیسرے مرحلے میں گاؤں کے اندر یا باہر ڈھونڈنا تھا مگر تلاش پہلے ہی مرحلے میں تمام ہو گئی۔

وود نے اوپر کی منزل کے اسٹوروم میں مسٹر سوراج کو دریافت کر لیا تھا۔

اس حالت میں کہ وہ چھت سے معلق تھے۔ اس کا پھندا ان کے گلے میں تھا۔ ایک کرسی جس پر چڑھ کے انہوں نے یہ پھندا اپنے گلے میں ڈالا ہو گا فرش پر اوندھی پڑی ہوئی تھی اور مسٹر سوراج جو قد میں کم تھے۔۔۔ فرش سے تین فٹ اوپر جھول رہے تھے۔ اسٹیم انجن کی زبردست سیٹی کے بعد اور مالکن کی گھٹی گھٹی چیخ سنا کی دی۔ لیکن وود نے ایثور کا شکریہ ادا کیا کہ ان میں سے کسی کو بے ہوش ہونے کا خیال نہیں آیا۔ ورنہ اس کے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جاتی۔

وہ لاش کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ مسٹر سوراج نے کرسی پر چڑھ کے پھندا گلے میں ڈالنے کے بعد لات مار کے کرسی نہیں گرائی۔۔۔ کسی نے ان کو مار کے لٹکا دیا تھا۔ ان کے لیے لات مار کے کرس گرائنا بالکل ناممکن تھا۔ جب وود نے کرسی کو سیدھا کر کے عین مسٹر سوراج کے نیچے کرسی کو رکھا تو اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اگر ان کے پیر کرسی پر رہتے تو وہ لٹک کے مر نہیں سکتے تھے اور اگر لٹک جاتے تو اس کرسی کو کیسے گراتے جواب بھی ان کے پیروں سے چند انچ نیچے تھی۔

دہلی ہو یا چاند نگر۔۔۔ وود نے تلخی سے سوچا۔ تصور میں آرام اور تفریح نہ ہو تو کہیں آنے جانے

سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ چھوٹا گاؤں۔۔۔ پر بہار  
فضا۔۔۔ پرسکون ماحول۔۔۔ یہ سب خوب صورت  
دھوکا دینے والے الفاظ ہیں۔۔۔ اسے دھوکا تو الفاظ  
کا اس پاگل نے بھی دینا چاہا تھا جو چاند نگر میں قدم  
رکھتے ہی اسے ملا تھا۔ جس نے دیوانگی میں ایک ایسی  
بات کہہ دی تھی جو حقیقت بن کے سامنے آ چکی  
تھی۔

اس نے کتنے ہی پراسرار انداز میں کہا تھا۔  
”وہاں تم بھی چکر میں آ جاؤ گے۔۔۔ جاؤ۔“  
کیوں اس نے یہ بات کہی تھی۔۔۔ اسے  
کیسے معلوم ہو چکا تھا کہ مسز سادھنا کے گیسٹ ہاؤس  
میں قیام کرنے والا چکر میں پڑ جائے گا۔ جب کہ خود  
مسز سادھنا کو خبر نہیں تھی۔

ونود نے مسز سادھنا کو مشورہ دیا تھا کہ وہ بلا  
تاخیر پولیس کو طلب کرے اور خود کسی چیز کو ہاتھ تک نہ  
لگائے۔ پھر وہ باہر نکل آیا۔ اسٹور روم اور پر والی منزل  
کے شمالی کونے پر تھا اور اس کی کھڑکیاں دونوں طرف  
کھلتی تھیں۔ ونود نے پہلے شمال کی طرف سے کھڑکی  
میں جھانکنے کی کوشش کی تھی۔ زمین پر لیٹ کے۔۔۔  
بیٹھ کر اور آس پاس کے درختوں پر چڑھ کے کمرے  
کے ہر رخ اور ہر زاویے سے دیکھا مگر جھولتی ہوئی  
لاش تو درکنار اس کا سایہ تک نظر نہ آیا۔ یہی صورت  
حال مغرب کی جانب تھی۔ باہر سے کوئی اندازہ لگا ہی  
نہیں سکتا تھا کہ کمرے میں ایک لاش جھول رہی  
ہے۔

پھر اس کرپک نے کیسے اتنے یقین کے ساتھ  
کہہ دیا تھا کہ وہ چکر میں آ جائے گا۔“  
سنیاسی یا مجذوب۔۔۔ جو چاہے سمجھ لو۔“  
پدمنی نے کہا تھا۔ ”بعض لوگ کہتے ہیں کہ پاگل  
ہے۔۔۔ نہیں بنتا ہے۔“

ونود کے لیے اس کے رویے اور الفاظ کا کوئی  
اور مطلب نکالنا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ اس کا رٹون  
نے یقیناً کچھ دیکھا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا اور  
کیسے۔۔۔ ”خیر حقیقت پر دیوانگی کا پردہ ہوگا تو بہت

جلد ہٹ جائے گا مسٹر کارٹون!“ اس نے گھر کے  
اندر لوٹتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔  
کرشن آدھے گھنٹے کے بعد جانے واردات پر  
وارد ہوا۔ اس چھوٹے سے گاؤں کے معمولی سے  
پولیس آفیسر نے بڑے افسوس کے ساتھ ونود سے  
مصافحہ کیا۔ افسوس کی ایک بات یہ تھی کہ ونود سیدھے  
سادھے خود کشی کے کیس کو قتل کا کیس بنانے پر مصر  
تھا۔۔۔ دوسری افسوسناک بات ونود دہلی کے پولیس  
کے محکمے میں ایس بی کے عہدے پر فائز تھا۔ سراغ  
رساں بھی سنہرے تھا۔ جس کی رائے کو نظر انداز نہیں کیا جا  
سکتا تھا۔ مزید کہ ونود نے صرف ایک فیتہ لے کر دو  
اور دو کو چار ثابت کر دیا تھا  
”مسٹر سوراج کا قد۔۔۔ چھت سے فرش کا  
فاصلہ۔۔۔ فرش سے سورج کا فاصلہ۔۔۔ کرسی کی  
بلندی۔۔۔ اور مسٹر سوراج کے پیروں کا فاصلہ کرسی  
سے۔۔۔ چاند نگر کے چیف کی اہمیت اپنے بدتمیز  
ماتحت اور اپنی رعایا کی نظروں میں گم ہونے لگی تھی۔  
مگر مصالحت میں بہتری تھی۔“  
”مسٹر ونود۔۔۔! میرا نام کرشن ہے۔“ اس  
نے خوش دلی سے مصافحہ کیا۔ ”اس کیس میں ہمارا  
اشتراک فائدہ مند رہے گا۔“  
اس نے اشتراک کا لفظ استعمال کر کے اپنا دتار  
بجال رکھا تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ پلیز۔۔۔! میری مدد  
کریں۔۔۔ یا آپ کی مدد مجھ پر ایسا احساس ہوگی  
جسے میں عمر بھر بھلا نہیں سکوں گا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس  
کے لہجے کی پشت پر التجا ضرور تھی۔  
لیکن اس معاہدے کے باوجود ونود نے پرشاد  
کی بات گول کر دی تھی۔ کیوں کہ ابھی وہ اس گاؤں  
میں اجنبی تھا اور ذاتی طور پر تصدیق کیے بغیر کسی پر  
شبہ کا اظہار بھی رائے غامہ کو اپنے خلاف کرنے کے  
مترادف تھا۔ کرشن جیسے نہ جانے کتنے ہوں گے جو  
پرشاد کو بچنے کی طرح بے ضرر یا قابل رحم سمجھتے ہوں  
گے۔ وہ انہیں قائل کرنا نہیں چاہتا تھا کہ پرشاد سب کو  
بے وقوف بنا رہا ہے۔

گاؤں کی مارکٹ صرف چھ دکانوں پر مشتمل تھی اور ان میں سے پانچ بند ہو چکی تھیں۔۔۔ چھٹی دکان بہت کچھ تھی۔ یعنی کافی ہاؤس بار۔۔۔ ریسٹورنٹ۔۔۔ سگریٹ، اسٹور وغیرہ۔۔۔ چنانچہ کچھ آباد تھی۔۔۔ اندر باہر دو چار گاہک ادھر رہے تھے پھر وقت ضائع کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ انہیں بہر حال وقت گزاری کرنا تھی۔

مالک نے دہلی سے تشریف لانے والے معزز مہمان کی خاطر یوں کی کہ تعارف کے فوراً بعد اسے گاؤں کی تاریخ اور جغرافیہ پر ایک پیکچر دیا۔۔۔ پہلے چائے۔۔۔ پھر کافی اور آخر میں دسکی پلاتے ہوئے اس نے خود کو بتایا کہ پرساد کیا یہاں سب حرامی ہیں۔ اور پاگل تو ایک سے ایک ہے مگر یہ لوگ خوش قسمت ہیں ورنہ جس زمین پر یہ آباد ہیں یہ ان کے باپ کی جاگیر نہیں۔۔۔ چاند مگر پہلے جزیرہ تھا مگر بعد نہ جانے کیسے اور کب وہ نہر خشک ہو گئی جس نے چاند مگر کو باقی زمین سے الگ کر رکھا تھا۔ اور وہ خاندان بھی مرکھ گیا جس کی یہ زمین تھی اور جو جزیرے کا مالک تھا۔ چنانچہ لوگ اس پر قابض ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ گزشتہ نصف صدی کی تاریخ کے اہم واقعات کے موضوع پر آتا دو وہاں سے بھاگ لیا۔ اسے جو کچھ معلوم کرنا تھا وہ معلوم ہو چکا تھا۔ باہر آ کر اس نے گہری سانس لی۔ مالک دکان سے پیچھا چھوٹا۔ وہ بور کرنے پر تل گیا تھا۔ پھر وہ ہدایات کی مدد سے زمین میں نقشہ مرتب کر کے چلنے لگے۔ پرشاد کا گہرا پاگل خانہ سے زیادہ عجیب و غریب خانہ تھا۔ اسے کہاڑ خانہ سے بھی موسوم کیا جاسکتا تھا۔ گاؤں کے باہر اس نے ایک جگہ پانچو پڑی بنا رکھی تھی جس کی تعمیر میں اینٹ، چونے، پتھر یا سیمنٹ کے سوا ہر چیز استعمال ہوئی تھی۔ اسے جتنا کاٹھ کہاڑ مل سکا تھا وہ دیواروں کی تعمیر میں استعمال ہو گیا تھا لکڑی کے باکس، ٹین کے ڈبے اور فلڑے۔۔۔ تختے اور درختوں کی خشک ٹہنیاں۔۔۔ ان سب کو اس سے باندھ کر پالیکوں سے جوڑ کر ایک کمرے کی شکل دے دی تھی جو مشکل سے آٹھ دس

فٹ اونچا اور لمبائی چوڑائی میں دس فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ دروازے کی جگہ خلا تھا جو دور سے ہی دوند کو نظر آیا تھا۔

دوند پوری احتیاط سے سر جھکا کر اندر داخل ہوا۔ سر کے ٹکرانے یا ہاتھ پیر کے غلط جگہ لگ جانے سے اس کہاڑ خانے کا ایک ڈھیر کی صورت میں اس پر گر جاتا۔ عین ممکن تھا۔ اندر کی نیم تاریک فضا سے مانوس ہو جانے کے بعد اسے یقین آنے لگا کہ پرشاد واقعی پاگل ہے۔۔۔ اندر وہ سب ناکارہ چیزیں بھری پڑی تھیں جو دنیا نے فالتو یا بے مصروف سمجھ کر کوڑے میں پھینک دی تھیں۔۔۔ خالی بوتلیں اور ڈبے۔۔۔ ٹوٹے ہوئے آئینے۔۔۔ ٹوٹھ پیسٹ اور شیونگ کریم کی خالی ٹیڑیوں کے ڈھکن۔۔۔ اچھے ہوئے رنگین ریشمی دھاگے اور اون کے کپڑے۔۔۔ شکستہ چینی کے برتن۔۔۔ ان نوادرات کی فہرست بہت طویل تھی جو پرشاد نے نہ جانے کتنے عرصے میں کہاں کہاں سے سمیٹ کر اپنے گھر میں سجائے تھے۔ یہ چیزیں صرف دیواروں پر ہی نہیں چھت پر بھی آویزاں تھیں۔ دوند ایک پرانے لکڑی کے باکس پر بیٹھ گیا جو ایک سائز کے چار ڈبوں پر قائم تھا۔ پھر وہ اس صورت حال پر غور کرنے لگا جو مجموعی طور پر سنگین بھی تھی۔ مضحکہ خیز بھی اور ناقابل یقین بھی۔

پرشاد کی ذات ایک بات سے معمہ بن گئی تھی جسے حل کرنا بہت ضروری بھی تھا دور سے سیٹی کی آواز سنائی دی جو رفتہ رفتہ قریب سے قریب آتی گئی۔ وہی تین بول اور ان کی مسلسل تکرار۔۔۔ پھر پرشاد اندر آیا اور دوند کو دیکھتے ہی سہم گیا۔۔۔ اس کی صورت پر وہی خوف تھا جو کسی بچے کی صورت پر چوری چھپے کوئی غلط کام کرتے ہوئے پکڑے جانے سے نظر آنے لگتا ہے۔۔۔ حالانکہ اسے دوند کے بلا اجازت اندر گھسنے پر براہم ہونا چاہیے تھا۔ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت تھی جو کسی بھی شخص کو زیب نہیں دیتی تھی۔ اس کا چہرہ متغیر سا ہو گیا۔ وہ خوف زدہ اور پریشان سا ہو گیا کہ ایک

اجنی شخص اس کی جھوپڑی میں کیوں اور کس لیے گھس آیا ہے۔

”تم نے مجھے پہچانا۔۔۔“ ونود نے دوستانہ نرم لہجے میں کہا۔ ”میں نے تم سے مسز سادھنا کے گیسٹ ہاؤس کا پتہ پوچھا تھا۔“

پر شاد جواب دینے کے بجائے اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کی پلکیں اور آنکھیں منجمد اس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ ونود کا خیال تھا کہ اپنی عقل سے کام لے کر وہ اس نیم پائل شخص سے سب کچھ معلوم کر سکتا ہے۔

مگر دس فٹ کے بعد ہی اس کا حوصلہ جواب دینے لگا۔۔۔ پر شاد سیدھی بات کا الٹا یا ذوقی جواب دینے میں ماہر تھا اور بڑی مصومیت سے اصل بات کو گول کر جاتا تھا جس سے لگتا تھا کہ وہ برا ذہین اور چالاک بھی ہے۔

”مسز سوراج۔۔۔ جسے مسز فیشن بھی لوگ اور مالکن بھی کہتی ہیں۔۔۔ اس لیے کہ جو فیشن لیتا ہے اسے مسز فیشن کہتے ہیں۔۔۔ ہاں میں گیسٹ ہاؤس کے پاس سے گزرا تھا۔۔۔ جانتے ہو کیا دیکھا تھا میں نے۔۔۔ گیسٹ ہاؤس اور کیا۔۔۔“

بالآخر ونود نے اس کی گردن دبوچ لی۔

”تم جھوٹ بولتے ہو۔ کہتے ہو۔ تم نے کہا تھا کہ وہاں جاؤ گے تو چکر میں پڑ جاؤ گے۔ تمہیں معلوم تھا کہ وہاں ایک قتل ہوا۔ تمہیں یہ بات کسے اور کیوں کر معلوم ہوئی تھی۔۔۔ جب کہ باہر سے کچھ نظر نہیں آتا۔“ ونود نے بڑے تیز لہجے میں کہا۔

پر شاد کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے خود کو چھڑانے کی معمولی سی جدوجہد کی۔

بھگوان کی سوغند۔۔۔ میں نے باہر سے دیکھا تھا۔۔۔ اندر تو میں جا بھی نہیں سکتا۔۔۔ ورنہ وہ بلا میرے پیچھے پڑ جاتی۔۔۔ موٹی کالی بلا۔۔۔ کالی چیل۔۔۔ وہ جھاڑو لے کر مجھے مارنے دوڑتی ہے مجھے دیکھتے ہی۔۔۔“

”پھر تم چوری چھپے اندر گئے ہو گے۔“ ونود نے اسے دبائے رکھا ”کیا مسز فیشن نے تمہیں کچھ چراتے ہوئے دیکھ لیا تھا؟“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ کیسے دیکھ سکتا تھا۔۔۔ مردے کسی کو دیکھ نہیں سکتے۔“ وہ چلایا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ وہ مر چکا تھا۔“ ونود نے اس کی بات پکڑ لی۔ ”اس کی لاش وہاں لٹک رہی تھی۔ تم وہاں کیا چرانے گئے تھے۔۔۔؟“ پر شاد نے جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا اور ونود کی گرفت سے نکل گیا۔ نہ جانے کہاں سے اس نے دو سیب برآمد کیے اور سینے سے لگا کر کونے میں دبک گیا۔ ”یہ سیب میرے ہیں۔۔۔ میں نے مسز سادھنا کے باغ سے نہیں توڑے۔“

ونود نے خود کو سمجھایا کہ اس کا واسطہ ایک دیوانے سے ہے۔ چناں چہ اسے ہوش سے کام لینا چاہیے۔

”ٹھیک ہے پر شاد۔۔۔! یہ سیب تمہارے ہیں مگر تم نے چرائے ہیں۔۔۔ مجھے سچ بتا دو گے تو میں اپنا سے نہیں کہوں گا اور نہ ہی مسز سادھنا کو بھی بتاؤں گا۔ تم نے درخت پر سے اندر جھانکا تھا۔“ ونود نے اپنا لہجہ بدستور نرم رکھا۔

”نہیں۔۔۔ کھڑکی کھلی تھی میں ڈر رہا تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔“ وہ سیب کو کترتے ہوئے بولا۔

”سیب کیسے پیٹھے اور رس بھرے ہیں۔“

”مگر تم نے لاش دیکھ لی تھی۔۔۔ پھر تم نے یہ بات مسز سادھنا کو کیوں نہیں بتائی۔۔۔ وہ تو تمہیں نہیں مارتی۔“ ونود نے کہا۔ ”وہ تو بڑی اچھی اور نرم دل عورت ہے۔ تم اس کے مزاج سے تو واقف ہو گے۔“

”میرا خیال تھا کہ انہیں علم ہوگا۔۔۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔ ”کیا میرے گھر میں لاش ہو گئی تو مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ہوگی۔“ اس کے لہجے سے دیوانگی کا عنصر اچانک غائب ہو گیا تھا۔ ”کیا انہیں زندہ مردہ کی تمیز نہیں۔۔۔ وہ شاید بھی ہوں گی کہ مسز

فیشن جھولا جھول رہے ہوں گے۔“ وہ نود کو لا جواب چھوڑ کر اٹھا اور دوسرے کونے کی طرف بڑھا۔ فرش کی ایک اینٹ اٹھا کے اس نے نیچے کسی خفیہ خانے میں ہاتھ ڈالا اور پھر مطمئن ہو کر اینٹ پر بیٹھ گیا۔ نود اس کی پراسرار اس حرکت کو غور سے دیکھتا رہا۔ لمحہ بھر کی پہلے کی متانت پھر دیوانگی کے آثار میں ڈھال گئی۔ ”یہ آپ میرے کھانے کی میز پر بیٹھے ہیں۔۔۔ اور اب میرے ڈنر کا وقت ہو گیا ہے۔“

پرشاد نے کاغذ کے مختلف لفافے کھول کے کھانے کی بہت سی چیزیں نکالیں جو یقیناً لوگوں کی دی ہوئی تھیں۔ ان میں سے جو خوشبو پھوٹ رہی تھی اشتہا انگیزی لگتا تھا کہ جو ڈشیں اور لے کر آیا ہے وہ ذائقہ دار اور لذت آمیز بھی ہیں۔

نود باکس پر سے اٹھا اور اس نے پرشاد کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ پھر پرشاد ہندیانی لہجے میں چلایا۔ ”چور۔۔۔ تم چور ہو۔۔۔ میرا خزانہ لوٹنے آئے ہو۔۔۔ نکل جاؤ۔۔۔ دفع ہو جاؤ۔“

نود نے اینٹ ہٹا کے خلا میں دیکھا۔۔۔ موہل آئل کے ایک ڈبے کو کھود کر اس طرح فن کیا گیا تھا کہ زیر زمین خانہ بالکل محفوظ ہو گیا تھا۔ مگر اس ڈبے میں رودی کے سوا کچھ نہ تھا۔۔۔ نود نے تین مختلف قسم کے تاش۔۔۔ ایک پرانا کیلنڈر جس پر ایک مشہور فلمی ستارہ کی پہچان خیر تصویر۔۔۔ کسی فلمی رسالے سے کاٹی ہوئی چند ہوش ربا قسم کی رنگین تصویریں۔۔۔ تقسیم سے قبل کے برٹش دور کے سکے۔۔۔ دو ٹافیوں اور دو کریم والے بسکٹوں پر مشتمل پیکٹ۔۔۔ اور ایک پرانے ریڈیو مال کو شرمندگی سے دیکھا۔ ماکرو فلم یا بلو پرنٹ۔۔۔ ایک بچے کے خزانے میں اور کیا ہوگا۔۔۔؟

ڈائنامیٹ۔۔۔ ٹیپ۔۔۔ کوڈیک۔۔۔ ٹرانسمیٹر۔۔۔ اب تک تو اس نے لوگوں کو یہی سب کچھ چھپاتے دیکھا تھا۔ اس نے ساری چیزیں واپس بھر دیں۔

”پرشاد۔۔۔ تم سیٹی بہت اچھی بجاتے ہو

جس پر بانسری کا دھوکا ہوتا ہے مگر تم گانا پورا کیوں نہیں گاتے۔۔۔۔۔“ نود نے اینٹ رکھ کے کہا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ شہزادی نے کیا کیا تھا۔۔۔۔۔“ پرشاد سوچتے ہوئے بولا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“ نود نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”مجھے پورا گانا آج بھی بہت اچھی طرح یاد ہے۔ بچپن میں گانا تھا۔ جب پسند بھی تھا۔“

”تو پھر اب کیوں نہیں گاتے ہو۔۔۔۔۔“ پرشاد نے حیرانی سے دریافت کیا۔

”میں بھی بچپن میں گایا کرتا تھا۔ لیکن اب تو مجھے پورا گانا یاد نہیں۔“ نود کچھ دیر پرشاد کی متانت کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

”رومت۔۔۔ یا تو تم واقعی دیوانے ہو یا دیوانے بن کے دنیا کو دیوانہ بنا رہے ہو۔ فکر مت کرو۔ میں معلوم کر لوں گا۔“ اس نے دروازے کے پاس جھک کر کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اینا کو اس بات پر غصہ کم سخت صدمہ تھا کہ پولیس والے سوراج یعنی مسز فیشن کی لاش بالکل نئی چادر میں لپیٹ کر لے گئے۔ انہوں نے اجازت لینا اور پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ کوئی پرانی چادر دے دیتی۔ کیا نئی چادریں لے جانا واقعی ضروری تھا۔

نود نے اسے تسلی دی کہ مرنے والے کے لیے پھولوں کی چادر نہ سہی۔۔۔ گیٹ ہاؤس کی طرف سے نئی چادر گونڈ رانہ سمجھ لیا جائے۔ یہ بھی ایک طرح سے مان ہے۔ یہ مسز فیشن کے لیے عزت کی بات ہے۔ ایک چادر کی اوقات ہی کیا۔

پھر اس نے مطلب کی بات کی۔ ”گزشہ رات تم نے کوئی غیر معمولی بات نوٹ کی تھی؟“

”ہیں سر۔۔۔۔۔“ وہ نہایت راز دارانہ لہجے میں بولی۔ ”رات کو جھینگڑاڑ رہے تھے۔ آپ جانتے ہیں تاکہ جب کوئی مرتا ہے تو۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ مجھے معلوم ہے۔“ نود نے اعتراف کیا۔ ”اس کے علاوہ کوئی اور آواز۔۔۔ کوئی

”نہیں۔۔۔ کرشن۔۔۔!“ وود نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ قتل بے مقصد نہیں ہوا۔ قاتل کو معلوم تھا کہ آج رات مندر سادھنا گھر میں نہیں ہیں اور اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ قتل کو خود کسی کا کیس بنانے کی کوشش سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجرم کے ذہن میں پہلے سے یہ منصوبہ تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان کی موت سے کس کی ذات کو فائدہ ہو سکتا تھا اور کیا۔۔۔؟“

کرشن نے بڑی بے بسی سے بہت بڑے شہر کے بہت بڑے سراغ رساں کو دیکھا۔ جسے بال کی کھال نکالنے کا شوق تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس کی بات مسترد کرنا اپنی نا اہلی کا اعتراف کرنے کے مترادف تھا۔ ڈاکٹر نے کتنا فیصلہ لکھا تھا۔ نہ خود کشی نہ قتل۔

موتنی کمرے میں رسی سے معلق پایا گیا۔ موت دم گھٹنے سے واقع ہوئی۔ بات ختم بشرطیکہ ختم بھی جائے۔

تیسرے دن اتوار کو مسٹر فیشن کا کریا کرم ہو گیا۔ سارا گاؤں شریک ہوا۔ اس رات وود کی ملاقات ایک پارٹی میں دوسرے خطبی سے ہوئی۔ یہ کرشن کا بیٹا سریندر تھا جو بنگلور میں کسی سرکاری محکمے میں اچھا بھلا افسر تھا مگر کسی بات پر ایک اچھی نوکری پر لات مار کر چاندگر آ گیا تھا۔ کیوں کہ شہر میں اس کا دل نہیں لگتا تھا اور اسے وہ گاؤں بہت یاد آتا تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا اور پلا بڑھا بھی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب اپنے باپ کے ماتحت کی حیثیت سے چاندگر میں رہ کر رعایا کی سوا کرے۔

ودودخت حیران ہوا۔ بنگلور جیسے خوب صورت، بارونق اور ہنگامہ پرور شہر میں زندگی کی پیش قدمی انتہائی ترقی یافتہ اور کمپیوٹر پارک جس کی برق رفتاری کام یابی نے ساری دنیا میں دھوم مچا رکھی تھی۔ زندگی بڑی سرعت سے رواں دواں تھی۔ لیکن اس گاؤں میں وقت بادل ناخواستہ کچھوے کی طرح آگے ریگلتا تھا اور لوگ ہی نہیں اس ماحول میں ہر چیز سوئی سوئی یا

آہٹ۔۔۔۔ تمہیں محسوس ہوئی تھی۔“ اپنا نے پھر بڑے اعتماد سے سر ہلایا۔ ”کوئی سیٹی بجا رہا تھا۔“ پھر اس نے ایک ہاتھ پیشانی پر رکھا اور کچھ سوچنے لگی۔ ”وہ چاند کے شہزادے۔۔۔ اور زمین کی شہزادی والا گیت۔۔۔۔“

اپنا کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا اور اس نے پلکیں جھپکائیں۔

”آپ۔۔۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔۔۔۔“

آپ تو اس وقت چاندگر پہنچے بھی نہیں تھے۔

”بس۔۔۔ یہ بات کسی کو بھی بتانا نہیں۔“ وود نے مسکرا کر اس کے عظیم الشان کندھے پر ہچکی دی۔

اس روز شام کو کرشن پھر آ پہنچا۔۔۔ کیوں کہ رسی کا رروائی بہر حال ناگزیر تھی۔۔۔ مندر سادھنا نے کہا کہ وہ اپنے بھانجی کے گھر چلی گئی تھی۔ جسے اینڈکس کا دروازہ اٹھا تھا۔ مگر اس کے نا تجربہ کار شوہر نے فرض کر لیا کہ وہ صاحب اولاد ہونے والا ہے۔

کرشن قہقہہ مارے ہنسا اور اپنا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ سوال ہر جگہ نقیشت کے نصاب میں شامل تھا۔

”اپنا۔۔۔ اچھی طرح سوچ کر بتاؤ کہ کیا تم نے کوئی غیر معمولی بات نوٹ کی تھی۔۔۔؟“

پھر اس نے جھینگروں کی نوجہ خوانی کے عقیدے کا ذکر کیا۔ ”مگر میں ڈر کر سو گئی تھی۔۔۔“

کانوں میں روئی دے کر اور سر چادر میں لپیٹ کر۔

کرشن نے سر کھپایا۔ ”اب نقیشت خاک کی جائے۔ ایک بڑھا بیوی کی موت کے بعد گھر چھوڑ کر

اس کمرے میں بند ہو گیا تھا اور پانچ برس سے گوشہ نشین تھا۔ ایک رات مالکن کی عدم موجودگی میں اسے

پھانسی پر لٹکا پایا۔ اس کا دمن کوئی نہ تھا۔ چنانچہ یہ حرکت چور ڈاکو سے منسوب کی جاسکتی تھی۔۔۔۔

بشرطیکہ کچھ چوری ہوا ہوگا۔۔۔ لیکن اب کسے پکڑا جائے۔۔۔ اپنا کو۔۔۔ نوسر۔۔۔! نقیشت ختم۔۔۔ کسی

باہل خطبی نے بلاوجہ ایک شریف آدمی کو مار ڈالا اسے گیا ملا ہوگا۔۔۔ شاید وہ کسی چیز اور رقم کے لیے آیا ہوگا خالی ہاتھ گیا۔“



نشے میں مدہوش بھری تھی۔ مگر سریندر اس خوابیدہ گاؤں کی فضا میں لوٹ آیا تھا۔ جہاں ایک دن ایک مہینے کی طرح طویل انتظار کے بعد تمام ہوتا ہے۔ سریندر نے اس گاؤں میں پیدا ہو کر بھی جانے کیوں یہاں کی زندگی کو پسند کیا تھا۔

اس حساب سے یہاں لوگ سینکڑوں سال جی لیتے ہیں مگر ونود کو اس جینے کا کوئی مقصد نظر نہیں آیا تھا۔ خود سریندر کے باپ نے اعتراف کیا تھا کہ گاؤں میں سب ایک دوسرے کا حجرہ نسب تک جانتے ہیں۔ چنانچہ جرائم مفقود ہیں۔ لوگ گھروں میں تالے تک نہیں لگاتے۔۔۔ بھی کوئی نشے میں کسی اپنے پرانے کی ایک آدھ ہڈی توڑ دیتا ہے یا کسی کی بکری غائب ہو جاتی ہے اور بعد میں پتا چلتا ہے کہ فلاں فلاں کے لڑکے اسے بھون کر کھا گئے ہیں۔۔۔ چنانچہ فلاں فلاں بکری والے کو بکری لے دیتے۔ بیویاں عموماً خاموش رہتی ہیں کیوں کہ شوہر کو آج اور اس جدید دور میں جہاں آزادی نسواں ہے اور عورت نے کچھ حد سے زیادہ آزادی حاصل کر لی ہے۔ وہ مرد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہے حاکم سمجھا جاتا ہے۔ جب زیادہ آزاد خیال بیویاں بے لگام ہو جاتی ہیں اور زبان درازی پر مار کھا کے بھائیوں کی خدمات حاصل کر لیتی ہیں یا پھر ان کے والدین یا سرپرست سمجھاتے ہیں کہ شوہر کی حاکمیت قبول کر لو۔ انہیں سویکار کیا اور وچن دیے ہیں تو اس پر چلو۔۔۔ شوہر سے ہی عزت ہے۔ وہی ہمارا ہے۔۔۔ وقت ایسا ہے کہ حالات سے سمجھوتا کر لو۔۔۔ اگر تمہیں شوہر نے چھوڑ دیا تو کیا کرو گی۔۔۔ نو جوان اور حسین لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہو رہی ہیں اور وہ رشتوں کے انتظار میں بوجھی ہو رہی ہیں۔ ہمارے سماج میں بیوہ اور مطلقہ عورتوں سے شادی کوئی نہیں کرتا ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی حسین، نو جوان، پرشباب اور بے پناہ کشش کی مالک کیوں نہ ہو۔۔۔ ایسی متاثرہ عورت دو کوڑی کی بھی چانی ہے یہ خیال دل کے ہر کونے سے نکال دو کہ بھائی شوہر اور پولیس

والوں کا دماغ درست کر دیں گے۔ چوں کہ یہ بات سولہ آنہ یا سو فیصد درست ہوتی تھی۔ وہ دنیا دہشتی تھیں اور حقیقت پسند بن جاتی تھیں۔ حالات سے سمجھوتا کر لیتیں۔۔۔ لہذا بات ختم۔۔۔

گاؤں کی تاریخ میں چوری ڈکیتی کی دو چار سنسنی خیز واقعات تو شامل تھے۔ مگر قتل۔۔۔ نوسر۔۔۔! یہاں جان لینا صرف فرشتہ اجل کا کام ہے۔ جو ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے اور اس کے باوجود۔۔۔ ونود نے سوچا، جرائم کے اسناد میں بطور معاون اسنے باپ کے ساتھ کام کرنا چاہتا تھا۔ لوگ اس کے ایثار سے اور اس کی اس عظیم جذبے سے بے حد متاثر تھے۔ اس کی گاؤں سے گاؤں والوں سے محبت کے قائل ہو چکے تھے اور ونود کا ہم عمر سریندر خاں اسمارٹ، خوش پوشاک اور چاق و چوبند تھا اور دراز قد بھی۔۔۔ اس لیے وہ ایک طرح سے ہیرو بن گیا تھا جس کے مقابل زندگی کی قلم میں ہر لڑکی ہیروئن اور محبوبہ بننے کو تیار تھی۔

مسز سادھنا۔۔۔ جو اپنے معزز مہمان کو ہر ایک کے سامنے نمائش کے لیے پیش کر رہی تھیں۔۔۔ ونود کو چپکے چپکے اور غیر محسوس انداز سے منسوب خوبیاں۔۔۔ خامیاں۔۔۔ روایات اور اسکینڈل اپنے تہرے کے ساتھ سنائی جا رہی تھی۔۔۔

ایک ان کی ہم حیات۔۔۔ ہم وزن جو گوری چٹی دس کی رنگت کی شریکتی کے ساتھ مسز سادھنا جیسی پورٹریٹ لڑکی جس کا رنگ کالا تھا۔۔۔ اور سن یا نیگرو جیسی رنگت۔۔۔ مسز سادھنا نے بتایا کہ موتی عورت بے حد کمین اور کنجوس ہے۔ یہ کالی لڑکی اس کے بیٹے کی مگنیتھی اور وہ زندہ رہتا تو اس سے شادی یقیناً شادی کر لیتا۔ اس کالی لڑکی میں بڑی جاذبیت اور بے پناہ کشش تھی۔ بدن بھی پرشباب اور گداز تھا۔ چہرے کے نقوش میں ایسا ٹیکھا پن تھا کہ جو سیدھے دل میں اتر جاتے تھے۔ گاؤں میں اور بھی نو جوان کالی لڑکیاں اور عورتیں موجود تھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کا ثانی نہ تھا۔ اس کا مگنیتر جو

دولت کے حصول کے لیے امریکا گیا تھا یا اقوام متحدہ کی طرف سے اس فوج میں ویت نام گیا تھا لوٹ کر نہیں آیا۔۔۔ اب لڑکی تمام عمر شادی نہ کرنے کی سوگند کھا چکی ہے اور بڑے خلوص سے بڑھیا کی خدمت کرتی ہے مگر بڑھیا صلے میں نفرت کے سوا کچھ نہیں دیتی۔ کیوں کہ لڑکی بہت ہی زیادہ کالی تو ہے کی طرح ہے۔ بڑھیا اسے منحوس بھی سمجھتی ہے کہ جوان بیٹے کو کھا گئی جو سرخ و سفید گوروں کی طرح تھا۔ بھلا محبت کی نظر کو قاتل کون سمجھتا ہے۔ اس پارٹی میں دونوں نے تقریباً پچیس چھپیس برس کی ایک عورت کو دیکھا جو دور شباب میں ہی بوڑھی نظر آنے لگی تھی۔ آثار بتاتے تھے کہ اس کا حسن بھی نگاہوں کو خیرہ کرتا ہوگا اور اب اس کے چہرے پر جو کشن بھی اس نے اس کے دل کش نشیب و فراز کو متاثر کر دیا تھا۔۔۔ مسز سادھنا نے اسے بتایا کہ شوہر دن رات نشے میں دھت پڑا رہتا ہے اور بیوی پر سخت ظلم کرتا ہے۔۔۔ کرن دولت مند ماں باپ کی اگلوئی بیٹی تھی مگر دولت شادی کے تین برس کے اندر اندر شراب بن کر بہہ گئی۔۔۔ پھر رجن یعنی کرن کے شوہر نے زیورات بھی ٹھکانے لگا دیے اور اب کرن اسپتال اور گھروں میں آیا کا کام کرتی ہے۔ چونکہ اسپتال کی انتظامیہ اور لوگ حالات سے واقف ہیں اس لیے معاوضہ کچھ زیادہ ہی دے دیتے ہیں جسے شوہر ہی جاتا ہے۔ اس پر اس لیے شک کرتا ہے کہ اس کا جسم متناسب اور پرشباب ہے اس لیے کرن کی ہڈیاں توڑتا ہے کہ۔۔۔ بتا تو جوتاتی دیر سے آتی ہے کس پار کے پاس جاتی ہے جو مجھے کام کے اتنے پیسے دیتا ہے۔ کرن ٹی زندگی جہنم ہے مگر وہ اب بھی ناہر رہی ہے۔ وہ چاہے تو کسی بھی فریبی بڑے شہر میں جا کر ملازمت کر کے سکون اور اطمینان کی گزار سکتی ہے۔ چوں کہ محبت کی شادی ہے اس لیے شوہر کو نہیں چھوڑنی ہے۔ کرن ایک مثالی عورت تھی جو اس معاشرے میں خالی خالی ہی رہ گئی تھی۔ وفاداری کے اس بے رحم معیار پر نو دو کو بڑا دکھ ہوا جو جان کا نذرانہ لیے بغیر نہ

بخشے۔ اس عورت نے محبت کی کیسی لاج رکھی ہوئی تھی۔ لیکن اس کا شوہر اس قابل تھا کہ اسے سولی پر چڑھا دیا جائے۔ پارٹی میں وہ تہا آئی تھی۔۔۔ کیوں کہ اس کا شوہر رجن شراب کے نشے میں مدھوش پڑا تھا اور صبح سے پہلے اس کا ہوش میں آنا ناممکن تھا۔ تازہ ترین مار پیٹ کی نشانیاں ہنوز اس کی صورت، گلے کے نیچے ابھاروں اور مرمریں سڈول ہاتھوں پر نمایاں تھیں لیکن لوگ اس کے آگے پیچھے پھر رہے تھے اور وہ ہنس رہی تھی اور خوش بھی تھی کہ جیسے شوہر کی پیار کی نشانیاں ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ توجہ اور التفات دراصل نرس کی خیرات ہے جو سب اپنے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھوانے کے لیے دیتے ہیں۔ مسز سادھنا نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ کرن نے ان نامساعد حالات اور شوہر کے ظلم و ستم اور جبر اور شقاوت پر اپنے اوپر بھی آغوش نہیں دی۔ وہ پوتر ہے۔ حالاں کہ ایسے مردوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو اس کی پاکیزگی اور آبرو پر داغ بننا اور منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہیں۔ اپنی اذیت اور دکھ وہ اپنے آپ کو رات دن مصروف رکھ کے اور اسپتال میں دھمی مریضوں کی سیوا میں بھول دیتی ہے۔

مسز سادھنا نے نو دو کو دہلی سے ایک برس سے قبل آئی ہوئی اس مصورہ سے بھی متعارف کرانے کی کوشش کی جو محض تصویریں بنا رہی ہے۔ حالانکہ رنگ اور برش سے محنت کرنے کے بجائے یہی کام کیرے سے بھی بہتر طور پر چشم زدن میں بہت اچھی اور ہر طرح اور زاویے سے اتر جاتی تھیں۔ اب تو کیرے ایسے آگئے تھے جو طلسمانی قسم کے تھے۔

کرن کے اس دیہاتی اجتماع میں صرف دو افراد تھے جن سے وہ شہر کی باتیں کر سکتی تھی۔ ایک دہلی سے آنے والا نو دو اور دوسرا بنگلور سے لوٹنے والا مسریندر۔۔۔ ایک بیماری کے باعث آیا ہوا اور دوسرا مسکین ہو کر۔۔۔ مگر اہمیت کے اعتبار سے دونوں کے فرائض ایک جیسے تھے۔ بالکل نامعلوم خود پر نو دو اور مسریندر کے درمیان رقابت کا ایک فضول سا جذبہ

پیدا ہو گیا۔

حصے بھی قریب ہی بکھرے ہوئے تھے۔۔۔ بوتل کی شراب فرش پر بہہ چکی تھی اور اس کا دھارا بہتے ہوئے خون سے جا ملا تھا۔ وہ دونوں چند لمحوں تک صورت حال کا جائزہ لیتے رہے۔

”نشے میں آ دی کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی تو ٹھوکر کھاتا ہی ہے۔“ سریندر نے اوپر سے آنے والے لکڑی کے ذریعے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کا خیال ہے کہ زنجن اوپر سے نیچے آتے ہوئے گرا اور سر کی چوٹ کے علاوہ بوتل کے زخم سے مر گیا۔“ ونود کھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔۔۔ اس میں شبہ کی کون سی بات ہے۔“ سریندر نے طنز سے کہا۔ ”یہ ممکن تھا کہ وہ گر کے بھی بچ جاتا۔۔۔ کیوں کہ اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی جو گرنے سے ٹوٹ گئی۔۔۔ اور۔۔۔“

”آپ کا خیال سو فیصد غلط ہے۔“ ونود نے اٹھتے ہوئے تکرار کی۔ ”جاؤ۔۔۔ اور جا کر اپنے پتا بچی کو بلا کر لے آؤ۔۔۔ ان سے کہو کہ کسی نے زنجن کو قتل کر دیا ہے۔“ ونود کا لہجہ ضرورت سے زیادہ سخت تھا۔

سریندر نے پلکیں جھپکا کرے ووقوفوں کی طرح ونود کو دیکھا اور پھر کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔

بیس منٹ کے بعد باپ بیٹا اتحادی فوجوں کی طرح مارچ کرتے ہوئے نمودار ہوئے۔ انسپکٹر کی حیثیت سے کرشن نے سب سے پہلے لاش کا معائنہ کیا۔ پھر اس نے ونود کو دیکھا۔ ”آپ کا یہ کہنا ہے کہ یہ حادثہ نہیں قتل ہے۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔“ ونود نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا اور بے نیازی سے اپنی سگریٹ جلائی۔ ”زنجن اوپر سے نہیں گرا۔ وہ اوپر جا رہا تھا کہ کسی نے اس کی گردن توڑ دی اور بعد میں جب وہ مر چکا تھا اس کے سر پر شراب کی بوتل مار کر سر بھی توڑ دیا اور شراب کی بوتل بھی توڑ دی۔“

”اس مفروضے۔۔۔ بلکہ احتمانہ مفروضے کی

ونود نے محسوس کیا کہ سریندر اپنے رویے اور اس کی غیر موجودگی اور باتوں سے بلاوجہ لوگوں کو زیادہ متاثر کر سکتا تھا اور ونود کا یہ انداز غلط نہ تھا کہ سریندر بلاوجہ اسے چیلنج کر رہا ہے۔۔۔ مگر اب سچ میں کپ ملاتے ہوئے اسے احتیاط سے کام لینا پڑ رہا تھا۔ مزید یہ اب اسے پدیشی کی توجہ بلا شرکت غیرے نہیں مل رہی تھی۔ چنانچہ وہ ضرورت سے زیادہ اسارٹ بننے کی کوشش میں ونود کو تنقید باز مذاق کا نشانہ بنانے لگا تھا۔ ونود کو مجبوراً جوابی کارروائی کرنی پڑی۔ اس کے سوا چارہ نہیں رہا تھا۔

پارٹی ختم ہوئی تو وہ تینوں ایک ساتھ باہر نکلے۔ ان کے درمیان کشیدگی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ درمیان میں چلنے والی پدیشی کو بھی احساس ہونے لگا تھا۔ تقریباً سو گز تک وہ ان کی نوک چھو تک برداشت کرتی رہی تھی۔ پھر یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کسی ایک کا مذاق دوسرے کو گراں گزرا تو نوبت سچ کلامی تک پہنچ جائے گی۔ پدیشی نے ان دونوں سے الگ ہو کر جانے کا فیصلہ کیا ہی تھا کہ گلی میں ایک گھر کا دروازہ کھلا اور کسی عورت نے چیخ ماری۔ سریندر اور ونود ایک ساتھ اس کی مدد کے خیال سے اس طرف دوڑے۔

”کرن۔۔۔“ سریندر نے اسے دور ہی سے شناخت کر کے کہا۔ ”کیا بات ہے۔۔۔“

”سریندر۔۔۔!“ کرن نے ہسٹریا کے مارے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”زنجن۔۔۔ وہ میرا خیال ہے کہ۔۔۔ زنجن مر گیا ہے۔۔۔ دنیا سے دفع ہو گیا ہے۔“ کرن کا خیال بالکل غلط نہیں تھا۔ زنجن سیڑھیوں کے قریب بڑے مضحکہ طریقہ پر ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ اس کا سر اسیا بچھا تھا کہ ایک طرف سے خون کے ساتھ مغز بھی باہر آ گیا تھا۔ دوسری طرف اس کے رخسار کا گوشت آٹکھ کے گوشت کے کنارے تک کٹ گیا تھا اور اس کے سارے دانت نظر آنے لگے تھے یہ شگاف شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتل کے ایک تیز دھار والے نوکیلے ٹکڑے سے آتھا تھا جس کے بانی

بنیاد کیا ہے؟“ کرشن نے بیٹے سے سنی ہوئی بات کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

”اپنی رائے کوئی الحال محفوظ رکھیں۔“ وود نے سگریٹ کو ایک کش کے بعد زمین پر ڈال کے رگڑ دیا۔ ”میں ابھی اوپر گیا تھا جہاں نرنجن نے نوشی میں مصروف تھا۔ وہاں ایک بوتل رکھی ہے جو بالکل خالی نہیں ہوئی ہے۔۔۔ اس میں سے ایک خاصے بڑے جام کو بھرا جاسکتا ہے۔۔۔ نرنجن دوسری بوتل اس صورت میں لاتا جب وہ خالی ہو جاتی۔۔۔ بلا نوش آخری قطرے تک نہیں چھوڑتے۔۔۔ لیکن اس سے ملنے کوئی آقا تھا۔۔۔ کوئی ایسا شخص جس کے علم میں تھا کہ کرن باری میں ہوگی اور نرنجن اکیلا ملے گا۔ نرنجن اس کی خاطر مدارت کے لیے دوسری بوتل لینے اتر اٹھا کیوں کہ اب اسے ایک نہیں دو جام بھرنے تھے۔“

”یہ سب آپ کے ذہن کی اختراع ہے۔“ سریندر نے دخل دیتے ہوئے کہا۔

”مث اب۔۔۔ پہلے میری بات ختم ہونے دو۔“ وود نے اس کی طرف ٹھوم کر کہا۔ ”آپ نے یہ زینہ دیکھا ہے۔۔۔ زینہ لکڑی کے الگ الگ تختوں کا بنا ہوا ہے۔ دو تختوں کے درمیان تقریباً آٹھ انچ کا فاصلہ ہے۔۔۔ کوشش کر کے دیکھو۔۔۔ یہ فاصلہ کتنا بڑھ سکتا ہے۔ دو تختوں کو اوپر نیچے کھینچو۔۔۔ تختوں کی لچک سے درمیان کا خلا نو انچ تک ہو جاتا ہے۔۔۔ نرنجن جب بوتل لے کر اوپر جا رہا تھا تو قاتل اوپر موجود تھا۔۔۔ اور شاید ہاتھ میں کوئی چیز لے کر منتظر تھا کہ نرنجن کا کام تمام کر دے اور نکل جائے۔۔۔ مگر قدرت یا نرنجن کی شامت اعمال نے ایک بہتر موقع فراہم کر دیا۔۔۔ نرنجن چند زینے چڑھا اور ٹھوکر کھا کے گر پڑا۔ ممکن ہے اس کا سر دو تختوں کے درمیان پھنس گیا لیکن یہ ذرا مشکل ہے۔۔۔ قاتل نے خود یہ کام کیا کہ نرنجن کو اٹھنے نہیں دیا اور ایک پاؤں سے دبا کر اس کا سر دو تختوں کے درمیان کر دیا۔۔۔ پھر وہ اوپر والے تختے پر چڑھ گیا۔ اور اس کے وزن نے نرنجن کی گردن توڑ دی۔۔۔ بعد میں اس نے نرنجن کو

نیچے لڑھکا دیا۔۔۔ شراب کی بوتل نرنجن کے ہاتھ میں تھی۔ قاتل نے بوتل کو گردن سے پکڑ کے نرنجن پر وار کیا اور اس کا سر پھاڑ دیا۔ بوتل کا جو حصہ ٹوٹ کر قاتل کے ہاتھ میں رہ گیا تھا وہ الگ پڑا ہے۔۔۔ اسے غور سے دیکھو۔۔۔ اس پر انگلیوں کے نشانات تو نہیں ملیں گے مگر آپ کارک پر لگی ہوئی سیل سلامت ملے گی۔ کیوں۔۔۔؟ نرنجن بوتل کھولے بغیر اوپر کیوں لے جا رہا تھا۔ اوپر تو کوئی ایسی چیز نہیں جس سے سیل توڑی جاسکے یا کارک نکالا جاسکے۔۔۔ پھر ذرا غور سے نرنجن کی گردن کو دیکھو۔۔۔ ایک گہرا سیاہی مائل نیلا نشان تو دو تختوں کے کناروں کا ہے مگر گردن میں لکڑی کے ریشے پوست ہیں۔۔۔ باریک باریک سلامیاں سی ہیں جو خون کے نیچے چپکے سے رہ گئیں۔ اگر تم زیادہ تفصیل سے معائنہ کرو گے تو تمہیں کہیں اوپر نیچے دو تختوں کے کناروں پر گوشت کے ریزے بھی چپکے ہوئے مل جائیں گے۔۔۔ اگر یہ مفروضہ میرے اجتہاد ذہن کی اختراع ہوگی آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔۔۔ تمہاری تفتیش فضول اور لا حاصل اور وقت کا ضیاع ہوگی۔“

پندرہ منٹ مکمل خاموشی میں گزر گئے۔ ایک وحشت سی رہی تھی۔

کرشن نے نرنجن کی گردن کا معائنہ کر لیا تھا اور اب وود کی رائے سے اتفاق کرنے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن یہ مجبوری اس پر سخت گراں گزری تھی۔ سینکڑوں میل دور سے آنے والے ایک سراغ رساں نے اس کی زندگی میں مشکلات پیدا کر دی تھیں۔۔۔ پہلے اس خود کشی کے اس سیدھے سادے کیس کو قتل بنایا۔۔۔ اور اب ایک حادثے کو قتل ثابت کر کے اسے دہریہ اذیت میں دھکیل دیا تھا۔ یہ اذیت۔۔۔ ایک بدترین ذہنی عذاب میں ڈال دیا تھا۔ ایک ایسے گرداب میں پھنس گیا تھا جس سے اس کا نکلتا دشوار اور تنگین بن گیا تھا۔

اس نے اپنے آپ کو ایک دلدل میں گردن تک دھنسا ہوا محسوس کرنے لگا۔ جس میں نکلتا اور

بصورت دیگر کر یا کرم میں شرکت یا پر سادہینے کے علاوہ کچھ نہیں کرنا پڑتا۔۔۔ دو مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔۔۔ پرانی تاریخ کے واقعات کی وضاحت نہیں کروں گا اس لیے کہ میں موجود نہیں تھا۔۔۔ مگر شاید آپ کے پتا جی کر سکیں۔۔۔“

پھر اس نے تیزی سے گھوم کر کرشن کو دیکھا اور واک آؤٹ کر گیا۔

کرن ساتھ والے کمرے میں منجھڑ بیٹھی تھی اور اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ آنکھوں میں ویرانی برس رہی تھی۔

”کرن شریقتی۔۔۔!“ ونود نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ اندازے سے بتا سکتی ہیں کہ یہ حرکت کس نے کی ہوگی۔۔۔؟“

”اندازے سے۔۔۔۔۔“ وہ غبی سے ہنسی۔

”میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ حرکت میرے کسی حتمین نے کی ہوگی۔۔۔ جس میں اتنی اخلاقی جرات تھی کہ ایک مظلوم اور بے بس عورت کو زندگی کے ترک سے نجات دلا سکے۔۔۔ جسے معلوم تھا کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ زنجن کو مار سکے یا اس سے طلاق لے کر نجات پا لوں یا بھاگ کر چھکارا حاصل کر سکوں۔“ وہ ہنپائی کیفیت میں ہنسی۔ ”میں بڑی وفا شعار بچی تھی۔ میں نے بھی بھولے سے بھی اپنی ذات پر آج نہیں آنے دی۔۔۔ جب کہ میری جسمانی دل غشی کے امیدواروں کی کوئی کمی نہ تھی۔

مجھے اپنے جال میں بھانسنے کے لیے کیا کیا چارا ڈالتے رہے۔۔۔ مگر مجھے اس کی موت کا قطعی رنج نہیں۔۔۔ صرف اس کی موت ہی میرے مصائب کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ میری موت یا زنجن کی موت۔“

کرن اپنی انتشار میں مبتلا تھی اور اس نے کہا تھا کہ آج سے وہ راتوں کو سکون کی نیند سو سکے گی۔۔۔

وہ مر گیا۔۔۔ خبیث۔۔۔ یوں گھر آنے پر شک بھری نظروں سے دیکھتا تھا اور کہتا تھا کہ۔۔۔ ”یہ بال بکھرے ہوئے کیوں ہیں۔۔۔ لباس بے ترتیب اور شکلوں سے بھرا ہوا کیوں ہے۔۔۔ ہونٹوں کی

باہر آنے کی کوشش میں اتنا ہی وقت چلا جائے۔ اب اس کی صرف یہ ذمے داری نہیں بلکہ فرض شناسی کا امتحان تھا کہ اب وہ دونوں وارداتوں کا سراغ لگائے اور دو قاتلوں کو پکڑے ورنہ اس کا سارا ریکارڈ خراب ہی نہیں ستیاناس بھی ہو جائے گا اور اتنے بڑے شہر سے آنے والا اتنا بڑا سراغ رساں فرائض میں غفلت برتنے پر اسے معطل ہی نہیں اندر بھی کر سکتا ہے۔

ادھر چالاک قاتل اتنی آسانی سے ہاتھ آنے والا نہیں تھا ورنہ پریشانی کی بات نہ ہوتی۔

”ان کی ازدواجی زندگی کے حالات سب پر عیاں ہیں۔“ ونود نے دوسری سگریٹ جلائی پوری بات کہہ دینے کے بعد وہ اپنے غصے پر قابو پا چکا تھا۔

”اگر کرن پارٹی میں موجود نہ ہوتی تو آپ اس پر آسانی سے الزام ٹھوپ سکتے تھے۔ مگر قتل کی یہ ہولناک واردات ایک گھنٹے پہلے ہوئی ہے۔ کرن کو تین گھنٹے تک متواتر دیکھنے والے گواہ بہت ہیں۔ وہ تین برسوں سے جس عذاب میں مبتلا ہے اس کی جگہ کوئی اور عورت ہوئی تو اپنی اس ظالم اور سنگ دل پتی کو تین ماہ میں کسی نہ کسی طرح راستے سے ہٹا دیتی۔ لیکن اس نے ایسا کیا اور نہ سوچا۔۔۔ وہ ایک مثالی شوہر پرست پتی کی طرح ہر ظلم سہہ کر سہوا کر رہی۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا اور آپ مجھ سے کہیں زیادہ جانتے ہیں اور اس عورت کو سمجھتے ہیں۔“

”مسٹر ونود۔۔۔!“ سریندر نے زہر سے بچھے ہوئے لہجے میں جیسے ونود کے وجود پر ڈنک مارا۔ ”اس چاؤں کی تاریخ میں بھی قتل کی کوئی واردات نہیں ہوئی تھی۔۔۔ مگر آپ کے قدم رنجہ فرماتے ہی ایک ہفتے میں دو قتل ہو گئے ہیں۔“

”میری رائے اس کے برعکس ہے مسٹر سریندر۔۔۔!“ ونود نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ”دو قتل پہلے بھی ہوئے ہوں گے مگر انہیں نااہلی کے باعث یادیدہ دانستہ خودکشی یا حادثہ سمجھ لیا ہوگا کیوں کہ قتل کے بعد قاتل کا سراغ بھی لگانا پڑتا ہے۔۔۔

مصور کی نظر سے نہیں تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ ”بڑے شہر کا بڑا جاسوس“

اس نے وہیں ایک آئینے میں اپنا عکس تصویر سے ملا کر دیکھا اور مزید حیران ہوا۔ خیر۔۔۔ مصور کی نگاہ جس انداز سے چاہے دیکھے۔ جانے لوگ اسے کس کس نظر سے دیکھتے ہوں گے۔۔۔ وہ کسی کی نگاہوں پر پہرا بٹھا تو نہیں سکتا۔۔۔ اس نے دل کو تسلی دی۔۔۔ یہ بھی کیا کم ہے۔ ایک مصور نے اسے اتنی اہمیت دی۔ جب کہ وہ فحشی ستاروں کی تصویریں بنانے کو اہمیت دیتے ہیں۔

اس کے خیالات کی رویک نخت ٹوٹ گئی۔ باہر سے سیٹی بجانے کی آواز صاف سنائی دینے لگی تھی۔ اور گیت کی لے وہی تھی۔ ونود نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کے دیکھا۔ پرشاد اپنے مخصوص انداز دیوانگی میں لہراتا ہوا آ رہا تھا۔ قریب آ کے وہ رکا اور اس نے ایک نظر دائیں بائیں ڈالی۔ اس ایک نظر میں دیوانگی نہیں نہ تھی۔۔۔ احتیاط تھی۔۔۔ اسے یقین آ گیا کہ دیکھنے والا کوئی نہیں وہ دبے پاؤں آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ دروازے کے قریب آیا۔ ونود نے اسے دروازے کو دھکیلنے کی کوشش کرتے دیکھا۔ پھر وہ ایک قدم پیچھے ہٹا۔۔۔ پلٹا اور دس قدم دور جھاڑیوں کے پیچھے ہی چھپ گیا۔

پرشاد کی شخصیت اس کے لیے روز بہ روز پراسرار بنتی جا رہی تھی لیکن اس وقت اس کا رویہ ونود کے لیے باعث تشویش بن گیا تھا۔ کیوں کہ پدمی گھر کھلا چھوڑ کے نہ جانے کہاں نکل گئی تھی اور یہ بھی نہ معلوم تھا کہ کب لوٹے گی۔۔۔ پرشاد کی یہاں اس طرح سے آنا اور چھپ کر آنا اور انتظار کرنا بے مقصد نہیں تھا اور یہ مقصد بہر حال نیک نہیں لگتے تھے۔

وہ اب واپس جانے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ پرشاد کی آمد کے بعد اسے اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

یہ خوب صورت اور نازک سی لڑکی جس کے ہاتھ رنگوں سے جادو جگانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ تنہا بھی اور اس دور افتادہ مقام پر جہاں کوئی

لپ اسٹک اڑی اڑی سی کیوں ہے۔۔۔ چہرہ سرخ کیوں ہو رہا ہے۔۔۔ اتنی دیر سے کیوں آئی۔ کن کن ڈاکٹروں نے تجھے اتنی دیر کیوں اور کس لیے روکے رکھا۔۔۔ اچھا تو کتنا مال اور کتنی شراب کی بوتلیں لائی ہے؟“

ونود نے ہمدردانہ اور دوستانہ لہجے میں بات کی اور چند لمحوں میں یہ معلوم ہو گیا کہ کرن نے بھی گھر سے روانہ ہوتے وقت کسی کو دیکھا نہیں تھا مگر قریب ہی کوئی سیٹی بج رہا تھا۔۔۔ وہی شہزادی اور شہزادے والا گیت جن کے درمیان زمین آسمان کا فاصلہ تھا۔۔۔ اس گیت کی دھن سے گاؤں کا ہر بچہ بچہ۔۔۔ لڑکیاں عورتیں اور لڑکے مرد سبھی واقف تھے۔ آشنا تھے۔

باہر جانے سے پہلے ونود ذرا سی دیر کے لیے درمیان والے دروازے پر رکا۔

”مسٹر کرن۔۔۔! میں آپ کے لیے دشواریاں تو پیدا نہیں کر رہا ہوں مگر آپ کی مدد اور تعاون بھی میرا فرض ہے۔ یہ دونوں قتل ایک ہی شخص نے کیے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ان کے درمیان تعلق بھی ہو۔“ پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر ہاتھ لگا گیا۔

مصوری میں ونود کا ذوق عام آدمی سے بہتر نہیں تھا جو وہ اچھے منظر کی باخوب صورت چہروں کی تصویر دیکھ کر تعریف کر سکتا تھا۔ دل میں سراپا ہے اور نہ ہی داد دینے کے الفاظ کی ادائیگی کیسے کی جانی ہے اور کس تصویر کی کن الفاظ میں ادا کرے۔ مگر وہ فن کی باریکی یا تجریدی مصور سے نا آشنا تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست کے ساتھ تجریدی آرٹ کی نمائش دیکھی تھی۔ اس میں کل بائیس پینٹنگز تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا اس کے دوست نے سمجھا تو اس کے بلے نہ پڑا۔ اسے لگا کہ کسی شریں بچے یا پھر کئی بچوں نے قتل کر ان کے کیسز پر مختلف رنگ کرا کے برش اور جھاڑو پھیر دی ہو۔۔۔ چناں چہ پدمی کے گھر میں اپنی صورت کا خوب صورت سا نقش دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے اپنی صورت کو ہمیشہ آئینے میں دیکھا تھا کسی

مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ونود کے لیے ناقابل یقین تھا۔ اس کی حیرت دو چند ہو گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے یہ اس کا وہم ہو۔

پرشاد کوندے کی طرح لپکا اور ونود کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس کے ہاتھ کسی آہنی شکنجے کی طرح لپٹ گئے۔ بیک وقت ونود کے دونوں پیر زمین سے یوں رند گئے جیسے زمین نیچے سے ہٹ گئی ہو۔ پھر ونود نے خود کو فرشی خاک پر چپٹ لیٹا ہوا پایا۔

پرشاد اس پر سوار تھا اور ونود کے لیے اٹھنا تو درکنار وہ جنبش کرنا بھی محال ثابت ہو رہا تھا۔ کیوں کہ پرشاد اس کی چھاتی پر سوار تھا۔ اس نے دائیں بائیں لپٹ کر خود کو چھڑانے کی اور کھڑے ہونے اور اٹھنے کی انتہائی کوشش کی مگر پرشاد نے کسی فریبی اسٹائل ریسلنگ کے پہلوان کی طرح ہلے تک نہیں دیا۔ اسے پرشاد نے ایسا قابو میں کیا تھا کہ وہ بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

اس اجایک اور غیر متوقع صورت حال سے پدمنی بھی گھبرا اٹھی تھی۔ پھر وہ پرشاد کو سمجھانے لگی تھی کہ پرشاد بس کرو۔۔۔ تم جیت گئے۔ اب ہٹو۔۔۔ مسٹر ونود کو اٹھنے دو مگر ونود نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ اس طرح کہ پرشاد نے یہ اشارہ نہیں دیکھا۔

”ٹھیک ہے، پرشاد۔۔۔! تم نے دشمن کو زیر کر لیا۔۔۔ اب تم کیا کرو گے۔“ ونود نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے انداز میں کہا۔ پرشاد کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک کوند گئی۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

اس کے ہاتھ ونود کی گردن پر جم گئے۔ آہستہ آہستہ دباؤ بڑھنے لگا اور ونود کا سانس رکنے لگا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ پرشاد کے ہاتھوں میں اتنی قوت پوشیدہ ہے۔۔۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔۔۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں رنگین دائرے جھلملانے لگے تھے اور اس کا سارا وجود زندہ رہنے کی جدوجہد میں شریک تھا۔ وہ تو اسے واقعی

پاکل یا جنونی دو قتل کر چکا تھا قطعی غیر محفوظ تھی۔ جب پانچ منٹ کے بعد ونود کو پدمنی کی شکل نظر آئی تو اس نے بھگوان کا شکر ادا کیا کہ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس کے لیے پدمنی کا انتظار اذیت ناک بنا ہوا تھا۔

باہر شام کا اندھیرا اب رات کی سیابی کی آغوش میں سما چکا تھا۔ ونود گھر سے نکل کے جھاڑیوں کی طرف بڑھا جہاں پرشاد دیکھا ہوا تھا اور پدمنی اس کے اور ونود سے قطعی بے خبر تھی۔

”پرشاد۔۔۔!“ ونود نے پدمنی کی آواز سنی۔ ”پھر وہی شرارت۔۔۔ چلو باہر نکلو۔“ وہ پرشاد کو یوں ڈانٹ رہی تھی جیسے کوئی شریر بچہ ہو۔ پرشاد خفت زدہ سا جھاڑی سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اس وقت تک ونود بھی قریب پہنچ چکا تھا۔ پدمنی اسے دیکھ کر حیرت اور مسرت سے مسکرائی۔

”آپ۔۔۔ آپ کب سے انتظار کر رہے ہیں۔۔۔ مجھے زیادہ دیر تو نہیں ہو گئی؟“

”میں دیکھ رہا تھا کہ آپ نے بڑی آسانی سے پرشاد کو تلاش کر لیا۔“ ونود نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”کیا آپ اس قسم کی آنکھ پھولی کی عادی ہیں۔“ اس کی نگاہ پرشاد کے چہرے پر جمی رہی جو نروس ہو رہا تھا۔ پدمنی دل کش انداز سے ہنسی اور پھر اس نے پرشاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔۔۔ پرشاد ایسی بچکانہ حرکتیں کرتا رہتا ہے۔۔۔ میں اس کی ان حرکتوں کی عادی ہو چکی ہوں۔“

”بچکانہ۔۔۔“ ونود نے بے خیالی میں کہا۔ پھر وہ مسکرایا۔ ”پرشاد۔۔۔! تم مجھ سے کتنی لڑو گے۔۔۔؟“

”کتنی۔۔۔“ پرشاد اس غیر متوقع سوال پر بوکھلا کے پیچھے ہٹا۔ ”مگر۔۔۔“ وہ ہکلا یا۔

”ڈرو نہیں۔۔۔ آنکھ پھولی تو لڑکیاں کھیلتی ہیں۔“ ونود نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”کتنی مردوں کا تھیل ہے۔۔۔ آؤ۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔

”ہاں۔۔۔ اندازہ تو میں بھی یہی کرنا چاہتا تھا۔“

”وہ نے کپڑے جھاڑتے ہوئے جواب دیا۔  
”لیکن اس کی جسمانی قوت کے علاوہ پرشاد کی صلاحیت خود میرے لیے ناقابل یقین حد تک حیرت انگیز ہے۔“

وہ دونوں خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔  
پھر وہ دونے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

”مس پدمنی۔۔۔! پلیز! آپ میری ایک بات مانیں۔ ایسے جنگل میں آپ ایکلی نہ گھوما کریں۔ خصوصاً شام کے بعد۔۔۔ اگر دل شام کے وقت سیر کے لیے کرتا ہے تو میرا غلصہ نہ مشورہ ہے کہ آبادی کے قریب کوئی گھر لے لیں۔ کوئی نہ کوئی معقول کرایہ پر دے دے گا

”مجھے کچھ نہ ہوگا آپ خواخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔“ وہ دل کش انداز سے مسکرا دی۔ ”میں خواخوا لوگوں کو چیلنج کرتی نہیں پھرتی۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ دود بھی بنے بغیر نہ رہ سکا۔  
”یوں بھی یہ کام آپ کا نہیں ہے مگر اس کے باوجود آپ نے ایک شریف آدمی کی اچھی بھلی صورت کا کارٹون بنا کے۔۔۔ کیا مجھے چیلنج نہیں کیا ہے۔۔۔ کاش! میں بھی مصور ہوتا۔۔۔“

”تو۔۔۔۔“ وہ بولی۔ ”پھر کیا آپ میرا کارٹون بنا دیتے۔ کارٹون بنانا بہت آسان ہے۔“  
”جی نہیں۔۔۔ ایسی تصویر بنانا کہ مس ورلڈ نہ سہی مس انڈیا لگتیں۔“ پھر دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔

بھگوان کے کارخانے میں سکون اور شاعری صرف سادی کی آغوش میں مل سکتی ہے۔ وہ دونے کسی فلسفی کی طرح طے کیا اور ولیم کی مقررہ دو گولیاں کھانے کے بعد روشنی گل کر کے روانہ ہو گیا۔۔۔  
لوگ جو دہلی کے شہروں میں رہتے ہیں انہیں چاند نگر جیسے گاؤں سکون کا کہوارہ لگتے ہیں دور کے ڈھول سہانے۔۔۔ اس نے تمام فضول خیالات کو ذہن سے خارج کرنے کی کوشش کی اور دھیرے دھیرے

زندہ درگور کرنے پر تل گیا تھا۔

لیکن اب پرشاد کو ہٹانا یا زبان سے منع کرنا۔۔۔ تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔  
پدمنی کی سچ ایک دہشت زدہ پکا رہتی۔ وہ ہذیانی لہجے میں ہمدردی تھی۔

”پرشاد! پرشاد۔۔۔ بس، بس، دیکھو تم نو دو کو مار ڈالو گے تم جیت گئے فاتح بن گئے تم سکندر اعظم بن گئے۔ اچھا اب ہوا اچھا یہ لو ادھر دیکھو لال اور نیلا اور پیلا رنگ ہر نیوب میں صرف ایک رنگ ہے۔ تم چاہے تو ایک رنگ لے لو یا پھر تمام رنگ بھی لے سکتے ہو۔“

پدمنی نے ذہانت سے کام لیا تھا مگر اس پر ہسٹریا کا اثر غالب تھا۔

پدمنی کی بات سنتے ہی پرشاد کے ہاتھوں وہ دود کی گردن کو چھوڑ دیا۔

پھر وہ نو دو کو یک لخت بھول کر ایک دم سے اٹھا اور لال نیلے پیلے رنگوں کی طرف بڑھا جیسے ان کی کشش کے سامنے وہ بے بس ہے۔

پدمنی غیر محسوس انداز سے ایک ایک قدم پیچھے ہٹتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ پرشاد کو دس قدم لے جانے میں کامیاب ہوئی۔ اس کی کوشش کامیاب ہو گئی۔ پھر اس نے اپنے سارے رنگ پرشاد کے حوالے کر دیے۔۔۔ پرشاد کا چہرہ فرط مسرت سے دیکھنے لگا۔ یہ رنگ جیسے اس کی بہت کم زوری اور ان کے حصول کی خواہش تھی۔ پھر وہ انہیں جب میں ٹھوس کر اور پلٹ کر دیکھ بغیر جنگل میں گم ہو گیا۔

پھر چند ساعتوں کے بعد اس کی سیٹی سنائی دینے لگی۔ چاند کا ایک شہزادہ تھا۔ ایک زمین کی شہزادی۔۔۔ ایک دن شہزادی نے کہا۔۔۔ وہ دود فرس پر لیٹا لہجے لیے سانس لیتا رہا۔ پدمنی نے اس کی حالت پر ایک نظر ڈالی اور پھر اس نے اپنا سر مرین ہاتھ بڑھایا اور اسے اخلا قات سہارا دیا۔

”مجھے امید نہ تھی کہ پرشاد اتنا طاقت ور ہوگا۔“  
پدمنی نے وہ دود کے اٹھنے کے بعد کہا۔



تھی۔۔۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی بھیا تک خواب دیکھ رہی ہوں۔۔۔ کوئی۔۔۔ مسز شکنتلا کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ اف!“ اس کے بدن نے جھرجھری سی لی۔ دہشت ہے اس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔

”بلیک بیوٹی۔۔۔! لیکن پرکشش۔“ مجمع میں سے دو چار افراد کی استہزائیہ انداز سے ہنسنے کی آواز آئی۔ گلا اس کا کوئی گھونٹ رہا تھا تو تمہیں چلانے کی کیا ضرورت تھی

”شٹ اپ۔۔۔“ ونود نے گھوم کر کہا۔ ”خواب میں تم اپنی ماں کو قتل ہوتا دیکھو گے تو کیا سکون سے سوتے رہو گے؟“

مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا اور پھر کسی نے ہنسنے اور کھسر پھسر کی کوشش نہیں کی۔ ”ہاں مس امرتا۔۔۔!“

”پلیز۔۔۔ پہلے میری بات سن لیں۔“ وہ کانپتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”خواب سچ بھی تو ہو جاتے ہیں نا۔ میری آنکھ کھلی تو۔۔۔ تو شریعتی شکنتلا دیوی کسی نے ان کا گلا گھونٹ دیا تھا۔“

ونود بات پوری ہونے سے قبل ہی آگے نکل گیا تھا۔ ”کون سا کمرہ ہے اس کا۔۔۔ کیا اوپر والا۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔“ لوگوں میں سے کسی نے کہا۔ ”نیچے والا آخری کمرہ۔۔۔ مولیٰ عورت اوپر نہیں چڑھ سکتی۔۔۔ اسی لیے یہ کمرہ اس نے اپنے لیے مخصوص کیا ہوا تھا۔“

کمال ہے۔۔۔ ونود نے رخ بدلتے ہوئے سوچا۔۔۔ لوگوں کو یہ بات تک معلوم ہے کہ کون کس کمرے میں ہوتا ہے۔۔۔ اسے اپنا کی ہم وزن اور ہم جسامت شکنتلا۔۔۔ کا چہرہ بھی یاد آ گیا تھا۔۔۔ مسز سادھنانے کہا تھا کہ وہ گاؤں کی سب سے دولت مند خیس اور کمین عورت ہے۔

شریعتی شکنتلا دیوی واقعی مریچکی تھی۔۔۔ لیکن اس کی موت سے امرتا کے منحوس خواب کی تعبیر کے مطابق نہیں ہوئی تھی۔ اس کا دھڑمسہری یہ تھا مگر کچھ

خوابوں کی نگری کی طرف بڑھنے لگا۔ جب سکوت شب میں دل خراش چیخوں سے اس کی آنکھ کھلی تو وہ اس کو بھی خواب سمجھا۔۔۔ مگر خواب تو کچھ اور ہی تھا۔ اس نے سوچا پھر اس کی نگاہ کلائی کی گھڑی پر گئی۔۔۔ اسے سوئے ہوئے صرف چالیس منٹ ہوئے تھے۔۔۔ بلیک جھپکتے ہی وہ بستر سے کود گیا۔ پتلون چڑھانے کے بعد ٹیٹس پہنتا ہوا وہ باہر بھاگا۔ دوڑتے دوڑتے اس نے بن لگائے اور ٹیٹس کے لہراتے ہوئے دامن کو پتلون کے اندر کیا۔ پانچ منٹ بعد وہ اس احاطے کے باہر جا پہنچا جہاں قریب سے آنے والے چار پانچ افراد پہلے سے موجود تھے۔ مزید لوگ مختلف سمتوں سے دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔“ ونود نے حیرانی سے کہا ”اندر ایک عورت مدد کے لیے چلا رہی ہے اور آپ لوگ کھڑے سن رہے ہیں۔“ وہ لکڑی کے پھانگ پر سے اندر کود گیا۔ باقی لوگوں نے بھی شرمندہ ہونے کے بعد اس کی تقلید کی۔

”کون رہتا ہے یہاں۔۔۔؟“ ونود نے دوازے پر دستک دیتے ہوئے پوچھا۔

”وہ بڑھپا مسز شکنتلا۔۔۔“ کسی نے جواب دیا۔ ”اس کی جیسی جیسی مدراسن کالی بہو۔۔۔ کنواری بیوہ مس امرتا۔“

ونود نے یہ احمقانہ جواب دینے والے کو گھور کے دیکھا اور دروازے کو ٹکڑی ماری۔ ”دروازہ کھولو۔۔۔ ہم مدد کے لیے آئے ہیں۔“

دروازہ کھل گیا اور ونود نے اپنے مقابل اس سیاہ فام جیسی مدراسن دہلی پتلی لڑکی کو جنس کا محبوب اقوام متحدہ کے امن مشن میں دیت نام جا کر مارا گیا تھا تو اس نے باقی عمر شادی کے بغیر گزارنے کی سوگند کھالی تھی۔ وہ ہسٹریائی انداز میں مسلسل چیخ رہی تھی۔

”مس امرتا ہانپنے لگی۔“ میں۔۔۔ میں سو رہی

انداز سے بولی۔ ”پتا تو درکنار اس کی شکل تک نہیں دیکھی ہوگی۔۔۔ سفید کتو۔۔۔ اب میں ہر روز صبح و شام یہی پیوں گی۔۔۔ کیوں کہ اب میں بہت دولت مند ہوں۔۔۔ تم لوگ مجھے کالی چڑیل۔۔۔ ڈائن کہتے رہتے ہونا۔۔۔ میں سارے سفید کتوں کو خرید سکتی ہوں۔۔۔ سب کو غلام بنا سکتی ہوں۔۔۔ تمہیں اپنی سفید چمڑی پر بڑا ناز ہے نا۔۔۔ تم کتوں کی طرح میرے چرن چاٹو گے۔“ اس نے توقف کر کے ایک قہقہہ مارا اور بوتل منہ سے لگائی۔

دودو کے ہاتھوں نے اس کے ہاتھ سے بوتل چھیننے تک تین چوتھائی بوتل کر دی تھی۔  
 ”تو۔۔۔ تو سفید کتے۔۔۔ تو۔۔۔ تو کون ہوتا ہے۔۔۔ کیا یہ بوتل تیرے باپ کی جو تو چھیننا چاہتا ہے۔۔۔“

دودو کا ایک زناٹے کا تھپڑ اس کے منہ پر پڑا تو وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ گرتے گرتے پتی اور لڑکھڑاکے پیچھے ہٹی تو دیوار سے لگے ہوئے بستر پر جا گری اور اس کا چہرہ غصے سے تپتا لگا تھا۔  
 پھر دودو نے پلٹ کر لوگوں کو دیکھا جو تماشا شائق بنے ہوئے تھے۔

”جاؤ۔۔۔ کوئی کرشن کو جلدی سے بلا کے لاؤ۔۔۔ باقی سب باہر۔“ اس نے چٹکی بجا لی۔  
 ”یہاں کوئی تماشا نہیں ہو رہا ہے۔ سمجھے۔“  
 دودو کے حکمانہ انداز اور سخت لہجے کے سامنے کسی نے لب نہیں کھولے۔ سب کے نکل جانے کے بعد دودو نے دروازہ بند کر دیا۔ امرتا اب بستر پر منجمد بیٹھی تھی۔

”یہ کیا بکواس ہے۔۔۔“ دودو نے اسے مس امرتا کا کہہ کے مخاطب کیا اور برقی سے بولا۔  
 ”تمہیں معلوم ہے۔ یہ سب مل کر کیا کر سکتے ہیں۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ مجھے اندازہ ہے کہ یہ سب میرے خلاف ہوائی دے سکتے ہیں کہ میں قاتل ہوں۔“ امرتا نے سچی سے کہا۔ ”کیوں کہ جانتے ہیں

اوپر کھسک گیا تھا۔۔۔ مسہری کے سزہا نے منقش ستون سے تھے جن کی نقاشی کا نمونہ مسہری کے ہر بائے پر بھی نظر آ رہا تھا۔ شریعتی شکننا دیوی کی گردن عجیب شہم کی لکڑی کے دودھ اوٹنے اور تقریباً تین انچ قطر کے مینار جیسے ستون سے بندھی ہوئی تھی۔ کسی نے پیچھے سے اس کی گردن کے گرد نالکون کی ایک انچ موٹی رسی کا پھندا ڈال کے پھینچ لیا تھا۔۔۔ اسے یقیناً شریعتی شکننا دیوی جیسی بھاری بھر کم عورت کو گھیننے کے لیے خاصی قوت صرف کرنی پڑی ہو گی۔۔۔ قاتل نے بعد میں رسی کو مزید دو بار گردن کے گرد گزارا تھا اور گانٹھ باندھ کے رخصت ہو گیا۔۔۔ دودو نے ایک نظر کمرے پر ڈالی۔۔۔ کارنس پر ڈبل فریم میں دو تصویریں لگی ہوئی تھیں۔۔۔ ایک نسبتاً معمر آدمی کی اور دوسری نوجوان کی۔۔۔ صورتوں کی مشابہت خود بتاتی تھی کہ وہ باپ بیٹا ہیں۔۔۔ دونوں وردی میں تھے۔ شریعتی شکننا دیوی کا پتی اور اس کا بیٹا جو دیت نام کی انجمنی مٹی میں مل گیا۔ باپ کو نہ جانے کس محاذ پر کس زمین کی قبر ملی ہوئی وودو نے سوچا۔

دوسرے کمرے میں کالی لڑکی مس امرتا بھی جج رہی تھی لیکن مدد کی پکار دیوانگی کی انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ وہ روتے روتے اچانک ہنسنے لگی تھی اور اس کی ہنسی کسی دیرانے والی چڑیل کی ہنسی سے زیادہ دہشت ناک تھی۔

دودو نے واپس آ کر ان لوگوں کو دیکھا جو کمرے میں تماشا شائق بنے کھڑے ہوئے تھے اور مس امرتا کی بکواس سن رہے تھے مگر خوف و صدمے کی شدت نے انہیں ذہنی طور پر مفلوج کر رکھا تھا۔ مس امرتا ہاتھ میں شراب کی ایک بوتل لیے دہلیز میں آ کھڑی ہوئی تھی اور بوتل منہ سے لگائے پتی جا رہی تھی۔ ایک بلا نوش کی طرح۔

”دیکھو۔۔۔ یہ دیکھو تمہارے آباؤ اجداد نے کبھی بی۔۔۔ کتنی پتی اور نایاب اور ہزار برس پرانی ہے۔“ وہ بوتل اٹھائے صبح کو مخاطب کرنی استہزائیہ

رات جب میں سونے کے لیے بستر پر دراز ہوتی تھی تو میرے ذہن میں یہی خیالات پرورش پاتے رہتے تھے کہ اسے کیسے ماروں۔۔۔۔۔ یوں تو طریقے بہت تھے لیکن الزام ہر صورت میں مجھ پر ہی آتا تھا۔۔۔۔۔ چنانچہ میں کچھ نہ کر سکی۔ صرف سوچ کے رہ جاتی۔ لیکن خواب میں اسے ہزار بار عذاب دے دے کر دیکھا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر ختم ہو رہی تھی۔۔۔ اور میں اس کی حالت پر رونے لگی رہی ہوں۔“

اب اس پر نشر غالب آنے لگا تھا۔ چنانچہ دود نے اسے بولنے دیا۔ کیوں کہ نشے میں وہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔

”اس وقت بھی میں خواب دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔ یہی خواب کہ اس کا کوئی گلا کھوٹ رہا ہے۔ کوئی سایہ سا ہے جو میرے قریب سے گزرا ہے۔ پھر میں نے اپنا شک دور کرنے کے لیے اٹھ کے دیکھا تو بھگوان نے میری سن لی تھی اور۔۔۔۔۔“

”مس امریتا۔۔۔۔۔! یہ راز کی بات ہے۔“ دود نے درمیان میں اس کی بات کاٹ دی۔ ”ہر طرف خاموشی ہوگی۔۔۔ تم نے آنے جانے والوں کے قدموں کی آہٹ تو نہیں سنی تھی۔۔۔ مگر ذرا سوچو۔۔۔ شریعتی شکنتلا دیوی کے چلانے کی آواز آئی تھی یا کسی اور کی آواز سنی تھی تم نے۔۔۔ جسے تم پھر سنو تو پہچان لو۔۔۔ ذہن پر زور دو۔۔۔ شاید وہ آواز شناسا ہو۔۔۔۔۔ آشنا ہو۔“

امریتا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر اس نے ذہن پر زور دے کر کہا۔

”مجھے صرف ایک بات یاد ہے۔۔۔ وہ بڑا حوصلہ مند شخص تھا۔۔۔ جاتے وقت وہ ذرا بھی نرمی نہیں تھا۔۔۔ کیوں کہ قتل کرنے کے بعد کوئی مزے سے سٹی بجاتا ہوا نہیں جاسکتا۔۔۔ اتنے سکون اور بے خونی سے قتل کرنا۔“ اس نے جملہ نامکمل اور نفی میں سر ہلایا۔

”تمہیں یاد ہے وہ سٹی بر کیا دھن بجا رہا تھا۔“

رادھا۔۔۔ میرا مطلب شریعتی شکنتلا دیوی اس گاؤں کی دولت مند عورت تھی جس نے مجھے اپنا وارث بنا دیا تھا۔۔۔ قانونی طور پر۔۔۔ اس کا وصیت نامہ وکیل کے پاس ہے۔۔۔ ایک روز اس نے اس خبیث عورت کے ظلم و ستم سے نفرت کرتے ہوئے مجھے رازدارانہ انداز سے بتایا اور سوگند لی کہ میں بیراز عیاں نہ کروں۔۔۔ اور اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کی دولت پر قبضہ کرنے کے لیے بہت جلد کر دیتا۔۔۔ جو میں نہ کر سکی تھی۔“

”مسز شکنتلا کا وصیت نامہ یا تحریری وراثت نامہ کس کے پاس ہے۔“ دود نے سوچتے ہوئے دریافت کیا۔

”وکیل کے پاس۔۔۔ اب بڑھیا مر گئی ہے تو میں اس علاقے کی سب سے دولت مند عورت ہوں۔“ وہ پھر ہسٹریائی انداز سے ہنسی۔ ”میں نہ صرف کروڑ پتی عورت ہوں بلکہ اس گاؤں کی معزز ترین۔۔۔ جس کے پاس اتنی زیادہ دولت ہوگی وہ اتنی ہی معزز کہلاتی ہے۔۔۔ میں بلیک بیوٹی ہوں۔ کنواری بیوہ۔۔۔ کالی چڑیل۔۔۔ ڈائن۔۔۔ منخوس۔۔۔ آج بلکہ ابھی اور اسی وقت سے یہ سارے خطابات ختم۔“

”میں نے سنا تھا کہ بڑھیا تم سے سخت نفرت کرتی تھی اور اس نے تم پر ظلم و ستم کے بہت پہاڑ توڑے ہیں۔۔۔ تمہارا بچپنا حرام کیا ہوا تھا۔“

”آپ نے ٹھیک سنا۔۔۔ اس میں رقی بھر مبالغہ نہیں۔۔۔ اس لیے کہ کوئی شخص ایسا نہیں جو اس چڑیل کے ظلم سے واقف نہ ہو۔۔۔ بچہ بچہ بھی بتا سکتا ہے۔۔۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ اس نے اپنی تمام دولت مجھے آسانی سے بخش دی۔“ پھر وہ ہنسی۔

”اس کمینے نے مجھے رلا رلا کے۔ تڑپا تڑپا کر۔۔۔ ذلیل کر کے میرے ساتھ کتوں سے چھی کہیں بدتر سلوک کر کے مجھے اس دولت کی زنجیر سے باندھ رکھا۔۔۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اسے قتل کر دوں۔ ہر

وندو نے حیران ہوئے بغیر کہا۔

سے نکلی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”اس وعدے کے بعد کہ پارٹی میں تم سے بات بھی نہیں کروں گی۔۔۔“ میری یہ بات تم یاد رکھنا گویا۔۔۔“ اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔

”یہ کتنی بڑی سزا ہے میری جان مونہ۔۔۔! میں اور تم اتنے پاس رہ کر بھی دور ہیں۔۔۔ کیوں کہ ہمارے درمیان جو سماج حائل ہے وہ محبت کرنا جانتے ہی نہیں۔۔۔ جو صرف نفرت کر سکتے ہیں۔۔۔ معلوم نہیں اس زندگی کی ایک غلطی کا عذاب کب ختم ہوگا۔“ ”میں نے تمہیں چاہنے کے سوا کوئی غلطی نہیں کی ہے گویا۔۔۔!“ وہ سرگوشی میں آہستہ سے بولی۔ ”ہمارے ہاں محبت کرنا کیوں جرم ہے۔“ گویا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ گویا دو دنوں ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھے اندھے سمندر کو دیکھتا رہا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چاہت کا ایک ہی جذبہ امرت رس بن جاتا ہے اور زہر کا پیالہ بھی۔۔۔ ایک عورت وہ بھی تھی جس کی چاہت کے فریب میں گویا نے جذبات کی سرحدوں کو عبور کر کے مذہب، رسم و رواج اور قانون کے تقاضے پورے کئے تھے اور شادی کے چند ماہ بعد اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ تہی دست رہ گیا ہے۔ نہ اس کے پاس باپ کی چھوڑی ہوئی دولت تھی اور نہ بیوی کی محبت جو اسی دولت کے دم سے زندہ تھی۔ پھر اس پر حقائق کا ہر انکشاف ظلم کا پہاڑ بن کے ٹوٹنے لگا۔ اسے معلوم ہوا کہ اتنی خوب صورت اور پرشباب گداز بدن کی نظر آنے والی شعلہ جسم اور ایسی خوب صورت پیار بھری باتیں کرنے والی بیوی کتنی بڑی اداکارہ ہے۔۔۔ وہ ایسی ہی محبت پہلے بھی اپنے دوسابق شوہروں سے کر چکی تھی۔ چنانچہ محبت کے مکالمے اسے ازبر ہو چکے تھے۔

گویا کو بہت کچھ پہلے ہی معلوم ہونا چاہیے تھا۔۔۔ مثلاً یہ کہ جب دولت نہ رہے گی تو وہ بیوی کے اخراجات کا بار کیسے ادا کیوں اٹھائے گا۔۔۔ قیمتی

”ہاں۔۔۔ ہاں مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔۔۔ اس لیے کہ اس کے لبوں پر میری کہانی کا گیت تھا۔“ امرتا تھی۔ ”میں زمین کی شہزادی ہوں نا۔۔۔ اور تم۔۔۔ چاند کے شہزادے ہو۔۔۔ وہ میرا اور تمہارا گیت تھا۔۔۔ آؤ، میرے پاس آ جاؤ۔“ اس نے اپنی مرمریں گداز اور عریاں بائیں پھیلا دیں۔ ”میں صدیوں سے، برسوں سے تمہارے انتظار میں ہوں۔۔۔ چاند کے شہزادے۔۔۔“

کرشن دروازے پر نمودار ہوا اور زیر لب مسکرایا۔ ”اور کچھ بتایا زمین کی کالی شہزادی نے۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ آپ کا کام ذرا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔“ وندو نے اپنی متانت برقرار رکھی۔ ”آپ کا واسطہ کسی ایک ہی قاتل سے ہے جو انتہائی چالاک ہے۔ بظاہر معصوم مگر بے حد سفاک۔۔۔ یہ سارے خون اس ایک آدمی نے کیے ہیں۔“ ”یہ تو خاصی کام کی بات معلوم ہو گئی۔“ کرشن کے لہجے میں طنز بھرا ہوا تھا۔ ”آپ اس شخص کا نام بھی بتادیں تاکہ میں اسے گرفتار کر لوں۔“

☆☆☆

گاڑی سمندر کے ساحل پر پہنچ کر رک گئی۔ ان کے لیے یہ جگہ مناسب تھی۔ اب تک ان دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ کار کا انجن بند ہو جانے کے بعد رات کے دھندلے اور سنائے میں سمندر کی جھاگ اڑاتی موجوں کا شور تیز ہو گیا تھا۔ غم آلود خشک ہوا اس کے بال اڑانے لگی تھی۔ اس نے ریشم کے کالے بادلوں جیسے ڈھیر کو پیچھے کیا اور اس کا رخ سے باندھ لیا۔۔۔ گویا اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک سرد آہ بھری۔

”یوں لگتا ہے جیسے تمہیں ایک ہفتے بعد نہیں بلکہ ایک صدی بیت جانے کے بعد دیکھا ہے۔“ ”گویا! میں جھوٹ بول کر باری کے بہانے

زندگی پر موت کو ترجیح دیں گے۔۔۔ گوپال نے طلاق کے لیے بیوی سے بات کی۔۔۔ لیکن حقیقت کا علم ہوتے ہی وہ اڑ گئی کہ طلاق کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ وہ جو اسے خوش کرنی اور کسی بات سے انکاری نہیں ہوتی ہے۔۔۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ اس کا اپنا ازدواجی مستقبل پر باد ہو چکا تھا۔ اور وہ اس کا بدلہ ایسے ہی لے سکتی تھی کہ گوپال کسی کے ساتھ اور کسی کو گوپال کے ساتھ آباد نہ ہونے دے۔ وہ گوپال کے ساتھ رہتے ہوئے ایک اجنبی عورت بن گئی تھی۔ اس کے جذبات اور احساسات تک کا خیال نہیں کرنی تھی۔۔۔ اور پھر وہ ایسے جلوے دکھائی کہ گوپال اسے ہانے کی حسرت کی آگ میں جلتا رہے۔ اس لیے بھی کہ وہ شعلہ جسم تھی۔ اگر اس کی زندگی میں مونا نہیں آئی ہوتی تو وہ بیوی کے قرب اور حشر سامانیوں سے احساس محرومی میں مبتلا ہو جاتا۔ وہ چاہتا تھا کہ جتنا جلد ہو سکے مونا اس کی جیون ساتھی بن جائے۔۔۔ چھپ چھپ کر ملنا ان دونوں کو پسند نہیں تھا۔ نہ ہی وقت گزاری۔

دو ماہ کے بعد مونا کے کہنے پر اس نے وکیل سے رابطہ کیا۔ مشورہ کیا تو اسے مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس نے اپنی لالچی بیوی سے آزادی خریدنے کی کوشش کی مگر وہ گھر سے جا چکی تھی۔ گوپال اسے ساری دنیا میں کہاں کہاں تلاش کرتا۔۔۔ وہ دل شکستہ لوٹ آیا۔ مونا کو قائل کیا جا سکتا تھا۔ دنیا اور عدالت کو نہیں۔۔۔ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنا جرم تھا۔۔۔ عجیب قانون تھا کہ کسی غیر عورت سے تعلقات رکھنا اور میاں بیوی کی طرح رہنا شادی جیسا جرم نہیں تھا۔ اس کی وہ سزا نہیں تھی جو دوسری شادی کرنے پر تھی۔

مونا گاؤں کی لڑکی تھی۔ فلم کی ہیروئن نہیں۔۔۔ اس نے گوپال سے ملنا چھوڑ دیا تو گوپال تقریباً پاگل ہو گیا۔۔۔ لیکن اس جدائی نے خود مونا کے لیے زندگی کو روک بنا دیا اور وہ چھپ چھپ کر

ملبوسات۔۔۔ سامان آرائش اور زیورات۔۔۔ ٹائٹ کلب۔۔۔ ریس اور جوئے خانوں۔۔۔ عالمی ہوٹلوں اور سیر و تفریح کے اخراجات جس کے لیے قارون کا خزانہ بھی بالآخر کم ثابت ہوتا۔۔۔ اور جب یہ اخراجات نہیں ہوں گے تو صرف محبت نہیں ہو گی۔۔۔ بیوی سر دلاش کی طرح اپنے آپ کو حوالے کر دے گی اور اس کی محبت، مہربانی اور فیاضی رخصت ہو جائے گی۔ محبت کا گہرا جذبہ تو درکنار اس کی رتق بھی نہ ہو گی۔۔۔ بیوی کی محبت اور قربت ایک ایسی دولت ہوتی ہے جو ان کو سرور اور شانتی بخشتی ہے۔

بیوی کو خواب ناک زندگی نہ دینے کی صورت میں وہ صرف نام کی بیوی ہو گی اور اس کے حسن کے پرتار ہوں گے جو اس کی مصروفیات کا سلسلہ دراز کرنے کی ذمہ داری قبول کر لیں گے۔۔۔ وہ قانوناً بیوی کا کہیں آنے جانے پر اور کسی سے ملنے پر کوئی پابندی عائد نہ کر سکے گا اور پھر اس دور میں بیوی روایتی اور ڈگر پر چلنے والی نہ رہی تھی۔

اختلافات کے ایک برس بعد وہ مونا سے ملا تھا اور چھ مہینے تک اس عشق کی صداقت کو ہر پیمانے پر آزمانے کے بعد یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ مونا سرباب نہیں۔۔۔ درحقیقت زندگی کے صحرا میں اس نخلستان تک آ گیا ہے جہاں مرادوں کی منزل ہوتی ہے اور اس میں عافیت بھی ہے۔ اس نے مونا سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔۔۔ کیوں کہ بعد میں اسے یہ بات معلوم ہوئی تو اعتماد کا آئینہ ٹوٹ کے بھر جاتا۔۔۔ مونا اس کا درد سمجھ لینے کے بعد اس کا درماں بن گئی۔

دوسرے لوگ صرف انگلیاں اٹھانا جانتے تھے اور دوسروں کی آنکھ میں تنکا تلاش کرنے سے پہلے اپنی آنکھ کا شہیر دیکھنا نہیں جانتے تھے۔ بچے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ گئے۔۔۔ مونا کے والدین نے پرانا حربہ استعمال کیا اور مونا کو دھکی دی کہ اس نے ایک شادی شدہ مرد سے معاشرت نہ چھوڑا وہ بے عزتی کی

گوپال سے ملتی رہی۔ تاہم اس میں گھر سے فرار ہونے کی جرات پیدا نہ ہو سکی۔

”گوپال۔۔۔!“ موتا نے پیکراں سمندر کی دولت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ماں بننے والی ہوں۔۔۔ جس کا خوف، اندیشہ اور خدشہ تھا۔ ان ملاقاتوں کا یہی نتیجہ نکلنے والا تھا۔۔۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ آئے دن کی تہائی میں ملاقاتیں رنگ ضرور لائے گی۔ لیکن کہتے تھے کہ موتا۔! کیا کروں۔۔۔ میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔۔۔ میری اس محبت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔۔۔ میل نہیں ہے۔۔۔ جنگ اور محبت پر بات جائز ہو جاتی ہے۔۔۔ میں بھول جاتا تھا کہ ہم دونوں میاں بیوی نہیں۔۔۔ تمہارا حسن، جوانی اور شباب۔۔۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہوں۔۔۔ میں بیوی سے طلاق لے کر جتنا جلد ہو سکے ایک ہو جائیں گے۔ لیکن جو سوچا وہ نہ ہو سکا۔ تم تمام حالات سے باخبر ہو۔۔۔ اب کیا ہوگا میری جان گوپال!

گوپال نے چونک کر اسے اوپر سے نیچے اور اس کے چہرے کو دیکھا۔۔۔ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکا اور یوں دیکھنے لگا جیسے وہ اس کے الفاظ کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔۔۔ موتا ماں بننے والی ہے۔۔۔ ایک بچے کی ماں۔۔۔ میرے بچے کی ماں۔۔۔ اس بچے کی ماں جس نے میری بیوی کے لطن سے جنم لینا قبول نہ کیا۔۔۔ اس نے موتا کا چاند جیسا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا۔

”موتا۔۔۔! پانی سر سے اوپر گزر چکا ہے۔ دیکھو موتا۔! اب ہم اس دنیا میں نہیں رہ سکتے۔۔۔ کیوں کہ یہ دنیا ہمیں جینے کا حق نہیں دے گی۔ نہ تمہیں اور نہ مجھے اور نہ ہمارے بچے کو۔۔۔ چلو ہم یہاں سے دور بہت دور چل کر بسا لیتے ہیں ہم گنہ گار ان فرشتوں کی دنیا سے جو اسے اپنی جنت سورگ اور جانے کیا کیا سمجھتے ہیں۔۔۔ جن کے ہاتھوں میں پتھر ہیں۔ اگر دنیا ہمیں سنگسار کرتی ہے تو کرے۔۔۔ ہم

ایک ساتھ تو مریں گے۔۔۔ موتا! اب انکار کا وقت نہیں رہا ہے۔۔۔ وقت جو کسی کا نہیں ہوتا ہے۔۔۔ وہ اندھا ہوتا ہے۔۔۔ بس گزرتا ہے اور گزرتا چلا جاتا ہے۔۔۔ بولو اب تم کیا کہتی ہو۔۔۔؟“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔ وقت کبھی مہلت نہیں دیتا ہے۔ اب اس کی گنجائش نہیں رہی۔“ موتا نے جذباتی ہو کر ایک سرد آہ بھری۔ ”چلو۔۔۔ تم۔۔۔ جہاں کہو گے میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری بیوی لوٹ آئے۔“

”وہ بھی نہیں آئے گی۔ کیوں آنے لگی۔ کیوں کہ وہ اپنا حسن و شباب اور بھرپور جوانی اور حسرت سناپنا کیش کراتی پھر رہی ہے۔۔۔ وہ ایک طوائف سے بھی بدتر بن کر بستر دل کی زینت بن رہی ہوگی۔۔۔ اس کے وجود میں بے پناہ غلاطت ہوگی۔۔۔ میرے خیال میں تو ایک طوائف بھی بہتر ہوگی۔۔۔ اسے طوائف نہیں کتیا کہنا چاہیے۔۔۔ گلی کی پالتو کتیا۔“

موتا نے اس کے سینے پر اپنا سر رکھ کے آنکھوں کو پلکوں کے درمیان سے بند کر لیا۔ وہ ان جانے سپنوں کی دنیا میں دور، بہت دور چلی گئی جہاں اس کا اپنا گھر ہوگا۔۔۔ گوپال صرف اور صرف اس کا ہوگا۔ ان کا بچہ دل کی ٹھنڈک اور آنکھوں کا تارا ہوگا۔۔۔ اور پھر وہ نئی زندگی ہوگی۔۔۔ ایک نیا جیون۔۔۔ وہ جیون جو ایک عورت چاہتی ہے۔۔۔ وہ چاہتی ہے۔ وہ سپنوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ تھوڑی دیر کے بعد اس کے سپنوں کا رنگ بگڑ گیا۔۔۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔ ہوا کے ساتھ جو کسی کے واضح طور پر سیٹی بجانے کی آواز آتی تھی اس سے وہ سپنوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ گئی تھی۔

موتا نے گوپال کے سینے سے سراٹھا کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”گوپال۔۔۔! یہ کون ہے۔۔۔؟ کون سیٹی اتنی تیز بجا رہا ہے۔۔۔“ موتا نے کہا۔

”معلوم نہیں۔۔۔ سارا گاؤں تو جشن میں

شریک ہے۔“ گوپال نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔

”جب میں بہت چھوٹی تھی میری ماں مجھے پر یوں، جن بھوتوں اور راج کماروں کی کہانیاں سناتی تھیں۔“ مونتا نے پھر اس کے چوڑے چکلے اور مضبوط سینے پر اپنا خوش نما سر رکھ دیا۔ خاموش آنسو اس کے رخساروں پر سے ہوتے گوپال کی قمیص کے گریبان کو تر کر رہے تھے۔ ”مجھے ان پر یوں کی اور دوسری کہانیوں کے مقابلے میں یہ گیت مجھے بے حد پسند تھا اور میں ماں سے کئی بار سنتی تھی۔۔۔ جاند کا شہزادہ اور زمین کی شہزادی۔۔۔ ان دونوں کا مرن کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ یہی پوچھنا تھا شہزادی نے۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ اور شہزاد نے کہا تھا۔۔۔ جاند بھی تو زمین کا ٹکڑا ہے۔“ گوپال نے آنکھیں بند کر کے مونتا کے جسم سے اٹھتی ہوئی خوشبو سے مسحور ہو کر کہا۔ ”یہ گیت مجھے بھی بہت پسند تھا۔۔۔ وہ بھی مٹی ہے۔۔۔ یہ بھی مٹی ہے۔۔۔ بھگوان نے انسانوں کو اور ہمیں بھی مٹی سے بنایا ہے۔۔۔ چلو ہم اوپر چلے جائیں۔۔۔ آکاش پر جہاں ستارے ہوتے ہیں اور جہاں جسموں کا نہیں آتماؤں کا ملاپ ہوتا ہے۔“

”مگر گوپال۔۔۔! یہ کوئی ہمارے تعاقب میں تو نہیں آیا ہے۔۔۔“ مونتا نے آنکھیں کھول کے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”میں دیکھتا ہوں کہ یہ کون ہے۔۔۔“ گوپال نے دروازہ کھول کے باہر نکلنا چاہا۔ سٹی بجانے والا واقعی بہت قریب آ گیا تھا۔

”نہیں گوپال۔۔۔! مجھے اکیلا چھوڑ کے مت جاؤ۔۔۔ ہو گا کوئی پائل۔۔۔ چلا جائے گا۔“ مونتا نے اسے روک لیا۔

لیکن گوپال نے دیکھ لیا تھا کہ ریت کے ٹیلے پر ان سے چند گز دور ایک سایہ سا نمودار ہو گیا ہے۔۔۔

اس نے مونتا کے گالوں کو تھپ تھپایا۔

”میں کہیں نہیں جا رہا ہوں۔۔۔ اس میں ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی کیا بات ہے۔۔۔ یہ

وہی ہوگا۔۔۔ پرشاد۔“

اس نے دلاسا دیا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ ریت پر چلتا ہوا گوپال اندھیرے میں دور ہو رہا تھا اور پھر مونتا کا دل ڈوبنے لگا۔ ایک ان جانی اس سے کہہ رہی تھی۔

”مونتا۔۔۔! تو نے اسے جانے نہ دیا ہوتا تو اچھا تھا۔۔۔ جانے والوں کا کیا ہے۔۔۔ اگر وہ لوٹ کے ہی نہ آئیں۔۔۔“ مونتا ہڈیانی لہجے میں چلائی ”گوپال۔۔۔! گوپال۔۔۔!“ آنکھیں پھاڑ کے اس سمت دیکھنے لگی جدھر گوپال گیا تھا۔

اس نے دیکھا۔ مگر گوپال ریت کے ٹیلے پر ایک دھبسا رہ گیا تھا۔ مونتا کا دل سینے میں دم توڑنے لگا۔ وہ کار سے نیچے اتر آئی۔

سٹی اب بھی سنائی دے رہی تھی۔۔۔ ذرا سی دیر کے لیے مکمل خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔۔۔ جس میں کوئی صدا نہ تھی۔۔۔ نہ سمندر کی پکار۔۔۔ نہ دل کی دھڑکن۔۔۔ نہ آواز۔۔۔ بس موت کا سا ہولناک سناٹا۔

وہ تیز تیز قدموں سے اوپر چڑھنے لگی۔۔۔ اس کا سانس اپنے جسم کو۔۔۔ اور اس جسم کے اندر پرورش پانے والے وجود کو گھسیٹتے ہوئے پھول گیا۔

”گوپال۔۔۔!“ وہ پھر چلائی۔ اس کی سابقہ ہڈیانی چیخ سے کہیں تیز اور اونچی تھی۔

مگر آسب زدہ سکوت برقرار رہا۔ ٹیلے پر پہنچتے ہی مونتا نے اسے دیکھ لیا۔

وہ ریت پر بالکل سیدھا لیٹا ہوا تھا۔۔۔ مونتا ایک چیخ مار کر بھاگی اور دوسری طرف اترنے لگی۔ ریت اس کے پاؤں پکڑ رہی تھی۔ زنجیر ڈال رہی تھی۔ آگے مت جاؤ۔۔۔ آگے مت جاؤ بے وقوف لڑکی۔۔۔ آگے کچھ نہیں ہے۔۔۔ گوپال بھی نہیں ہے۔۔۔ ٹھوکر کھائی۔ تو ازن قائم نہ رکھ سکی تو گری۔

پھر مٹی۔۔۔ لیکن اس سے کچھ حاصل نہ تھا۔ خون گوپال کے سینے سے اب بھی بہہ رہا تھا اور ریت میں جذب ہو رہا تھا۔

”گوپال۔۔۔ گوپال۔۔۔“ وہ دیوانہ وار چیخنے لگی۔ ”تم جھوٹے ہو۔۔۔ دعا باز ہو۔۔۔“ فرہی ہوا ابھی چند منٹ پہلے تم نے یہ جھوٹ کیوں بولا تھا۔۔۔ تم نے مجھ سے ابھی کہا تھا کہ ہم ایک ساتھ مریں گے۔۔۔ کیا تم نے مجھ سے یہ سچ کچھ نہیں کہا تھا۔۔۔ وہ اسے بری طرح جھجھوٹنے لگی تھی۔ پھر معاف اس کی نظر نے فرشتہ اجل کو دیکھا۔۔۔ وہ کھڑی ہو گئی اور اس کے سینے میں سانس دھکنی کی طرح چل رہی تھی۔

”تم نے مارا ہے نا اسے۔۔۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھتی کہ کیوں۔۔۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔۔۔ تم۔۔۔ تم موت کے فرشتے ہونا۔۔۔ تم نے ہی ان سب کی جان لی۔۔۔ میں تم سے نہیں پوچھتی کہ کیوں۔۔۔ بوڑھے مسٹر فین کی۔۔۔ سوراخ کی اور شریعتی شکنتلا دیوی کی۔۔۔ تمہارا یہی کام ہے۔۔۔ میرا بھی کام کر دو۔۔۔ پلیز! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔۔۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی زندہ رہنا نہیں چاہتی ہوں۔۔۔ یہ زندگی بھی لے لو۔۔۔ اس لیے کہ اب اس کا کوئی مصرف نہیں رہا۔۔۔ جینا بھی تو ایک عذاب سے کم نہیں رہا۔“

لیکن موت کا فرشتہ اس کی بات نظر انداز کر کے پلٹا اور سیٹی بجاتا ہوا بے نیازی سے چلا گیا اور وہ اسے ایک ساعت تک جاتا ہوا دیکھتی رہی تھی۔

”چلو۔۔۔ ہم اور اوپر چلیں۔۔۔ اور اوپر چلے جائیں۔ آکاش پر جہاں ستارے رہتے ہیں۔۔۔ اور جہاں جسوں کا نہیں روحوں کا ملاپ ہوتا ہے۔۔۔ یہ ملن ابد تک رہے گا۔۔۔ رہتا ہے نا۔۔۔“

سیٹی کی آواز دور ہوتی ہوئی معدوم ہوتی گئی۔ اس کی درد بھری آواز بھی۔۔۔ التجا بھی۔۔۔ فرشتہ اجل کو متاثر نہ کر سکی۔

وہ آہستہ آہستہ واپس چلنے لگی۔۔۔ وہ بھی چلا گیا۔۔۔ موت کا فرشتہ بھی چلا گیا۔۔۔ خیر میں خود

اس کے پاس پہنچ جاتی ہوں۔ اس کے سوا چارہ نہیں۔ کار میں بیٹھ کر اس نے کنکیشن میں لگی چابیوں کو دیکھا۔ اسے ڈرائیونگ نہیں آتی تھی۔ مگر اس نے لوگوں کو اور گوپال کو کار چلاتے دیکھا تھا۔ اور دیکھتی رہتی تھی۔۔۔ چابی کھماتے ہی سویا ہوا انجن بیدار ہو گیا۔ اب۔۔۔ ہاں کچ۔۔۔ پھر گیر۔۔۔ کار ایک زبردست جھٹکے سے آگے بڑھی۔۔۔ مونہ نے اسٹیرنگ وہیل کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور ایک پاؤں سے اسٹیل پٹر دیانی مگنی۔ اتنا تو بہر حال اس کے علم میں تھا کہ رفتار کیسے بڑھانی جانی ہے۔۔۔ روکنے کا مسئلہ سرے سے تھا ہی نہیں۔۔۔ اور کار کے دائیں بائیں لہرانے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔۔۔ یہاں کون تھا۔۔۔ جو تصادم سے ٹوٹے۔۔۔ سمندر۔۔۔ سمندر کہاں وقتا ہے اس کی آغوش میں پناہ ہے اس کے دل میں بڑی جگہ ہے۔ گناہ گاروں کے لیے بھی۔

کار بے قابو کے انداز میں پانی میں اتری۔۔۔ موجوں نے بڑھ کے مونہ کا سوا گت کیا۔ مگر کار رک گئی تھی۔۔۔ پانی مونہ پر چھینے اڑاتا گزر رہا تھا۔ مونہ نے بالوں پر سے اسکارف کھولا۔۔۔ گردن کو اسٹیرنگ پر رکھا اور پھندا بنانے کے اسکارف کو باندھ دیا۔۔۔ یوں کہ وہ جتنا گردن چھڑانے کی کوشش کرے پھندا اتنا ہی سخت ہوتا جائے۔۔۔ اس نے ایک بار پھر چابی گھمائی۔ انجن آخری بار پھڑ پھڑایا۔۔۔ اور کار خود کشی کے لیے گہرائی میں کود گئی۔۔۔ پانی اب مونہ پر سے گزر رہا تھا لیکن کار کی چھت پر سے نہیں۔۔۔ جب سوچ گزر جاتی تھی تو چھت پر دکھائی دینے لگتی تھی۔۔۔ چنانچہ گھنٹہ بھر بعد جب آخر شب کا چاند طلوع ہوا تو اس کی مدھم روشنی میں ایک ماہی گیر نے دیکھا کہ کل تک جہاں صرف ریت تھی وہاں ایک چٹان سی نظر آنے لگی ہے۔ اس نے کوئی دو تین مرتبہ آنکھیں مل کر دیکھا کہ یہ اس کا واہمہ نہ ہو۔۔۔ یہ واہمہ نہ تھا۔ وہ حیران ہو کے آگے بڑھا۔



ہے۔ پیشہ ور مجرم سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ اس کا اندازہ یوں ہوتا تھا کہ اس نے کہیں کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا ورنہ ہر قل اپنا وجود کسی نہ کسی طرح نام و نشان چھوڑ دیتا ہے۔

کرشن کی حالت سب سے خراب تھی۔ وہ ذہنی انتشار کا شکار تھا۔ اتر حالت پر قابو اسے بڑا دشوار تھا۔۔۔ کیوں کہ جسے ایک قاتل کا نہیں بلکہ تین قاتلوں کا پتا چلانا تھا یا تینوں کو قتل کرنے والے ایک شخص کا۔۔۔ مگر اس کی ہر کوشش کا نتیجہ ابھی تک صفر ہی تھا۔ اس کی صلاحیت اور ساری قابلیت دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ اس کا دماغ معطل سا تھا کہ یہ وارداتیں معمہ کیوں بن گئی ہیں۔

وہ مزید اس لیے بھی پریشان ہو رہا تھا کہ اس کی بائیس سالہ ملازمت کا ریکارڈ خراب ہو رہا تھا۔۔۔ اور پولیس کی نوکری جسے وہ اب تک حلوہ سمجھتا آیا تھا لوہے کے چنے چبوا رہی تھی۔۔۔ لوگ ہر جگہ اور ہر وقت زبان سے یا آنکھوں کی زبان سے پوچھتے رہتے ہیں کہ تم کیا کر رہے ہو۔۔۔ ہماری سلامتی کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ ہم اس لیے ٹیکس دیتے ہیں کہ قانون ہمارا محافظ ہے اور ہماری جان و مال خطرے میں لگ رہی ہے۔ کرشن کے پاس خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ لوگ اب رات کے وقت باہر نہیں نکلتے تھے۔ گھروں کے دروازے سرشام ہی بند ہو جاتے تھے اور اس کے باوجود چاند نگر کے رہنے والے ایک ان جانے قاتل کے خوف سے رات بھر کروٹیں بدلتے تھے۔۔۔ ہر آہٹ برہم جاتے تھے اس لیے وقت آنے والے مہمانوں کو بھی فرشتہ اجل سمجھ کر ڈر جاتے تھے۔ اس فضا میں دیوالی کی خوشیاں بھی ماند پڑ گئی تھیں تو یہ ایک قدرتی امر تھا۔

وہود کا موڈ اب اتنا آف ہو گیا تھا کہ وہ اس غیر مہذب اجتماع سے نکل جانا چاہتا تھا۔ چناں چہ وہ معمولی سے حادثے کو حماقت کا بدترین مظاہرہ سمجھ کے دند پر دل کھول کر ہنس رہے تھے۔۔۔ اور فقرے

دندان جاہل دیہات کے رہنے والوں کے لیے تماشا بننا ہوا تھا جو شہر کے رہنے والے کو مسخرے کی طرح فرش پر منہ کے بل گرتے دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے تھے اور ہنس ہنس کے بے حال ہو رہے تھے۔ جیسے کسی فلم کا مزاحیہ منظر ہو۔۔۔ وہ کوئی مزاحیہ کردار ہو۔

گاؤں کے واحد ڈانس ہال کے فرش پر لیٹا ہوا وود سوچ رہا تھا کہ یہ حرکت کسی کی ہو سکتی ہے۔۔۔ شوقیہ اور محض تفریح کے لیے فلمی ذہن پر رقص ہونے لگا تو وہ بھی شامل ہو گیا تھا۔ رقص کے دوران کسی نے اس کی ٹانگوں میں اپنی ٹانگ اڑائی تھی اور وود کو سنبھلنے اور توازن قائم رکھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔۔۔ اسے سریندر پر شبہ تھا جو پدمنی کو مسلسل ہم رقص دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔ لیکن سسر سادھنا بڑی چالاکی سے وود کی مدد کر رہی تھی اور دیوالی کے پرسترتہوار کا رقص رقابت کا ایک دلچسپ کھیل بننا ہوا تھا۔

سریندر، ہجوم سے دور نکل گیا تھا چنانچہ وود اس شبہ کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ پدمنی اپنی خفت پر قابو پانے کی کوشش میں ناکام تھی۔ وود نے تمام دہلی کے رہنے والوں کی عزت خاک میں ملا دی تھی۔۔۔ مگر ہوا کیا تھا۔۔۔ وود بہت اچھا رقص کر رہا تھا۔۔۔ پھر یہ اچانک اس کے قدم کیوں اکھڑ گئے۔۔۔ اس نے وود کو سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر وود خود ہی کپڑے جھاڑتا اٹھ کھڑ ہوا۔

جشن مسرت آدھی رات بیت جانے کے بعد زور و شور سے جاری تو رہا تھا لیکن اس میں وہ گرم جوشی اور شباب اور جنون نہیں تھا۔ اس لیے کہ چاند نگر میں یہ پہلی دیوالی تھی جو خوف و ہراس کی فضا میں آئی تھی۔ گاؤں کے بعد دیگرے تین کل ہو چکے تھے اور بظاہر ان تینوں کا آپس میں کوئی رشتہ نہ تھا۔ ہر شخص خود کو دست قاتل کا اگلا شکار سمجھنے میں حق بجانب تھا۔۔۔ وہ کوئی جنونی تھا یا دیوانہ۔۔۔ مگر یہ بات سب ہی سمجھتے تھے کہ وہ بے حد چالاک بھی ہے۔۔۔ عیار بھی

چست کر رہے تھے۔۔۔ بد قسمتی یہ کہ ونود کے ساتھ گاؤں کی کوئی لڑکی نہیں خود پدمی ہی ورنہ الزام شاید کسی دیہاتی لڑکی پر آ جاتا۔ بہت ساری لڑکیاں حسن و شباب کا نادر نمونہ بھی تھیں۔

ونود برانہ مانتے اور بدستور محور رقص رہنے کی کوشش میں بدستور تماشا بن رہا تھا اور اسے تماشا بنانے والوں میں سریندر پیش پیش تھا جس کے جملے بعض اوقات غیر شائستہ ہو جاتے تھے۔۔۔ مگر ونود کے لیے رقص کے بجائے بالنگنگ یا جوڈو کا مظاہرہ دہلی والوں کی رہی سہی ناک کٹوا دینے کے مترادف ہوتا۔۔۔ چنانچہ وہ غیر محسوس انداز سے دروازے کی طرف کھسکتا چلا گیا کہ نظر بچا کے نکل جائے۔

بوڑھے اب باپ رہے تھے یا پھر تھک کے بیٹھ چکے تھے۔۔۔ مگر پچاس کے قریب نوجوان جوڑے بڑی مستقل مزاجی سے رات بھر ڈانس کرنے کے ارادے پر عمل پیرا تھے۔ لڑکیاں زیادہ پر جوش تھیں۔۔۔ چوں کہ دیوالی کا دن تھا اس لیے وہ بہک اور چمک رہی تھیں۔ جیسے ان کے والدین اور سرپرستوں نے مہلی چھوٹ دے رکھی ہو۔۔۔ اور پھر ان کی خواہش تھی کہ لڑکے انہیں جیون ساتھی چن لیں۔ انتخاب کے لیے یہ سنجیدہ موقع تھا۔۔۔ لڑکیاں خصوصی طور پر تیار ہو کر آئی تھیں اور وہ لڑکوں سے بہت زیادہ فری ہو رہی تھیں۔ ان کی بے تکلفی نے لڑکوں کو مائل اور متاثر کر دیا تھا۔

ونود نے پدمی کو بتا دیا تھا کہ ایسی کی تیسری مقابلہ رقص کی۔۔۔ وہ واپس جا کے سوئے گا۔۔۔ روئے گا اپنی عقل پر اور تقدیر پر بھی۔ مگر عین وقت اس وقت جب ونود دروازے سے نکلنے والا تھا اس کے کندھے پر کس نے ہاتھ رکھا۔ ونود نے پلٹ کے دیکھا تو اسے کرشن کا وحشت زدہ چہرہ نظر آیا۔

”مسٹر ونود۔۔۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔۔۔“

”آپ کا معاون اور دست راست آپ کا بیٹا ہے۔“ ونود نے غرا کر کہا۔ ”مسٹر سریندر۔۔۔ وہ

دیکھو مسز سادھنا کے ساتھ رقص کر رہا ہے۔“

”پلیز۔۔۔۔۔ مسٹر ونود!“ کرشن نے نرمی سے کہا۔ ”یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔۔۔ وہ نا تجرب کار ہے۔“

کرشن کے لہجے میں ایسی کوئی بات تھی جس نے ونود کو سوچنے اور خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ وہ چند ساعتوں تک اس کی شکل دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پھر وہ پدمی سے معذرت کر کے کرشن کے ساتھ باہر آ گیا۔

”کیا بات ہے مسٹر کرشن۔ آپ بہت ہی پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔“

”بات۔۔۔ بات تو صرف اتنی سی ہے کہ پہلے تین آدمی الگ الگ مرے تھے۔۔۔ یا قتل ہوئے تھے۔“ کرشن نے نجی سے کہا۔ ”اب دو دوسرے لگے ہیں یا قتل ہونے لگے ہیں۔۔۔ میری عقل کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہے کہ۔۔۔ آخر زندگی دینے والے نے اس گاؤں میں رہنے والوں کو طبعی موت مرنے کے مواقع سے کیوں محروم کر دیا ہے۔۔۔ ہمیں کس کے گناہوں کی سزا مل رہی ہے؟“

ونود اس کی پوری بات سمجھنے کے باوجود خاموش رہا اور بالآخر اس کے جذبات کا آتش فشاں سرد ہوا اور وہ معقولیت کے ساتھ بات سننے اور سنانے کے قابل ہو گیا تو ساحل سمندر کی طرف چلتے چلتے اس نے ونود کو گوپال اور مونا کی داستان عشق اپنے تبصرے اور حالات کے پس منظر کے حوالے کے ساتھ سنا دی۔

”یہ رومیو جولیٹ سے بہتر کیس بن سکتا تھا۔۔۔ بشرطیکہ وہ مردود گوپال اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے جولیٹ کو قتل کر کے خود کشی نہ کرتا۔ بلکہ دونوں ہی اکٹھے مرتے۔۔۔“ اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ کیوں کہ وہ اب ساحل تک آ پہنچے تھے۔

”آپ کو ایک ایسی فلمی کہانی ملتی جس سے ممبئی کی فلم عمری کا کوئی پروڈیوسر لاکھوں کمالیتا۔۔۔“

اور اس کوشش میں گوپال کے اپنے ہاتھ کٹ گئے تھے۔ اس نے دستہ تھام کے زور لگایا ہوتا تو یہ بھی نہ ہوتا۔۔۔ پھر کرشن کو مزید مایوسی ہوئی جب دود نے ٹارچ کی روشنی میں ریت پر زنا نہ قدموں کے نشان دریافت کر لیے۔

”کوئی عورت۔۔۔ ظاہر ہے مونا یہاں تک آئی تھی اس وقت گوپال مر گیا تھا اور وہ یہاں گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ ریت میں یہ ننھا سا کڑھا اور پنڈل کا سانچہ نظر آ رہا ہے آپ کو۔“ دود نے کہا۔ ”کیا مطلب ہو سکتا ہے۔“ کرشن سر ہلا کر رہ گیا۔ مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ کیا جواب دیتا۔

”مطلب صاف اور واضح ہے۔ گوپال کو مونا نے قتل نہیں کیا تھا۔۔۔ اگر وہ مونا کے ساتھ خود بھی کار میں موجود ہوتا تو سارے کپڑے نہ سہی۔۔۔ اس کے جوتے کپڑے تو پانی میں بھیکتے۔۔۔ آپ نے دیکھا اور دیکھ رہے ہیں نا کہ جوتے کپڑے خشک ہیں۔“ دود نے وضاحت کی۔

”پھر۔۔۔ پھر مونا۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اسے ڈرا بیونگ نہیں آئی تھی۔ اس بات کا سبب کو علم ہے۔“ کرشن نے سر جھکا کر کہا۔

”اور پھر آپ نے اس امر پر غور کیا کہ مونا کے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔“ دود نے اپنی وضاحت جاری رکھی۔ ”مگر یہ ہاتھ مونا کے نیچے دے ہوئے تھے۔۔۔ کیا خود کشی کرنے والا اس پوز میں بیٹھا رہ سکتا ہے۔۔۔ نزع کے کرب میں ہاتھ خود بخود گلے پر آ جائے اور اس کا فکھولنے کی غیر شعوری کوشش ضرور کرتی۔۔۔ پھر یہ دیکھو کہ اس کا فکھولنے کا پھندا خاصا ڈھیلا ہے۔۔۔ وہ تھوڑا سا سر اٹھا سکتی تھی۔۔۔ اتنا کہ ناک پانی کی سطح سے اوپر رہے بلکہ تھوڑی سی جدوجہد کر کے اپنا سر بھی نکال سکتی تھی۔ اس کا فکھولنے میں بڑی لچک ہوتی ہے۔“

کرشن سمندر کو دیکھتا رہا جس کی موجیں اس کی بے بسی پر خندہ زن نظر آتی تھیں۔ وہ لا جواب سا ہو کر رہ گیا۔ کیا کہہ سکتا تھا۔

”یہ بتاؤ کہ تمہاری تفتیش کہاں تک پہنچی ہے۔“ دود نے سپاٹ لیجے میں کہا۔ ”کیا کچھ معلوم ہوا؟“ ”معلوم یہ ہوا کہ کچھ معلوم نہیں کیا جاسکتا۔“ کرشن نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ ”ایک پھولنی سی بات قابل غور ہے۔۔۔ شرمیتی ٹھنکنا دیوی کے گھر میں سے سرخ رنگ کے آئل پینٹ کی ایک خالی ٹیوب ملی تھی۔“

دود نے سر ہلایا۔ ”وہ پدمنی نے میرے سامنے اس خطی پرشاد کو دی تھی۔ کسی نے اسے مورد الزام ٹھہرانا چاہا ہوگا۔“ ”ہوگا کیا مطلب۔۔۔“ کرشن نے تکرار کی۔ ”واقعات کی شہادت۔۔۔“

”وہ شہادت جو سنی سنائی پر مشتمل ہے۔“ دود نے درمیان میں اس کی بات کاٹ دی۔ ”امکانات کو نظر انداز مت کریں مسٹر کرشن۔۔۔! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اصل قاتل پھانسی کا پھندا پرشاد کے گلے میں ڈالنے کی کوشش کر رہا ہو۔۔۔ پینٹ کی ٹیوب پر تو مس پدمنی بھی مشتبہ افراد میں شامل ہو جاتی ہے۔ لیکن عقل سے کام لو۔۔۔ کیا پرشاد یا پدمنی واقعی قاتل کر سکتے ہیں؟“

”مس پدمنی کا کوئی سوال نہیں۔۔۔۔۔ کرشن نے رکتے ہوئے کہا۔ ”مگر پرشاد۔۔۔ نوسرا! میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔۔۔ جس شخص نے کار کو پانی میں ڈوبا ہوا دیکھا تھا۔ اس نے کسی کو سیٹی بجاتے ہوئے بھی سنا تھا اور وہ سنا جس سے بچہ بچہ واقف ہے۔۔۔ مگر اس نے کسی کو دیکھا نہیں۔۔۔ وہ کشتی لے کر جال ڈالنے جا رہا تھا۔“

دود نے پہلے گوپال کی لاش دیکھی اور خود کشی کے نظریے کو یکسر مسترد کر دیا۔

اس کے دل میں ایک خنجر پیوست تھا اور اگرچہ گوپال کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں خنجر کے دستے سے پکڑی ہوئی تھیں۔۔۔ مگر اس نے اپنے ہاتھ اپنے ہی سینے میں خنجر اتارنے کے لیے استعمال نہیں کیے تھے۔ اس نے کوشش کی تھی کہ قاتل کا ہاتھ تھام لے

”یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔۔۔ مسٹر ونود۔۔۔! اچھا نہیں ہو رہا ہے۔۔۔ لوگ اب خوف زدہ نہیں مشتعل ہیں۔ بے قابو ہو رہے ہیں۔ برداشت کا دامن ان کے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔۔۔ آپ اجنبی ہیں۔۔۔ آپ ان گاؤں والوں کی نفسیات اور مزاج کو نہیں سمجھتے۔۔۔ انہیں سمجھنا فضول اور لا حاصل ہے۔۔۔ یہ لوگ اگر پرشاد کو مجرم اور آپ کو منہوس سمجھنے لگیں تو اس میں میرے لیے تعجب کی کوئی بات نہیں ہوگی۔“

تعجب خود ونود کو بھی اس وقت نہیں ہوا جب اگلے روز کرشن کے آفس میں گفتیش کا آغاز ہوا اور گواہوں نے اپنے اپنے بیانات لکھوانے شروع کیے۔ کرشن کے معاون سریندر کے علاوہ گاؤں کے چند سرکردہ اور معتبر لوگ بھی کارروائی میں شریک رہے۔ آفس کے باہر خوف کا مارا ہوا مشتعل ہجوم اس آتش فشاں کی طرح کھڑا رہا جو پھر پھٹنے کے قریب ہو تو دھواں دینے لگے۔

ہر چہرے پر اب بھی سوالات تھے مگر ان کی نوعیت بدل گئی تھی۔

وہ پوچھ رہے تھے کہ قاتل کے خلاف اتنے لوگوں کی گواہی موجود ہے تو اسے گرفتار کر کے قانون کے تقاضے پورے کیوں نہیں کیے جاتے۔ اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ چھٹا اور ساتواں اور آٹھواں قتل بھی اسی سفاکی اور بے رحمی سے نہیں ہوگا اور یہ قانون اتنی ہی بے بسی کے ساتھ گفتیش کی رسی کارروائی کے سوا کچھ نہ کر پائے گا۔ بلکہ اپنی زندگی کی حفاظت کی ذمہ داری کے ساتھ انصاف بھی ہمیں کیا اپنے ہاتھ میں لینا ہوگی۔ کرشن کا ستارہ گردش میں آ گیا تھا تو وہ غریب کیا کرتا۔

اور یہ اس کی زندگی کا بدترین دن تھا۔ وقت تھا اسے بیک وقت پانچ افراد کے خون کا حساب دینا تھا اور وہ کورے کاغذ پر صرف قتل ہونے والوں کے نام لکھے بیٹھا تھا۔ بلاشبہ گواہ ایک دو نہیں بہت سارے تھے مگر ان میں ایک بھی چشم دید گواہ نہیں تھا۔ قانون

ٹھوس ثبوت چاہتا تھا۔ بغیر ثبوت کے وہ کسی پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ صرف شک و شبہ کر سکتا تھا جس کی قانون میں اور عدالت کے نزدیک کوئی گنجائش نہ تھی۔ وقفے وقفے سے کوئی آگے بڑھتا تھا اور اندر گواہی دینے کے لیے آ جاتا تھا۔

”میرے کانوں کو دھوکا ہونے کا کوئی سوال بھی نہیں اور نہ ہی یہ میری سماعت کا فتور ہے۔“ زرنجن کی ہونہار نے کہا۔ ”کچ تو یہ ہے کہ مجھے اپنی بیوی کا کوئی غم نہیں۔۔۔ میں جس روز بیوہ ہوئی کتنی خوشی ہوئی جان کر بے گے الفاظ نہیں ہیں۔۔۔ میں ایسا محسوس کر رہی آئی ہوں اور کر رہی ہوں کہ میں نے جو دولت پائی ہے وہ ایک بڑی نعمت ہے۔۔۔ آزادی سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔۔۔ جبر و استبداد کی چکی میں تین برس تک پستی رہی ہوں۔۔۔ مگر ایک تو میں اپنی ذات پر آنے والے شکوک کے داغ مٹانا چاہتی ہوں۔۔۔ دوسرے میں کسی اور موت نہیں چاہتی کہ وہ شقاوت اور بے رحمی سے نشانہ بن جائے۔۔۔ وہ بلاشبہ میرا نجات دہندہ اور عظیم محسن ضرور ہے۔۔۔ لیکن اب وہ خون آشام درندہ، اب ایک خون آشام درندہ بن چکا ہے۔ میں سو گند کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ میں نے سیٹی ماری اور دھن فوراً پیمان لی تھی۔ کیا یہ گیت کسی اور نے نہیں سنا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن کیا آپ کو اب بھی وہ گیت یاد ہے۔“ ونود نے کہا۔ ”یادداشت پر زور دیجیے اور سوچ کر بتائیے کہ سیٹی بجانے والے نے ہر بول دوہرایا۔ آخر کب تک۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔“ زرنجن کی بیوہ نے سوچ کے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس نے پورا گیت سنایا تھا۔ سنانے کا مطلب ہے میں نے سنا تھا۔ ظاہر ہے وہ سنا سننے نہیں تھا صرف سیٹی کی آواز آرہی تھی۔“

دوسری گواہی ایسا کی تھی۔ ”لارڈ! اس نے اپنے وسیع و عریض سینے پر انگلی کے اشارے پر خاصی بڑی صلیب بنائی۔“ اس رات بھینگر رو رہے تھے۔۔۔ میں نے

نے کہا۔ ”اب تم یاد کرو۔۔۔ تم نے کیا یہی سنا تھا؟“

”میں اب خداوند یسوع مسیح کی قسم کھا سکتی ہوں کہ میں نے پورا گیت سنا تھا۔“ اینا نے یقیناً کامل کے ساتھ کہا۔

”قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔“ کرشن بولا۔  
”ہم ایسے ہی مان لیتے ہیں۔۔۔ تم اب جاسکتی ہو۔“  
اب اس علاقے کی سب سے دولت مند اور

معزز ترین ہستی۔۔۔ بلیک ہوا۔۔۔ کالی چڑیل بڑے غرور اور تکبر کے ساتھ نمودار ہوئی۔۔۔ اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اسٹول پر بیٹھ گئی۔ حالانکہ کرسی خالی بڑی تھی۔ اس نے ساڑھی کے فال کو گھنٹوں تک اونچا کر لیا تھا۔ گاؤں کے سرکردہ افراد نے انہوں کے ساتھ امرتا کی کالی کالی سڈول، گداز سے بھری ٹانگوں کو دیکھا۔ گودہ کالی بھی لیکن چوں کہ جوان بھی اس عریاں پنڈلیوں میں بڑی جاذبیت اور کشش تھی جودل کو گرمادینے والی تھی۔۔۔ اس کا یہ انداز ایک فلفلی راقصہ جیسا نرم لیا ہوا تھا۔

”کیا آپ کو معلوم ہے کہ سرودودسراغ رساں! کہ مجھے موسیقی میں کتنی دسترس ہے۔۔۔؟“ وہ ونود کے سوال پر ممتی خیز انداز سے مسکرائی۔

”مجھے گانے کا شوق تھا اور میں نے موسیقی کی تعلیم و تربیت بھی حاصل کی تھی۔۔۔ اگر میرا منگیتر ویت نام سے لوٹ آتا تو ہم شادی کر لیتے اور ہندوستان کے ہی کسی پر فضا مقام۔۔۔ شملہ۔۔۔ میسور کے نندی ہلز۔۔۔ یا پھر کشمیر یا پھر سوئٹزرلینڈ چلے جاتے۔۔۔ پھر دو مہینے بعد واپس آ کر اپنا گروپ بنالیتے۔۔۔ وہ خود گٹار بہت اچھا بجاتا تھا اور بھی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو شال کر لیتے تاکہ گروپ بہت ہی اعلیٰ قسم کا بن جاتا۔۔۔ ہم اسٹیج شو کرتے۔۔۔ شہر شہر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔۔۔ پھر پی وی اور فلم والے ہم سے معاہدہ کر لیتے۔۔۔ بلیک ہمارے گیتوں کی دیوانی ہوتی۔۔۔ ہمارے گیسٹ ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں ہارٹ

مہا کہ یسوع مسیح خیر کرے۔ البشور خیر کرے۔۔۔ نہ جانے کس کو دنیا سے جانا ہے مجھے کیا معلوم تھا کہ جانے والا کب کا اس سنسار سے جا چکا ہے۔“ اور خوف کی لکڑی سے اس کے پہاڑ جیسے بدن میں زلزلہ آ گیا۔

چوں کہ اس کی سانس سینے میں جکولے کھا رہی تھی اس نے اس پر قابو پا کر قدرے توقف کے بعد کہا۔

”اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ جہاں میں سو رہی ہوں۔۔۔ اس کمرے کے اوپر چھت سے کوئی لاش معلق ہے تو صبح میری بھی لاش پڑتی۔۔۔ میرا ہارٹ فیل ہو جاتا۔۔۔“ جھنجھکروں کے رونے سے میں دہشت زدہ ضروری تھی اور سو نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے سیٹی کی آواز ضرور سنی تھی۔  
ونود نے اپنا سوال دوہرایا۔ ”کتنی دیر تک سیٹی بجانے والے نے پورا گیت سنایا تھا۔۔۔؟“

”لارڈ۔۔۔!“ اینا نے حیرانی سے ونود کو دیکھا۔ ”یہ آپ شہریوں جیسے سوال کیوں کرتے ہو۔۔۔ مجھے کیا معلوم گیت کتنا لمبا ہے؟“

”اچھا دھیان سے سنو۔“ ونود نے کہا ”میں سیٹی بجاتا ہوں۔ تم مجھے عین اس جگہ ٹوک دینا جہاں تمہیں شک ہو کہ تم نے اس سے آگے کچھ نہیں سنا تھا۔“ اینا نے سر ہلادیا اور ونود نے سیٹی بجانا شروع کی۔۔۔ چاندگر کے سرکردہ لوگوں نے اور کرشن نے ناگواری اور حیرانی کے ساتھ ونود کو دیکھا۔ آپس میں نظروں کا تبادلہ کیا اور خاموش رہے۔ ونود کی سیٹی خالی کمرے میں ہول بول دوہرائی رہی۔ اینا بڑی متانت سے سر ہلاتی رہی۔ گیت ختم ہو گیا۔

آسمان پر جہاں ستارے رہتے ہیں۔۔۔ جہاں جسموں کا نہیں روحوں کا ملن ہوتا ہے۔۔۔ گیت کی دھن آخری دو بولوں پر تیسری بار بدلتی تھی۔ اور اس طرح دھن کے تین الگ الگ حصے صاف پہچانے جاتے تھے۔

”بس اینا۔۔۔! پورا گیت یہی ہے۔“ ونود

کیک کی طرح فروخت اور۔۔۔“ وہ توقف کر کے قہقہہ مار کے ہنسی۔ ”مگر ہمیشہ ایسے خواب فریب دیتے ہیں۔۔۔ وہ بڑے مکار اور دغا باز ہوتے ہیں۔۔۔ ایک یا ایک گولی۔۔۔ یا ایک خنجر۔۔۔ ان خوابوں سے رشتہ ختم کر دیتا ہے۔ میں تمہیں بتاؤں۔۔۔ میں نے کیا سنا تھا۔“

”اس نے سیٹی بجانی شروع کی۔۔۔“ ونود نے اس کی مہارت کا اعتراف کیا۔ وہ نمبر ون بھی دوسرا نمبر پر شاد کا تھا اور تیسرا خود اپنا تھا۔ ایک منٹ ختم ہو گیا۔ مس امرتا کی آنکھیں بدستور بند رہیں اور کوئی ٹوٹا ہوا خواب دیکھتی رہیں۔ یوں جیسے کوئی شکستہ آئینے کا ٹکڑا اٹھالے اور اس میں اپنا پورا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرے۔ امرتا نے وہ گیت سنایا جو اس نے سنا تھا۔

آخری گواہ چھیرا تھا جو پانی میں ڈوبی ہوئی کار دیکھ کر کرن کو فوراً ہی اطلاع دینے چلا گیا۔

”میں سر۔۔۔ میں نے پورا گیت سنا تھا۔۔۔ میں اس وقت کشتی کھول رہا تھا۔ ہوا کا رخ موافق تھا۔ یعنی زمین سے سمندر کی طرف۔۔۔ چنانچہ آواز صاف پہنچ رہی تھی۔ مگر میں حیران اور پریشان اور ہراساں نہیں ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا۔

”شکریہ۔۔۔“ ونود نے اسے ٹوک دیا۔ ”اتنا کافی ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔“

”کیوں۔۔۔“ ماہی گیر نے چیخ کر اور تروخ کر کہا۔ ”تفتیش کی نگرانی کیا آپ کر رہے ہیں۔ گاؤں کے پولیس افسر کی جگہ آپ ہو گئے ہیں؟“

صورت حال یک لخت کشیدہ ہو گئی۔ بد مزگی سی ہونے لگی۔ معتبر لوگوں نے جو تفریبا اسی ماہی گیر کے ہم خیال ہو گئے تھے انہوں نے کرن کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ونود بے نیازی سے سگریٹ پیتا رہا۔ پرسکون رہا۔ اسے ان کی کوئی چٹانہ تھی۔

کرن نے بڑی بے چینی سے پہلو بدلا اور اس کے سر پا میں ایک لہر اٹھی۔

”دراصل۔۔۔ وہ میرا مطلب ہے مجھے بھی

مزید اب کچھ نہیں پوچھنا ہے۔ جو پوچھنا تھا وہ پوچھ لیا ہے۔“ ماہی گیر اٹھا اور احتجاج کے انداز میں واک آؤٹ کر گیا اور بڑبڑاتا گیا تھا۔

کمرے میں ایک منٹ تک ایسی خاموشی رہی جیسے وہ سب مرنے والوں کے سوگ میں رسماً چپ ہو گئے ہیں۔ پھر کرن نے اپنے ماتحت کو حکم دیا یہ اسے جھکڑیاں ڈال کر لے آؤ۔

ونود نے سگریٹ کے ٹوٹے کو فرش پر ڈال کے جوتے کی ایڑھی سے مسل دیا اور کھڑا ہو گیا۔

”یہ کام میں کروں گا۔۔۔ مجھے بغیر جھکڑی کے خطرناک ترین مجرموں کو لانے لے جانے کا تجربہ ہے۔“

وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر باہر آیا۔۔۔ سو سو اسو افراد کی تب نظروں نے اس کا استقبال کیا۔ کوئی اسے راستہ دینے کے لیے ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا ان کے چہروں پر نفرت اور غصے کی سرخی تھی۔ ونود نے دائیں جانب ہجوم کر چالیس پچاس قدم کا اضافی فاصلہ طے کیا اور پھر وہ پرشاد کے پاگل خانے۔۔۔ یا عجائب خانے۔۔۔ یا کباڑ خانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

”پرشاد کا ٹھکڑا کباڑ کے انبار ہی اپنے اوپر لیٹے پرانے کپڑوں کا ڈھیر ڈالے پڑا تھا اور باہر کی روشنی سے اس نیم تاریک ماحول میں آنے والے کو پہلی نظر میں کسی کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ونود نے اسے پہنچ نکالا اور پیروں پر کھڑا کر دیا۔

”پرشاد۔۔۔ اٹھو! یہاں کا وقت آ گیا ہے۔“ ونود نے اسے جھنجھوڑ کے سخت لہجے میں کہا۔ ”اب تمہاری اداکاری نہیں چلے گی۔۔۔ تمہیں ثابت کرنا پڑے گا کہ تم دیوانے ہو یا وہ دیوانے ہیں جو تمہیں دیوانہ سمجھتے ہیں۔ لوگ تم سے بدظن ہیں اور نفرت اور غصے میں بھرے بیٹھے ہیں۔“ ایک لمحے کے لیے پرشاد کی آنکھوں سے وحشت اور جنون کے تمام آثار مٹ گئے۔

”آپ کیا چاہتے ہیں۔۔۔“ وہ متانت سے

بولو۔ ونود کو اپنائیت سے دیکھنے لگا۔

”میں تمہیں لوگوں کے سامنے لے جانا چاہتا ہوں۔“ ونود نے کہا۔ ”کیوں کہ لوگ انصاف چاہتے ہیں۔“

پر شاد پھر دیوانہ بن گیا۔ ”یہ لوگ۔۔۔ لوگ مجھے مار دیں گے۔ نہ صرف بڑے بلکہ بچے اور لڑکیاں عورتیں۔۔۔ سبھی پتھر مارتے ہیں مجھے۔“ وہ سہم کر چلا یا۔ ونود نے اسے ایک جھککا دیا۔ پھر اس نے پر شاد کا بازو پکڑ کے کہا۔

”لیکن میرے ہوتے ہوئے کسی کی مجال نہیں کہ کوئی تمہیں مارے۔۔۔ مگر میں تمہیں ساتھ لے جانے سے پہلے تم سے کچھ پوچھوں گا۔۔۔ جو پوچھوں اس کا سچ جواب دینا۔۔۔ اگر تم نے جھوٹ بول کے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کی تو میں تمہارے ٹکڑے کر دوں گا۔۔۔ ٹکڑے سمجھتے ہو نا۔۔۔ ہاتھ الگ۔۔۔ پاؤں الگ۔۔۔ اور سر الگ۔۔۔ اور میں تمہارا سر گاؤں کے بچوں کو دے ماروں گا۔۔۔ فٹ بال کھیلنے کے لیے۔“

پر شاد کا چہرہ لاش کی طرح سفید پڑنا چلا گیا اور وہ بری طرح کانٹنے لگا۔

”بھگوان کی سونگ لے لو۔۔۔ میں قطعی جھوٹ نہیں بولوں گا۔“ وہ بری طرح ہکلا یا۔

تیس منٹ کے بعد ونود نے اسے انصاف کرنے والوں کی عدالت میں لا کھڑا کیا۔

”محرم حاضر ہے۔ اس سے پہلے کہ آپ سب فرد جرم عائد کریں میں پر شاد سے دو چار باتیں کروں گا۔ امید کہ آپ میں سے کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔“ گو بات قابل اعتراض تھی لیکن کسی میں چونکہ دم مارنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس لیے لوگ مجبوراً خاموش رہے۔ ان کے چہروں پر ناگواری ابھرا آئی۔

”پر شاد۔۔۔!“ ونود نے کسی پر بیٹھنے سے پہلے پر شاد کو اپنے قریب بٹھالیا۔ ”تمہیں وہ گیت یاد ہے نا۔۔۔ چاند کا ایک شہزادہ تھا اور ایک زمین کی شہزادی۔“ پر شاد نے اقرار میں سر ہلایا اور دوسروں

کی طرف دیکھا جیسے اسے ڈر ہو کہ اس اعتراف میں کوئی بات قابل گرفت تو نہیں۔

”تم سیٹی بہت ہی اچھی بجاتے ہو۔“ ونود نے کہا۔ ”میں نے سنی ہے۔“

پر شاد نے خوش ہو کر پھر گردن ہلائی۔ اسے یقین نہیں آیا کہ ونود تعریف کرے گا۔

”اچھا۔۔۔ یہ سب لوگ تم سے سیٹی پر وہی دھن سننا چاہتے ہیں۔“ ونود نے کہا۔ ”اگر تم نے ان سب کو خوش کر دیا یہ سب تمہیں انعام بھی دیں گے۔۔۔ انعام ہم میز پر رکھے دیتے ہیں۔ تمہارا دل جو چاہے لے لینا۔“ ونود نے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر دیں کہ کیا تاثرات ہیں۔

پھر اس نے سو روپے کا ایک نوٹ میز پر رکھ دیا۔۔۔ کرشن نے کلائی کی کھڑی اتاری اور نوٹ پر رکھ دی۔ پھر کسی نے اپنا پارک پیس رکھا۔ اس میں سونے کی ایک انگوٹھی بھی شامل ہوئی۔ میز پر انعامات سج کر۔۔۔ پر شاد کو متوجہ کرنے لگے۔ ونود نے بھی پھر اپنی کھڑی رکھ دی۔ پر شاد نے بڑے اشتیاق سے اس خزانے کو دیکھا اور اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا تو ونود نے اسے روک دیا۔

”ایسے نہیں پر شاد۔۔۔! شرط یہ ہے کہ پہلے تم سیٹی بجا کر سناؤ۔“ ونود نے کہا۔

پر شاد کا چہرہ اک دم سے اتر گیا۔ ”مجھے اس میں سے کوئی چیز پسند نہیں۔۔۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“ وہ ایک ان جانا سے خوف محسوس کر رہا تھا۔ اچھا تو تمہیں کیا چاہیے۔۔۔ بولو۔“ ونود نے کوشش جاری رکھی۔ ”دیکھو جو چاہتے ہو بتا دو دیکھو یہاں ایسی کوئی چیز ہے جو تمہیں پسند ہو۔“ پر شاد خالی خالی نظروں سے سب کی صورتوں کو دیکھتا رہا۔۔۔ پھر اس کی نگاہ کرشن کی جیب پر آویزاں پانچ کنوؤں والے ستارے پر جم گئی جو پولیس کے سرکاری عہدے کا بیج تھا۔ ایک اعلا پولیس کا۔۔۔

”یہ۔۔۔ یہ میں لوں گا۔“ پر شاد نے انگلی اٹھا کے بیج کی طرف اشارہ کیا۔

ایک ایک چیز اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میں کیا کروں۔۔۔ تم انعام لینا ہی نہیں چاہتے۔“  
 ”مجھے یہ ستارہ چاہیے۔“ پرشاد نے مغلوب لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں یہ گیت پورا نہیں سنا سکتا۔۔۔“ اس کی آنکھوں کے کناروں میں نمی کی چمک آ گئی۔ پھر وہ بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ میں پورا گیت یاد کر کے سنا دوں گا۔ مجھے میرا انعام دے دو۔“ وود نے نفی میں سر ہلایا اور بیچ کا ستارہ کرشن کو واپس کر دیا۔

پرشاد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی قیمتی گھڑی سو روپے کے نوٹ، قلم اور سونے کی انگلیٹیوں کو نظر اٹھا کے دیکھا بھی نہیں تھا۔  
 ”آپ سب لوگوں نے گواہوں کے بیانات سنے۔“ وود نے کمرے کی کشیدہ فضا میں خاموش بت بنے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔  
 پھر اس نے لمحائی توقف کے بعد کہا۔ ”ان سب نے ایک ہی بات کہی تھی کہ سیٹی بجانے والے نے پوری دھن سنائی تھی۔“  
 کسی نے اس کی بات سے انکار نہیں کیا اور نہ ہی ہنسا سکا رہا۔

”پرشاد کو صرف تین بول آتے ہیں آپ نے دیکھ لیا۔ ایک بار کسی نے سرخ آکل پیٹ کی خالی ٹیوب چھوڑ کے فل کے الزام میں پرشاد کو ملوث کرنے کی کوشش کی تھی۔۔۔ سیٹی بجا کے قاتل نے ہر جگہ پرشاد کی موجودگی کا تاثر پیدا کیا۔۔۔ مگر اس سے لاشعوری میں یہ غلطی ہوئی کہ وہ پورا گیت سنا تا رہا۔ جو پرشاد کو نہیں آتا۔۔۔ اور اگر اب بھی آپ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ پرشاد اداکاری کر رہا ہے اور جھوٹ بول کر بچنا چاہتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں اور آپ لوگ شوق سے پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں ڈال دیں اور بیچ چوراہے پر اس کی لاش لٹکا دیں۔“  
 سب کو سانپ سونگھ گیا تھا اور ان کی آنکھیں پرشاد کو گھور رہی تھیں جو پتیل کے جگمگ کرتے

کرشن نے بادل ناخواستہ پن کھول کر اپنا بیچ الگ کیا اور میز پر دیگر انعامات کے درمیان رکھ دیا۔  
 ”دیکھو۔۔۔ مسٹر کرشن نے تمہاری بلا چوں و چراں مان لی۔“ وود نے کہا۔ ”یہ چمک دار ستارہ تمہیں مل سکتا ہے۔ بشرطیکہ تم گیت سنا دو۔“  
 پرشاد نے خوش ہو کر وود کو دیکھا۔ پھر اس کے لبوں سے وہ نغمہ بلند ہوا جو فرشتہ اجل کا پیام بن کے سنائی دیتا رہا تھا۔۔۔ پہلا بول۔۔۔ پھر دوسرا بول۔۔۔ پھر تیسرا بول۔۔۔ اور نغمہ ختم۔۔۔ خاموشی اور انتظار۔

”آگے سناؤ پرشاد۔۔۔! گیت تو ابھی پورا نہیں ہوا۔ ادھر رہا ہے۔“ وود نے کہا۔  
 ”آگے۔۔۔ آگے تو مجھے نہیں آتا۔۔۔“  
 پرشاد نے بے بسی سے کہا۔ ”جتنا آتا ہے سنا دیا۔“  
 ”نہیں پرشاد۔۔۔! جھوٹ بولو گے تو انعام نہیں ملے گا۔۔۔“ وود نے چمک دار ستارہ سنہری زنجیر کے ساتھ پنڈولر کی طرح ہلایا۔  
 ”مگر میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کے بعد کیا ہے۔۔۔ میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں۔“ پرشاد نے فریاد کی۔

”اچھا۔۔۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ وود نے کہا۔ ”میں تمہیں یہ دھن پوری سناؤں گا۔۔۔ کیا اس کے بعد تم سنا سکو گے۔۔۔؟“

”میں۔۔۔ مجھے معلوم نہیں۔۔۔ لیکن میں پوری پوری کوشش کروں گا۔“ پرشاد نے کہا۔  
 وود نے ایک بار اسے پوری دھن سنائی۔۔۔ پرشاد جو تھے بول تک پہنچا اور رگ گیا۔۔۔ وود نے پھر پورا گیت سنایا۔ لیکن دوسرے حصے کی دھن مختلف تھی اور تیسرے حصے میں لیے پھر بدلتی تھی۔ وود نے اسے دوسرے پوری دھن سنائی تھی۔

پرشاد ستارہ لینے کی شدید خواہش کے باوجود وود کا ساتھ نہ دے سکا۔ اس کا ذہن زبان کا ساتھ نہ دے سکا۔ اس کا چہرہ دکھ اور مایوسی کی تصویر بن گیا۔  
 ”سوری پرشاد۔۔۔! وود نے میز پر سے



نظروں سے گھورنے لگیں۔

”خواتین و حضرات۔۔۔!“ وود نے کسی مقرر کی طرح مجمع کو مخاطب کیا تو مجمع اسے ناگواری سے دیکھا تو وہ ایک لحظہ خاموش رہا۔

”اس دیوانے کو مسٹر کرشن نے بے گناہ قرار دے کر باعزت بری کر دیا ہے۔ قاتل پرشاد نہیں کوئی اور ہے۔“ اس نے کسی مقرر کی طرح مخاطب کیا۔

”دیوانہ یہ ہے یا کرشن۔۔۔“ کسی اور نے چیخ کر کہا۔ ”تم ہو یا تمہارا باپ۔۔۔۔۔ اسے سامنے لاؤ۔“

”شٹ اپ۔۔۔۔“ وود نے گرج کر کہا۔ اس نے برداشت کیا۔ اس کے دل میں آیا کہ ان دونوں کا منہ توڑ دے جنہوں نے بکواس کی۔

لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ ایک آدمی کے مقابلے میں مشتعل ہجوم کے جذبات بارود کا ڈھیر ہوتے ہیں جسے صرف ایک چنگاری سلگا سکتی ہے۔۔۔ اور تشدد پر آمادہ ہجوم کو تشدد ہی سے قابو کیا جاسکتا ہے۔ لاشی چارج، آنسو گیس اور ہوائی فائرنگ وود نے اپنا رویہ اور نکالا اور اس نے اپنا رخ مجمع کی طرف کر دیا جو راستے میں رکاوٹ بن گیا تھا۔

”میرا راستہ چھوڑ دو۔۔۔ میں دس تک گنوں گا اور پھر درمیان میں گولی چلا دوں گا جسے خودکشی کرنا ہے وہ کھڑا رہے۔ ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔ چار۔“ ہجوم دو حصوں میں بٹ گیا۔ درمیان میں تین فٹ چوڑا راستہ صاف ہو گیا۔ وود اور پرشاد ایک ساتھ چلتے ہوئے ان کے بیچ میں سے گزر گئے۔ جو خالی ہاتھ ہونے کے باعث بے بس ہو گئے تھے۔ پچاس قدم طے کرنے کے بعد وود نے گالیاں سنیں۔۔۔ ایک سے ایک فحش بے ہودہ قبیح اور غلیظ چوں کہ اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا ان کی یہ گالیاں ان کے منہ پر جوتا بن کر لگیں۔ وہ اور مشتعل ہو گئے۔۔۔ چند پتھر اس کے قریب آ کر رکے۔ ان میں سے ایک بھی نہیں لگا تھا۔ وہ پرشاد کا بازو تھامے

ستارے کے لیے رو رہا تھا۔ اس کی زبان جھوٹ بول سکتی تھی لیکن یہ آنسو نہیں بول سکتے تھے۔ پرشاد کی بے گناہی شیعے سے بالاتر ثابت ہو چکی تھی۔ ان کے پاس پرشاد کو مورد الزام ٹھہرانے کی کوئی دلیل نہیں تھی۔ ”اب تم جا سکتے ہو پرشاد۔۔۔! کرشن نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔

”لیکن مسٹر کرشن۔۔۔! باہر ایک غضب ناک ہجوم کھڑا ہوا ہے۔“ وود نے کہا۔ ”میں وہ اشتعال میں جذباتی قدم نہ اٹھائیں۔ اس لیے بہتر ہے پرشاد کو زیر حراست رکھیں۔“

”زیر حراست رکھوں۔“ کرشن نے قدرے برہمی سے کہا۔ ”لیکن کس جرم کی پاداش میں۔ آپ جانتے ہیں کہ بے گناہ کو گرفتار کرنا بھی جرم ہے۔“ ”ہاں۔۔۔ مگر کسی کی جان کی حفاظت کے لیے حراست ناگزیر ہو تو یہ جرم نہیں۔۔۔ اس لیے اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی تو نہیں ہے۔“ کرشن نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر اس نے ان دونوں کو باری باری دیکھا۔

”میرے پاس ایسی کوئی جگہ نہیں۔۔۔۔۔ یہ ذمہ داری آپ قبول کر لیں۔ اس لیے کہ آپ اسے لے کر آئے ہیں۔“ وود کھڑا ہو گیا۔ وہ پرشاد کو زیر حراست دفتر کے کمرے میں جسے اس نے حوالات بنا رکھا تھا اس میں رکھ سکتا تھا۔ لیکن اس کے لیے ایک طرح سے فٹ بھی تھا اور وبال بھی۔۔۔ لوگ بڑے مشتعل ہو رہے تھے۔ موقع یا کراس کی جان بھی لے سکتے تھے اس وقت بھی وہ اس کی جان لینے کے درپے تھے۔

”میں اسے جہاں سے لایا تھا وہیں پہنچا دوں۔ اس کے بعد آپ کا یہ فرض بنتا ہے کہ ہر شہری کی طرح اس کی زندگی کو کبھی تحفظ فراہم کریں۔“

”چلو پرشاد!“ اس نے پرشاد کا ہاتھ تھاما اور اسے لے کر باہر نکل آیا۔

ہجوم میں اشتعال کی ایک لہری اٹھی۔ نفرت اور غصے میں بھری ہوئی نگاہیں ان دونوں کو غضب ناک

چلتا گیا۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کے نہیں دیکھا۔  
 ”پرشاد۔۔۔“ وود نے اس کی جھونپڑی میں  
 پہنچنے کے بعد کہا۔ ”دیکھو یہاں تمہارے لیے خطرہ  
 ہے۔۔۔ لوگ تمہاری جان کے بدترین دشمن ہو رہے  
 ہیں۔۔۔ کہیں اور جا سکتے ہو تو چلے جاؤ۔۔۔ کسی شہر یا  
 گاؤں میں یا۔۔۔“

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس دیوانے سے کیا  
 کہے جو ابھی تک خاموشی سے اس کو بہا رہا تھا۔  
 ”کیا کوئی ایسی جگہ بھی جہاں تم چھپ کے رہ  
 سکو۔۔۔ کچھ دن۔۔۔“

”مجھے وہ ستارہ چاہیے۔“ پرشاد نے بھوں  
 بھوں کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے وعدہ کیا تھا  
 نا۔۔۔“ وہ خواب دیکھ رہا تھا جس میں ہمیشہ کی طرح  
 پدمنی اس کے سنگ تھی۔ اس کے سامنے ایک سفید  
 یادیل پھیلا ہوا تھا اور وہ ہاتھوں میں دھنک لیے کھڑی  
 تھی۔

”بڑے شہر کے جاسوس۔۔۔“ وہ ہنستے ہنستے  
 بولی۔ ”اب میں آپ کی تصویر بناؤں گی۔“ مگر سفید  
 بادلوں سے اچانک آہو کی سرخی نمودار ہوئی۔ خون کا  
 رنگ پھیلنے لگا۔

”پکڑ لو اسے۔۔۔ یہ دیوانہ نہیں۔۔۔ قاتل  
 ہے قاتل۔“ آوازوں کا شور سا اٹھا۔ ”انصاف ہم  
 کریں گے۔ دیکھیں کون روکتا ہے۔۔۔“ وہ ہڑبڑا  
 کے اٹھ بیٹھا۔ اسے اپنی سماعت پر فتور سا لگا۔ لیکن یہ  
 فتور نہ تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔۔۔ میں تو پدمنی  
 کے ساتھ تھا۔۔۔ پھر یہ شرمچانے والے کہاں سے آ  
 گئے۔۔۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں۔

اندھیرا اس کے گرد تھا مگر وود جاگ چکا تھا۔  
 نیند غائب ہو چکی تھی۔ اب اس کا ذہن خواب کو  
 حقیقت سے جدا کرنے میں مصروف تھا۔

بے شک جو کچھ میں دیکھ رہا تھا۔۔۔ خواب  
 تھا۔ مگر پھر خواب کہیں سے ٹوٹ گیا تھا اور میرے  
 کان سب سے پہلے جاگے تھے۔ آوازوں کا دبا دبا  
 شور کسی خواب کا حصہ نہیں تھا۔ اس نے کھلی کھڑکی سے

جھانک کر دیکھا۔ اندھیرے میں اسے دور ہوتے  
 ہوئے چراغ دکھائی دیے۔ اس نے پھر اپنی آنکھیں  
 ملیں اور غور سے دیکھنے لگا۔ چراغوں کی روشنی میں  
 متحرک سائے سے نظر آ رہے تھے۔ نیچے کا دروازہ  
 بھی کھلا ہوا تھا۔ وود نے آگے جھک کر دیکھا۔ وہ  
 معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر یہ سب کچھ کیا ہے اور اتنی  
 رات سے کیا ہو رہا ہے۔

”اینا۔۔۔!“ اس نے پکار کے پوچھا ”یہ کون  
 لوگ ہیں۔۔۔ کیا تم بتا سکتی ہو۔“

”لاؤ۔۔۔!“ اینا نے چیخ کر سر گھمایا اور اوپر  
 کی طرف دیکھا۔ ”آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا  
 مسٹر وود۔۔۔! میں خود بھی یہی دیکھنے نکلی کہ آدمی  
 رات کو یہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔ مگر میں نے بیس پچیس  
 آدمی ہی دیکھے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں لالٹینیں  
 تھیں اور ایک لمبی سی رسی بھی تھی۔“

ایک جست میں وود واپس بستر تک پہنچا۔  
 شب خوابی کے کپڑے اس نے جسم سے چند سینڈ میں  
 الگ کر دیے۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ الگ الگ کام  
 کرنے لگے اور اس نے بیک وقت ٹیٹھ کے ساتھ  
 پتلون پہننے کی کوشش کی۔۔۔ ناکام رہا۔ گرتے  
 گرتے بچا۔ دو منٹ سے کم وقت میں وہ جوتے پہن  
 کر تیار ہو چکا تھا۔۔۔ وہ گولے کی طرح دروازے  
 سے نکلا اور دروازہ یوں بند ہوا جیسے توپ چلتی ہے۔

آدھا زینہ اتر کے وود کو ایک خیال نے روک  
 لیا۔ وہ دونوں پیروں میں گھومنے کی کوشش دوبارہ  
 کرتے گرتے بچا اور واپس اوپر پہنچا۔ اندھیرے  
 کے باوجود اس کے ہاتھوں نے سوٹ کیس میں  
 کپڑوں کے بیچی دبا ہوا ریو اور نکال لیا۔ تفریح اور  
 آرام کی غرض سے چاندنگر آتے ہوئے بھی وہ ریو اور  
 کو چھوڑ کے نہیں آ سکا تھا۔ ریو اور اب اس کی ایسی  
 ہی ناکر ضرورت بن گیا جیسے عام آدمی کے لیے قلم  
 ہوتا ہے یا کھڑکی ہوتی ہے۔۔۔ دروازہ پھر بند ہوا۔  
 توپ کا دوسرا گولہ چلا۔ نیچے سے اینا نے چلا کر کہا۔

”مسٹر وود۔۔۔! اندر دروازے اتنے مضبوط

ہیں اور نہ دیواریں کہ۔۔۔“

اینا کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے باہر جا چکا تھا۔ وہ پوری بات سن نہ سکا تھا۔

اندازے سے سمت کا تعین کر کے اس نے تیزی سے دوڑنا شروع کیا۔ اس کی صحت پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی ایک فرلانگ دوڑنے کے بعد اس کا سانس پھول گیا۔ اندھیرے میں اس نے ایک شعلہ سا لپکتا دیکھا اور پاگلوں کی طرح بھاگنے لگا۔ پرشاد کا گھر جل رہا تھا۔۔۔ تاریکی میں روشن ہو جانے والا ایک دیوانے کی متاع حیات کون کتر کر رہا تھا جو اس نے تمام عمر گزار کر حاصل کیا تھا اور شاید یہی انصاف تھا۔

دیوانہ وہ ہے جسے اکثریت دیوانہ قرار دے۔ اکثریت کی دیوانگی پر کون انگلی اٹھا سکتا ہے۔ وود کے پیچھے تک ایک آدمی کی جنت کو جہنم کی آگ مٹا چکی تھی اور کوڑے کے ڈھیر سے بلند ہونے والے شعلے وود کو مذاق اڑا رہے تھے۔۔۔ استہزا کر رہے تھے۔۔۔ مسخر کر رہے تھے کہ بڑی دیر کی مہربان نے آتے آتے۔۔۔ مگر انصاف کرنے والے جا چکے تھے اور وود کو دو فرلانگ دور چراغ غٹمٹاتے نظر آ رہے تھے اگر انہیں یقین ہوتا کہ مجرم بھی اس آگ میں جل کر خاک ہو جائے گا تو وہ مزائے موت پر عمل درآمد کا یقین آ جانے تک کھڑے تماشا دیکھتے رہتے۔

وود نے سوچا۔۔۔ جیسے پھانسی دینے والے اس وقت تک کھڑے رہتے ہیں جب تک ڈاکٹر موت کی تصدیق نہ کر دے اور پھر مجرم کی لاش کے پھر جی اٹھنے کا کوئی امکان نہ رہے۔ پرشاد یقیناً بدحواس ہو کے بھاگا ہوگا اور جہنم نے اسے گرفتار کر لیا ہوگا۔۔۔ مکان کو نذر آتش کرنے کے بعد مکین کا کام تمام کرنے کے لیے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں رس تھی۔۔۔ وود کو اپنا کی بات یاد آئی تو وہ پھر بھاگا۔۔۔ دو فرلانگ لمبا راستہ دو میل سے بھی زیادہ ٹھن اور صبر آزمائیت بن گیا جس کا ہر لمحہ جان لیوا

تھا۔ وود کی جسمانی قوت تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ جہنم کے سائے لائین کی مدد روشنی میں متحرک نظر آنے لگے۔ وہ سب ایک پیڑ کے نیچے جمع تھے۔۔۔ بیس پچیس فوجی آدمی۔۔۔ ان میں سے ایک درخت کی شاخ پر بیٹھا تھا اور پھانسی دینے کے انتظامات کو آخری شکل دے رہا تھا۔

وود نے دس قدم رک کر اطمینان کا سانس لیا اور اس نے چہرے کا پسینہ پونچھا جو پانی کی طرح تر کر رہا تھا۔ وہ چند منٹ بعد پہنچتا تو اسے پرشاد کی جھولتی ہوئی لاش کے سوا کچھ نہ ملتا۔ پرشاد ایک اسٹول پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جیسے اسے یہاں تاج پوشی کے لیے لایا گیا ہو۔ اسے شاید کوئی فریب دے کر لایا گیا تھا ورنہ وہ اتنی آسانی سے نہ اتار دیتا۔

”کیا تمہیں کچھ چاہیے۔۔۔“ جلاد کا فرض ادا کرنے والے نے بڑی نرمی سے سوال کیا۔ ”اپنی کوئی آخری خواہش ہے تو بیان کرو تا کہ پوری کی جا سکے۔“ تماشا دیکھنے والوں کا غیظ و غضب تم ہو گیا تھا۔ کیوں کہ انصاف کے تقاضے پورے ہو رہے تھے۔ چنانچہ مرنے والے کے ساتھ جبر و زیادتی۔۔۔ بدکلامی۔۔۔ مار پیٹ غیر ضروری بلکہ غیر اخلاقی فعل بن گئی تھی۔ مجرم خوش سا تھا۔ نہ مزاحمت تھی نہ دفاع اور نہ فرار کی کوشش۔۔۔ اس جہنم میں سے ایک شخص نکلا اور وہ پنڈت کے فرائض سنبھالے اور آگے بڑھ کر پرشاد سے بولا۔

”پرشاد۔۔۔! مرنے سے پہلے المیہ کے آگے اپنے گناہوں کا اعتراف کرو۔۔۔ کیا تم نے ان پانچ بے گناہ افراد کو قتل کیا تھا؟“

”مجھے۔۔۔ مجھے پانی چاہیے۔“ پرشاد نے نروس ہو کر پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

اس کی حیوانی جبلت جاگ اٹھی تھی اور وہ یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ یہ پینک نہیں ہے بلکہ وہ کسی انجانے خطرے سے دوچار ہے۔ کوئی تیسرا شخص چڑے کی غلیظ ٹوپی میں پانی لانے کے لیے روانہ

ہوا۔ پھر وہ پانچ منٹ بعد لوٹ آیا۔ غالباً قریب ہی کوئی جھیل یا چشمہ موجود تھا۔

پرشاد نے ٹوپی کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور لبوں سے لگایا۔۔۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ آدھے سے زیادہ پانی خود پرشاد کے جسم پر بہہ گیا اور ٹوپی اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اس میں بچا کھچا پانی زمین پر گر کے مٹی میں جذب ہو گیا۔

جلاد نے پھانسی کا پھندا پرشاد کی گردن میں ڈال دیا۔ لوگوں نے سانس روک لیے۔ اب صرف اسٹول ٹھیک لینے کی دیر تھی۔

ودود درخت کی اوٹ سے نکل آیا۔ ریوالور کا سیفی کچھ پہلے ہی ہٹا چکا تھا۔۔۔ فائر کی خوف ناک آواز جنگل کے سناٹے میں دستی بم کے دھماکے کی طرح گونجی اور آشیانوں میں سوئے ہوئے پرندے چیخنے چلاتے پرواز کرنے لگے۔ انصاف کرنے والے یوں پیچھے ہٹ گئے تھے جیسے ودود نے ان کے سامنے ٹائم بم پھینک دیا ہو۔

”اگر کوئی بھی ذرا بھی ہلاتا تو بلا تامل اسے میں گولی مار دوں گا۔“ ودود نے پرسکون رہتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے ایک ہاتھ سے ری کا پھندا پرشاد کی گردن سے نکال دیا تو لوگوں کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں نکلنے لگیں اور ان کے چہرے سرخ ہو گئے۔

”ریوالور لے کر بہادری کا مظاہرہ کرنے آئے ہو۔۔۔“ جلاد نے ہمت کر کے کہا۔ ”کیا یہ بزدلی نہیں ہے۔ اس کے بغیر مقابلہ کر کے دیکھو۔“

”ہاں۔۔۔ ریوالور اسی لیے ہوتا ہے کہ ایک تنہا آدمی پچیس آدمیوں کا مقابلہ کر سکے۔“ ودود نے ریوالور کو لہراتے ہوئے کہا۔ ”خون کے پیاسے درندوں سے نہیںنے کے لیے یہ آلہ بہت کارگر ہے۔ شاید یہ پہلا موقع ہے کہ جب میں نے ریوالور کسی کی جان لینے کے لیے نہیں۔۔۔ بلکہ جان بچانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ تم مجھے بزدل کا طعنہ دے رہے

ہو، خود کو اور اپنے تمام آدمیوں کو دیکھو۔۔۔ قانون کو ہاتھ میں لے کر اسے پامال کر رہے ہیں۔۔۔ ایک بے گناہ اور معصوم آدمی۔۔۔ اسپیکٹر اسے بے گناہ قرار دے چکے ہیں اور اسے تم لوگوں کے سامنے ثابت کیا گیا تھا۔ اس کے خلاف تم لوگوں کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔۔۔ قانون کی اجازت نہیں۔۔۔ ورنہ میں تم سب کو ایک ایک کر کے سولی پر لٹکا دوں۔۔۔ پرشاد نیچے اترا اور میرے ساتھ واپس چلو۔۔۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے رہوں گا اور اگلے قدموں چلوں گا۔ تم مجھے اس طرح راستہ بتاتے جاؤ گے جیسے میں اندھا ہوں۔ تم ان بد معاشوں سے ڈرنا نہیں۔۔۔ کسی نے تمہیں گرفتار کرنے کی کوشش کی تو انہیں بھون دوں گا۔۔۔ صرف یہ ریوالور بھرا ہوا نہیں ہے۔۔۔ میری جیب میں سو گولیوں کا پیکٹ موجود ہے۔“ یہ آخری جملہ اس نے تماشاخیوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے کہا تھا۔

پرشاد ہنسا۔۔۔ یہ واقعی اس کے نزدیک ایک دلچسپ ہی نہیں بلکہ سنسنی خیز اور خطرناک کھیل تھا۔ اب اسے جیسے احساس ہوا تھا۔ ودود نے نہایت محتاط انداز سے اور چوکنا ہو کر ایک ایک قدم پیچھے ہٹنا شروع کیا۔۔۔ سارے لوگ اس کی نظروں کی گرفت میں تھے۔ صرف ایک شخص نے جبکہ کر پتھر اٹھانے کی کوشش کی مگر ودود کی سنسناتی ہوئی گولی اس کے پیروں کے پاس زمین پر لگی اور وہ شخص اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اس کا چہرہ مردے کی طرح بے حرکت ہو گیا اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں سے خوف و دہشت جھانکنے لگی۔

پھر غلیظ، انتہائی فحش اور بے ہودہ گالیوں کا ایک طوفان آ گیا۔ ذلت۔۔۔ بے بسی، اشتہام اور نفرت کے جذبات ایک دم سے بھڑک اٹھے تھے۔ اس نے کبھی ایسی فحش گالیاں نہیں سنی تھیں۔ وہ نہ صرف اسے بلکہ پولیس اور قانون اور پرشاد کو بھی دے رہے تھے۔ ودود نے ان کے اشتعال کی کوئی فکر نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ہر ایک کو اپنی جان پیاری ہے کسی

ہی تھی۔۔۔ بہر حال امکان تھا کہ وہ دیکھ رہا ہو۔  
”پر شاد!“ وہود نے اسے آواز دی۔

اور پھر اس نے غسل خانے میں جھانکا۔ مگر اسے اپنی حماقت کا احساس پریشان کرنے لگا تھا۔ یہ اس کی ذرا سی بھول کا نتیجہ تھا کہ پر شاد گلدھے کے سر کے سینک کی طرح غائب تھا۔ اگر وہود نے دروازہ مقفل کر کے چابی اپنے پاس رکھی ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔۔۔ اب وہ دیوانہ اس بستی کے رہنے والے فرزانوں کے غول میں نہ گھر گیا ہو جو اس کی جان کے دشمن تھے اور اپنے انتقام کی آگ اس کے بے گناہ خون سے بجھانے کی ناکام کوشش کے بعد زیادہ خطرناک ہو چکے تھے اور اس کے تعاقب میں کہیں نہ کہیں چھپے ہوئے بیٹھے ہوں گے۔

وہود کمرے سے نکل کر نیچے پہنچا تو ایٹا چھ فٹ لمبا ڈنڈے والے برش سے فرش کی صفائی میں مصروف تھی۔

”ایٹا۔۔۔!“ وہود نے مجرمانہ ندامت اور تشویش ناک لہجے میں کہا۔ ”کیا تمہیں کچھ معلوم ہے کہ پر شاد کہاں گیا ہوا ہے۔ کیا اس نے بتایا۔“  
”ہیں۔۔۔ وہ جہنم میں گیا ہے۔“ ایٹا ایک ہاتھ کمر پر اور دوسرے ہاتھ سے اپنے برش کا ڈنڈا نیزے کی طرح تھام کر بڑے تلخ لہجے میں بولی۔

”مسٹر وہود۔۔۔ کمر آؤ۔۔۔ آپ نے خود رہنے کے لیے کرائے پر لیا ہوا ہے۔۔۔ یہ کوئی پاگل خانہ نہیں ہے۔“

”میں نے صرف تم سے یہ پوچھا ہے کہ پر شاد کہاں ہے۔“ وہود نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

”مجھے نہیں معلوم۔۔۔“ وہ بے رخی سے بولی تو اس کے چہرے پر ناگواری، تیزی اور تندہی ابھر آئی۔  
”میں نے صبح اٹھتے ہی اسے باورچی خانے میں چوروں کی طرح چیزیں چرا کے کھاتے پکڑا تھا۔ ایک تو اس نے رات کا بچا ہوا چکن بروسٹ جو ہاف تھا سلاستی اور کچپ کے ساتھ بغیر ڈکار کے پہلے ہی ہضم کر چکا تھا۔ اس کی ہڈیاں ڈرین میں یڑی تھیں۔

میں اتنی مجال نہیں کہ قریب آ کر اس پر حملہ آور ہو۔ وہود بڑے اطمینان سے اٹلے پاؤں اور پر شاد کی ڈھال بن کر چلا گیا۔ رفتہ رفتہ وہ دونوں اس قاتل جہنم سے دور ہو گئے۔۔۔ وہ جوان کے ہیولے تھے انہیں اندھیرے نے نگل لیا تھا۔ نہ وہ اسے نظر آئے اور نہ وہ اسے۔۔۔ ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

وہود نے آدھے راستے میں پر شاد کو روک لیا جو اپنے گھر کی سمت جانا چاہتا تھا۔ وہ انصاف کرنے والے پاگل ہو چکے تھے۔ وہود نے آخری وقت میں ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ ان کے نزدیک شہر سے نازل ہونے والا یہ شخص جاسوس نہیں شیطان تھا جو عین وقت پر پہنچ گیا تھا۔ پر شاد نے حیرت اور سوالیہ نظروں سے وہود کی طرف دیکھا تو وہود نے کہا۔

”پر شاد۔۔۔! ادھر نہیں۔۔۔ تمہارا اب کوئی گھر نہیں۔۔۔ تم آج کی رات میرے ساتھ رہو گے۔ کل سوچیں گے کہ تمہارا کیا انتظام کیا جائے۔“  
پر شاد خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ دونوں دبے دبے پاؤں وہود کے کمرے میں پہنچے۔ کیوں کہ پر شاد ایٹا سے خائف تھا۔

”وہ مجھے جھاڑو لے کر مارنے دوڑے گی۔“ اس نے کہا تھا۔

وہود کا خیال تھا کہ اس میں نہ غلط بیانی کی گنجائش ہے اور نہ ہی مباحثے کی۔ چنانچہ اس نے احتیاط بہتر بھی۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اس نے پر شاد کو اپنا کمر فرس پر بچھانے کے لیے دیا۔ پھر ریوالور کو پر شاد کی نظروں سے بچا کے تنیکے کے نیچے چھپایا اور لیٹ گیا۔

صبح اٹھنے کے بعد اس کی نگاہ خالی کمر پر گئی۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ گزشتہ رات وہ پر شاد کے سو جانے کے بعد سو یا تھا کہ کہیں وہ نیند میں نہ اٹھ کے چل پڑے یا تنیکے کے نیچے سے وہ خطرناک کھلوانا نکالنے کی کوشش نہ کرے خود وہود نے اس کی نظر بچا کے چھپایا تھا۔ ایک فیصد

سے ناکام بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ لیکن صبح سویرے اپنا نے سوچے سمجھے بغیر پرشاد کو مار بھگایا۔۔۔ اب پرشاد کی جان یقیناً خطرے میں ہے۔

وُود کے دل کھوڑی سی ڈھارس ہوئی مگر اس کا اضطراب برقرار رہا۔۔۔ کرشن کے تیار ہونے تک اور کافی لانے تک وہ کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ سریندر اندر آیا اور وُود کو اچانک اور غیر متوقع اپنے ہاں دیکھ کر ٹھٹھا۔

پھر اس نے مختصر اُکھا۔ ”خبریت تو ہے سر۔۔۔! آج صبح صبح“ وہ صبح کی سیر کر کے لوٹا تھا اور غالباً یہ اس کی عادت تھی۔ وُود نے سر کی جنبش سے جواب دیا اور زبردستی مسکرایا۔ سریندر اندر چلا گیا۔ نہ جانے جالندھر جیسے شہر کی مصروفیات میں وقت کیسے نکالتا ہوگا۔ وُود نے سوچا پھر کرشن آ گیا اور وہ دونوں ایک پرانے ماڈل کی ہنگامہ خیز کار میں ایک ساتھ روانہ ہوئے۔۔۔ کسی بھی شہر میں یہ کار تماشا بن سکتی تھی۔ چاندنگر کے ماحول میں نہیں چند منٹ میں کرشن کا آفس آ گیا۔ کرشن نے پرشاد کی تلاش کے احکامات جاری کیے اور خود بھی وُود کے ساتھ چل پڑا۔ اسے بھی پرشاد کی بڑی فکر لاحق ہو رہی تھی۔

آدھے ٹھٹھنے کے بعد انہیں اطلاع مل گئی کہ پرشاد کہاں ہے۔۔۔ وہ سمندر کے کنارے الٹا پڑا تھا اور دور سے دیکھنے پر یوں لگتا تھا جیسے اس کا سر غائب ہے مگر اس کا سر ریت میں دفن تھا۔۔۔ کسی نے خاصا بڑا لٹڑھا کھود کے سرگردن تک دبایا تھا اور اوپر بھی ریت ڈال دی تھی۔۔۔ وہ خود۔۔۔ ساکت و صامت کھڑا۔۔۔ کرشن کے ایک ماتحت کو ریت ہٹاتا دیکھتا رہا۔۔۔ وہ جو دیوانے کی دشمنی میں دیوانے ہو گئے تھے بالآخر جیت گئے تھے اور وُود جو ایک بار اس بے گناہ کو تختہ دار سے اتار لانے میں کامیاب ہو گیا تھا بار چکا تھا۔۔۔ کم یابی کی خوشی میں وہ یہ بھول گیا تھا کہ زندگی کی لکیر تو دست قدرت کھینچتا ہے اور انسان اس کو عبور کر کے ایک دن بھی جی نہیں سکتا۔ جب وُود

ایک گلاس دودھ جو ہاف لیٹر تھا وہ پی چکا تھا۔۔۔ غصہ خدا کا۔۔۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ بد معاش تین کیلے نگل گیا۔۔۔ پھر میں نے یہ ڈنڈا اٹھایا اور اس کے دو لگائے محال ہے جو اس کے ندیدے پن میں فرق آیا ہو۔ باہر ٹٹکتے ٹٹکتے وہ نہ صرف تین اور غب غب کھا گیا بلکہ دو عدد سیب جو آدھا کھو تھے وہ اور کیل بھی لے گیا۔

”تو تم نے اسے مار کر باہر نکال دیا۔“ وُود نے تیز و تند لہجے میں چیخ کر کہا۔ ”کیا تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ وہ کتنے دنوں کا بھوکا ہے۔۔۔ وہ کھانے ہی پر ٹوٹ پڑا تھا۔ تم پر تو نہیں۔۔۔ تم پر ٹوٹ پڑتا تو تم کیا کرتیں۔۔۔؟“

”اور نہیں تو کیا کرتی۔۔۔“ اپنا تاثر اور احساس کے بغیر بولی۔ ”باقی اور جو بہت سارے پھل تھے اس کے سامنے ڈھیر کر دیتی اور اسے من مانیاں کرنے دیتی۔۔۔ میں نے اسے سوگالیاں دیں اور سوگز تک اس کے پیچھے بھاگی۔ مگر اس نے پورے ایک درجن کیلے ہڑپ کر لیے اور سیب اپنی جیب میں بھر لیے۔۔۔ وہ کوئی بھوت لگ رہا تھا۔“

”بے وقوف عورت۔۔۔“ وُود نے پیر شیخ کر کہا۔ ”میں اس کی جان بچا کے لایا تھا۔۔۔ میں نے اسے پناہ دی تھی۔ ورنہ لوگ اسے پھانسی پر لٹکا دیتے اور تو نے اسے پھر دشمنوں کے حوالے کر دیا۔“ وہ دروازے کی طرف لپکا۔

”اچھا ہے وہ اب کے اسے پھانسی لگا دیں۔“ اپنا نے پیچھے چلا کر کہا۔ ”میری جان بھی چھوٹ جائے۔۔۔ اور میری عزت پر آج نہ آئے۔“ وُود سخت پریشان تھا کہ اب کہاں جائے اور کس سے پوچھے کہ وہ دیوانہ کہاں ہے۔ کوئی بتانے سے رہا۔ سب اس کی جان کے دشمن ہیں۔ پھر وہ کرشن کے گھر پہنچا جو سوکر اٹھا ہی تھا۔ وہ برش کرتا باہر آیا اور وُود کو اتنی سویرے دیکھ کر حیران ہوا۔

کم سے کم الفاظ میں وُود نے اسے بتایا کہ رات کو کیا ہونے والا تھا۔ جسے وہ بروقت مداخلت

نے کہا۔ ”اگر آپ کی بات درست ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قاتل بدستور ہمارے درمیان موجود ہے۔“

”ہاں۔“ ونود نے سر ہلایا۔ ”اور اگر وہ اپنے اگلے شکار کا انتخاب کر چکا ہوگا تو ثابت بھی ہو جائے گا۔“

”مگر اس کا اگلا شکار کون ہوگا۔“ کرشن نے بے بسی سے دریافت کیا۔ ”مجھے یہاں قتل کی ان وارداتوں کے درمیان کوئی رشتہ نظر نہیں آتا۔۔۔ کوئی بات مشتبہ کہ نظر نہیں آتی جو قتل کی وجہ بن سکے۔ آخر کوئی یہ قتل عام کیوں کر رہا ہے۔ اس کا پس منظر واضح نہیں ہے۔“

”ایک بات پر یقین رکھیں مسٹر کرشن!“ ونود نے چلے ہوئے کہا۔ ”انصاف میں دیر ممکن ہے اندھیر نہیں سودن چور کے ایک دن کو تو ال کا۔“

”ونود۔۔۔ تم پاگل ہو جاؤ گے۔“ پدمی نے دروازے میں نمودار ہو کر کہا۔ ”گھڑی میں ٹائم دیکھو کہ کیا وقت ہوا ہے۔“

وہ نائیلون کے سیاہ لباس شب خوابی میں اپنے حسن کی تمام تر جلوہ آفرینی کے ساتھ ونود کے سامنے تھی۔

مگر ونود کی نظر میں کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھیں۔ پدمی جانتی تھی کہ ونود کی آنکھیں اس کے وجود سے یقیناً باخبر ہیں مگر وہ خود ہر احساس سے محروم ہو چکا ہے۔۔۔ احساس جمال۔۔۔ چاہت کا جذبہ۔۔۔ یہ سب وقتی طور پر بے معنی ہو گئے ہیں۔ وہ نیند اور بھوک جیسی جسمانی ضروریات تک فراموش کر چکا تھا۔ ایک کمر جہاں وہ مکمل میسوسی کے ساتھ کام کر سکے۔

کانغذ۔۔۔ قلم۔۔۔ سکون۔۔۔ کبھی چائے یا کافی اور سگریٹ۔۔۔ مگر اس کے باوجود وہ محض دہلی سے آرام اور تفریح اور صحت یاب ہونے کی غرض سے آیا تھا۔۔۔ ڈننی مریض بن گیا تھا۔ وہ کیا سوچ کر آیا تھا۔۔۔ کیا ڈننی مریض بننے کے لیے۔۔۔؟

نے پرشاد کو بچایا تو پرشاد کی زندگی کی مہلت تمام ہونے میں چند ہی گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ اگلی صبح کا آفتاب طلوع ہوتے ہی اس کے زندگی کے چراغ کو گل ہو جانا تھا۔ اب اس کے مسخ ہو جانے والے چہرے پر بے جان آنکھیں بھی اندھی ہو گئی تھیں کیوں کہ ان میں ریت بھر گئی تھی۔ چنانچہ پرشاد نہ شرمسار ہوا تھا اور نہ کسی کو شرمندہ کر رہا تھا۔

”آپ نے دیکھا مسٹر کرشن۔۔۔!“ ونود نے تلخی سے کہا۔ ”آپ کے قانون سے زیادہ طاقت ور جنگل کا قانون ہے جو کسی کے نظام انصاف کو تسلیم نہیں کرتا۔۔۔ دیکھو۔۔۔ میزان عدل بھی قاتل کے ہاتھ میں ہے۔“

”آپ۔۔۔ آپ کا مطلب ہے پرشاد کو مارنے والے وہ سب ہو سکتے ہیں جو گزشتہ شب اسے پھانسی دے رہے تھے۔“

ونود نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ سب ناکامی پر مشتمل ضرور ہوں گے۔۔۔ شاید وہ پھر کوئی پروگرام بنالیں کہ اب پرشاد کو کیسے ٹھکانے لگایا جائے۔ مگر چند گھنٹے بعد وہ اپنی جلدی اور فوری یہ حرکت دوبارہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان میں جرات پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ کیوں کہ وہ پیشہ ور قاتل یا جنونی نہیں ہیں۔ عام لوگ تھے جن کے جذبات برا ہیچنتہ ہو گئے تھے۔ اب وہ خوف سے چھپے پٹھے ہوں گے کیوں کہ میں نے بہت سے چہرے دیکھ لیے تھے۔ دوبارہ دیکھنے پر میں انہیں پہچان لوں گا۔ یہ اسی سفاک اور عیار قاتل کی حرکت ہے جس نے پانچ افراد کو قتل کر کے پرشاد کو مجرم بنادیا تھا۔ کیوں کہ وہ دیوانہ تھا اور قاتل اسے سزائے موت دلانے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا مگر میں نے اس کے عزائم کو خاک میں ملایا۔۔۔ جب کہ آپ نے بھی اسے بے گناہی کی سند عطا کر دی تو قاتل کے لیے پرشاد کا وجود بے مصرف ہی نہیں خطرناک بھی ہو گیا۔ اس لیے اس نے چٹاٹل کر کے قربانی کے بکرے کو مار بھی ڈالا۔“

”مجھے آپ کی بات سے اتفاق ہے۔“ کرشن

”کیوں پدمنی۔۔۔“ وہ بار بار کہتا تھا۔ ”یہ سب قتل کیوں ہوئے۔ اب تک میری عمر اس دہشت کی سیاحی میں گزری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہر قتل کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ بے وجہ کوئی قتل نہیں کرتا بالکل بھی کسی کی جان لیتا ہے تو اپنا دشمن جان کر اور دشمنی کی کوئی بنیاد ضرور ہوتی ہے۔“ اس نے پدمنی کو حساب لگا کر بتایا۔

”مرنے والوں میں پہلا ایک بے ضرر بوڑھا تھا جس کے پاس دولت بھی نہیں تھی۔ دوسرا ایک شرابی تھا جسے اپنا ہوش تک نہ تھا وہ شراب کے نشے میں ہر وقت دھیت رہتا تھا۔

تیسری ایک کنجوسی بڑھیا تھی جسے صرف دولت سے پیار تھا لیکن دنیا سے خالی ہاتھ گئی۔ پھر دو محبت کرنے والے مارے گئے تھے جو کسی کے دشمن نہ تھے۔

آخری آدمی اور دولہا تھا یا مجذوب، دیوانہ تھا یا ہوش مند۔۔۔ یہ قتل کسی نے دولت کے لیے نہیں کیے تھے۔۔۔ قاتل وحشی جنونی نہیں تھا۔۔۔ اور وہ بے وقوف بھی تو نہیں تھا۔۔۔ بڑی ذہانت سے وہ لوگوں کو چن چن کے مار رہا تھا جو بظاہر ایک دوسرے سے قطعی بے تعلق تھے۔ ایک دوسرے کو صرف اس حد تک جانتے تھے کہ وہ چاند نگر کے رہنے والے ہیں۔ مگر چاند نگر میں تو دو سو گھر تھے جن میں۔۔۔ کم از کم پانچ سو افراد تھے۔ یہ تیسرا دن تھا اور اس عرصے میں وودو نے کم سے کم پچاس وجوہات لکھی تھیں جو قتل کی محرک ہوئی ہیں اور ہر بار اس قتل ہونے والوں کے درمیان قدر مشترک نہ ملنے سے مایوسی ہوئی تھی۔ اسے اندازہ نہ تھا اس کا قیاس غلط ثابت ہوگا۔

”تم نے سنا نہیں۔“ پدمنی نے قریب آ کر کہا۔ ”جاؤ۔۔۔ اب جاؤ۔“ وودو چونکا۔ ”ہاں۔“ وہ خفت سے مسکرایا۔ ”مجھے اب واقعی سو جانا چاہیے۔۔۔ مسز سادھنا سے زیادہ ہر روز وہ شاہ جنت کی بیٹی مجھ پر گرم ہوتی ہے کہ مسٹر۔۔۔ ایہ دہلی نہیں ہے۔۔۔ یہاں شرفا آدمی رات تک باہر رہتے

ہیں اور نہ جاگتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جیسا دلیس ویسا بھیس۔“ اس کی نگاہ غیر ارادی طور پر دیوار کیر گھڑی پر گئی۔ ”ڈھائی بج گئے۔۔۔ آج تو وہ ہر گز ہر گز دروازہ نہیں کھولے گی۔۔۔ اور اگر دروازہ کھولا وہی ڈنڈے والا برش لے کر مجھے مار بھگانے کے لیے۔۔۔ وہ دہرے پر جس سے وہ تنگ آ جاتی اور بے زار ہو جاتی ہے یہی ڈنڈا اٹھالیتی ہے۔“

پدمنی ہنس پڑی۔ ”تو۔۔۔ اگر ایسی بات ہے یہیں سو جاؤ۔۔۔ جگہ بہت ہے۔“ اپنی ہی بات پر خود ہی اس کے رخسار دکھ اٹھے۔

”مگر۔۔۔۔۔ ہاں جگہ تو بہت ہے مگر۔۔۔ لوگ!“ وودو نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”کون لوگ۔۔۔؟“ پدمنی نے کہا۔ ”یہ جو بے گناہوں کو پھانسی دے کر انصاف کے تقاضے پوری کرتے ہیں۔۔۔ اور جن میں ایک بے ضمیر قاتل چہرے پر مصومیت کی نقاب چڑھائے بے خونی سے گھوم رہا ہے۔۔۔ بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا۔۔۔ ہمیں ان سے کیا۔۔۔ اور ان کی شرافت سے کیا اور ان کی شرافت کے معیاروں سے۔۔۔ ہمیں ان کی اس دنیا میں نہیں رہنا ہے۔“

”وہ۔۔۔ وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ پدمنی!“ وودو نے کم زور لہجے میں کہا۔ ”مگر وہ کیا مثل ہے۔ روم میں وہی کرو جو رومین کرتے ہیں۔“

”رومن تو قتل کر رہے ہیں۔“ پدمنی فخر سے بولی۔ ”انہیں بھی جو صرف محبت کرتے ہیں۔۔۔ وہ نہیں جانتے ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔۔۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔۔۔ کیا آپ کو اپنی نیت کے خلوص پر کوئی شک وشبہ ہے؟“

”میں نے زندگی میں اتنے خلوص سے کسی کو نہیں چاہا۔۔۔“ وودو نے سپاٹ انداز سے کہا۔ ”یہ چاند نگر۔۔۔ دل نگر بن گیا۔۔۔ اور اب بھی ہے۔“ ”تو ڈارلنگ۔۔۔! چلو چھوڑو یہ سب۔۔۔ چلو ہم دہلی لوٹ چلتے ہیں۔ ساری دنیا کے غم کون پالتا ہے۔“ پدمنی بولی۔ ”آپ بے حد جذباتی ہو رہے



ہیں۔“ ونود نے نفی میں سر ہلایا اور اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے کہا۔

”نہیں۔۔۔ پدمی! اب میں اس دلدل سے نہیں نکل سکتا۔۔۔ بالفرض میں اگر بھاگ بھی گیا تو یہ بوجھ تمام عمر میرے ضمیر پر رہے گا۔۔۔ چند دن اور میری جان۔۔۔! کوئی غیب کی صدا مجھے کہتی ہے کہ صیاد اپنے جال میں آ رہا ہے اور اس کے گرد حلقہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔۔۔ ایک مجرم کتنا ہی ہوشیار۔۔۔ جال بازی کیوں نہ ہو وہ قانون سے بچ نہیں سکا نہ بچ سکتا ہے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میرا خیال ہے میں یہیں سو جاؤں۔“

”ویسے تو دوسرا بیڈروم بھی ہے مگر اس کی چابی گم ہو گئی ہے۔ کیا تم شرافت سے میرے بیڈ کے نیچے نہیں سو سکتے۔“ صبح کا سورج سمندر سے ابھر اور آسمان کی وسعت کو طے کرتا ہوا چاند گر تک آپہنچا۔ روشنی سے پدمی کی آنکھ کھلی تو دیوار کی کھڑکی میں دس بج رہے تھے اور ہر روز کی طرح وہ اکیلی تھی۔ ”ونود ڈارلنگ۔۔۔!“ اس نے یکارا۔

پھر وہ ایک انگڑائی لے کر اٹھی اور آئینے میں خود کو دیکھ کر مسکرائی۔ غسل خانے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا کمرے کی نیم تاریک فضا سے روشن آسمان اور اجلی دھوپ کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔۔۔ ہوا میں بہار کی خوشبو تھی اور سرسبز درختوں کے دامن میں پھولوں کے رنگ دمک رہے تھے۔ اتنی پر آسائش دنیا میں موت کا احساس کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ باہر نکل آئی۔ ونود کا کہیں پتا نہیں تھا۔ نہ اپنے اس کمرے میں جسے وہ بڑے شہر کے جاسوس کا کمرہ کہتا تھا۔۔۔ کیوں کہ پدمی کی بنائی ہوئی تصویر وہیں رکھی تھی۔

”آخر یہ کیا بکواس ہے۔ میرے سر میں یہ خنجر۔۔۔ یہ پستول اور گولیاں کیوں بھر گئی ہیں اور میرا سردستی بم کی طرح بنایا گیا ہے۔“ اس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”یہ بے ایمان ہے۔۔۔ تمہیں دل بھی دکھانا چاہیے جس میں تمہاری صورت کا نقش

نظر آتا۔“

پدمی نے ایک سرد آہ بھری اور باورچی خانے کا رخ۔۔۔ پھر دروازہ کھول کر اس نے کسی امید کے بغیر باغ میں دیکھا۔۔۔ انتظار کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔۔۔ یہ انتظار کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے اسے وہی محسوس کر سکتے ہیں جو اس کرب سے گزرتے ہیں۔ اس نے مایوسی سے سوچا تمام دن وہ خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔۔۔ اس نے پیٹ کرنا چاہا مگر سارے رنگ ایک ہو گئے یا ہر رنگ لہو کا رنگ بن گیا۔ پھر وہ کتاب پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔۔۔ ہر طرف ایک سناٹا تھا اور نامعلوم خوف کے سائے تھے۔۔۔ پہلی بار پدمی کو احساس ہوا کہ وہ اکیلی ہے۔ حالانکہ اس گھر میں رہتے ہوئے اسے ایک برس ہو گیا تھا اور ایک دن بھی ایسا نہیں تھا جس میں تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑی ہو۔ دوپہر کے بعد دستک سن کے وہ دروازے کی طرف لپکی عمر ونود کے بجائے اسے اپنا کا آتش فشاں پھاڑ نظر آیا۔ وہ بلائے بغیر اندر آئی۔

”مس۔۔۔“ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”اپنے لیے نہ سہی۔۔۔ دوسروں کی خاطر مکان آبادی کے قریب لینا چاہیے۔ یہاں ٹیکسی نہیں ملتی۔“ اس نے پرجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور ایک کرسی میں فٹ ہو گئی۔۔۔ ”کدھر ہے وہ؟“

پدمی شوخ انداز سے مسکرا دی۔ ”غالبا تم مسٹر ونود کو پوچھ رہی ہو۔۔۔ وہ مسز سادھنا کے گیسٹ ہاؤس میں رہتے ہیں۔“

پدمی نے ٹیلی گرام کا لفاظ دیکھا جو غالباً مسز سادھنا پہلے ہی کھول چکی تھی۔ تار دہلی کے پولیس کے

ہیڈ کوارٹر سے آیا تھا اور اس میں ونود کو سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ فوراً لوٹ آئے۔ اس کی بقیہ چھٹی منسوخ کی جاتی ہے۔ وہ ایک دن کی تاخیر بھی نہ کرے۔

طوالت کے علاوہ تار میں استعمال ہونے والی سخت زبان نے پدمنی کو حیران کر دیا تھا۔ کوئی عذر قابل قبول نہیں ہوگا۔۔۔ تاخیر کو حکم عدولی سمجھا جائے گا۔ فون پر رابطہ نہ کیا جائے۔ کیوں کہ معاملہ سنگین ہے۔

پدمنی نے تار کو سنہال کے رکھ دیا اور اپنا کی خاطر مدارت کے لیے کافی بنانے چلی گئی۔

”لڑکی۔۔۔“ اپنا نے رخصت ہوتے وقت کہا۔ ”تم نے شادی کیوں نہیں کی اب تک۔۔۔ حیرت ہے، یقیناً نہیں آتا تم شادی شدہ نہیں ہو۔“

پدمنی ہنس پڑی۔۔۔ ”بس ایسے ہی۔۔۔ خیال نہیں آیا اب تک اور نہ ہی کبھی خیال آیا۔۔۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ شادی جلدی کر لی جائے۔“

”اب خیال کرو۔۔۔ سوچو۔۔۔ تم اچھی پتی بن سکتی ہو۔ اچھے پتی کے لیے انتظار میں عمر ضائع مت کرو۔۔۔ عمر بڑی تیزی سے گزر جاتی ہے۔۔۔ شوہر کبھی اچھے نہیں ہوتے۔۔۔ بنائے جاتے ہیں ونود میرا مطلب ہے تار۔۔۔ خیر۔“

وہ پلٹی اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ ہنستے ہنستے پدمنی کا برا حال ہو گیا۔ پھر اسے تار کا خیال آیا۔ اس نے مضمون کو دوبارہ پڑھا تو گویا اب ونود چلا جائے گا۔۔۔ گڈ میں بھی یہی چاہتی تھی۔۔۔ تار بروقت آیا۔

ونود رات سے کچھ دیر پہلے نمودار ہوا اور دھڑام سے بستر پر گر پڑا۔

”پانی۔۔۔ چائے، کافی، ایک جام شرب اگر ہو تو۔“ اس نے چلانا شروع کیا۔ ”معلوم ہے آج میں کیسا پہاڑ کھود کے آیا ہوں۔۔۔ نہیں ایسے نہیں۔۔۔ یہ بات۔۔۔ بہت اہم ہے اور انتہائی سنگین بھی۔۔۔ سب دروازے کھڑکیاں بند کر

دو۔۔۔ اور اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔۔۔ مگر پہلے کھانے کو لاؤ۔۔۔ بھوک نا قابل برداشت ہو رہی ہے۔ چوہے بہت تیزی سے دوڑ رہے ہیں۔“

”پہلے تم سکون اور اطمینان سے بیٹھ جاؤ اور یہ دیکھو۔۔۔“ پدمنی نے بھنا کر کہا۔

پدمنی نے لفافہ ونود کے سامنے ڈال دیا مگر وہ اس پر نگاہ ڈالے بغیر کھڑا ہو گیا۔ ہر کھڑکی سے باہر جھانک کے اس نے اندر سے پتلی لگائی اور پردے برابر کیے۔ تمام دروازوں کو اندر سے مقفل کیا اور

باورچی خانے سے پدمنی سے اس کی صورت اور حرکات و سکنات کو دیکھتی رہی۔ وہ یک لخت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ کسی حد تک پریشان اور تشویش کا شکار اور بے حد چوکس۔۔۔ جب وہ کھانے پینے کا سامان لے کر آئی تو وہ ایک ڈائری کے صفحے پلٹ رہا تھا پھر اس نے ہر جیب سے کاغذات نکالے اور اپنے سامنے رکھ لیے۔

”پدمنی۔۔۔! تمہیں ریوالور کا استعمال آتا ہے؟“ اس نے کافی پیتے پیتے بے خیالی میں پدمنی پر نگاہ جما کر کہا۔ ”نہیں۔“

”اچھا کل میں سکھا دوں گا۔۔۔ آدھے گھنٹے کی بات ہے۔۔۔ پھر تم اپنی حفاظت خود کر سکو گی۔“

”کیسی حفاظت۔۔۔“ پدمنی نے پریشانی سے کہا۔ ”تمہارا رویہ میری سمجھ سے باہر ہے۔۔۔ کس سے خطرہ ہے مجھے۔۔۔؟“

”اسی قاتل سے جواب تک چھ افراد کی زندگی کا نذرانہ لے چکا ہے۔“ ونود نے کہا۔ ”اس کا ساتواں شکار تم ہو۔“

کافی کا گنگ پدمنی کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔ میز کے کونے سے ٹکرایا اور ٹوٹ گیا۔ ”کیا تم پاگل ہو گئے ہو ونود؟“

”یہ تم کئی بار پوچھ چکی ہو۔۔۔ دوسرے لوگوں کی طرح۔“ ونود نے برا مانے بغیر کہا۔ ”اور اس کا جواب وہی ہے یعنی کہ میرا دماغ بالکل صحیح خطوط پر کام کر رہا ہے۔۔۔ میں نے وہ بنیادی بات معلوم کر

لی۔“

”میں نے وہ بنیادی بات معلوم کر لی۔“

تھا۔ کیوں کہ ریکارڈ بڑی ابتری کی حالت میں تھا۔۔۔ میں نے دھمکی دی کہ بعد میں ایف بی آئی والے آئیں گے تو ریکارڈ ہی نہیں ڈسٹرکٹ آفس بھی اٹھا کے لے جائیں گے۔ بادل ناخواستہ انہوں نے نہ خانوں کی خاک دھول میں پڑے ہوئے رجسٹر نکالے، فائلیں تلاش کیں۔۔۔ کاغذات ڈھونڈے اور میرے ساتھ بیٹھ کر دیکھے۔۔۔ چھ گھنٹے کی محنت کے بعد میں تفصیلات مرتب کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اموات و پیدائش کا ساراریکارڈ ابھی تک موجود ہے۔ حالانکہ یہ بات سولہ سو نوے کی ہے۔ تقریباً پہلے کی انگریزی بھی غلامہ دور میں جو بھی نہ تھی جو آج ہے۔ مثلاً ایس کی جگہ ایف پڑھا جاتا تھا۔۔۔ اور گرامر کے اعتبار سے بھی وہ سرکاری عیدالتی زبان جس کا سمجھنا مشکل تھا مگر آسانی یہ ہو گئی تھی کہ مجھے ایک شخص آج کی زبان میں مطلب سمجھا گیا۔۔۔ شہنشاہ ولیم سوم نے نہیں چاند تارا چندا کے نام کی کارنامے پر خوش ہو کر ہندوستان میں ہی اس کے نام ایک جزیرہ بخش دیا۔۔۔ معلوم نہیں وہ فوج کا کیپٹن تھا یا کسی بحری جہاز کا۔۔۔ یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ اسے یہ انعام کیوں دیا گیا تھا۔ اس وقت زمین اور جزیرے کے درمیان ٹھوڑا سا سمندر حائل تھا۔ پانی کی یہ بٹی کسی نہر کی طرح تھی جو بعد میں خشک ہو گئی۔۔۔ لیکن ایک صدی قبل سونامی طوفان آیا تو پھر سمندر وجود میں آ گیا تھا۔۔۔ چاندگری کا گاؤں اسی کیپٹن چاند تارا چندا کے نام پر ہے۔ اور گاؤں میں پچاس فیصد لوگ رہے ہیں چاند تارا چند کہلاتے ہیں تو غالباً اس کی وجہ بھی غالباً یہی ہے۔۔۔ خیر جزیرہ 1776 کی خانہ جنگی تک کیپٹن چاند تارا چند خاندان کی ملکیت رہا 1779۔ میں جب سول وار ختم ہو گئی تو اس کی ملکیت کا سوال اٹھا۔۔۔ کیا بری تہہ کے شہنشاہ ولیم سوم کا فرمان کوئی قانونی سند ہے۔۔۔ جس کی رو سے جزیرے کو کیپٹن چاند تارا چند کی ملکیت سمجھا جائے۔۔۔ وہ شاہی فرمان چڑے پر کسی ایسے رنگ سے لکھا گیا تھا کہ تین سو برس گزر جانے

لی ہے جو محمد بنی ہوئی تھی یعنی قتل کی وجہ۔۔۔ یہ سب لوگ بلاوجہ مارے نہیں گئے ہیں۔۔۔ قاتل کا آخری وارنٹ پر اب تک اس لیے نہیں ہو سکا کہ وہ مجھ سے ڈرتا ہے اور میں یہاں موجود تھا۔۔۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں چھٹیاں ختم ہونے کے بعد چلا جاؤں گا۔۔۔ پھر تم تنہا رہ جاؤ گی۔ وہ اپنے مقصد میں تقریباً کامیاب ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ آخری کامیابی کے لیے دہلی بھی پہنچ سکتا ہے۔ اس خوش فہمی میں پتلا رہنے کی ضرورت نہیں کہ تم دہلی جا کے بچ جاؤ گی۔ یوں دہشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا اور تم دیکھو گی کہ شامت اعمال خود اسے تمہارے دروازے تک لائے گی۔۔۔ تمہیں حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ کیوں کہ تمہاری زندگی ہی اس کے لیے موت کا سامان بن جائے گی۔“

اس نے رک کر سرگریٹ جلائی اور ایک ہاتھ سے پدنی کو قریب کر لیا۔

”بات ٹھوڑے سے انتظار کی ہے جان من۔۔۔ قاتل زیادہ دن انتظار نہیں کر سکتا۔۔۔ میں نے آج سارا دن جھک ماری ہے۔ لیکن میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔۔۔ آج صبح مجھے اچانک ایک بہت پرانی بات یاد آ گئی۔۔۔ جب میں گاؤں پہنچا تھا۔ سب سے پہلے میری ملاقات پرشاد سے ہوئی تھی اور اس نے مجھ سے ایک ایسی بات بھی تھی کہ مسٹریشن کی لاش دریافت کرنے کے بعد میں شکوک کا شکار ہو گیا۔۔۔ میں نے گاؤں کے جزل اسٹور کے لیے اور بار کے مالک سے بات کی جس نے پرشاد کا پتا بتانے کے بعد مجھے گاؤں کی تاریخ سے روشناس کرایا تھا اور میں بڑی مشکل سی اس باتوں کی شخص سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہوا تھا۔ آج صبح مجھے اس کی بات یاد آئی تو میں تمہیں سوتا چھوڑ کے نکل گیا۔ میں نے اس سے تفصیلی گفتگو کی اور پھر ڈسٹرکٹ آفس چلا گیا۔۔۔ بیس میل دور۔۔۔ وہاں پرانا ریکارڈ لکھوانا ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ مجھے مجبوراً اپنا شناختی کارڈ استعمال کرنا پڑا تھا۔ کیوں کہ کوئی تعاون پر آمادہ نہ

کے باوجود آج بھی صاف اور واضح طور پر پڑھا جا سکتا ہے۔ چاند تارا چند کے وارثوں نے حق ملکیت کے لیے عدالت سے رجوع کیا اور پندرہ برس کی قانونی جنگ کے بعد مقدمہ جیت لیا۔

مگر شاہی فرمان منسوخ کرنے کے بعد اسے ایک ناقابل تینخ سرکاری حکم میں بدل دیا گیا۔۔۔ قانوناً جاگیر انگلنڈ کے بادشاہ کی عطا کردہ جاگیر نہیں بلکہ ہندوستانی حکومت کے لیے ایک طرح سے عطیہ بن گئی جس سے چاند تارا چند کے وارثوں کی پوزیشن بہت نمایاں ہو گئی۔۔۔ معلوم نہیں چاند تارا چند کے خاندان کو اس غایت کا مستحق سمجھا بھی گیا تھا یا نہیں یا خود جزیرے کے مالک اس قدر طاقت ور اور اثر و رسوخ کے مالک تھے کہ ان کی جاگیر ان سے کوئی چھین سکا۔۔۔ کافی ہاؤس بار کے مالک نے مجھ سے ایک بات کہی تھی کہ یہاں سب ناچاراً بھین ہیں اور یہ زمین ان کے ماں باپ کی جاگیر نہیں۔۔۔ یہ بات بہت سے لوگ بھی کہتے ہیں مگر حقیقت کا علم کسی کو نہیں۔

سوا سو برس تک یہ سلسلہ بنجر و عافیت چلتا رہا۔۔۔ یعنی ایک وارث مرتا تھا تو اس کا سب سے بڑا بیٹا از خود جزیرے کا مالک بن جاتا تھا۔ پھر قدرت کے ایک اشارے سے کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ سن اٹھارہ سو بارہ میں جزیرے کا مالک شام تارا چند تھا۔ اس نے اپنی اولاد دزینہ کی امید میں چھ لڑکیاں پیدا کیں اور انہی حوصلہ نہیں ہارا تھا کہ ایک حادثے میں ڈوب کر مر گئیں۔ اس کی چھ بیٹیاں چھ مختلف افراد سے بیاہی جا چکی تھیں اب یہ بحرہ نسب ملاحظہ ہو۔

مہلی لڑکی سرلا کا ایک بیٹا تھا۔ بیٹے کا بھی ایک بیٹا ہوا۔ پھر ایک لڑکی پیدا ہو گئی جس کی شادی سوراج عرف فیض نام کے شخص سے ہوئی۔۔۔ مقبول نمبر ون مسٹر فیض انہی کا بیٹا تھا جس کی بیوی مرچنگی سی اور جو بے اولاد تھا۔

دوسری لڑکی مائنی کا سلسلہ بھی ایسے ہی چلا اور  
یکے بعد دیگرے مانچویں نسل تک ہر ایک کا وارث

اکلوتا بیٹا ہی رہا۔ مقتول نمبر دو زنجن اسی سلسلہ نسب کا آخری فرد تھا جو بے اولاد مر گیا تھا۔

تیسری لڑکی رادھا کی چوتھی نسل تک ایک ایک بیٹا زہد رہا باقی کم عمری میں مرتے گئے۔ آخری بیٹے نے شکنتلا دیوی نام کی لڑکی سے شادی کی جو مقتول نمبر تین سے۔۔۔ اس کا شوہر ہندوستان کی ایک جنگ جو چین سے ہوئی ماریا گیا۔۔۔ بیٹا ویت نام کی نذر ہوا۔

چوتھی لڑکی پدھا۔۔۔ اس کی چار نسلیں یوں ہی گزریں کہ ہر ایک کو ایک ایک ہی بیٹا نصیب ہوا۔ اس خاندان کا آخری فرد مقتول نمبر چار تھا۔ جس نے ایک بار شادی کی اور دوسری بار محبت۔۔۔ مگر دنیا سے لاوارث گیا کیوں کہ اس کے ناجائز بچے کو جہنم دینے والی بھی کار لے کر سمندر میں اتار گئی۔

پانچویں لڑکی تھی پونم۔۔۔ اس کی اگلی چار نسلوں کے پیارے بیٹے رہے۔۔۔ پانچویں نسل میں ایک ہی بیٹی تھی جس کا نام تھا سیتا۔۔۔ جو شادی سے قبل ہی مر گئی۔ موت کے اسباب بھی پتا نہ گئے ہیں یعنی کوئی بیماری وغیرہ۔۔۔ بیماری کیا تھی اس کی کوئی وضاحت نہیں ہے۔

چھٹی اور آخری لڑکی کا نام ہو گیا تھا۔۔۔ اس کا سلسلہ نسب تیسری نسل پر آ کر ختم ہو گیا یعنی اس کا ایک بیٹا ہوا۔۔۔ اس بیٹے کی ایک بیٹی تھی جس کی شادی گوتم نام کے ایک شخص سے ہوئی مگر ایشور بنے اسے اولاد سے محروم رکھا۔

دود کا غذات کو الٹ پلٹ کے پڑھنے میں اتنا مصروف تھا کہ اس نے پدمی کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا۔۔۔ اب یہ داستان ماضی تمام ہوئی۔ تو اسے پدمی کی حالت دیکھ کر تعجب ہوا۔۔۔ اس کا رنگ کورے لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا اور وہ پلک جھپکے بغیر غلامیں دیکھ رہی تھی۔ دود نے اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کا نرم و نازک خوب صورت ہاتھ تھا تا تو وہ لاش کی طرف سر دلا گا۔

”یدمنی۔۔۔! کیا بات ہے جان۔۔۔!“

تہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا“، ونود نے کہا تو اس کے لہجے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

پدمنی نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور اس خوف سے معصوم سرگوشی کی۔ ”ونود۔۔۔ تم نے واقعی بڑی عرق ریزی کی۔۔۔ محنت کی۔۔۔ مگر مجھے اپنی ماں کا نام یاد ہے۔ ان کا نام سیتا تھا۔ یہ غلط ہے کہ وہ شادی سے قبل ہی طبعی موت مر گئی تھی۔ کیوں کہ اس نے اپنی مرضی سے ایک کم حیثیت آدمی کے ساتھ فرار ہو کر ان کی عزت کی اڑھی اٹھا دی تھی۔ معلوم نہیں بعد میں والدین نے طبعی موت کا اندراج کرانے کے لیے کیا کیا جھکندے استعمال کیے۔۔۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میری ماں زندہ رہی تھی اس نے امر ناتھ نام کے ایک شخص سے شادی کر لی تھی۔۔۔ میرا نام پدمنی ناتھ ہے۔۔۔ میرا باپ شادی کے دو برس بعد پراسرار طور پر غائب ہو گیا تھا اور میری ماں مجھے گود میں لے کر گھر سے نکل گئی تھی۔۔۔ کیوں کہ اسے یقین تھا کہ میرے باپ کو میرے نانے انخوا کر کے مروا دیا ہے۔ وہ بہت خردماغ، ضدی اور بد معاش تھا۔ یہ سب باتیں میری ماں نے مجھے بتائی تھیں۔۔۔ اگر میری ماں بیوہ ہو کر ضدی پراڑی رہتی اور باپ کے گھر نہ لوتی تو وہ ایسے بھی اٹھوا لیتا مگر سیتا بھی تو اسی ضدی باپ کی بیٹی تھی۔۔۔ وہ میری اور اپنی جان بچا کے نکل آئی اور اس نے باقی زندگی کم نام رہ کر گزاری۔۔۔ مرنے سے پہلے وہ سب کچھ میرے حوالے کر گئی تھی۔۔۔ اپنی شادی کی رجسٹریشن کا سرٹیفکیٹ اور میری پیدائش کا بھی سرٹیفکیٹ بعد میں اس کی موت کا بھی سرٹیفکیٹ مجھے مل گیا۔۔۔ یہ سب دستاویزات میرے پاس محفوظ ہیں۔۔۔ لیکن جو کچھ تم نے بتایا وہ واقعی مجھے معلوم نہ تھا۔“

ونود اس کی صورت دیکھتا اور اس کی آنکھوں میں درمیان میں جھانکتا رہا تھا۔

”تم نے بات مجھے مکمل کرنے نہیں دی تھی۔“ وہ بولا۔ ”انہی کا عذات میں مجھے دو کا عذات میں

ایسے کا عذات ملے جو بظاہر الگ تھے لیکن غور کرنے پر میں تعلق دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک تو اس شادی کے رجسٹریشن کی سرٹیفکیٹ کی نقل تھی۔۔۔ اور دوسرا تمہاری پیدائش کا سرٹیفکیٹ تھا۔ معلوم نہیں کس مصلحت کے پیش نظر تمہاری ماں نے یہ نقول ارسال کی تھیں جن کو کسی نے توجہ دیے بغیر فائل میں لگا دیا تھا۔ میں اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ سیتا شادی سے پہلے نہیں مری تھی اور تم ہی اس کی وارث ہو۔۔۔ مگر باقی کہانی کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔۔۔ اب تم نے خود ہی داستان کے نامکمل حصے پورے کر دیے ہیں تو واقعات کی پوری تصویر سامنے ہے۔

پر شاد اس لیے مارا گیا کہ وہ قربانی کا بکرا تھا۔۔۔ باقی سب چاند نگر کے جاگیر کے قانونی وارث تھے۔ یہاں تک کہ وہ لڑکی بھی جو سمندر میں ڈوب گئی۔ ڈوبدی گئی یا پھر اس نے خودکشی کر لی۔ اپنے بطن میں ایک وارث کی پرورش کی مجرم تھی۔۔۔ اگر ان کی شادی ہو جاتی تو شوہر کو بیک وقت دو عورتوں سے شادی کے جرم میں سزا ہو سکتی تھی۔ لیکن ان کی اولاد کے حق وراثت پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ آخری وارث تم ہو چنانچہ قاتل کا اگلا نشانہ تم بنو گی۔۔۔ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے یہ بعد میں معلوم ہو گا۔ اس کی سازش بے نقاب ہو گئی ہے اور اب تم ہی وہ دانہ دوام ہو جس پر اس کی گرفتاری کا انحصار ہے۔۔۔ آئندہ چند روز کم ایکلی رہو گی۔۔۔ ایکلی یوں کہ میں رات کی وقت تم سے اجازت لوں گا۔ اس طرح کہ وہ چھپ کر دیکھ رہا ہو تو اسے یقین آ جائے کہ تم ایکلی رہ گئی ہو۔ میں دس منٹ کے اندر اندر گھوم کر پچھلی طرف سے اندر آ جاؤں گا۔ پھر تم آرام سے بے فکر ہو کر سو جانا۔ میں اس کا انتظار کروں گا۔

”لیکن ونود۔۔۔! تمہیں واپس جانا ہے۔“

پدمنی نے تاروالا لاف پھراٹھایا۔ ”یہ دیکھو۔“

ونود کے ماتھے کی ہر شکن گہری ہونے لگی۔۔۔

تار بھیجے والا محکمہ کا سربراہ تھا۔۔۔ گردہ بہت مہذب

اب میں ریلوے اسٹیشن تک جا رہا ہوں۔۔۔ حکم عدولی کرنے یعنی تارکا جواب دینے کے لیے۔۔۔ سوری۔۔۔ پدمنی کی محبت اور اس کی جوانی، حسن اور شباب آنے نہیں دیتی۔“ وہ شوخی سے بولا۔

پدمنی سرخ ہوئی۔ حیانے اسے اور حسین بنا دیا اور چہرے پر ایک دل آویز نکھار آ گیا۔ اس کے دل میں آیا کہ اسے ہونٹوں میں جذب کر لے۔۔۔ اس نے اپنی اس خواہش کو دبا لیا۔ اس لیے کہ بات بہت آگے بڑھ جاتی۔ اس نے دل پر بڑا جبر کیا۔ پدمنی مصنوعی حشمت سے دیکھنے لگی۔ پدمنی نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کیا اور وہ دوڑ کر نکل گیا۔ بچوں کی طرح قہقہہ مار کے اس نے دور سے پدمنی کی طرف دیکھا جو اسے ہاتھ ہلا رہی تھی۔ آج اسے یہ جان کر بہت تعجب ہوا کہ وہ بہت عرصے بعد دل کھول کر ہنس رہا ہے۔ اس نے ہوائی بوسہ اس کی طرف اچھال دیا۔

خیر۔۔۔ اب یہ چکر ختم ہو تو لعنت جائیداد کی جاگیر پر۔۔۔ سب سے بڑی جاگیر عشق کی ہے۔۔۔ پدمنی کا عشق جس پر کسی کی اجارہ داری ہے تو میری۔۔۔ ریلوے اسٹیشن پہنچنے تک وہ آنے والے دنوں کے تصور میں گم رہا اور خود ہی مسکراتا گیا۔ اسٹیشن پر وہ کیمین بند پڑا تھا جو ٹیلی گراف آفس بھی تھا۔ وہ کچھ دیر احمقوں کی طرح سر کھجاتا رہا کہ۔۔۔ اب حکم عدولی کیسے کی جائے۔ پھر محاسن کی نگاہ مخالف سمت اٹھی۔۔۔ اس نے ڈیڑھ ٹانگ والے اسٹیشن ماسٹر کو عبثی حصے جنگل جیسے باغ سے برآمد ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ یہاں سب کچھ تھا۔۔۔ لائن مین۔۔۔ بلیک کلرک۔۔۔ ٹکٹ چیکر۔۔۔ اور ٹیلی گراف مشین کا آپریٹر۔۔۔ اس نے بے حد معذرت سے ونودی کی طرف دیکھا۔

”کب سے کھڑے ہیں آپ۔۔۔ مجھے بے حد افسوس ہے کل صبح سے یہاں کوئی نہیں۔۔۔ ممکن ہے آپ کے علاوہ لوگ آ کے چلے گئے ہوں۔ اب وہ میری شکایت کریں گے۔ مگر میں کیا کروں۔۔۔ میں نے کہا تھا کہ دیہات ہو گیا ہے۔

اور شائستہ آدمی تھا۔۔۔ ونود کے ساتھ اس کا رویہ بڑا مشفقانہ تھا اور اس نے بے حد اصرار کے ساتھ ونود کو صحت کی بحالی کے لیے رخصت پر بھیجا تھا۔۔۔ یہ کہہ کر کے قیامت آ جاتی ہے تو آجائے لیکن تم فکر نہ کرنا۔۔۔ اور پھر ایسا کون سا سنگین مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ یا حکم عدولی کا کوئی سوال نہ تھا مگر یوں زبردستی اسے کوئی بلا نہیں سکتا تھا۔۔۔ وہ تار دے سکتا تھا کہ لعنت تمہاری نوکری پر میں اپنا استعفا دیتا ہوں مگر یہ بات کہنے کے لیے بھی تار دینا ضروری تھا۔ اسٹیشن پر واقع تار گھر پہنچنے کا مطلب تھا وہ پدمنی کو کم سے کم پون گھنٹے کے لیے تنہا چھوڑ جائے یا اسے رات کے وقت جنگل میں کسی قسم کا خطرہ مول لے جائے۔ موجودہ حالات میں کسی قسم کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے جواب کو صبح پر ملتوی کیا اور اپنا کی پروا کیے بغیر پھر وہیں سو گیا۔

صبح اس نے پدمنی کو ریوالور کا استعمال سکھایا اور سائیلینسر لگا کے جنگل میں فائرنگ کی مشق کراتا رہا۔ پھر میگزین میں گولیاں بھر کے اس نے ریوالور پدمنی کے حوالے کر دیا اور پھر اس سے کہا۔

”ضرورت پڑنے پر نتائج کی پروا کیے بغیر فائر کر دینا۔۔۔ تذبذب کی قطعی گنجائش نہیں ہوگی کیوں کہ دشمن بہت چالاک اور عیار بھی ہے۔۔۔ اور مسلسل چھ قتل کرنے کے بعد وہ ایک خون آشام درندہ بن چکا ہے جسے کامیابی کے غرور نے ضرورت سے زیادہ اعتماد بھی بخش دیا ہے۔ اپنے دفاع میں قتل کرنا کوئی جرم نہیں۔۔۔ بس گولی چلانے سے پہلے یہ دیکھ لینا کہ نشانہ میرا دل تو نہیں ہے۔۔۔“

پدمنی خوف زدہ ہونے کے باوجود مسکرائی۔ ”اور تم اب خالی ہاتھ اپنی حفاظت کیسے کرو گے۔۔۔“ ”اول تو میرا دشمن کوئی نہیں اور مجھے اپنی نہیں تمہاری حفاظت کرنی ہے۔“ ونود نے ہاتھ اٹھایا اور جھیلی کو کھڑا کر کے ہوا میں فائر کیا۔ ”اور خالی ہاتھ ہونے کے باوجود میں اتنا کمزور اور بے بس نہیں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔۔۔ یاد دشمن سمجھنے کی غلطی کرے گا۔۔۔“

رہا ہے۔ ”گلدک مسٹر ونود!“ مسز سادھنا نے کہا۔  
”امید ہے تم پھر آؤ گے۔“

”آپ کے یہاں آنے کے بعد گزرتو بہت  
پھیلی مسٹر ونود۔۔۔!“ اپنا تھوڑا سا افسردہ ہو کر  
کہا۔ ”آپ بہت اچھے آدمی تھے۔۔۔ ہر بات تو  
میں نے اس لڑکی یعنی نس پدمنی کو بھی بتا دی پھر بھی  
بجھتی ہے کہ تصویریں بنا کر عمر گزاری جاسکتی  
ہے۔۔۔ وہ جاری ہی بنا۔۔۔؟“

”مجھے نہیں معلوم اور نہ ہی میں نے اس سے  
ساتھ چلنے کے لیے کہا۔“ ونود نے انجان بن کر کہا۔  
”یہ اس کی اپنی مرضی ہے اور میں اسے مجبور کرنے  
سے رہا۔۔۔ وہ چوں کہ یہاں پہلے سے تھی۔۔۔ ابھی  
رہے گی کہ اس کا دل یہاں لگ گیا ہے۔ میرا اس کا کیا  
سمبند ہے جو ساتھ چلے گی۔“  
”بہی تو آپ مردوں میں بڑی خرابی ہوتی  
ہے۔۔۔!“ اپنا نے اپنی سابقہ رائے کو مسترد کرتے  
ہوئے کہا۔

بانی باتیں کہنا فضول سمجھا۔ کیوں کہ ونود  
بہر حال تنہا جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔۔۔ پھر پرشاد یاد  
آیا جو اس کی زندگی میں آنے والا پہلا اور آخری مرد  
تھا۔۔۔ ایک راز تھا جو اس کے من کے گوشوں میں  
دفن تھا۔۔۔ وہ قدرت کے معاملے میں دیوانہ نہیں  
تھا۔۔۔ وہ کچھ راتیں کیسے بھول سکتی تھی۔ ایک رات  
جب گیسٹ میں کوئی نہیں تھا۔ مگر اوپر کے کمرے  
میں تھی۔ اس رات سخت جس اور گرمی تھی۔ ہوا بالکل  
بندھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ اس نے اچھی طرح  
نہا اور بال خشک کر کے فرش پر درجی بچھا کے لیٹ گئی۔  
آخری ایام کا جانے تھا جو بادلوں کے پیچھے جاتا اور نکل  
آتا۔ اس نے کپڑے ایک طرف ڈال دیے تھے۔  
اسے بڑے زور کی نیند آ رہی تھی۔ پھر اک دم سے  
بارش شروع ہو گئی۔ مون سون جو تھا۔۔۔ وہ گہری  
نیند میں غرق تھی کہ اس نے محسوس کیا کہ کسی مرد نے  
اسے نیند کی حالت میں بے بس کر دیا اور فائدہ اٹھا رہا  
ہے۔۔۔ وہ ناگ بن کر ڈس رہا ہے۔۔۔ اس پر ایسا

مجھے صرف ایک دن کے لیے اس کی آخری رسومات  
میں جانا ہے مگر اوپر والے نے کوئی آدمی نہیں  
بجھا۔۔۔ اس لیے میں تالا ڈال کر چلا گیا۔“  
”میں شکایت نہیں کروں گا۔“ اس نے  
ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ”مجھے اس تار کا جواب دینا ہے  
جو کل آیا تھا۔۔۔“

”کل۔۔۔“ اس نے حیرانی سے لفاظی لے  
لیا۔ ”میں تو برسوں شام ہی کو چلا گیا تھا۔۔۔ کل  
شام۔۔۔ کیسے آ گیا۔۔۔ اور میں ابھی صبح پہنچا  
ہوں۔“

پھر اس نے غور سے تار کا مضمون پڑھا۔۔۔  
اس کے ماتھے پر شکنوں کا جال گہرا ہو گیا۔ اس نے نفی  
میں سر ہلایا اور اس نے اپنے آفس کا نقل کھولا۔ اندر  
فرش پر تار کے خالی فارم بکھرے پڑے ہوئے  
تھے۔۔۔ ٹاپ رائٹر کھلا رکھا ہوا تھا۔۔۔ میز کی  
درازیں آدھی اندر تھیں اور آدھی باہر تھیں۔ اس نے  
کمرے کی تمام چیزوں کا جائزہ لیا۔ پھر ونود کی طرف  
دیکھا۔

”کوئی یہاں آیا تھا۔ کسی نے شرارت کی  
ہے۔۔۔ تار دہلی سے ہے۔۔۔ کوڈ نمبر کہاں  
ہے۔۔۔ اس میں۔“ وہ بولا۔

”میں سمجھ گیا۔۔۔“ ونود نے تار کا لفاظی واپس  
لے لیا۔ ”دیکھ لو اگر کوئی نقصان نہیں ہوا ہے تو اس  
معاملے میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ ورنہ خواہوا گفتیش کا  
چکر شروع ہو جائے گا۔ بات بہت آگے بڑھ جائے  
گی، پریشانی نہیں ہوگی۔“

نقصان یہاں کیا ہو سکتا ہے۔۔۔ ہر چیز اپنی  
جگہ موجود ہے۔۔۔ وہ بولا۔ ”لیکن میں آپ کے  
مشورے اور تعاون کا شکر گزار ہوں۔“ ونود کا ذہن  
واپسی میں بھی خیالات کی یلغار کا شکار تھا مگر خیالات  
کی نوعیت بدل گئی تھی۔۔۔ مسز سادھنا کے گیسٹ  
ہاؤس چنچنے تک وہ اپنا لائحہ عمل مرتب کر چکا تھا۔ اس  
نے اپنا سامان پیک کرنے کے بعد اپنی میزبان  
خاتون کو مطلع کیا کہ وہ رات کی گاڑی سے واپس جا

نشہ طاری ہوا کہ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور اپنے آپ کو اس ناگ کے حوالے کر دیا۔ اسے لگا تھا کہ اس کی زندگی میں سہاگ رات آئی ہے۔ جب بجلی چمکی تو اس نے ناگ کو دیکھا۔ یہ پرشاد تھا اسے اس سے پرشاد دیوانہ نہیں۔۔۔ نفرت انگیز نہیں لگا۔۔۔ اس لیے کہ وہ مرد تھا۔ آج تک کسی مرد نے اسے توجہ بھری نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ یہ پہلا مرد تھا جس کی محبت بھری سرگوشیاں تھیں اس کے کانوں میں امرت گھول رہی تھیں۔۔۔ اس نے کہا تھا کہ ”اینا۔۔۔! تم شہزادی ہو تم گیت ہو۔۔۔“ وہ پوچھنے تک رہا تھا۔ پھر ایسی مدہوشی چھا گئی تھی وہ گہری نیند سو گئی تھی۔ صبح بے دار ہوئی تو اس پر پرانی شراب کا سا نشہ طاری تھا جب وہ تھکن اتارنے اور جوڑ جوڑ کرنے کے لیے اور کافی پینے کے لیے کچن میں گئی تو دیکھا کہ پرشاد کچن بھی لوٹ گیا ہے۔ رات کا بچا کھانا۔۔۔ آدھا کلو دودھ۔۔۔ بارہ کیلے اور کافی بھی بنا کے پی کے گیا ہے۔۔۔ اس روز اسے پرشاد کی یہ حرکت ناگوار نہیں لگی تھی۔ بلکہ وہ اس کی خاطر مدارت بھی کرتی تھی۔ چائے کافی بنا کر پلائی انڈے بھی ابلتی یہ محبت تھی جس نے ملن کا سلسلہ ایسا دراز کیا کہ دراز ہوتا گیا۔ اپنا بھی کیا کرنی محبت اور جنگ میں ہر چیز جائز ہو جاتی ہے لیکن پرشاد کا اس پر اور کچن پر ضرورت سے زیادہ ہاتھ صاف کرنا زہر لگا تھا۔ اس لیے ہر بات کی حد ہوتی ہے۔ کیوں کہ مالکن نے پوچھا تھا کہ یہ کون اتنا سارا کھانا اور تمام پھل ہڑپ کر لیتا ہے۔۔۔ کھا جاتا ہے۔۔۔ پھر اس نے مالکن سے کہا تھا کہ اسے پرشاد پر شک ہے۔ وہ شاید راتوں رات چوری چھپے آتا ہے اور کچن صاف کر جاتا ہے۔۔۔ اس نے پہلے تو پرشاد کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ باز نہیں آیا۔ اس لیے کہ اسے ایسا کھانا اور پھل کہاں اور کیسے نصیب ہوتے۔۔۔ وہ دن بھر کا بھوکا ہوتا۔۔۔ ہونٹوں کا کھانا بھی پچتا نہ پچتا۔۔۔ وہ چوری کرنا تو اس سے شکم میری نہیں ہوتی تھی۔۔۔ وہ مالکن کو کیسے بتاتی کہ وہ پرشاد سے محبت کرنے لگی ہے

اور پرشاد حد سے تجاوز کرنے لگا ہے۔ جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو وہ اسے جھاڑو اور ڈنڈے سے مارنے لگی۔ گھر کے قریب پھٹنے بھی نہیں دیتی۔ سہاگ راتوں کا یہ جذباتی سلسلہ بند ہو گیا۔ جب پرشاد دو ایک مرتبہ خوب پٹا اور اس کی بری طرح گت بنی اس نے آمد و رفت بند کر دی۔۔۔ لیکن اپنا ایک عورت پرشاد کی محبت اور قرب چاہتی تھی لیکن ان کے درمیان نفرت اور غصے کی دیوار کھڑی ہوئی۔ کیوں کہ پرشاد کچن سے زیادہ دل چسپی لیتا تھا۔ کیوں اب اسے اپنا میں کوئی کشش نظر نہیں آتی۔۔۔ وہ دستر خوان سے خوب سیر ہو چکا تھا۔ لیکن اپنا کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی اور اس نے پرشاد کو بہت سمجھایا کہ وہ کچن سے چوری کر کے کھانا اور پھل نہ لے جایا کرے۔ لیکن پرشاد کے کان پر جوں تک نہیں رہتی تھی۔

دو دو دو پہر کے بعد کافی باؤس اور بار میں بیٹھا مالک سے باتیں کرتا رہا تھا۔۔۔ بار کا مالک مقامی ریڈیو اسٹیشن کی طرح تھا۔۔۔ دودو جانتا تھا کہ جو بات یہاں کہی جائے گی بہت جلد گاؤں میں سب کو معلوم ہو جائے گی۔

”تو مسٹر ونود۔۔۔! یہ جو چھ آدمی قتل ہو چکے ہیں۔۔۔ بلا وجہ ہی مارے گئے۔۔۔ نوسر۔۔۔! میرا ذہن یہ بات تسلیم نہیں کرتا۔۔۔ کہ یہ پولیس کی نااہلی ہے۔۔۔ کرشن اب بوڑھا ہو گیا ہے۔۔۔ ہمیں کسی جوان آدمی کی ضرورت ہے۔۔۔ سریندر کیسار ہے گا۔“ وہ بولا۔

”وہ نوجوان ہے۔۔۔ باپ کے تجربے سے فائدہ اٹھائے گا تو یقیناً بہتر رہے گا۔“ ونود نے کہا۔

”شاید وہ قاتل کا سراغ لگالے۔۔۔ ویسے مجھے ذاتی طور پر امید نہیں۔۔۔ قاتل نے کوئی سراغ نہیں چھوڑا۔۔۔ اور اب پرشاد کے مرنے کے بعد کوئی نئی واردات بھی نہیں ہوتی ہے۔“

”کیا اس کا مطلب ہے قاتل وہی تھا۔۔۔“ مالک نے برادرانہ تجسس کے ساتھ پوچھا۔ ”آپ کی



رائے تو پہلے مختلف تھی۔“

”ہاں۔۔۔ مگر ہر آدمی بعض اوقات غلط رائے قائم کر سکتا ہے۔“ ونود نے اعتراف کیا۔ ”خود مسٹر کرشن بھی قائل ہو گئے تھے۔ مگر۔۔۔ خیر ایشور کرے یہ سلسلہ ختم ہو جائے۔۔۔ پر شاد بھی اسے انجام کو پہنچا۔ اگر یہ سب اس نے کیا تھا اسے اس کی سزا بھی مل گئی۔ جو جیسا کرتا ہے بھرتا بھی ہے اچھا اجازت دیں گڈ بائی۔“

”گڈ بائی۔۔۔ مسٹر ونود۔۔۔!“ بار کے مالک نے کہا۔ ”اگرچہ بعض لوگ آپ سے خوش نہیں ہیں مگر میں ان میں شامل نہیں ہوں۔۔۔ میں دوبارہ ملاقات کا انتظار کروں گا۔۔۔ ایک آخری کپ کافی یا جام۔۔۔ میری طرف سے۔“ بار کے مالک نے دو جام تیار کیے اور بھرے گلاس ٹکرائے اور خالی کر دیے۔

ونود بار سے نکلا اور کرشن کے آفس جا پہنچا جہاں سریندر بھی موجود تھا۔۔۔ اس نے کچھ کہے بغیر تار سامنے رکھ دیا۔

”تو گویا آپ جا رہے ہیں۔“ کرشن نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ”کب روانگی ہے؟“

”آج رات ہی۔۔۔“ ونود نے قطعی فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”ڈیوٹی از ڈیوٹی۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ میری موجودگی میں حالات انتہائی ناخوشگوار رہے۔۔۔ اور میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکا۔۔۔ لیکن آپ اکیلے نہیں ہیں۔۔۔ سریندر آپ کے ساتھ ہے۔۔۔ جوان آدمی زیادہ پر عزم ہوتا ہے اور اس کی رہنمائی آپ کا تجربہ کرے گا تو یقیناً کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔۔۔ اور آپ اس کیس میں بھی قاتل کا سراغ لگا لو گے۔۔۔“ اس تعریف پر سریندر کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ ونود نے باری باری دونوں سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور واپس چل پڑا۔ سورج غروب ہونے کے بعد اپنا اور مسز سادھنا اور اینا نے الوداع کہا۔ متعدد دیگر افراد نے اسے اپنا سوٹ کیس

اٹھائے اسٹیشن کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ جن میں سریندر اور کافی ہاؤس کا مالک بھی شامل تھا۔۔۔ سریندر اس بارہی میں بیٹھا تھا اور ان دونوں نے بیک وقت ہاتھ ہلایا۔۔۔ ریلوے اسٹیشن پر ڈیڑھ ٹانگ کی انتظامیہ کے سربراہ نے بھی اسے بڑی عقیدت سے ٹکٹ پیش کیا اور کچھ معذرت کے ساتھ قیمت وصول کی کہ یہ تو بہر حال سرکار کی جیب میں جائے گی ورنہ کوئی بات نہ تھی۔۔۔ جب گاڑی آئی تو تب بھی وہ موجود تھا۔۔۔ اس کے علاوہ کوئی چھپ کر دیکھ رہا تھا تو اس نے بھی وجود کو گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا۔ اس کی ایک مجرم کی سی نگرانی ہو رہی تھی۔

تاہم ٹرین کے چلنے سے پہلے اسے دوسری طرف سے اترتے ہوئے صرف ایک ڈبے کے مسافروں نے دیکھا۔۔۔ مگر ونود نے ان کی کوئی پروا نہیں کی کہ انہوں نے کیا سوچا سمجھا ہو گا۔۔۔ گاڑی کا پردہ درمیان میں تھا اور وہ اس کی اوٹ میں نکل جانا چاہتا تھا۔۔۔ ٹرین کے گم ہونے تک ونود بھی جنگل میں گم ہو چکا تھا اور قطعی غیر مصروف راستے سے پدمنی کے گھر کی سمت دوڑ رہا تھا۔۔۔ جھاڑیوں سے الجھتا اور درختوں سے بچ کے نکلتا وہ اندازے کے مطابق بھاگتا گیا۔ جب اسے پدمنی کا گھر نظر آیا تو اسے تھوڑی سی تسلی ہوئی۔۔۔ جلی تار بنا کے ونود کو رخصت کرنے کا انتظام کرنے والا یقیناً مطمئن ہو گا کہ وہ اسے مقصد میں کامیاب رہا۔۔۔ اب ایک کم زور عورت کیا کرے گی جو ویرانے میں تنہا رہتی ہو اور برش چلانے کے سوا کچھ نہ جانتی ہو۔۔۔ نہ خنجر، نہ پستول، نہ بندوق وہ اطمینان سے اپنا کام کرے گا۔۔۔ ابھی تو پدمنی جاگ رہی ہو گی۔۔۔ بھرا ہوا ریو اور اس کے پاس ہے۔ خطرہ اگر ہوگا تو اس کے سو جانے کے بعد۔

پدمنی کے خواب گاہ کی کھڑکی بند تھی لیکن شیشوں سے مدھم سا اجالا نکلتا رہا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پردہ ڈالے بیٹھی ہے۔۔۔ ونود نے سوٹ کیس نیچے رکھا اور اپنا کوٹ اتار کے سوٹ کیس پر ڈال

دیا۔۔۔ پھر اس نے ٹائی کھولی اور پتلون کے پانچے  
جرابوں میں اس لیے۔ سکریت کی طلب شدید تھی مگر  
اندھیرے میں ایک ننھا سا شعلہ بھی اس کی موجودگی کا  
راز فاش کر دیتا تو بنانا یا کھیل بگڑ جاتا۔

وہ گھوم پھر کے ایک ایسی جگہ آ گیا جہاں سے وہ  
بیک وقت خواب گاہ کی گھڑی پر اور گھر کے دروازے  
پر نظر رکھ سکتا تھا۔ ایک بار پدمنی نے پردہ ہٹا کے  
گھڑی کی کھولی اور باہر جھانکا۔۔۔ پھر روشنی گل ہو  
گئی۔۔۔ ونود نے گھڑی کے روشن ڈائل میں وقت  
دیکھا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ پدمنی  
پریشان تو ہوئی کہ ونود بتائے بغیر کہاں غائب ہو گیا  
اور شاید اب تک انتظار کرنے کے بعد مایوس ہو گئی ہو  
گی۔۔۔ اس کے آستانہ حسن پر حاضری نہ دینا  
خلاف معمول بات تھی۔۔۔ چنانچہ صبح وہ مسر  
سادھنا سے معلوم کرنے ضرور جائے گی۔۔۔ ونود  
کے لیے تھوڑی سی پریشانی کی بات تھی۔۔۔ اگر اس کا  
منصوبہ ناکام رہا اور قاتل آج رات ہی اس کے  
پھیلانے جال میں گرفتار ہونے نہ آیا تو وہ اگلا دن  
کہاں چھپ کر گزارے گا۔۔۔؟ وہ آج کی رات ہر  
قیمت پر ضرور آئے گا۔۔۔ پرشاد کی موت کے بعد  
اس نے ایک ہفتہ موقع ملنے کے انتظار میں  
گزارا۔۔۔ اور جب اس کے لیے مزید انتظار مشکل  
ہو گیا تو اس نے جنگلی تار بھیج کر ونود کا پتا کاٹ  
دیا۔۔۔ وہ بے حد محتاط تھا۔۔۔ اور آخری مرحلے میں  
کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا لیکن تار دینے کی  
حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ یا تو اس کے اعصاب  
جواب دینے لگے تھے۔۔۔ یا پھر وقت اس کے لیے  
اہم تھا۔۔۔ وہ ونود کی چھٹی ختم ہونے تک انتظار نہیں  
کر سکتا تھا۔ اسے جو کچھ بھی کرنا تھا ایک مقررہ وقت  
میں کرنا تھا۔۔۔ یہ بات وہ خود ہی بتا سکتا تھا کہ وقت  
کی معیاد کتنی تھی اور اس کا خونی مشن کون سے  
مقاصد کے لیے تھا۔ ونود نے مکمل خاموشی میں  
اچانک ابھرنے والی آواز سنی۔۔۔ جنگل کے کونے  
کونے میں جھینگر رونے لگے تھے۔ ونود تو ہم پرست

آدمی کبھی نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جھینگر روتے نہیں گاتے  
ہیں اور یہ آواز اپنی بے حد طویل مونچھوں پر ٹانگوں کی  
رگڑ سے پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ وائلن کی ایجاد  
جھینگر ہی سے منسوب ہے مگر ان حقائق سے آگاہی  
کے باوجود اسے اپنا کی بات یاد آئی۔۔۔ کوئی دنیا  
سے ریخت ہونے والا ہے۔۔۔ یہ بات مضحکہ خیز  
ضرور تھی مگر اپنا کا عقیدہ مسٹر فیشن کی موت کے بعد  
یقیناً زیادہ رائج ہوا ہوگا۔۔۔ کیا آج کی بھی کوئی  
روح عالم فانی سے کوچ کرے گی۔۔۔ کس کی  
روح۔۔۔ وہ ایک ٹانگ پر کھڑے کھڑے تھک گیا  
تھا۔ اس نے اپنے ذہن پیدا ہونے والے احقانہ  
خیال پر لعنت بھیجی۔۔۔ پھٹکارا۔۔۔ پھر وہ ایستادہ  
کھڑا ہو گیا۔۔۔ جنگل کے سکوت اچانک محال ہو  
گیا۔ سارے جھینگروں نے بیک وقت چیپ سادھ  
لی۔۔۔ ونود چونکا ہو گیا۔۔۔ جھینگر ایک حقیر سا کیڑا  
ہے جسے فراغت اور فرصت میسر آئے تو اپنا وائلن  
بجانے کا شوق پورا کرتا ہے اور معلوم نہیں یہ ان کی  
بولی ہے جسے وہ خود سمجھتے ہیں یا محض ایک آواز جس کی  
فریکوئنسی بہت زیادہ ہوتی ہے۔۔۔ لیکن ان کی  
خاموشی ہر حال ایک ایک بات کی خبر دیتی تھی۔۔۔  
کوئی ان کی خلوت میں خلل ڈالنے آ گیا ہے۔۔۔  
کوئی حیوان جس کی موجودگی انہیں خوف زدہ کر سکتی  
ہے۔۔۔ جنگل کا حیوان ناطق۔۔۔ ونود کا پورا  
وجود ہوشیار ہو گیا۔

وہ دیم سادھے گوش بر آواز کھڑا رہا۔ خاموشی  
اتنی گہری تھی کہ دور سے آنے والی ایک آواز بھی  
اسے بہت ہی قریب لگی۔۔۔ کوئی خشک پتی چٹتی تھی۔  
غالباً پیروں کے نیچے آ کر۔۔۔ پھر خشک پتے  
چرچے۔۔۔ صرف ایک بار۔

ونود اس سمت اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ  
کے دیکھتا رہا۔ اسے یوں لگا جیسے ایک مبہم سا گہرا سایہ  
پھر متحرک سایہ دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا  
ہے۔۔۔ چند سیکنڈ بعد جب وہ سایہ درختوں کے تنے  
کی طرح ساکت ہو گیا تو ونود نے اپنی آنکھیں

ملیں۔۔۔ کیا فریب نظر تھا۔۔۔ ب۔ مگر سایہ پھر متحرک ہوا اور پلک جھپکتے میں دیوار پر سے گھر کے اندر اتر گیا۔

سکتے۔۔۔ خبیث!“ وود نے چیخ کر کہا۔ پھر وہ اپنے دشمن پر جا پڑا۔۔۔ وہ دونوں ایک ساتھ نیچے گرے۔۔۔ پہلے ہی راؤنڈ میں وود کو اندازہ ہو گیا تھا کہ دشمن کسی بھی طرح بھی کمزور نہیں۔۔۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو وود کی کمر کے گرد آہنی حلقے کی طرح لپیٹ لیا تھا اور وود کا سانس رکنے لگا تھا۔۔۔ اندھیرے میں وہ دونوں دوبار اوپر سے نیچے ہوئے اور ایک شوکیس الٹ کر چور چور ہو گیا۔۔۔ پھر ایک ٹیبل لیپ گرا۔ وود کی لات لگنے سے ایک کرسی دیوار پر جا لگی۔ ان کے درمیان زور آزمائی اور مقابلہ جاری رہا۔

”پدمنی۔۔۔! پدمنی۔۔۔!“ وود نے چلا کر کہا۔ ”لائٹ۔۔۔ جلدی سے لائٹ آن کر دو۔“ مگر اسے پدمنی سے کوئی جواب نہیں ملا۔۔۔ وہ جواب کیا دیتی۔۔۔ وہ بے حس و حرکت خاموش پڑی رہی۔۔۔ وود کا سینہ کٹ گیا۔ اس کا دل فریاد کرنے لگا۔۔۔ اپنا ہوا آپ پینے لگا۔ کیا وہ مر چکی ہے! وہ تمہارے رپوا اور سے۔۔۔ تمہاری سراغ رسانی کے تجربے اور تمہاری خود اعتمادی کے باوجود مر چکی ہے۔۔۔ کوئی بھی اس کی حفاظت نہیں کر سکا۔۔۔

ودود کا خون رگوں میں ایلنے لگا۔۔۔ اس نے اپنی کہنی قاتل کے سینے پر ماری۔ وہ اس چوٹ کی تاب نہ لا کر کراہا اور ذرا سی دیر کے لیے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وود سمجھ گیا کہ وہ کیوں خاموش ہے۔۔۔! وہ اپنی آواز شناخت کرنے کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا مگر اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔۔۔ اندھیرے میں بھی اس کی صورت کے نقوش واضح ہو گئے تھے۔ اس نے موقع پاتے ہی خود کو الگ کیا اور اپنا ایک ہاتھ اٹھایا مگر قاتل ٹپ کر نکل گیا۔

ودود نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کی ضرب مہلک ثابت ہوئی ہے۔ اس نے اٹھتے ہی وود پر حملہ کیا مگر وود نے اسے اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ پھر وہ سوچ بورڈ کی طرف لگا۔ پٹن دبانے کے بعد بھی اندھیرا باقی رہا۔۔۔ قاتل نے نیچے سے مین سوچ آف کر دیا

پھر وود نے اپنے دل میں اس کی مہارت کا اعتراف کیا اور آگے بڑھا۔۔۔ دوڑنے سے اس کا راز فاش ہو سکتا اور وود قاتل کو خبردار ہونے کا یا فرار ہونے کا کوئی موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔۔۔ اس نے بیس قدم کا فاصلہ پوری احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے طے کیا۔۔۔ تین منٹ کے بعد وہ بھی اندر کود گیا۔ گھر کے اندر پرانے کلاک نے دوبجے کا اعلان کیا تو وہ حیران رہ گیا۔۔۔ گویا وہ تین گھنٹے سے زیادہ انتظار کرتا رہا تھا۔ اسے اپنے سامنے کا دروازہ کھلا دکھائی دیا۔۔۔ وہ چیتے کی طرح چلتا گیا جو اپنے شکار کو تعاقب کی خبر نہیں دیتا۔۔۔ اور اچانک جا پڑتا کہ شکار کو دم لینے کی مہلت نہیں ملتی۔۔۔ گھپ اندھیرے کے باوجود اس نے ہال میں کسی چیز سے ٹھوکر نہیں کھائی۔ سابقہ تجربے کی آنکھ سے وہ ہر چیز کو وہیں دیکھ رہا تھا جہاں وہ بھی۔۔۔ پھر زینہ آ گیا جس کے تختے پرانے اور ڈھیلے ہو چکے تھے۔

ودود کے کانوں میں ایک مانوس آواز آئی۔۔۔ ہلکا سا کھٹکا جو پدمنی کے بیڈروم کا دروازہ کھولنے سے پیدا ہوتا تھا۔ وہ احتیاط کو بھول کر دو دو تین تین زینے جست میں طے کرتا اوپر کی طرف بھاگا۔۔۔ بیڈروم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وود کی آنکھیں اب اندھیرے میں دیکھ رہی تھیں۔ وہ پدمنی پر جھکا ہوا تھا۔ پدمنی اپنے جسم کو بچ رہی تھی مگر اس کی گرفت سے نجات کی جدوجہد بے سود ثابت ہو رہی تھی۔۔۔ وہ قد آور صحت مند مرد تھا جس کی طاقت کا مقابلہ کرنا پدمنی جیسی نازک لڑکی کے لیے ناممکن تھا۔ اس کے حلق سے غرغراہٹ بلند ہو رہی تھی۔ وہ وود کی آہٹ پر چوکنہ ہو گیا تھا۔۔۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی وہ تیزی سے پلا۔

”تم۔۔۔ تم۔۔۔ اب بچ کے نہیں جا

بھیکا۔ مگر ریوالور دروازے سے نکل آیا اور فرش پر گر گیا۔۔۔ وہ زینے کی طرف دوڑا۔۔۔ قاتل اب دروازہ کھول کر جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ونود نے اندر آنے کے بعد ہند کر دیا تھا۔

”میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔“ ونود نے چلا کر کہا۔ ”مگر تم اب بچ کر کہیں نہیں جاسکتے۔“ مگر قاتل جواب دیے بغیر باہر نکل گیا۔۔۔

ونود کے زینے طے کرنے اور دروازے سے باہر آنے تک وہ پچاس قدم دور جا چکا تھا۔ ونود اس کے پیچھے لپکا۔۔۔ قاتل بلا کا حیر رقرار تھا۔۔۔ ونود نے محسوس کیا کہ وہ اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔۔۔ چند سیکنڈ کے بعد وہ جنگل کے گھنے درختوں کے اندھیرے میں گم ہو چکا تھا۔ ”خیر۔“ ونود نے ہانپتے ہوئے سوچا۔

یہ وقتی ناکامی ہے۔۔۔ اب وہ بچ کر عدم آباد ہی جا سکتا تھا۔۔۔ دنیا میں اس کے لیے کہیں پناہ نہیں تھی۔۔۔ پھر وہ واپس دوڑنے لگا۔ اب اسے پدمنی کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔۔۔ کہیں چالاک قاتل دوسری جانب سے گھوم کر پھر گھر میں داخل ہو سکتا تھا۔ دکن پر بھروسہ کرنا بیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔ ریوالور کا خالی ملنا بڑی غیر متوجہ اور حیرت انگیز بات تھی۔ پدمنی یہ بے وقوفی نہیں کر سکتی تھی کہ خالی ریوالور تکیے کیے نیچے رکھ کر اطمینان سے سو جائے۔۔۔ اسے ریوالور خالی کرنا بھی آتا کہاں ہے۔۔۔ یہ حرکت قاتل کی ہو سکتی ہے جس نے جعلی تار دینے کے بعد دن میں کسی وقت ریوالور خالی کر دیا ہو گا کہ وہ رات کو آئے تو خطرے کی کوئی بات نہ ہو۔۔۔ شاید اس وقت پدمنی گھر میں نہیں ہوگی اور قاتل کو حسب توقع ریوالور تکیے کے نیچے مل گیا ہو گا۔۔۔ قاتل کو یہ بات بھی معلوم نہیں ہوگی ریوالور ونود کا ہے ورنہ وہ اس سے پدمنی کا کام تمام کر دیتا۔۔۔ الزام تو شاید ونود پر نہ ہوتا مگر پدمنی مر جاتی تو زندگی بھر اسے اپنی حماکت کا خیال پریشان کرتا اور اس کے لیے جینا محال اور اذیت ناک ہو جاتا۔۔۔

اس نے پدمنی کو اپنی حفاظت کے لیے ریوالور دیا تھا

تھا۔۔۔ یہ مہلت مختصر تھی جو ونود نے جلانے کی ناکام کوشش میں ضائع کر دی تھی۔۔۔ وہ روشنی میں دوسرا فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔۔۔ ایک یہ کہ قاتل بے نقاب ہو جانے کے بعد وقتی طور پر یہ سمجھ لے کہ اب اس کے لیے بچ نکلنے کے امکانات ختم ہو چکے ہیں اور اب یہ زندگی اور موت کی بازی ہے جس میں صرف جیتنے والا زندہ رہ سکتا ہے۔۔۔ دوسرے وہ روشنی میں اپنے خالی ہاتھوں کو جوڈو کے داؤ آزمانے کے لیے بہتر اور موثر طور پر استعمال کر سکتا تھا۔۔۔ حوصلہ افزا بات یہ ہوئی کہ ونود نے پدمنی کے زور زور سے سانس لینے کی آواز سنی اور اس کا حوصلہ دوچند ہو گیا۔ اسے لگا کہ زندگی پدمنی کو نہیں بلکہ اسے ملی ہے۔۔۔ اس کی روح کی شانتی جس نے اسے ایک نیا انسان بنا دیا تھا۔

اس وقت قاتل نے جو دیوار سے ٹکرا کے وقتی طور پر مفلوج ہو گیا تھا۔ جنگلی بھینے کی طرح اس پر حملہ کیا۔۔۔ ونود مقابلے کے لیے تیار ہوا ہی تھا مگر تیزی سے اس کی طرف آنے والا ایک لخت رخ بدل کے دروازے کی طرف دوڑا اور بگولے کی طرح باہر نکل گیا۔ ونود بھونچکا رہ گیا۔ پھر وہ کوندا بن کر پدمنی کے بستر کی طرف لپکا۔ اسے امید تھی کہ پدمنی نے اس کی ہدایت کے مطابق ریوالور تکیے کے نیچے رکھا ہو گا۔

”پدمنی۔۔۔! پدمنی۔۔۔! میں ابھی آتا ہوں۔۔۔ تم پریشان اور خوف زدہ نہ ہو۔“

اس نے ریوالور ہاتھ میں آتے ہی کہا اور سرعت سے باہر بھاگا۔ پدمنی نے جواب نہیں دیا تھا مگر وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ بالکل خیریت سے ہے۔۔۔ قاتل لکڑی کے تختوں پر دم دم اترا جا رہا تھا اور ونود نے کمرے سے باہر آتے ہی دیکھا کہ وہ نیچے پہنچ چکا ہے۔۔۔ اس نے بالکونی سے نشانہ لے کر فائر کیا۔۔۔ کلچ۔۔۔ ہلکی سی آواز آئی۔۔۔ کلچ۔۔۔ ریوالور خالی تھا۔۔۔ اس نے سوچے سمجھے بغیر ریوالور کو گھما کر

دیکھ لیا ہے۔ میں اسے قانون کے حوالے کر دوں گا۔۔۔ اب اسے کہیں بھی پناہ نہیں ملے گی۔ پھر تم جہاں کہو گی ہم چلے جائیں گے۔۔۔ جہاں بھی جائیں گے سکون اور اطمینان سے زندگی گزاریں گے نیچے کلاک نے تین کھٹے بجائے۔۔۔ اس نے پدمنی کے بال اور لباس کو درست کیا۔۔۔ قاتل نے اس کے ساتھ دست دراز کی بھی کی تھی اور پدمنی نے قاتل کی خواہش کو پورا ہونے نہیں دیا تھا۔ ونود نے پھر اسے بستر پر لٹا دیا۔ تلاش کر کے اس کے لیے سکون اور گولیاں کھلا دیں۔۔۔ اور اس کے بستر کے سامنے کرسی بچھ کر بیٹھ گیا اور اس کے سو جانے کا انتظار کرنے لگا۔

وہ جلد ہی گہری نیند سو گئی۔ لیکن ونود ہاتھ میں بھرار پوالور لیے جاگتا رہا۔ دھن کا کیا بھروسہ تھا۔ اس لیے بھی وہ اسے پہچان چکا تھا۔ قاتل اس بات کی کوشش کرے گا اسی اور پدمنی کو موت کی نیند سلا دے۔ شباخت اور قانون کی گرفت سے بچنے کی یہی صورت تھی۔ ان دونوں کو موت کے کھاٹ اتارنے کی کوشش کرے گا۔ پدمنی سو رہی تھی۔ ہلکوں کے درمیان آنکھوں پر بڑے ہوئے تھے۔ وہ جانے کن خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کے معصوم چہرے پر معصومیت کی دل آویزی تھی۔۔۔ وہ اس لیے جاگ نہیں رہا تھا کہ پدمنی کا حسن و شباب جاگ رہا تھا بلکہ قاتل شب خون نہ مار دے۔ اسے ہر قیمت پر پدمنی کی زندگی عزیز تھی۔ اپنی سلامتی سے کہیں زیادہ۔۔۔ اس نے رات آنکھوں پر کاٹ دی۔ لیکن بڑے سکون اور اطمینان اور غور سے اور قریب سے پدمنی کو دیکھتا رہا۔

اتنی بروج کا ذب کا دھندکا پھیلنے لگا۔۔۔ جب ونود نے کرن کے دروازے پر دستک دی تو وہ چند لمحوں کے بعد آنکھیں ملتا ہوا نمودار ہوا۔ اس نے ایک لمبی جمائی لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔  
”مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اتنی صبح اور کوئی نہیں آ سکتا۔۔۔“ وہ بولا ”اور آپ کے آنے کے بعد

مگر پدمنی اس ریوالور کی حفاظت نہ کر سکی کیوں کہ وہ مصوری تھی۔ کوئی پیشہ ور قاتل، سراغ رساں یا پولیس مین نہیں جو سب کچھ بھول سکتا مگر ریوالور نہیں بھول سکتا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے پدمنی کو زینے سے اترتے دیکھا۔۔۔ اس کے ہاتھ میں شمع دان تھا جس پر ایک موم بتی نصب تھی۔۔۔ ایک لمحے کے لیے ونود اس تصویر سین سے مبہوت ہو کر رہ گیا۔۔۔ موم بتی کا ننھا سا شعلہ اس کے رخ روشن کو منور کر رہا تھا۔۔۔ اچالے کے اس حصار میں وہ کوئی آسانی مخلوق لگتی تھی جس نے بادلوں کا لباس پہن رکھا ہو۔۔۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور وہ ایک ہاتھ سے ریڈنگ کا سہارا لیے ہوئے تھی۔۔۔ ونود تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے پدمنی کو سنبھال لیا۔ پدمنی کا پرشاب گداز جسم اس کے بازوؤں کے حلقے میں لرزنے لگا

”تم۔۔۔ تم۔۔۔ تم کہاں تھے۔“ وہ بڑی مشکل سے بولی۔ ”طرح طرح کے دوسوے اور اندیشے مجھے ڈسنے لگے تھے۔“

”میں جان بوجھ کر نہیں آیا تھا۔“ ونود نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ ”میں دراصل قاتل کو موقع دینا چاہتا تھا کہ تمہیں تنہا سمجھ کے آئے اور میں باہر موجود تھا تمہاری حفاظت اور نگرانی کے لیے۔۔۔ میں نے اسے آتے دیکھ لیا تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ بچ کر نکل گیا۔“

”چلو جانے دو۔۔۔“ پدمنی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”یہی کیا کم ہے کہ ہم دونوں زندہ ہیں۔۔۔ بس اب یہاں سے نکل چلو۔۔۔ دہلی۔۔۔ اور اگر اس کے وہاں بھی پہنچے کا خطرہ ہے تو بنگلور۔۔۔ مدراس۔۔۔ کوکنا۔۔۔ اندرون ملک۔“ وہ ونود کے سہارے اوپر چلنے لگی۔

”ہم بہت جلد چلے جائیں گے جان من۔۔۔!“ ونود نے کہا۔ ”اب ڈرنے اور خوف زدہ اور ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ کیوں کہ اب وہ میری گرفت میں ہے۔۔۔ میں نے اسے

خیریت کا سوال غیر ضروری لگتا ہے۔“

”میں آپ کو آخری بار پریشان اور سویرے سویرے زحمت دینے آیا ہوں۔“ ونود نے متانت سے کہا۔ ”سریندر کہاں ہے؟“

”سریندر۔۔۔۔۔“ کرشن چونکا۔ ”معلوم نہیں۔۔۔ عجیب اتفاق ہے کہ مجھے اس کے کمرے میں جانے کی ضرورت پیش آگئی اور مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ موجود نہیں۔۔۔ آدھی رات کے وقت وہ عموماً کہیں نہیں جاتا۔۔۔ ابھی آتے ہوئے میں نے پھر جھانک کر دیکھا تھا۔۔۔ وہ غائب ہے۔۔۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی کے چکر میں پڑ گیا ہے۔“ ونود کو اس کا لہجہ بڑا عجیب اور کھوکھلا لگا تھا۔ اس نے سوچا یہ شاید اس کا وہم ہو۔۔۔

”آپ کا خیال درست ہے۔۔۔ وہ یقیناً کسی چکر میں پڑ گیا ہے۔“ ونود نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ”کیا آپ اس وقت میرے ساتھ چل سکتے ہیں؟“ ”انکار میں کیسے کر سکتا ہوں۔۔۔؟ میری یہ جرات۔“ کرشن نے طنز سے کہا۔ ”لیکن آپ یہ تو بتائیں کہ آخر ہوا کیا ہے؟“

”مس پدمی پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔“ ونود ہٹانے لگا۔ ”لیکن یہ پہلا اتفاق ہے کہ قاتل ناکام رہا۔۔۔ وہ اب جنگل میں روپوش ہے۔“

”آل رائٹ۔۔۔“ کرشن نے خوش دلی سے کہا۔ ”میں دو منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔“ وہ اندر غائب ہو گیا اور وہ واقعی دو منٹ میں لوٹ آیا۔

”کسی نے مس پدمی کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔“ ونود نے کرشن کے ساتھ کار میں بیٹھنے کے بعد کہا۔ ”میری بروقت مداخلت سے وہ کامیاب نہ ہو سکا۔۔۔ آپ نے اس کا چہرہ تو دیکھ لیا ہوگا۔۔۔“ کرشن نے حیرانی سے ونود کو دیکھا جو جذبات سے عاری ساٹ لہجے میں بول رہا تھا اور کرشن کی طرف دیکھنے کے بجائے سیدھا اپنے سامنے پھیلے ہوئے سرسری اجالے کو دیکھ رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ میں نے اسے بہت قریب سے

بہت اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔“ ونود اسی بے حس لہجے میں بولا۔ ”اور مقابلے کے دوران چند چیزیں بھی میرے ہاتھ آ گئیں۔۔۔۔۔ جیکٹ کا ایک بٹن۔۔۔ ایک قلم۔۔۔ پرس شاید گر گیا تھا اسے پتا ہی نہیں چلا اور وہ فرا وقت بدحواسی کی کیفیت میں چھوڑ گیا تھا۔“

”پھر یہ تو کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ تم اسے پہچان لو گے نا۔۔۔“ کرشن نے بڑے جوش سے کہا۔

”ہاں۔۔۔ پہچان تو آپ بھی لیں گے۔“ ونود نے پہلی بار کرشن کو دیکھا۔ ”مسئلہ پہچان لینے کے بعد پیدا ہوگا۔ اسے گرفتار کرنے کا۔“

”کیوں۔۔۔ اگر وہ مجرم ہے تو اسے گرفتار کرنا میرا فرض ہے۔۔۔ اس میں مسئلہ کیا۔۔۔؟“ ”بعض اوقات فرض کی ادائیگی کی راہ میں ایک

نہیں بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔“ ونود نے کہا۔ ”مسائل یا مجبوریاں۔۔۔ جو چاہے کہہ لو۔۔۔ مصلحت کے تقاضے۔۔۔ جذباتی رشتے۔۔۔“

”آپ نے غلط کہا مسٹر ونود۔۔۔!“ کرشن نے سخت لہجے میں کہا۔ ”پولیس مین صرف پولیس مین ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔۔۔ وہ دہلی جیسے بڑے

شہر کا ہوا چاندگر جیسے چھوٹے سے گاؤں کا۔۔۔ فرض شناسی کی آزمائش کے مرحلے بھی کبھی نہ بھی پولیس مین کی زندگی میں آتے ہی ہیں۔۔۔ پولیس مین بننے سے پہلے بھی میں نے اپنے آپ سے یہ سوال کیا تھا کہ کیا بھی میرے لیے ایسا ہی مرحلہ پیدا ہوا تو میں

اس سے کامران گزاروں گا۔۔۔ مجھ سے بہت پہلے بہت سے لوگوں نے اپنی اور اپنے پیاروں کی اور خون کے رشتوں کی قربانی دینے کی ان گنت روایات قائم کی ہیں۔۔۔ کیا میں بھی ان کے نقش قدم پر چلنے

کا اہل ہوں۔۔۔ اور جواب تھا۔۔۔ ہاں۔۔۔ مجھ میں یہ ہمت ہے۔۔۔ اگر جواب نفی میں آتا تو میں اس پیشے سے دستبردار ہو جاتا جس میں اپنی ذات کچھ

نہیں۔۔۔ جو کچھ ہے۔۔۔ وہ دوسروں کی جان و مال اور آبرو کا تحفظ ہے۔۔۔ ہر پیشہ بڑا تقدس آمیز ہے۔۔۔ قانون کا بول بالا کرنے والا۔“

”مجھے آپ کی باتوں سے ریا کاری کی بو نہیں آتی۔۔۔“ ونود نے کہا۔ ”آپ کا لہجہ آپ کی نیت کی صداقت کا آئینہ دار ہے مسٹر کرشن! مگر اس کے باوجود مجھے احساس ہے کہ آپ ایک جوان اکلوتے بیٹے کے باپ ہیں۔۔۔ اور یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ آپ جیسے باپ کا بیٹا قاتل ہے۔“

غیر ارادی طور پر کرشن کا پاؤں ایک سیلیڈر سے ہٹ گیا۔ کار نے ایک جھٹکا لیا اور انجن بند ہو گیا۔ صدمہ کرشن کے ذہن پر گرنے والی بجلی کا تھا جس نے اسے مفلوج کر دیا تھا اور اس کے جسم کی ساری طاقت سلب کر لی تھی۔

”آپ جانتے ہیں کہ میں کوئی بات اس وقت تک نہیں کہتا جب تک میں خود قاتل نہ ہو جاؤں اور مجھے یہ یقین نہ ہو کہ میں دوسروں کو بھی قاتل کر سکوں گا۔“ ونود نے کہا۔ ”اور یہ تو اتنی بڑی بات ہے کہ آسانی سے کہیں بھی نہیں جاسکتی۔۔۔“

مکمل خاموشی میں وقت کا ایک ایک لمحہ کرشن کو چیلنج کرتا ہوا گزرنے لگا۔۔۔ آپ کو اپنا عہد یاد ہے۔۔۔ آپ کو اپنے وہ الفاظ یاد ہیں جو آپ نے ابھی چند منٹ پہلے بڑے غرور کے ساتھ کہے تھے۔۔۔ آپ کو وہ الفاظ بھی چند برس قبل اپنی شریک جیون سے کہے تھے اس وقت جب وہ مر رہی تھی۔۔۔ میں سریندر کو مال بن کر پاؤں لگا۔۔۔ اس کے سوا میرا بے بھی کون۔۔۔ اب اس عہد کا کیا ہوا ہوگا۔ سریندر اب آپ کا بیٹا نہیں رہا نہ آپ اس کی ماں ہو اور نہ اس کے باپ ہیں۔۔۔ آپ صرف پولیس مین اور وہ صرف ایک قاتل ہے۔۔۔ شاید وہ قاتل جس کے دامن پر چھ بے گناہوں کا لہو ہے۔۔۔ فرض شناسی کی آزمائش کا وقت آ گیا ہے مسٹر کرشن!“

”اگر قاتل واقعی سریندر ہوگا تو آپ دیکھ لیں گے اسے گرفتار کرتے ہوئے میرے ہاتھوں میں ذرا سی بھی لغزش نہیں آئے گی۔“ کرشن نے پھر کار اسٹارٹ کرتے ہوئے سکون اور اعتماد کے ساتھ کہا۔

”آپ کے لیے بیٹے کو گرفتار کرنا آسان تو ہے اس سے حقیقت کا اعتراف کرنا بھی آسان ہوگا۔“ ونود نے کہا۔ ”لیکن پہلے تو اسے تلاش کرنے کا مرحلہ ہے۔۔۔ میں نے اسے جنگل میں گم ہوتے دیکھا تھا۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بعد میں جنگل سے نکل کر کہیں فرار ہو گیا ہو۔“

کرشن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”آپ سے زیادہ میں اسے سمجھتا ہوں۔“ اس نے کار کو سڑک کے ایک طرف روک لیا۔

”یہ بات ہے تو آپ مجھے ایک بات سمجھائیں۔“ ونود نے کہا۔ ”وہ چاند نگر کے قانونی وارثوں کو کون کیوں کر رہا تھا؟“

ونود نے اپنی بات ختم کر کے کرشن کی طرف دیکھا۔ اس سوال نے کرشن کے اعتماد کی کھوکھلی بنیادوں کو ہلا دیا ہے۔۔۔ شاید ابھی تک وہ اس امید سے خود کو فریب دے کر مطمئن رکھنے کی جدوجہد کر رہا تھا کہ بعض الزام عائد کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔۔۔ عدالت ثبوت مانگتی ہے۔۔۔ محض ایک فلم۔۔۔ یا ایک بن پاپرس از خود ثابت نہیں کر سکتے کہ پدمنی پر قاتلانہ حملہ کرنے والا سریندر تھا۔۔۔ سریندر کا پدمنی سے میل ملاپ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ کچھ لوگ تو یہ بھی کہنے لگے تھے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے بہتر رفیق حیات نہیں مل سکتا۔۔۔ چنانچہ سریندر کی کچھ چیزیں اگر پدمنی کے گھر لگتی ہیں تو کیا ہوا۔۔۔ اس سے صرف یہی ثابت ہو سکتا ہے کہ سریندر رات کو اس گھر میں تھا۔۔۔ مگر اب یہ امید یک نخت سراب ثابت ہو گئی تھی۔

ونود جو بڑے شہر کا بڑا اور ماہر سراغ رساں تھا۔۔۔ سب کچھ پہلے ہی معلوم کر چکا تھا۔۔۔ کرشن کو چھائی کا پھندا اوجان بیٹے کی گردن میں صاف نظر آنے لگا تھا۔۔۔ وہ پولیس مین جو بڑے اعتماد سے فرض شناسی کی ایک اور روایت قائم کرنے کا دعو کر رہا تھا۔ نہ جانے کون تھا۔۔۔ ونود کے سامنے صرف ایک باپ جو اپنے اکلوتے بیٹے سے محرومی کے خیال

سے دہشت زدہ لرزہ بر اندام بیٹھا تھا۔ ایثور نے پہلے اسے شریک حیات سے محروم کیا تھا اور اس نے بڑے صبر و استقامت کے ساتھ تنہائی کے سفر کا عذاب اٹھایا تھا مگر اس کے بڑھاپے کی لالچی بھی تقدیر کے بے رحم ہاتھ جھین رہے تھے ذرا سوچ رہا تھا کہ اب وہ کس کے سہارے جائے گا۔ جینے کی آرزو کے لیے کوئی بہانہ ہونا چاہیے۔۔۔ آدی صرف اپنے لیے کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔

خاموشی کا وقفہ نزع کے کرب کی طرح طویل ہوتا گیا۔ بالآخر ونود نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ”آئی ایم سوری کرشن!“ کرشن چونکا۔ اس نے ماتھے پر سے پسینہ رومال سے خشک کیا۔

”کوئی۔۔۔ کوئی بات نہیں مسٹر ونود۔۔۔! یہ مقدر کے کھیل ہیں۔۔۔ آپ کیا کچھ معلوم کر چکے ہیں۔۔۔“ ونود نے کم سے کم الفاظ میں کرشن کو وہ سب کچھ بتادیا جو اس نے پدمی کو بتایا تھا۔

کرشن اپنا سر اسیرنگ رکھے بڑے غور سے سنتا رہا۔۔۔ ونود کو اپنی بے رحمی پر شرم آئی۔۔۔ کاش! یہ سب کچھ کسی اور نے کرشن کو بتایا ہوتا۔ کاش! وہ چاند مگر ہی نہ آیا ہوتا۔۔۔ ادھر ادھر ہونے والے متعدد جرائم کی خبروں کے ساتھ وہ اخبار ہی میں اس خبر کو بھی سرسری طور پر پڑھ لیتا اور بھول جاتا۔ اسے ایسا صدمہ نہ ہوتا۔ اس دنیا میں کیسے کیسے جرائم ہوتے ہیں۔ مجرم قانون کے ہتھے نہیں چڑھتے ہیں۔

”میں آپ کی ذہانت اور آپ کی محنت کا اعتراف کرتا ہوں۔“ کرشن نے سر اٹھا کے کہا۔ ”آپ کی معلومات میں قدرے اضافہ بھی کر دیتا ہوں ویسے تو یہ بات بھی چھپی نہیں رہ سکتی تھی کہ۔۔۔ اور تفتیش کے دوران آپ کو اپنے سوال کا جواب مل ہی جاتا کہ سریندر نے یہ قتل عام کیوں کیے۔۔۔ مجرم تو میں بھی ہوں کہ شبہ ہونے کے باوجود میں نے کسی پر اس کا اظہار نہیں کیا اور تفتیش کو جھٹکنا نہیں سہی۔۔۔ میں فرشتہ نہیں۔۔۔ وہ آدی ہوں جو خطا کا پتلا ہے اور اپنی فطری کم زوریوں سے نہیں لڑ

سکتا۔۔۔ آپ نے ابھی سیتا کی ایک بیٹی کا ذکر کیا تھا جس کا شجرہ نسب تیسری نسل پر آ کر ختم ہو گیا تھا۔ کیوں کہ آخری وارث لا ولد تھا۔۔۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایثور نے انہیں اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے ایک لڑکے کو قانونی طور پر گود لے لیا اور اسے بیٹا بنالیا تھا۔۔۔ میرا اصل باپ پرکاش کرشن تھا۔۔۔ مگر مجھے یاد نہیں کہ وہ کس عمر میں مجھے یتیم کر گیا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ ماں مجھے جنم دینے وقت مر گئی تھی۔ چنانچہ میں نے ہوش سنبھالا تو چاند تارا چند کے گھر میں تھا اور میرا نام کرشن نہیں پرکاش تارا چند ہو چکا تھا۔۔۔ جوان ہونے تک مجھے تھا قتل کا علم بھی ہو چکا تھا اور مجھے قانونی بیٹا بنانے والوں نے مجھ سے جذباتی محبت نہ سہی قانونی محبت بھی نہیں کی تھی۔۔۔ شاید سوتیلے بیٹوں کو بھی نفرت کے ساتھ تھوڑا سا پیار مل جاتا ہے۔۔۔ کبھی حقیقی ماں کا بھی حقیقی باپ۔۔۔ مگر مجھے صرف نفرت ملی۔۔۔ ترس اور رحم کے جذبات کی خیرات۔۔۔ حقارت کی نظر اور ذلت و رسوائی۔۔۔ طعنے اور تلخ اور کڑوی سیلی اور زہر آلود باتیں کہ۔۔۔ منحوس نے اپنی زندگی کے لیے ماں کی جان لے لی۔۔۔ پھر باپ کو کھاکھا گیا اور اب۔۔۔ خیران باتوں کو دوہرانے کا کیا فائدہ۔۔۔ مختصر یہ کہ میرے قانونی ماں باپ بھی مر گئے تو میں نے نفرت کے اس طوق کو گلے سے اتار بھیجا۔۔۔ میں نے پھر اپنا نام وہی کر لیا جو میرا اصل نام تھا۔ یعنی کرشن۔۔۔ چالیس برس کے بعد کوئی گواہ نہیں رہا تھا کہ میں بھی چاند تارا چند سے تعلق رکھتا تھا۔۔۔ میرا بیٹا بھی سریندر تارا چند نہیں۔۔۔ سریندر کرشن۔۔۔ مگر نام کی تبدیلی سے قانونی حیثیت نہیں بدلی۔۔۔ وہ چاند تارا چند کیسی کا ایک وارث تھا ان سب کی طرح جو اس کے ہاتھوں مارے گئے۔۔۔ اب وہ چاند مگر کا واحد قانونی وارث ہے۔“ وہ جی سے ہنسا۔ ”میں نے آپ کے سوال کا جواب دے دیا ہے۔۔۔ آؤ اب مجرم کی گرفتاری میں میری مدد کرو۔۔۔ میرے ساتھ رہو تا کہ میرے قدم نہ



”لگائیں۔“

سریندر کے ہاتھوں نے ونود کی گردن کو جکڑ لیا۔ پھر اس نے ونود کا سر زمین پر دے مارا۔ ونود کی آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں رنگین تارے بھللائے لگے اور اس کا سانس رکنے لگا۔

زندہ رہنے کی آرزو نے ونود کو ایک وحشانہ قوت عطا کر دی اور اس نے نیچے سے سریندر کے پیٹ میں مکا دے مارا مگر سریندر کی قوت برقرار رہی۔ ونود کے ہاتھ میں ٹٹولنے سے ایک پتھر آ گیا۔ اس نے ہاتھ گھما کے پتھر کو سریندر کے سر پر مارنا چاہا مگر ضرب کی شدت اتنی نہ تھی کہ اس سے سریندر کا سر پھٹ جاتا۔ تاہم ایک لمحے کے لیے سریندر چکرا گیا اور اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔۔۔ ونود نے دونوں ٹانگیں سمیٹ کر اسے پوری قوت سے دھکا دیا اور سریندر کے گرتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

اتنی مہلت اس کے لیے کافی تھی مگر اس نے سریندر کو جڈو کا وار کرنے کی پوزیشن لیتے دیکھا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ مقابلہ سخت ہے اور دشمن آسانی سے زیر ہونے والا نہیں ہے۔“ سریندر کی آنکھوں میں ایک وحشانہ اور سفاک چمک تھی۔ خون کی وہ پیاس جو بھوکے درندے کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ۔۔۔ اس منزل تک آ جانے کے بعد میں صرف ایک آدمی کے باعث ناکامی قبول کر لوں گا۔۔۔“ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

”میرے لیے صرف ایک راستہ کھلا رہ گیا ہے کہ مسٹر ونود! تمہیں ماروں اور اس سنسار سے نیست و نابود کر دوں۔۔۔“

”تم اس کے باوجود چاند نگر کے وارث نہ بن سکو گے،“ ونود نے چوکس رہتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا باپ بھی اس بات کو جانتا اور سمجھتا ہے۔“

”اس کی فکر نہ کریں آپ۔۔۔! وہ میرا باپ ہے دشمن نہیں۔۔۔ وہ بھی چاند نگر کا مالک ہے۔“

وہ کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔۔۔ ونود دوسری طرف سے باہر آیا۔۔۔ ایک ساتھ کھڑے ہو کر انہوں نے اپنی سامنے پھیلے ہوئے جنگل کو دیکھا اور ریو اور نکال لیے۔ بائیں جانب سمندر سے ایک خوبی سورج طلوع ہو رہا تھا اور صبح کا آغاز اپنے پرستار غنوں سے کرنے والے پرندے آج جیسے رورہے تھے۔

”مسٹر کرشن!“ ونود نے کہا۔ ”یہ بہتر ہوتا اگر ہم کسی اور کو بھی ساتھ لے لیتے۔۔۔ یہ جنگل بہت بڑا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہوگا۔۔۔۔۔“ کرشن نے قطعی لہجے میں کہا۔ ”جب وہ چھوٹا سا تھا تو اکثر اس جنگل میں گم ہو جاتا اور تلاش کرنے پر دو ہی مقامات پر ملتا تھا۔۔۔ میں آپ کو اندازے کے لیے راستہ سمجھا دیتا ہوں۔۔۔ ایک طرف آپ جائیں گے۔۔۔ اور دوسری طرف میں خود جاؤں گا۔۔۔ اور مسٹر ونود۔۔۔!“ وہ کچھ کہتا چاہتا تھا مگر پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

ونود پوری احتیاط سے کرشن کے بتائے ہوئے راستے پر آگے بڑھا۔ سورج کی دھوپ کا رنگ اب چاندی جیسا ہو گیا تھا۔ آشیانوں سے نکلنے والے طیور تلاش رزق کے لیے پرواز کر چکے تھے۔۔۔ اور جنگل میں وہی پرانا سناٹا لوٹ آیا تھا جس میں کبھی کبھی کسی ہندے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ پر پیچ راستہ اپنے درختوں کے درمیان ٹل کھاتا بڑھتا جا رہا تھا۔۔۔ کبھی کچھ راستہ دو حصوں میں بٹ جاتا تھا تو ونود کی ہدایت مطابق دائیں یا بائیں مڑ جاتا تھا۔ اس کی نظر وہ چٹان تلاش کر رہی تھی جو سائبان کی طرح چلی ہوئی تھی۔

چٹان چہ میل بھر کا راستہ طے کرنے کے بعد اب ایک درخت پر سے کوئی بھاری بھر کم وجود اس پر لراؤ وہ سنبھل نہ سکا۔۔۔ ریو اور اس کے ہاتھ سے اواز کر گیا اور وہ اس بوجھ کے نیچے دب گیا۔۔۔

سریندر نے نفرت اور حقارت سے کہا۔

وہ نے اسے حملہ کرنے کا موقع دیے بغیر جسٹ لگائی مگر سریندر نے بڑی مستعدی سے خود کو بچایا اور ونود کے ایک فلائنگ کلک رسید کی مگر ونود نے اس کی ٹانگیں کھینچ لیں اور قلابازی کھا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ سریندر نے دوبارہ فلائنگ کلک مارنی چاہی۔ ونود نے پھر اس کی ٹانگیں کھینچ لیں اور وہ اپنے ہی زور میں دور جا گرا۔ پلک جھپکتے میں اس نے ونود کا ریوالتور اٹھا لیا۔ ونود اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ سریندر کچھ دیر اپنی سانس کو قابو میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔

”آپ نے خود کشی نہ کی ہوتی تو اچھا تھا مسٹر ونود۔۔۔ میں آپ کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔۔۔ میں نے اس لیے آپ کو واپس بھیجنے کی کوشش بھی کی تھی۔۔۔ آپ چلے گئے ہوتے تو زندہ رہتے۔۔۔ اگر آپ میری جگہ آپ بھی تقدیر کی اس پیش کش کو ہر قیمت پر قبول کرتے۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے سریندر۔۔۔!“ ونود نے کہا۔ ”اس جزیرے کے تمہیں زیادہ سے زیادہ دو کروڑ روپے ملیں گے۔“ سریندر مسکرایا۔۔۔ کیا دو کروڑ روپے بھی کم ہوتے ہیں۔۔۔ دو کروڑ سے دس کروڑ بنائے جا سکتے ہیں۔۔۔ مگر جالندھر میں نانکوں سے سر کھانے والا کلرک اس کے خواب تک نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ میں اب کلرک نہیں ہوں۔ چاندنگر کا مالک ہوں سودا کرنا میرا کام ہے حکومت کو اس زمین کی سخت ضرورت ہے۔۔۔ دفاعی نقطہ نظر سے اس جزیرے کی جغرافیائی پوزیشن کو مثالی قرار دیا گیا ہے اور ماہرین نے کہا ہے کہ پانچ کروڑ تک میں بھی یہ زمین خرید لی جائے تو معلوم نہیں یہاں کیا ہوگا۔۔۔ کوئی جو ہری تجربہ یا کوئی ریسرچ کا کام۔۔۔ لیکن میں نے ٹاپ سیکرٹ فائل میں پورا نوٹ پڑھ لیا تھا۔۔۔ میں پانچ کروڑ کا مالک بن چکا ہوں مسٹر ونود۔۔۔!“

”ابھی نہیں سریندر۔۔۔!“ بائیں جانب سے کرشن کی آواز آئی۔ ”ابھی تو میں زندہ ہوں۔۔۔ میرے بعد واقعی تم مالک بن جاؤ گے۔۔۔“ سریندر کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لیے متغیر ہو گیا اور آنکھوں سے وحشت جھانکنے لگی۔

”آپ درمیان میں نہ پڑیں پتا جی۔۔۔“ اس نے گھوم کر دیکھے بغیر کہا۔

”میں تمہیں چاندنگر کے انسپکٹر کی حیثیت سے حکم دیتا ہوں کہ ریوالتور ڈال دو۔“ کرشن نے تلخمانہ سخت اور خشک لہجہ میں اس سے کہا۔

”اچھی بات ہے پتا جی۔۔۔!“ سریندر نے ریوالتور اٹھایا۔ ”بس ایک منٹ۔۔۔ میں ریوالتور ڈال دوں گا۔“

”سریندر۔۔۔!“ کرشن چلایا۔ ”میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“

سریندر کا ہاتھ رک گیا۔ ”آپ مجھے شوٹ کر دیں گے۔۔۔“ وہ ہنسا، ”نہیں پتا جی۔۔۔ آپ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔۔۔ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔۔۔ آپ خود کو شوٹ کر سکتے ہیں مگر مجھے نہیں۔“

اس نے پھر ریوالتور اٹھایا ہی تھا کہ ونود غوطہ کھانے لگا۔۔۔ بیک وقت دو فائر ہوئے اور ونود۔ سریندر کو پیٹ پکڑ کر زمین پر گرتے دیکھا اس ریوالتور جھپکے سے دور جا گرا تھا۔۔۔ ونود نے جھپکا کر ریوالتور کو اٹھایا اور جیب میں رکھ لیا۔

کرشن ایک درخت کی اوٹ سے نمودار ہوا! آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ وہ خواب میں چلنے والے طرح پلک جھپکاے سریندر کی طرف دیکھتا ہوا بڑے سریندر کے قریب پہنچ کر وہ گھٹنوں کے بل گرا اپنے سینے پر جھک گیا۔۔۔ جس کی آنکھوں میں یقینی کاسار اگرب سمٹ آیا تھا۔

”سریندر۔۔۔!“ سریندر۔۔۔! تم یہ با کیوں بھول گئے تھے کہ تمہارا باپ پولیس مین ہے۔“

اپنا ستارہ جیب پر سے الگ کیا اور بیٹے کی لاش پر رکھ دیا۔

”اس سے زیادہ حکومت مجھ سے نہیں لے سکتی بیٹے! یہ آخری چیز تھی جو میں نے خود ہی حکومت کے حوالے کر دی ہے۔“ وہ خود فراموشی کے عالم میں بڑبڑایا۔

☆☆☆

وندو ویران پلٹ فارم پر ساکت و صامت کھڑا ہوا تھا۔ اس کے مقابل میں وہ پکارا سہ تھا جس پر چل کر وہ چاندگر پہنچا تھا۔ اس راستے پر وہ پہلی بار ایک دیوانے سے ملا تھا جسے چاندگر کے شہزادے اور زمین کی شہزادی کی کہانی پوری نہیں آتی تھی۔۔۔ جسے معلوم نہیں تھا کہ شہزادی نے ایک دین کیا کہا تھا۔۔۔ وہ جگہ اب بھی وندو کے سامنے تھی۔۔۔ وندو کے تصور میں وہ گھر کے چراغ سے نہیں انصاف کرنے والوں کی آتش انتقام سے آگ لگی اور جس نے ایک انمول خزانے کو رکھ کر دیا۔۔۔ اس خزانے میں کیا نہیں تھا۔۔۔ مسرت تو ایک جذبہ ہے جو رنگین کالج کے نکلنے میں بھی رہتا ہے اور کوہ نور ہیرے میں بھی۔۔۔ جو دیوانے کی جھگی میں بھی رہتا ہے۔۔۔ جس شان سے دنیا کے کسی بڑے سے بڑے محل میں بھی۔۔۔

چاندگر اب کسی کانٹا نہیں تھا۔ ایک کیپٹن کو عطا ہونے والی جاگیر کے سارے وارث اس کی مٹی میں دفن ہو چکے تھے۔ اب حکومت جو چاہے کرے۔۔۔ اسے پانچ کروڑ کیا اس پاگل کو پانچ روپے بھی نہیں دینے پڑیں گے جو چاندگر کا مالک ہے اور جو پہلے اس بستی کا اسپر تھا مگر اب گاؤں سے باہر ایک غار میں برہنہ تنہا رہتا ہے اور کسی کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں۔

”وندو۔۔۔!“ پدمنی نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔  
”گاڑی آگئی ہے۔“ وندو نے سر ہلایا اور دونوں سوٹ کیس اٹھالے۔

”آپ۔۔۔ آپ نے مجھے۔۔۔ زندہ رہنے کا ایک موقع دیا ہوتا پتا جی۔۔۔“ وہ انگلی اٹھا کے بولا۔ ”تو آپ بھی میری طرح غلامی کا یہ طوق اتار کے پھینک سکتے تھے۔۔۔ یہ کیسی وفاداری۔۔۔ کیسی فرض شناسی ہے پتا جی۔۔۔ اتنی معمولی۔۔۔ سی تن خواہ کے لیے۔۔۔ مٹھی بھر روپوں کے لیے آپ۔۔۔ آپ نے یہ نہیں سوچا۔۔۔ کہ میرے بعد کیا ہو گا۔۔۔ حکومت نے کیا۔۔۔ کیا دیا تھا آخر۔۔۔ آپ کو۔۔۔ ساری عمر کا حساب جوڑیے۔۔۔ کیا پانچ کروڑ کا آدھا۔۔۔ آدھے کا آدھا۔۔۔ بنتا ہے۔ آپ نے گھائے کا سودا کیا ہے پتا جی! آپ نے سب کچھ گنوا دیا۔۔۔ چاندگر کی جاگیر۔۔۔ اپنا بیٹا!“

کمرش کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو خاموشی سے ان جھریوں میں بہتے رہے جو عمر کے ساتھ اس کے چہرے پر پھیلتی جا رہی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کو بے بسی سے مرتاد دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ اس جنگل سے گاؤں بہت دور تھا اور سریندر کے جسم سے اتنا خون بہہ چکا تھا کہ اسے اٹھا کر لے جانے کی کوشش کرنا بے سود تھا۔ اگر اسے بچانے کا سامان ہوتا تب بھی کیا تھا۔۔۔ زندگی کا انجام بہر حال موت تھی۔ وہ موت جو اس سے زیادہ پر عذاب انتظار کے بعد تختہ دار پر آتی ہے۔۔۔ جب رحم کی آخری اپیل پھر مسترد ہو جاتی۔

”آئی ایم سوری۔۔۔ بیٹے! مجھے معاف کر دو۔۔۔ میں نے بہت کوشش کی۔۔۔ بات پانچ کروڑ کی نہیں۔۔۔ تم جیسے واپسوں کے خون کی تھی۔ اور ایک پاگل کے لہو کی تھی۔۔۔ پھر سب نے مل کر مجبور کر دیا مجھے۔۔۔ میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ۔۔۔ لیکن ان سب کا مقابلہ میں اکیلا کیسے کرتا۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا کیوں کہ سریندر بیٹا اس کا عذر سننے بغیر مر گیا تھا۔ اس نے

ایک جوان، انتہائی پرکشش اور پرشباب  
گداز بدن کی شعلہ مجسم کے گرد گھومتی کہانی۔  
جس نے اپنے شوہر کو راستے سے ہٹایا اور ایک  
پولیس آفیسر کو اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے  
اپنے سگے باپ اور بہن کو بھی نذر آتش کیا۔ اپنے  
بھائی کو بھی موت سے ہمکنار کیا اور چچا کو  
بھی۔۔۔ موت کا نشانہ بنانے اور زندہ دفن کی کوشش  
کی۔۔۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری جوان لڑکے اور  
مرد تھے۔

## خونی کھیل

ایم الیاس

ایک لڑکی جو جتنی خوب صورت تھی اتنی  
ہی نرم دل تھی۔ اس کا دل بھی بڑا خوب صورت  
تھا۔ اسے نفرت کرنا آتا ہی نہیں تھا۔۔۔ حویلی میں  
ایک خونی کھیل جو رقص کر رہا تھا۔  
ایم الیاس کی خصوصی تحریر جو آپ کو بہت  
پسند آئے گی۔ نذر قارئین ہے۔

پتھر دل انسانوں کی کہانی جو بڑے سفاک اور درندہ صفت تھے



”انیل بھیا کی۔۔۔“ اس نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔“ ایک جوان عورت نے ہندیانی لہجے میں چیخ کر کہا۔ ”تم جھوٹ بول رہے ہو۔۔۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔۔۔ بولو جھوٹ ہے۔“

”چہرہ دکھاؤ۔“ دوسری عورت بگڑ کے بولی۔

”کوئی اور ہوگا۔“ انیل بھیا اوتار تھے۔ انہیں کبھی موت نہیں آ سکتی۔“

کشتی میں لاش کے پاس کھڑے ہوئے ایک شخص نے لاش پر سے چادر ہٹا دی تو اس کا چہرہ بھی کسی مرد کے کی طرح ہو رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں یہ نیل بھیا ہیں۔“ ایک مرد نے زوردار آواز میں کہا۔ ”ہمارے دیوتا بھیا۔“ پھر وہ رو دیا۔

”انیل بھیا۔۔۔! انیل بھیا۔۔۔! ہمارے انیل بھیا۔۔۔! دیوتا بیٹا۔۔۔!“ ہر طرح چیخ و پکار مچ گئی۔

تھوڑی دیر بعد انیل کی لاش اس کے گھر میں صحن میں رکھی ہوئی تھی۔ وہاں موجود کون ایسا تھا جو دھاڑیں مار مار کے نہیں رو رہا تھا۔

اس چارپائی کے پاس جس پر انیل کی لاش رکھی تھی۔ اس کا بھائی دونو ایک کونے میں بت بنا بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا اور اپنے بھائی کی لاش کو نجد نظر دوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے فرض شناس بھائی کو خوب جانتا تھا۔ اس نے کئی بار کہا تھا اور کہتا رہتا تھا۔

”دونو۔۔۔! وقت کا ہر لمحہ ناقابل اعتبار ہوتا ہے۔۔۔ میں نہیں جانتا کہ میری زندگی کب تمام ہو گی۔۔۔ میں پولیس کی ملازمت میں آنے سے قبل بھی مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچاتا رہا۔ پولیس کی وردی پہننے کے بعد تو میرے فرائض میں اور شدت پسندی آ گئی۔ میں نے بھی کسی طاقت ور اور با اثر اور بڑی سے بڑی شخصیت کو نہیں بلکہ قانون کو دیکھا۔۔۔ قانون کی لاشی نے کسی کو نہیں بخشا ہے۔۔۔ اور

**صبح** کا وقت تھا۔ شام پور کی ندی کنارے زندگی جہنم لے چکی تھی۔ لڑکیاں عورتیں کپڑے اور برتن دھو رہی تھیں۔ نہ صرف بچوں کو نہلا رہی تھیں بلکہ خود بھی نہلا رہی تھیں اور ادھر مردوں کو لڑکوں کو آنے کی ممانعت بھی تاکہ آزادی سے نہلا اور تیر سکیں۔

دوسری طرف گاؤں کے مچھیرے شکار پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ چاروں طرف جو سناٹا تھا۔ چڑیوں کی چکارنے صبح کو سہانا کر دیا تھا۔ دن کا اجالا تیزی سے ہر سمت پھیل رہا تھا۔

اجانک خاموش فضا میں انسانی آوازوں کا شور سا اٹھا۔ ایک عورت نے ہزیانی لہجے میں چیخ کر کہا۔

”وہ ادھر دیکھو۔۔۔“ کشتی میں انسانی آوازوں کا شور سا اٹھا۔ ایک عورت نے ہزیانی لہجے میں چیخ کر کہا۔

”وہ ادھر دیکھو۔۔۔ کسی کی لاش لائی جا رہی ہے۔۔۔ ہائے رام کس کی ہو سکتی ہے۔۔۔؟“

ندی کنارے لڑکیاں عورتیں۔۔۔ لڑکے مرد بھی چوسنے اور کام چھوڑ کے اس طرف متوجہ ہو گئے۔۔۔ وہ کشتی مغربی سمت سے آ رہی تھی۔ اس کے عرشہ پر جو چارپائی تھی اس پر لاش رکھی تھی۔ لاش کو سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ معلوم نہیں دیتا تھا کہ عورت کی لاش ہے یا کسی مرد کی۔۔۔ کیوں کہ کشتی اتنی دور تھی کہ ٹھیک سے دکھائی نہ دیتا تھا۔ چوں کہ لاش پر چادر ہونے سے لگ نہیں رہا تھا کہ کس کی ہو سکتی تھی۔ اتنا ضرور تھا کہ یہ کسی ڈاکو، گھیرے اور مجرم کی نہ تھی۔ اگر ہوئی تو وہ چادر سے ڈھکی نہ ہوتی۔

یہ خیر جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ جب تک کشتی قریب آئی اس وقت تک بچہ بچہ اور سارا گاؤں اٹھ آیا۔۔۔ سنسنی، خوف و دہشت اور ہراس پھیلنا ہوا تھا۔ ہر شخص پر تجسس تھا۔

”یہ کس کی لاش ہے بیٹا۔۔۔!“ کشتی کے قریب آتے ہی شامو چاچا نے کشتی میں کھڑے ہونے والے جوان لڑکے سے پوچھا۔

دیکھو۔۔۔ تم ابھی جوان ہو۔۔۔ باہمت ہو اور ساتھ ساتھ بلا کے ذہن بھی۔۔۔ ذہانت سے بڑا موثر ہتھیار کوئی نہیں۔۔۔ میرے بعد تمہیں قانون کی بالا دستی کے فرض کا یہ کام نہیں کرنا ہے۔۔۔ اور ہاں دیکھو۔۔۔ جس صبح کا آفتاب میری زندگی کا چراغ گل کر دے، اس شب کے اندھیرے کی پناہ کو غنیمت سمجھنا اور ہر قدم پر محتاط رہنا کہ قاتل کی دست رسانی میری زندگی کی طرح ختم کرنے کی کوشش نہ کرنا۔۔۔ پھر دو دن اپنے بھائی کی شکست کو دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے کھلی آنکھوں کی التجا کو بے اثر دیکھ کر مردہ مجسموں نے پکارا ہو۔ اس کے تیل بھیا کی آتش آرا کہیں دور سے آئی۔۔۔ ”وود۔۔۔! مجھے تمہارے آنسوؤں کی نہیں تمہارے عزائم کی ضرورت ہے۔۔۔ انتقام پہ امانت اب تمہارا ورثہ ہے۔۔۔ اثاثہ ہے۔۔۔ اسے جان عزیز سے اس کی حفاظت کرنا۔“

☆☆☆

رات کا سیاہ اندھیرا پہلے جیسا گہرا نہیں رہا تھا جس میں ہاتھ کو ہاتھ بجھائی نہیں دیتا تھا اور سحر کے اجالے کا ہر اول دستہ صبح کا ذب لیے دھند میں اترنے لگا تھا۔ صبح کا آواز ٹیکسال سے نکلنے والے چاندی کے نئے سکے کی طرح دکھ رہا تھا اور ماند پڑنے والے ستارے بالکل پرانی چوٹیوں کی طرح لگتے تھے لیکن این کی دسک چمک آنکھوں کو خیرہ کرنے والی نہیں رہی تھی۔

واہ بھگوان۔۔۔ اوپر چاند ستارے پھیلا دیے۔۔۔ اور دھرتی پر چوٹی اٹھنی اور روپے بنا دیے۔۔۔ نہ وہ اپنے، نہ یہ اپنے۔۔۔ شکر جا چائے کسی فلسفی کی طرح سوچا اور گروٹ بدل کے ایک سرد آہ بھری۔

اب وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی تھی کہ آنکھ کھلتی تو سورج سر پر چمکتا ہوا ہوتا تھا۔ یہ سب ملاوٹ کرنے والوں کی بد معاشی ہے۔ ایک ایک سکہ رکھوا لیتے ہیں اور جیسے احسان کر کے مال دیتے ہیں۔ مگر وہ

بھی ناقص۔۔۔

شکر کی نگاہ چمک کر نگرانی کے پہرہ دار پتھر کے اس مجسمے پر چلی گئی جو اپنے چبوترے پر ہاتھ میں انصاف کی ترازو لیے تقریباً سو برس سے ہر انسان کو بے حسی سے دیکھ رہا تھا جس بے حسی سے زندہ انسان برداشت کر رہے تھے۔ مرتے کیا نہ کرتے۔

چوک نام تھا دو نیم پختہ اور نامور راستوں کا جو صلیب کے بازوؤں کی طرح جو ایک دوسرے مل کر سیدھے گزر جاتے تھے۔۔۔ اور شکر نے جب سے ہوش سنبھالا تھا کنور تچ سنگھ کو اس شان بے نیازی سے اس چوک کے وسط میں سیاہ پتھر کے تین فٹ اونچے چبوترے پر کھڑے دیکھا تھا۔ یک لخت اسے یوں لگا جیسے مجسمے نے اپنی جگہ بدل لی ہے۔ پھر ایک جگہ اسے دو مجسمے دکھائی دینے لگی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ یہ نظر کا دھوکا تھا اور اس گولی کا اثر تھا جس کی وجہ سے شکر کا دماغ ابھی تک ماؤف تھا۔

مگر دوسری بار دیکھنے پر میں سراب قائم رہا۔ اندھیرے میں ٹھوڑا سا اجالا اور مل گیا تھا۔ چنانچہ شکر کی نظر واضح طور پر دو پر چھائیاں دیکھ رہی تھیں اور منظر آسمان کے سرمئی کیڑوں پر بنی ہوئی سیاہ تصویر کی طرح تھیں۔ ایک پر چھائیں کے خطوط جانے پہچانے سے لگے۔ ہر رات وہ اپنے اس ٹھکانے پر سونے کے لیے آتا تھا اور پتھر کی بیچ برائینٹ کو نیکے گی جگہ رکھ کے سو جاتا تھا۔ اس نے مجسمے کو چاندنی راتوں میں بھی دیکھا تھا اور اندھیری صبحوں میں بھی۔۔۔ یہ نہ ہوتا تو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔۔۔ پھر اس نے اپنی دونوں آنکھوں کو خوب مل کے دیکھا تھا۔ مجسمے واقعی دو تھے۔ یہ نظر کا فریب نہ تھا۔ وہ ہر طرح سے بالکل واضح تھے۔

ایک ساکت و جامد اور منجمد۔۔۔ اس طرح ایک ہاتھ پھیلائے میزان عدل سنبھالے۔۔۔ دوسرا متحرک۔۔۔ ترازو کے تیسرے پلڑے کی طرح۔۔۔ کیا ترازو کے تین پلڑے ہو سکتے ہیں۔۔۔ شکر نے ذہن پر زور دے کر سوچا۔۔۔ نہیں ایک بھی ہوئے چاہے دوسرے میں وہ چیز جو توی جائے۔۔۔

کونکہ یا سونا۔۔۔ اور دال یا بھات۔۔۔ کیا تیسرے  
میں دکان دار بیٹھا ہوا ہے۔۔۔ یا خریدار۔۔۔ وہ  
بے ساختہ ہنس پڑا۔۔۔ یہ تصور بھی خارج از امکان  
تھا۔ مزید یہ کہ پتھر کے ترازو کے دوپلے بھی تو منجمد  
تھے۔ مگر یہ تیسرا پڑا جھول رہا تھا۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔۔۔ رام رام۔۔۔  
ستیا ناس ہو اس گولی کا جس سے اب جاگتی آنکھیں  
ایسے بھیانک سینے لگی ہیں۔ پہلے تو وہ نیک بخت  
دکھائی دے جاتی تھی جس نے جیون بھر ساتھ نبھانے  
کے لیے وجہیں دیا تھا مگر میں برس بعد وہ وچن بھلا کے  
چتا پر جا بیٹی تھی۔ وہ ہر جا کی نکلے گی اس نے خواب و  
خیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔

اور پھر صرف ایک صدمہ تو نہ تھا۔ تناور درخت  
جیسا بنظر آتا تھا جو ڈاکوؤں کے گاؤں پر حملے کے  
دوران مارا گیا تھا۔ بڑا جی دار بننا تھا۔ ان کا پیچھا نہ  
کرتا تو جیتا رہتا اور جو اگر ہوتا تو آج پوتے ہوتے۔  
مگر اب اس کا کیا رونا۔۔۔ اور وہ خود کہاں زندہ  
تھا۔ وہ بیٹھ پر سے اتر کے آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔  
سر اب حقیقت میں ڈھلنے لگا تھا۔۔۔ یہ کون باگل کا  
بچہ ہے جو صبح صبح آگے پتھر کی شاخ سے کیے پھل کی  
طرح لٹک گیا۔۔۔ نشتے میں بھی آدمی سر کے بل کھڑا  
ہو سکتا ہے۔۔۔ مگر اس طرح کیسے لٹک سکتا ہے۔  
فریب جانے پر اسے رسی نظر آئی جو شکل سے ایک  
ہاتھ کی جی۔ وہ ٹھنک کے رک گیا۔ کیوں کہ رسی کا  
ایک سرا تو مجسمے کے بازو پر بندھا ہوا تھا۔ مگر دوسرا  
آدمی کی گرفت میں نہیں تھا بلکہ اس کی گردن سے کسی  
سانپ کی طرح لپٹا ہوا تھا۔ شکر کی ٹانگیں کاٹنے لگیں۔  
اس سے لٹکنے والے آدمی کی گردن مضحکہ خیز طریقے پر  
دائیں جانب جھکی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی کھلی  
ہوئی تھیں اور ساکت تھیں۔۔۔ شکر نے ایک بار وہ  
لاش دیکھی تھی جو وارث شہر کی جیل سے لے کر آئے  
تھے۔ پھاسی پانے والے کی گردن بھی ایسی ہی ہو گئی  
تھی۔ مٹی اور برکی بنی ہوئی۔۔۔ اسے یوں لگا جیسے  
یہ وہی لاش ہے جو اس کی نظروں کے سامنے لٹکی ہوئی

ہے۔ ہوا کے ساتھ ساتھ جھول رہی ہے۔ چوں کہ  
اس کے کرپا کرم میں تو شکر بھی شریک ہوا تھا اور  
وارثوں کے سامنے نہ سہی پیٹھ پیچھے۔ اس نے بھی کہا  
تھا کہ یہ انصاف ہے۔۔۔ خون کا بدلہ خون۔۔۔  
اس نے سر جھٹک کر وہ وقت ذہن سے خارج  
کر دیا اور اس کے بارے میں مزید سوچنا نہیں چاہتا  
تھا۔

پھر وہ ہمت کر کے اور آگے بڑھا اور اس نے  
پیچانے کی کوشش کی۔ اسے تھا نے داریا دیا۔  
پھر اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔ کیا تھا نے  
دار نے خود کشی کر لی ہے؟

حیرت۔۔۔ نہیں۔۔۔ اس نے اپنے  
آپ کو قائل کیا۔۔۔ تھا نے دار خود کشی کیوں کرنے  
لگا۔۔۔ بغرض محال اسے مرنا ہی ہوتا تو وہ اپنے  
پستول سے اپنے اس کوارٹر میں خود کو گولی کیوں نہیں  
مار لیتا جو نیا نیا تھا۔ تھا نے کی عمارت کے ساتھ ہی  
اس کی تکمیل ہوئی تھی اور وہ اس تھا نے کا چارج لینے  
والا پہلا تھا نے دار تھا۔ مگر کے خود کو کون تماشا بنانا  
ہے۔۔۔ کیا زندگی سے عزیز آدمی کے لیے کوئی چیز  
نہیں ہوتی ہے۔ وہ اس کی سلامتی کے لیے کسی  
جدو جھوٹا دہن کرتا ہے۔

اب اس کے نزدیک شک و شبہ والی کوئی بات  
نہیں رہی تھی۔ تھا نے دار کو یقیناً کسی نے قتل کیا ہے۔  
یہاں لاکے اسے پھاسی دے دی ہے۔ اس نے ایک  
مہینے میں کتنی بار دعو کیا تھا کہ وہ اپنے علاقے میں کسی  
کی بد معاشی چلنے نہیں دے گا اور حکومت صرف قانون  
کی ہوگی۔۔۔ اگر کسی نے لا قانونیت کی تو اسے جیل  
کی ہوا کھلا دے۔۔۔ بد معاشوں اور مجرموں کی ہڈی  
پسلی ایک کر دے گا۔ جو کسی کی سفارش لائے گا تو  
اسے اندر کر دے گا۔ اس لیے کہ قانون کی بالادستی کسی  
مجرم کے ساتھ رعایت نہیں کرتی ہے۔ قانون، قانون  
ہوتا ہے۔ وہ اندھا ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا ہے کہ  
مجرم کون اور کتنا بڑا ہے۔ کتنا با اثر ہے۔ طاقت ور  
ہے۔ اس نے صرف کہا نہیں تھا بلکہ اس پر سختی سے عمل

اس لیے وہ سب سے پہلے یہ اطلاع دینا چاہتا تھا کہ لاش صرف اس نے دیکھی ہے۔۔۔ کیا اس اطلاع پر سرکار اسے کوئی انعام دے گی۔۔۔ خیر یہ انعام نہ سہی۔۔۔ سب کو یہ بات معلوم ہوگی تو اس سے پوچھنے آئیں گے۔

”ارے شکر چاچا۔۔۔! تم نے سب سے پہلے دیکھا تھا۔۔۔ کیسے۔۔۔؟ پھر ڈرے نہیں۔۔۔ خوف زدہ نہیں ہوئے۔۔۔ اور ہاں بے ہوش بھی نہیں ہوئے۔۔۔ بڑے مضبوط دل کے ہو۔۔۔ اچھا شروع سے بتاؤ۔“

وہ تھانے میں داخل ہوتے ہی چلانے لگا۔ اچانک کسی نے اس کی گردن دیوچی۔ ”داروپی کے صبح صبح دنگا کرنے۔۔۔ کہاں آیا ہے۔۔۔؟ وہ بھی تھانے میں۔۔۔“

”ارے سنتری بادشاہ۔“ اس نے بمشکل کہا۔ ”میں نشے میں نہیں ہوں۔۔۔ حوال دار صاحب کو بلاؤ۔۔۔ بلاؤ۔۔۔ میں انہیں خود ہی بتاؤں گا۔ تھانے دار ائیل شرما کو کسی نے پھانسی دے دی ہے۔۔۔ بھگوان کی سوغند۔۔۔ وہ چوک میں لٹکے ہوئے ہیں۔۔۔ یقین نہیں آ رہا ہے تو دیکھ لو چل کے۔“

لاٹ صاحب بہادر نے ایک گورے کشنری جان بچا کے بحفاظت دلی پہنچانے پر کنور بیج سنگھ کو ایک بہت بڑی جاگیر عطا کی تھی۔ بیج پور انہوں نے ہی بسایا تھا۔ جب تک وہ جیسے ریاست کے مطلق العنان اور خود مختار حکمران رہے۔ جن کی رعایا ان کی شان کی مالا جھتی تھی اور وہ حکمران بھی خوش رہے جن کی رعایا میں خود کنور صاحب شامل تھے۔ بچھنر برسوں میں چند مزارعین کے کچے گھروں اور ایک کچے مکان سے آباد ہونے والے بیج پور میں سینکڑوں کچے کچے مکان بن گئے تھے اور واحد کچے مکان کی جگہ کنور بیج سنگھ کے وارثوں کی شان دار پر شکوہ جوہلی تعمیر ہو چکی تھی۔ یہ زمین اپنی زرخیزی سے سونا اگتی تھی۔ ندی کے کنارے شیشم کا گھنا جنگل ہر سال کچھ

کر کے دکھایا بھی تھا۔ ایک توجہ کمہار کی بیٹی جو چودہ برس کی تھی تو اس کے پڑوسی جوان لڑکے نے دست درازی کرنی چاہی تو اسے دن بھر مرغا بنا کے رکھا تھا۔۔۔ اور پھر اسی چوک میں اور گن گن کر سو جوتے لگائے تھے۔ لڑکیوں اور عورتوں سے بھی کہا تھا کہ وہ ڈریں نہیں جتنے جوتے مار سکتی ہیں لگائیں۔۔۔ ان میں کوئی چھ سات نو جوان اور کم عمر لڑکیوں نے بھی اس کی خوب مرمت کی تھی کیوں کہ وہ ان لڑکیوں سے بھی من مانیاں اور دست درازی کر چکا تھا اور انہیں دیوچ کر جبر و زیادتی سے کھیتوں میں بری نیت سے لے جانے کی کوشش بھی کی تھی۔ ادھر چند مرد کسان آٹے نکلے تھے ورنہ وہ ان لڑکیوں کی عزت لٹ چکی ہوتی۔ انسپکٹر کے تعینات ہونے سے گاؤں کا ماحول بدل گیا تھا۔ لڑکوں اور مردوں کی ہمت اور مجال نہیں تھی کہ راہ چلتی لڑکیوں، عورتوں کو میلی لگا ہوں سے دیکھیں۔ ادھر گاؤں میں ایک جھیل گھنے درختوں سے گھری ہوئی تھی وہاں عورتیں صبح اور دوپہر کے سناٹے میں آکر نہ صرف آزادی سے نہایتیں پلکے تیرتی تھیں اور وہاں مردوں کے جانے کی ممانعت تھی۔ جو لڑکے مرد چوری چھپے تانک جھانک کرتے تھے ان کے بال منڈوا اور آدھے منہ پر کالک مل کر گاؤں میں ذلیل و خوار کیا تھا، گدھے پر سواری کروا کے۔

اور پھر دوسری مرتبہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ جب غلام محمد کی گائیں بھینسیں چرا کے لے جانے پر کنور صاحب کا مالی پکڑا گیا تھا۔۔۔ نشی کا کا کے کھلیان میں آگ لگانے کی کوشش پر انہیں حوالات میں بند کر کے دماغ درست کر دیے تھے جن سے چوری چکار پاں بالکل بھی بند ہو گئی تھیں۔ لچے لٹکے اور چھٹے بد معاش بھی اس کی صورت دور ہی سے دیکھ کر کترا جاتے تھے۔

شکر بے تحاشا تھانے کی طرف سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ حوالدار اور دو سپاہی گہری نیند میں غرق پڑے ہوئے تھے۔۔۔ گاؤں میں بھی سبھی سوئے ہوئے تھے۔ صرف شکر نے تھانے دار کی لاش دیکھی تھی۔



اور پھیل جاتا تھا۔ مزار سے اہل چلا کے فصلیں کاٹتے تھے اور کنور صاحب کے خزانے بھرتے تھے۔ مگر خود غربت کو مقدر کی بات جان کے کنور صاحب کے عطا کردہ اتنے ہی انعام و اکرام پر قناعت کرتے تھے جس سے جسم و جان کا رشتہ برقرار رہے۔ ان میں سے کسی کی کیا جرات تھی کہ اس مالی نا انصافی کی شکایت زبان پر لاتے۔ غریب، غریب سے غریب ہوتا جا رہا تھا اور وہ امیر سے امیر تر۔۔۔ یہ ایک دستور تھا۔

کنور صاحب رعایا کی خوش حالی کے کبھی قائل نہ تھے اور رعایا ان کی آنکھوں میں تیز دھوپ کی طرح چھتی تھی اور دل پر چایک رسید کرتی تھی۔۔۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ کسان خوش حال ہو گا تو محنت سے جی چرائے گا۔۔۔ بچوں کو تعلیم دلائے گا۔۔۔ علم سے باغیانہ خیالات کی فصل پیدا ہونے لگتی ہے۔۔۔ اور کسان کو کھن لگ جاتا ہے۔۔۔ اسے اتنا ہی دو کہ ایک وقت پیٹ بھر کے کھائے تو دوسرے وقت کی فکر کرنے لگے۔

وہ ریاست میں تھانہ، پولیس کچہری، سب خود ہی تھے۔ ان کا حکم قانون تھا جس کی اپیل بھکوان کے سوا کسی کے پاس داخل نہیں کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ ان کے انصاف کا بول بالا تھا۔ ان کے جانفیں پڑھ لکھ کر ان سنبہرے اصولوں سے منحرف ہوئے اور نقصان میں رہے۔

کنور تاج سنگھ کو مرتے وقت اس بات کا افسوس تھا کہ انہوں نے دولت مندی کی تقلید کرتے ہوئے اولاد کو تعلیم کے حصول کے لیے سات سیندر پارکیوں بھیجا۔ وہ کوئے تھے۔۔۔ کالے دیسی کوئے۔۔۔ گورے راج ہنسوں کے دور میں وہ اپنی چال بھول گئے۔

دیش کو سوراج ملا تو ان کی جھٹانے بھی سوراج مانگنے کی جسارت کی۔۔۔ نمک حرام اور انسان فراموش لوگ سر اٹھانے لگے تو کنور تاج سنگھ کو اپنی غلطی کا اندازہ ہوا۔۔۔ مگر اس وقت پانی سر سے گزر چکا

تھا۔۔۔ سرکار نے ریاست کے معاملات میں مداخلت کی۔ مقدمات ضلع کچہری میں فیصلہ ہونے لگا۔ پرائمری اسکول ترقی کر کے مڈل اسکول بن گئے اور ہسپتال میں سرکاری ڈاکٹر آنے لگے۔ ضلع کے حاکم۔۔۔ ڈپٹی کمشنر۔۔۔ تحصیل دار۔۔۔ اور مجسٹریٹ۔۔۔ تاج سنگھ کے پوتے کنور بے سنگھ سے ملنے آتے تھے۔۔۔ کبھی کبھی کسی دعوت کے بہانے تو کبھی شکار کھیلنے کے لیے۔۔۔ چنانچہ وہ بے سنگھ کی حاکمیت برقرار رہی۔

ریاست کے انضمام سے بھی صورت حال میں تبدیلی نہیں آئی۔

اور ان کے مسائل البتہ بند ہو گئے مگر وہ بے سنگھ کے ٹھٹھاٹ باٹ میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ خود کو واقعی آزاد اور مختار سمجھنے والوں کو بہت جلد سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ اپنے کام سے کام نہیں۔ آباؤ اجداد کی طرح اطاعت گزار رہیں اور سیاسی نعرے بازیوں سے گمراہ نہ ہوں۔ وہ حاکم ضلع کے پاس داد رسی کے لیے جائیں یا ضلع کچہری میں فریاد لے کر۔۔۔ فیصلہ وہی ہو گا جو ہر ضلعی حاکم کیلی فون پر وہ بے سنگھ سے مشورے کے بعد دے گا۔ اگر وہ بے سنگھ یا اس کے وارث دور اندیش اور وقت شناس ہوتے تو اندازہ کر لیتے کہ ان کی شاہ خرچی کا محتمل تو قارون کا خزانہ بھی نہیں ہو سکتا اور اپنی دولت جاگیر پر اکڑنے پھرنے کے بجائے اس سے کارخانے قائم کر لیتے تو جاگیر داروں سے صنعت کاروں کی صف میں شامل ہو جاتے اور ان کی اجارہ داری کا دائرہ وسیع تر ہو جاتا۔ مگر وہ بگڑے ہوئے رئیس زادے تھے جن کے لیے فکر معاش کی خاطر کام کرنا کسر شان تھا اور ان کی انا کی تو ہن بھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اب کنور بے سنگھ کا خاندان اس دیو ہیکل برآمد کے کھوکھلے تنے کی طرح رہ گیا جسے اندر ہی اندر دیک چاٹ چکی ہو اور جیسے زلزلے کا خفیف سا جھٹکایا معمولی سا طوفان زمین بوس کر سکتا ہو۔ لیکن ان کا دبدبہ بانی تھا۔ کنور وہ بے سنگھ بہت کم باہر نکلتا

تھا۔۔۔ اور وہ دیکھ رہا تھا کہ حالات کتنی تیزی سے  
 انحطاط پذیر ہیں۔ مگر وہ وقت جب کچھ کیا جاسکتا تھا  
 گزر چکا تھا۔ وقت بڑا بے رحم تھا۔ سفاک اور خود  
 غرض ہوتا ہے۔ وہ ٹھہرتا نہیں ہے کسی کا انتظار نہیں کرتا  
 ہے۔ اس نے ان کا انتظار نہیں کیا۔ چنانچہ وہ بے سنگھ  
 اب پشیمان پیچھتاوے اور تاسف کے احساس کو  
 شراب میں ڈبو رہا تھا اور اس ناکام کوشش میں خود بھی  
 ڈوب رہا تھا۔ خود کو فریب دیتا تھا اور وہ سوچتا بھی نہیں  
 جا رہا تھا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔۔۔۔۔ کیسے اور کیوں  
 گر ہوگا۔۔۔ وہ انجام اور مستقبل سے بے پروا ہو کر  
 جس حال کی چکی میں پس رہا تھا اس کے نزدیک اس  
 کے سوا چارہ بھی نہیں رہا تھا۔

زمین ہندو مہاجنوں کے پاس گروی رکھی جا  
 چکی تھی۔۔۔ سونے چاندی کے ظروف پہلے زیورات  
 میں ڈھلے تھے۔ پھر یہ زیورات چپکے چپکے بڑی راز  
 داری سے کولکٹہ کے صرافوں اور اعلیٰ خاندان میں  
 بک گئے تھے۔۔۔ اب ایک حویلی رہ گئی تھی یا وہ  
 جنگل جوندی کے ساتھ ساتھ میل بھر تک پھیلا ہوا  
 تھا۔۔۔ مدت سے اسے کوئی ٹھیکے پر لینے نہیں آ رہا تھا  
 اور کسی فرد نے سونے کی اور فکر کرنے کی زحمت بھی  
 نہیں کی تھی۔۔۔ فکر بھی تو صرف یہ تھی کہ ایسا کیوں ہوا  
 اور کس لیے ہو رہا ہے۔

حویلی میں دو کاریں تھیں۔۔۔ ایک پرانے  
 وقتوں کی پر شکوہ بیوک تھی۔۔۔ جھومتی اور شانِ تمکنت  
 سے نکلتی تھی جو کنور و بے سنگھ کے خاندان سے منسوب  
 تھی۔۔۔ دوسری نئی۔۔۔ بہت مختصر طوفان رفتار سے  
 دوڑنے والی سرخ فاسی ونگین جسے کنور سنگھ کی بیٹیاں  
 اڑاتی پھرتی تھیں اور گاؤں کے باسی کھڑکی کے کھلے  
 شیشے سے۔۔۔ ان کے شانوں تک نہیں انداز سے  
 ترشے ہوئے کھلے بالوں کے سیاہ ریشم کو ان کے  
 چروں پر لہراتا دیکھتے رہ جاتے تھے۔۔۔ بوڑھے  
 حیرانی سے اور جوان رشک سے۔۔۔ ان کے لیے وہ  
 عورتیں نہیں کوہِ کافی کی پافلمی دنیا کی پریاں تھیں جو  
 خوابوں میں ان کی ہو جاتی تھیں اور انہیں چاہتی اور

مہربان ہو کر اتنی دور چلی جاتی تھیں کہ اپنی فیاضی اور  
 شباب کے نشے سے انہیں مدہوش کر دیتی تھیں۔ جب  
 وہ یہ براگندہ سینے سے بے دار ہوتے تو پھر وہی سینا  
 دیکھنے لگتے جو انہیں سارا دن چین لینے نہیں دیتا تھا۔  
 مگر حقیقی دنیا میں ان کی آرزو بھی کسی سنگین جرم  
 سے کم نہ تھی اور جذبات اور ان جانے نصورات کدول میں  
 ذکر بھی۔۔۔ وہ اپنے ان جانے نصورات کدول میں  
 تدفین کر کے سرد آہیں بھرتے، جن کا غبار سینے میں  
 پھیل جاتا۔۔۔ اس گاؤں کے بہت سے منجھے اور  
 جیالے نوجوان اپنی بے لگام خواہش سے مغلوب ہو  
 کر انہیں غلط قسم کے سطحی اعزاز کے اشارے کرنے یا  
 کسی فلمی گانے کے بول بولنے سے بھی باز نہیں آئے  
 لیکن یہ جیالے تحصیل ہیڈ کوارٹرز کے تھانے پیش  
 ہونے کے لیے اپنے پیسوں پر چل کے گئے تھے مگر  
 کھاٹ پر ڈال کر لائے گئے تھے اور مہینے بھر درس  
 عبرت بنے رہے۔۔۔ اور ظالم سماج کی نا انصافی پر  
 خون کے آنسو بہاتے رہے تھے ان واقعات کی  
 شہرت نے دوسروں کے عاشقانہ جذبات کو یوں سرد  
 کر دیا جیسے پانی کی ایک بالٹی سے جیسے چلم کی آگ  
 بجھا دی جائے۔۔۔ اب تو نوجوان کامیادار بوڑھے  
 بھی اس کھلی کھڑکی کی طرف سے دیکھتے نہیں تھے۔  
 انہیں اپنے جسم کی ہڈیوں اور چہرے کے جغرافیے کا  
 بڑا خیال رہتا۔ وقت کے ساتھ کب چلے تھے۔ وقت  
 نے ساتھ دیا تو کنور و بے سنگھ حالات کے سامنے بھی  
 ہتھیار نہ ڈالتے اور اپنی شان دار روایات کے حصار  
 میں قلعہ بند رہتے۔۔۔ مگر وقت کسی جہاں کی عورت کی  
 طرح بدلاتا تو ایک ایک کر کے سب ساتھ چھوڑ گئے۔  
 پہلے جاگیر سے ہاتھ دھو بیٹے۔۔۔ پھر دولت  
 کے سوتے خشک ہو گئے۔ حالات نے کنور صاحب  
 سے بڑھاپے کی لالھی بھی چھین لی۔۔۔ بھگوان نے  
 انہیں ایک بیٹے کی دولت سے نوازا تھا جو وہ کسی دنیا  
 کسی بھی نعمت سے بھی کم نہ تھا۔۔۔ مگر ان کے نام نہ  
 لگا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گاؤں کی لڑکیوں اور شادی شدہ  
 اور کئی کئی بچوں کی ماؤں کے سینے بھی دھک سے رہ

مارے جانے کی اطلاع لے کر اکیلا ٹھوڑا کھر کے دروازے آ کھڑا ہوتا ہے۔ صبح چمچیروں نے جال ڈالا تو گھاس پھوس میں الجھی ہوئی لاش بھی ایک ایسی جگہ سے برآمد ہوئی جہاں نہ کوئی تیرنے جاتا تھا اور نہ ہی کشتی لے کر۔۔۔ اور ندی کے پشتے سے آگے صاف ساحل کو چھوڑ کے جنگل کی طرف وہ شخص کیسے جا سکتا تھا۔ جو خود جنگل کا مالک ہو اور جس کا بچپن اس زمین کے چپے سے چپے سے آشنائی کے رشتے استوار کرتے کرتے گزرا ہو مگر تفتیش کے لیے آنے والے پولیس افسروں نے اسے حادثاتی موت قرار دیا تھا۔ کئی گھنٹوں کی تفتیش کے بعد۔

”آپ کے بھائی نے غوطہ لگایا اور آبی گھاس کی جڑوں میں الجھ گیا جو ایک جال کی طرح تھا۔“  
”مگر کیسے۔۔۔؟ وہ ادھر گیا کیسے۔۔۔؟“  
کیوں گیا وہ وہاں۔۔۔ کہ اسے تو سب کچھ معلوم تھا۔۔۔“ وہ بے سنگھ نے غصے سے چلا کر کہا تھا۔ ”کیا وہ پاگل تھا۔۔۔ وہ میرا بھائی تھا۔۔۔ کیا میں تمہیں پاگل لگتا ہوں۔۔۔“

پولیس افسران تھے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے پر واضح کیا تھا کہ سکندر وجے سنگھ کو صدے نے پاگل کر دیا ہے اور انہوں نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا تھا۔

”وہ۔۔۔ دیکھے نا۔۔۔ آج کل کے نوجوان۔۔۔ ایڈنچر کی خاطر سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اس نے شاید۔۔۔ یقیناً کوئی تجربہ کیا ہوگا۔“  
”بکتے ہو تم۔۔۔ مہندر ہرگز ایسا نوجوان نہیں تھا۔۔۔ جاؤ دفع ہو جاؤ بد معاشرہ! میری نظروں کے سامنے سے ورنہ ایک ایک کو گولی مار دوں گا۔۔۔ کسی کو بھی زندہ جانے نہیں دوں گا۔“ انہوں نے اشتعال میں چلا تے ہوئے کہا تھا۔ ”کیا میں اندھا ہوں۔ اتنا بھی کیا دیکھ نہیں سکتا اور نہ سمجھتا کہ۔۔۔ مہندر کو کسی نے مارا ہے۔۔۔ تم اندھے ہو۔۔۔ تم مجھے چلا سکتے کہ اسے مارنے والا کون ہے۔۔۔ تم مجھے ہو کہ مہندر کی موت ایک حادثہ ہے۔۔۔ کیا تمہیں اس کی

جاتے تھے۔۔۔ وہ شکاری بنا ہوا تھا۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہ ہوتی تو کہ لڑکی کی عمر کیا ہے۔۔۔ یہ عورت کتنے بچوں کی ماں ہے۔۔۔ یہ تو بیوا ہتا دہن ہے۔۔۔ وہ حسن و شباب، بھرپور جوانی، سنڈول، بھرا بھرا گداز جسم اور تناسب دیکھتا تھا۔ کس کی مجال بھی جو اس کی درندگی اور آبرو لوٹنے کی شکایت کی جاتی۔ جب لڑکیاں عورتیں گھروں سے نکلتی تھیں تو لمبا سا گھونگھٹ نکال کر۔۔۔ یا پھر ایسے لباس میں کہ جسم کی زینت ظاہر نہ ہو۔

اس کا نام بلونت سنگھ عرف بلی۔۔۔ انہی کا خون تھا تو شاید اس کا وجود اس خون کا عطیہ تھا جو فساد پیدا کرتا ہے۔

کنور صاحب کا اصل وارث ان کا بھائی بندر تھا جسے انہوں نے تین برس کی عمر سے پال پوس کر جوان کیا تھا اور اس کی شخصیت کو اپنے خاندان سانچے میں ڈھلتے دیکھ کر بہت پر امید تھے کہ وہ بگڑے ہوئے معاملات کو سنبھال لے گا اور خاندان کی سادھ کی دیوار گرنے سے پہلے سہارا فراہم کر دے گا۔ وہ ذہین تھکتی اور روشن خیال ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی روایات کی سر بلندی پر غرور کرتا جانتا تھا۔ وہ وقت شناس، دور اندیش اور قابل فہم بھی تھا۔ وہ یہ بات جانتا تھا کہ دنیا کہاں جا رہی ہے۔۔۔ کتنی تیزی سے بدل رہی ہے۔ وقت کے ساتھ۔۔۔ بدلا نہ گیا تو جاگیر، حویلی اور سونے کے زیورات۔۔۔ ہیرے جواہرات تو کیا جسم پر کپڑے تک نہ رہیں گے۔

مگر وہ ایک روز نیاؤ لے کر نکلا تو لوٹ کر نہ آیا۔۔۔ ندی باڑھ پر نہ بھی اور وہ کالج میں کشتی ران کے متعدد مقابلے جیت چکا تھا۔ بہترین پیراک بھی تھا۔۔۔ اگر کشتی الٹ جانی یا کوئی اسے الٹا کے دریا کے بیچ میں پھینک دیتا تب بھی وہ تیرتا ہوا کنارے تک پہنچ جاتا۔۔۔ کنارے تک وہ پہنچا تو سہی۔۔۔ مگر کئی گھنٹے بعد۔۔۔ جب تلاش کرنے والے ناکام اور مایوس لوٹ آئے تھے۔ خالی کشتی بھی کنارے سے بوں آ گئی جیسے میدان جنگ میں مالک کے

پراسراریت میں سازش کی بوئیں آتی۔۔۔؟“  
اس دن جیسے کنورو بے سنگھ کی کمرٹوٹ گئی تھی۔  
مہندر کے ڈوبتے ہی ان کی ہر امید کا ستارہ ڈوب گیا  
تھا اور انہوں نے سارے اندیشوں کو۔۔۔ تمام  
دکھوں کو۔۔۔ اور دنیا جہاں کی مسرتوں کو شراب میں  
ڈبو دیا تھا۔

”یہ آپ خود کشی کر رہے ہیں پاپا۔۔۔“ ان کا  
آکسفورڈ میں پڑھا ہوا بیٹا ملی کہتا تھا۔ ”پلیز  
پاپا۔۔۔! آپ ایسا نہ کریں۔“

”ہاں۔۔۔ تو کیا بتاتا ہے مجھے۔۔۔ تو میرا  
باپ ہے کیا۔۔۔“ وہ غرا کے کہتے تھے۔ ”میں تیرا  
باپ ہوں۔۔۔ یہ شراب نہیں۔۔۔ خون ہے  
میرا۔۔۔ بدمعاش۔۔۔! الو کے پٹھے۔! تو مجھے  
سمجھانے آیا ہے۔“

کنور بے سنگھ کے دوست۔۔۔ مشہور معالج  
ڈاکٹر شرما کہتے۔ ”ذرا اپنی حالت کو دیکھو بے!“

”کیا میری حالت بہت قابل رحم ہے۔۔۔“  
وہ سوال کرتے تھے۔ ”تو مجھ پر رحم کر۔۔۔ کوئی  
انجکشن لگا مجھے جس سے یہ پاپ کٹے۔۔۔ تو دوست  
ہے نصیحت نہ کر۔۔۔ میری مدد کر۔۔۔ ورنہ کوئی اور  
بات کر۔۔۔ کسی بھی موضوع پر۔“

کنورو بے سنگھ کی تینوں بیٹیاں سب کچھ دیکھتی  
تھیں۔ سنی تھیں اور خاموش رہتی تھیں اس لیے اس  
میں انہیں اپنی عافیت محسوس ہوتی تھی۔ سب سے  
بڑی بیٹی کلید پور مڈل ورینٹر کا پرائیوٹ امتحان دیا  
ہی تھا کہ اس کی شادی کر دی گئی تھی۔ کیوں کہ عشق  
کے چکر میں وہ کسی کی جھوٹی میں کسی کے پھل کی طرح  
گر پڑی۔۔۔ اس کی زندگی میں آنے والا لڑکا اس کا  
ہم عمر تھا۔۔۔ کئی دنوں تک وہ اس سے کھلونے کی  
طرح کھیل کر جی بہلاتا رہا اور وہ بھی اس سے بڑی  
خود پیردگی سے پیش آتی۔ پھر ایک دن اس لڑکے کو  
اندیشہ ہوا کہ کہیں اس کی سیاہ کاری کا نتیجہ برآمد ہوا تو  
اس کی خیر نہ ہوگی۔ وہ ایک دن گدھے کے سر کے  
سنگ کی طرح غائب ہو گیا۔ اتفاق سے چار دن بعد

اس کا رشتہ آیا تو شادی کر دی گئی۔ مگر اس کی اپنے  
شوہر سے نہ بنی۔۔۔ کیوں کہ سات برسوں میں وہ  
اسے اولاد نہ دے سکی تھی۔

غیر مت مند ہوتی تو سسرال کے طعنے سن کر خود  
کشی کر لیتی۔۔۔ حالانکہ وہ شادی کے دو برس بعد  
امید سے نہ ہوئی تو اس نے اولاد کے لیے شوہر کی  
آنکھوں میں خوب دھول جھونکا۔ نو جوان لڑکوں سے  
جو اس سے عمر میں دو برس چھوٹے اور تین چار برس  
بڑے تھے۔ ان سے محبت کا ڈراما رچا کے انہیں ہر  
طرح سے خوش کرتی رہی۔۔۔ لڑکے بے خوف ہو کر  
اس سے دل بستگی کرتے تھے کہ اولاد ہوئی تو ان پر کوئی  
آج نہیں آئے گی۔۔۔ کلید پور اتنی حسین،  
پرکشش اور ہیجان خیز نشیب و فراز کی حامل تھی کہ  
لڑکوں کے پیہر پھسل جاتے۔ اس کے باوجود ساس اور  
شوہر کے طعنوں نے جینا حرام کر دیا تو وہ باپ کے گھر  
لوٹ آئی۔ کہہ دیا کہ وہ اب بھی کسی قیمت پر سسرال  
نہیں جائے گی۔

اس کے شوہر نے قانون کی مدد لی اور دوسری  
شادی کی اجازت مانگی۔۔۔ کنور بے سنگھ کو  
مجسٹریٹ نے یہ اطلاع دی تو انہوں نے داماد کو  
مصالحت کے لیے بلایا۔ وہ بے خوف و خطر اپنی کار  
میں آیا اور اس نے وہ بے سنگھ کو صاف صاف اور واضح  
الفاظ میں بتا دیا کہ وہ مجبور ہے۔۔۔ اس نے سات  
برسوں میں کلید پور کو ولایت لے جا کر ڈاکٹروں  
کے زیر علاج بھی رکھا۔۔۔ اس کے دقیقہ نوسی ماں  
باپ نے دربار صاحب دان پن سے لے کر شہت  
سادھوؤں کی سیوا تک سب کر کے دیکھ لیا تھا۔  
ڈاکٹروں کی رپورٹ تھی کہ کلید پور پیدا کسی بانجھ  
ہے۔۔۔ کوئی علاج اور آپریشن اسے ماں نہیں بنا  
سکتا۔۔۔ سائنس نے بھگوان سے شکست مان لی  
تھی۔ وہ بے بس ہو گئی تھی۔

شادی آدمی اپنی نسل کا نام چلانے کے لیے کرتا  
ہے۔ صرف عورت اور اس کے جسم سے کھینے اور  
جذبات کی تسکین کے لیے نہیں۔۔۔ اس نے

گئی کہ واردات کے وقت کلدیپ کو رو اور وہ سگھ کے خاندان کے تمام افراد اپنی حویلی میں موجود تھے اور اس بات کے عینی گواہ بہت تھے۔

انہوں نے گرفتہ صاحب پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا کہ ان کی بیٹی کا شوہر سے کوئی تنازعہ نہ تھا اور جب قتل کی واردات ہوئی تو گھر کے تمام افراد کھانے کی میز پر موجود تھے۔۔۔ وکیل جس نے دوسری شادی کا مقدمہ دائر کیا تھا واپس لے لیا۔ بھول گیا کہ حالات بدل گئے ہیں۔ اپنے موکل کی موت کے بعد اسے زبان کھولنے کا انجام اسے اپنی موت کی صورت میں نظر آنے لگا تھا۔ وہ مجسٹریٹ بھی خاموش رہا جس کی عدالت میں مقتول کا دوا تھا سماعت کے لیے پیش ہونے سے قبل ہی ختم ہو گیا تھا۔

اس واقعے نے کنور وہ سگھ کی ساکھ بگاڑ دی لیکن ان کی طاقت کا سکہ بٹھا دیا۔ یہ احساس عام ہو گیا تھا کہ کوئی وہ سگھ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ کسی نے ان کی طرف شک اور مشکلی نظر سے دیکھا تو اس کی آنکھیں پھوڑ دی جائیں گی۔

کلدیپ کو اب چھپیس برس کی بھرپور عورت تھی جس کے بدن میں ایک عجیب سا گداز اور رسیلا پن تھا۔ انگ انگ سے مستی الٹی پڑتی تھی۔ جو مرد اسے دیکھتے ان کا دل گرما جاتا۔۔۔ لڑکیوں کا حسن، جسم کی شادیاں اور کشش ماند پڑ جاتی۔ اب اس میں ادھورا پن نہیں رہا تھا۔ وہ جیسے روز بروز جوان ہوتی جا رہی تھی اور دوشیزہ سی لگتی تھی۔ ایک عجیب سا نکھار اور شادابی نے اس میں بڑی جاذبیت سما دی تھی۔

اپنی سب بہنوں سے زیادہ حسین اور دلکش عورت جو اپنی ماں کا نقش مان جو اس لیے بہتر تھا کہ اس کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی تھی اور اس کے حسن کا نکھار زمین سے زیادہ ماحول کا سازگار اور موسم سے قائم تھا۔ فطرت اور مزاج کے اعتبار سے اس کے خون میں کنور وہ سگھ کی جھلک بہت نمایاں تھی۔۔۔ چنانچہ وہ ایک خطرناک عورت تھی۔ جو اپنے حسن کی قوتِ نخیر سے کام لینا بھی جانتی تھی اور

کلدیپ کو کبھی قائل کرنا چاہا تھا۔ مگر وہ ضدی عورت معاملے کو خاموشی سے ختم کر دینے کے بجائے بڑھانے پر تامل گئی تھی۔ ایک طرف تو وہ کہتی تھی کہ میں فلاں کی بیٹی ہوں۔۔۔ یہ کر دوں گی۔۔۔ وہ کر دوں گی لیکن وہ یہاں جو گل کھلا رہی تھی اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ سسرال میں رہ کر وہ جذبات کے تجربات سے گزرتی رہے۔۔۔ اس کے شوہر نے کہا تھا کہ زمانہ واقعی بہت بدل گیا ہے۔۔۔ کلدیپ کو کرا شوہر بہت دولت مند تھا اور بھیکہ دار تھا۔ لیکن پڑھا لکھا اور معقول آدمی تھا۔ اس نے وہ سگھ کو قائل کر لیا تھا کہ اس کی مجبوری جائز ہے اور وہ سگھ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مقدمہ واپس لے لے تو کلدیپ کو اسے خود چھوڑ دے گی۔ کلدیپ کو نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنایا ہوا تھا۔ دینا یہ نہ کہے کہ کلدیپ کو کو طلاق دی گئی ہے۔ دینا یہ نہ کہے کہ اس نے شوہر سے طلاق لی ہے۔۔۔ اس کے شوہر نے طلاق کو اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ تیسرے دن اس نے مقدمہ واپس لے لیا جس کا علم اس کے وکیل کے سوا کسی اور کو نہ تھا۔ اس کے خاندان والوں نے بھی کسی سے نہیں کہا تھا۔ کیوں کہ وہ کنور وہ سگھ کے خاندان کو بدنام کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وکیل نے بہت کہا اور سمجھایا بھی تھا کہ ریاست ختم ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے قوانین اور حاکمیت بھی دفن ہو گئی ہے۔ اب اس ملک کا قانون رائج ہے جس میں سب برابر ہیں۔ اگر انہوں نے کہا تھا کہ ایک قانونی کارروائی ناگزیر ہے مگر تشہیر قطعی ہونا نہیں چاہیے۔ مجسٹریٹ ان کے گھر جا کر بیان لے سکتا ہے اور اپنے فیصلے کی نقل دے سکتا ہے۔ عزت دار گھروں کی عزت پر دے میں رہے تو اچھا ہے۔

مگر مقدمہ واپس لینے کے بعد۔۔۔ یعنی پورے سات دن بعد۔۔۔ وہ ایک ویران سڑک پر سے گزر رہا تھا کہ سرخ رنگ کی فاکس وین سے کلدیپ کو نے نشانہ لیا اور اسے گولی مار دی۔ یعنی شاید کوئی نہ تھا۔ واقعات کی شہادت اس لیے مسترد ہو

سشدر رہ جاتے تھے۔ ”تو تو بالکل پاگل ہے سر جو!“

یہ بات اس کی ماں کے بعد خود بے سنگھ کا سگھ کلام بنا۔۔۔ پھر بڑی بہن نے حویلی میں وہی حیثیت حاصل کر لی جو ماں کی بھی تو کلدھ پ کو رہی یہ بات کہنے لگی۔۔۔ سر جو نے بھی اس کی بات کا برا نہیں مانا۔۔۔ وہ ہنستی تھی اور اپنے حال میں مست تھی۔۔۔ اور پھر وہ ماضی کے درختے کھول کر کالج پہنچ جاتی جہاں اس کے ہم جماعت کتنے جذباتی اور بے باک تھے۔ ایک رنگین دنیا کے لمحات اور گھڑیاں اور دن نہیں بھولے تھے۔ وہ ان ہم جماعتوں کو بھولی تھی اور نہ ان کی عاشقی جو اسے آج سرمایہ لگتے تھے۔“

تیسری بیٹی شاما جو حسن و رعنائی ہی میں زیادہ نہیں تھی طاقت میں بھی کسی سے کم نہ تھی۔۔۔ مگر اس کا اصل سرمایہ، اثاثہ سیرت کا وہ حسن تھا جو کسی کے حصے میں نہ آیا تھا۔ تعلیم نے اسے بگاڑا نہیں تھا بلکہ سنوار دیا تھا اور دولت نے اس کے مزاج میں غرور نہیں تشکر کے جذبے کی پرورش پائی تھی۔ اس کا دل ششے کا مٹشی منشور تھا جس میں سے محبت کے سات رنگ ایک جذبے کا اجالا بن کے بھی نظر آتے تھے اور الگ الگ بھی۔

اسے سب سے عشق تھا۔ پھولوں سے اور تلیوں کے رنگ سے۔۔۔ خوشبو سے، نغمہ ساز سے۔۔۔ زندگی اور زندہ انسانوں سے جو بہرہ دہ تھے جو اپنی طرف عمر کو آنے والوں کے لیے ایک زیادہ حسین، زیادہ پر آسائش اور زیادہ قابل قدر دنیا بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ شاما کو اپنے شرابی۔۔۔ ظالم باپ سے بھی پیار تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ شاما کو نفرت کرنا آتا ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

اب مجھے کے گرد ایک حلقہ بنائے وہ سب کھڑے تھے جو ادھر سے گزر رہے تھے یا جن کو دوسروں سے چوک میں ہونے والے سنسنی خیز تماشے کی خبر مل گئی تھی۔ آہستہ آہستہ مجمع بڑھ رہا تھا مگر تھانے

اپنی ذہانت سے بھی۔۔۔ اس نے اب بھی شکاری ٹھیل جاری رکھا ہوا تھا جو اس کے حسن و شباب اور جسم کو چلا بخش رہا تھا۔۔۔ کیا جمال اس کے قریب کا کوئی ساتھی لب کشائی کر دے۔ وہ تو انہیں ایسا دیوانہ بنا دیتی تھی کہ وہ اس کے اسیر اور کھ پتلی بن کے رہ جاتے۔

وہ گھوڑے پر اکیلی میلوں گھوم آتی تھی۔۔۔ مگر سب جانتے تھے کہ اس کے شکاری لباس میں بھرا ہوا ریوالبور بھی رہتا ہے۔ اتنی ہمت کسی میں نہ تھی کہ اس شیرنی کی طرف انگلی بھی اٹھ سکے۔۔۔ یہ بات صرف دو ایک ہی جانتے تھے کہ وہ جو اکیلی میلوں نکل جاتی ہے گھوڑے پر وہاں اس کا کوئی منتظر ہوتا ہے۔ وہاں ایک کوشری بھی ہے جس میں نہایت صاف ستھرا اور آرام دہ بستر موجود ہے۔ جانے والے جانتے تھے کہ اس کی جوان تنہائی کا دوست سپاٹ صحرا نہیں ہے۔۔۔ اس صحرا میں کس کس نے گل کھلائے ہیں۔۔۔ اگر یہ بات زبان پر لانے اور کسی کو ہم راز بنانے سے پہلے بچ پور کے چوک میں نصب مجسمہ انہیں خبردار کر دیتا تھا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میزان عدل میرے ہاتھ میں ہے۔

کنور وجے سنگھ کی دوسری بیٹی اپنے بھائی کی طرح تھی۔ دولت کی فراوانی سے تن آسانی اور بے فکری اسے ورثے میں ملی تھی۔

وہ روشن خیالی میں سب سے آگے نکل گئی تھی۔ کنور وجے سنگھ کا خیال تھا کہ اسے کرائسٹ کالج کی تعلیم نے ڈوب دیا جہاں بگڑے ہوئے رئیس زادے کم نہ تھے۔ اب وہ کچھ نہیں کرتی تھی اور نہ ہی کچھ سوچتی تھی۔۔۔ اور نہ ہی کچھ سوچنا بھی چاہتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ وہ غلط وقت پر غلط جگہ پیدا ہو گئی تھی جس کے باعث معاشرے کی اور خاندان کی تمام رسوم و قیود کی پابندی کرنے اور اخلاقی اقدار کھوکھلا ہونے کے باوجود قابل احترام سمجھنے پر مجبور تھی۔ اس عدم توازن نے سرجیت عرف سر جو کو کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ اس کی حرکتوں سے، اس کی باتیں سن کر کنور وجے سنگھ

کا قائم مقام نگران بن جانے والا حوال دار اپنے افسر اعلیٰ کو مطلق دیکھنے والوں کو درے مار کر بھگانے سے قاصر تھا۔ اس نے کسی کو قریب آنے نہیں دیا تھا اور جس میں مبتلا ہو کے سوال کی جرات کرنے والے کو بری طرح جھڑک دیا تھا اور پھر جس میں مبتلا ہو کے کسی کو سوال کرنے کی جرات پیدا نہیں ہوئی۔

تھانے دار کی لاش اسی طرح مجسمے کے بازو سے جھول رہی تھی اور پلک جھپکائے بغیر انصاف کے ترازو کو دیکھ رہی تھی۔ قہقہے کے سر کردہ افراد یعنی اسکول ماسٹر اور اسپتال کے نوآموز ڈاکٹر نے حوالدار کو مشورہ دیا تھا کہ وہ روشن کو نیچے اتارے۔ اس دہشت ناک منظر کو بچوں اور عورتوں نے دیکھا تو اچھا نہیں ہوگا۔ مگر حوال دار نے واضح کر دیا تھا کہ اچھائی برائی سے زیادہ اسے قانون کے تقاضے پورے کرنے کا خیال ہے اور اس کے اختیارات محدود ہیں۔ اس نے اطلاع دی ہے اور چوں کہ معاملہ ایک پولیس افسر کی پراسراریت کا ہے اس لیے عین ممکن ہے کہ ضلع سے کوئی بڑا افسر یا تو ایس پی صاحب آجائیں۔ ان کے آنے تک وہ نہ تو کسی چیز کو ہاتھ لگائے گا اور نہ کسی کو قریب آ کے دخل درمقولات کرنے دے گا۔ وہ تو مجسمے کے چاروں طرف کھلے پھولوں کی کیاریوں سے بھی دور تھا کہ زمین کا نقش قدم ہو تو نہ بگڑے۔

ساکت و صامت مجمع بڑی مستقل مزاجی سے منٹاٹھاے کھڑا تھا اور اب اس میں لڑکیاں، عورتیں بھی شامل ہو گئیں تھیں۔ دہشت زدہ ہو کر، چیخ مارتے یا بے ہوش ہو کر کرنے کے بجائے عورتوں نے واجبی سی ہائے رام، ہائے ایشر اور یا اللہ پر اکتفا کیا تھا۔ بچے سخت متوجہ تھے اور لاش کی ظاہری حالت کے تغیر پر سرگوشیوں میں متبرہ کر رہے تھے۔ حیات بعد از موت۔۔۔ روح اور زبیت کے مسائل پر اپنی عقل اور روایات کے مطابق بحث کر رہے تھے سوال جو صورت حال کو سمجھنے کا دعوہ رکھنے والوں کو صورت پر تحریری اور اس کا جواب بھی ایک ہی ہو سکتا تھا مگر

مصلحت کا تقاضا ان کے لبوں پر سکوت بن گیا تھا۔

گھوڑے کی ٹانگیں سن کر بیک وقت سارے سر گھوم گئے۔ معمول کے مطابق شب سواری کے لیے نکلنے کے لیے کلدیپ کوڑے اپنے سفید کبوتر، چیتے صبا رفتار گھوڑے کو اپنے دادا کی سادھی کے قریب روکا۔ اور پھر کچھ دیر اس لاش کو دیکھتی رہی جس کی بدہمتی نے مجسمے کے وقار اور حسن کو بری طرح محروح کیا تھا۔ مجمع خود بخود دمٹ گیا تھا کلدیپ کے لیے، عین اپنے جد امجد کے جرنوں تک راستہ صاف ہو چکا تھا۔ وہ متغیر انداز سے گھوڑے پر سوار تھی۔ وہ خالی پتلون پر لمبے گھٹنوں سے ذرا نیچے تک آنے والے چربی موزے چڑھائے اور ان کی ٹرٹ پہنے اور سر پر کیپ رکھے بالکل مرد لگتی تھی۔ اس کے تر و تازہ رخساروں کا گلابی رنگ دمک رہا تھا۔ بڑی بڑی سیلی آنکھوں کی سحر آفرینی کو کابل نے دو چند کر دیا تھا۔ بدن کے قوس و خم اس لباس میں اپنی دل آویزی کی خیر دیتی تھی۔ اس پر ایک عجیب سی سرشاری طاری تھی۔ گزرے لمحات کا فسانہ اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔ اسے سرفراز کر کے آئی تھی جس پر اس کا دل آبا ہوا تھا۔ اس کا ثبوت اس کے ایک رخسار میں سرخ ابھرا ہوا نشان جیسے چھپنے کا نا ہو۔ شاید اس نے آئینہ نہیں دیکھا تھا۔ لیکن دیکھنے والوں نے دیکھ لیا اور بس دیکھ ہی تو سکتے تھے اور لباس کی شکنیں اور بے ترتیبی۔ لب کشائی کی آئینے کے سوا کس میں جرات تھی۔

اس نے ایک ادائے ناز سے کیپ اتاری۔ ایک جاٹھار نے گھوڑے کی لگام تھام لی تھی۔ وہ ایک جست میں نیچے اتری تو بدن میں ایک لہری اٹھی جس نے بدن کے نشیب و فراز اور خم نمایاں کر دیے اور اس کے شانوں تک کٹے ہوئے اور ہائیز روجن پر آکسائیڈ سے سنہرے شیڈ سے کٹے ہوئے سنہرے تاروں جیسے بال پھسل کر چہرے کے گرد ہالہ بنانے لگے۔ مجمع دم بخود دیکھتا رہا۔ کلدیپ متوازن قدم اٹھاتی آگے بڑھی۔

”حوالدار۔۔۔!“ اس نے اپنی نرم اور شیریں آواز میں متانت سے کہا۔ ”یہاں یہ کیا تماشا ہو رہا ہے۔“

”صاحب کا دیہانت ہو گیا۔ اس لیے لوگ جمع ہیں۔“ حوالدار نے تماشے کے لفظ پر ناگواری کے رد عمل کو ظاہر ہونے نہیں دیا۔ اس نے بڑے ضبط سے کہا۔

”وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔۔۔ سوال یہ ہے کہ دیہانت یہاں کیوں ہوا۔۔۔؟“ کلدیپ نے چھڑی سے اشارہ کیا۔

حوال دار کی سمجھ میں نہ آیا کہ تفتیش مکمل ہونے سے پہلے اس کا کیا جواب دے۔۔۔ جواب دے بھی تو کیا دے۔

”اگر اسے مرنا یہاں ہی تھا تو چلو اس کا شوق پورا ہوا۔“ کلدیپ نے کہا۔ اسے ابھی تک کیوں ٹپکائے کھڑے ہو۔ کیا اس منظر کو کسی فلم کی شوٹنگ میں استعمال ہوتا ہے۔“ کلدیپ نے مسخرے کہا۔

”جی۔۔۔ جی نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“ حوالدار نے کہا۔ ”یہ وہ۔۔۔ دراصل حکامات نہیں۔“

”اچھا تو میں حکم دیتی ہوں کہ اس لاش کو رانیاہاں سے ہٹا دو۔“ کلدیپ کور نے اس کی بات مٹا دی۔

”آپ سمجھنے کی کوشش کیجیے۔“ حوال دار نے جج کے سامنے اپنا وقار بحال کرنے کی کوشش کی اور قبل کر کہا۔ ”تفتیش کے لیے اعلا افسران آنے لے ہیں۔ میں ان کے حکم کے بغیر اس لاش کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔“

کلدیپ کور نے سر ہلایا اور وقار سے آگے بڑھی۔ عین لاش کے قریب پہنچ کر اس نے تین زینے کیے اور تین فٹ اونچے چوڑے پر جا کھڑی۔ اس نے اچانک جیب سے گرہان نکالی اور اس ایک ہی وار سے رسی کاٹ دی۔ تھا۔ دار کا بے جان جسم دو فٹ نیچے چوڑے پر گر ا اور زینوں سے

لڑھک کے پھولوں کی کیاری میں جا کر رک گیا۔

”اٹھا لو اسے۔۔۔“ کلدیپ کور نے جج سے مخاطب ہو کر تحکمانہ لہجے میں کہا۔ انداز نفرت اور حقارت سے بھرا ہوا تھا۔ ”تھانے پہنچاؤ اور میری نظروں کے سامنے سے جلد سے جلد دفع کرو۔“

حوالدار ابھی تک غصے اور بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اسے بڑے جبر اور خصل سے کام لینا تھا۔

مرد کیا اس عورت کی جگہ کوئی عام عورت بھی ہوتی تو وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا مزا چکھا دیتا۔

مگر کلدیپ کے بارے میں اس کی معلومات اس کی فرض شناسی کی راہ میں حائل ہو گئی تھیں۔

کلدیپ کا حکم جیسے فرمان شاہی تھا۔ بیک وقت دس پندرہ جوان مرد تیزی سے زرخیز غلاموں کی طرح آگے بڑھ آئے تھے جیسے حکم کی تعمیل نہ ہونے کی صورت میں ان کے سر قلم کر دیے جائیں گے۔

حوالدار بھی آگے بڑھا جوان جوان مردوں کے پیچھے تھا۔ کلدیپ نے اس کا راستہ اپنی چھڑی سے روک دیا۔

”یہ میرے دادا کی سادھی ہے۔۔۔ سرکار کا پھانسی گھر نہیں ہے۔۔۔ خود کشی کرنے والے کو بھی ہماری اجازت لے کر یہاں مرنا چاہیے۔۔۔ اور تمہیں ہماری ذاتی جاگیر پر قدم رکھنے سے پہلے مجھے۔۔۔ یا میرے پناہی کنور وے سنگھ کو مطلع کرنا چاہیے تھا۔۔۔ یہ جگہ میرے گھر کی طرح ہے اور یہاں سے میں کسی لاش کو باہر پھینک دوں یا تمہیں دوں۔ قانون کے سامنے اس کی جواب دہی میں کروں گی۔“

کلدیپ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے برساتی تھیں۔ اس کے سینے میں چوں کہ سانسوں کا زیروم ہچکولے کھا رہا تھا۔ اس نے سانس پر قابو پانے کے لیے توقف کیا تھا۔ پھر بولی۔

”اپنے اعلا افسران سے کہو کہ جو تفتیش کرنی ہو



بالکل ہی الگ تھا۔“

”ہاں۔۔۔ میں تو لب اسٹک استعمال نہیں کرتی۔“ کلد پیپ نے اپنے گداز، گلابی اور ریلے ہونٹوں پر ہاتھ پھیرا۔ ”یہ کی لب اسٹک کے نشان نہیں ہیں۔ مگر میں پہچان گئی تھی۔“

پھر وہ مالی کی طرف متوجہ ہو گئی جو ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ وہ اسے لاش کے گرنے سے خراب ہونے والے پھولوں کو ٹھیک کرنے کی ہدایت دینے لگی۔ حوالدار اندر ہی اندر بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے کیاری میں قدم تک نہیں رکھا تھا کہ کسی کا نقش پانہ مٹے۔

انگلیوں کے نشانات اور دوسرے سراخ بجانے کے لیے اس نے لاش کو چھوا تک نہیں تھا۔ اس لیے کہ کارروائی کر سکے۔ اور یہ عورت کتنے طمطراق سے قانونی تقاضوں کی ایسی تیسی کر رہی تھی۔ شاید افسران اعلا اس کی ایسی تیسی کر سکیں۔

وہ ان لوگوں کے سامنے کسی مٹے ہوئے مہرے کی طرح رخصت ہونا نہیں چاہتا تھا یہ کیسی تھی۔ تذکیل اور توہین تھی۔ اس کی نہیں بلکہ قانون کی جواب دور کھڑے تھے معنی خیز انداز میں مسکرا رہے تھے۔

لیکن کلد پیپ کو ایک اور جان نثار کے ہاتھ پر قدم جما کے گھوڑے پر سوار ہو گئی اور اس کی طرف دیکھے بغیر گھوڑے کو پوری رفتار سے دوڑانی ہوئی جنگل میں اس طرح غائب ہو گئی جیسے کوئی آتشاں کا بے تابی سے منتظر ہو۔ اب حوالدار کے لیے لاش لے جانے والے جلوس کے پیچھے جانے کے سوا چارہ نہ تھا۔ وہ بلا نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ٹرین صرف ایک منٹ کے لیے تیج نگر کے اسٹیشن پر اس طرح سے رکی جیسے اسے سانس لینا ہو۔ جیسے یہ رکی کارروائی ہو۔ اس کے چھوٹے سے مگر خوب صورت پلیٹ فارم پر اترنے والا فرد دس پر پوری رکھ کے ریلوے لائن عبور کر چکا تھا اور جنگل کے بائیں ہاتھ پر پھیلے ہوئے ٹھیتوں کے درمیان

تھانے میں کریں۔۔۔ کنور وے سنگھ کی پرائیوٹ پراپرٹی پر بلا اجازت قدم رکھ کر تم خود بھی تو ایک جرم کا ارتکاب کر رہی چکے ہو۔ اپنی افسروں کو اچھی طرح سے سمجھا دینا کہ وہ یہ کھٹلی ہرگز نہ کریں۔“

اس کی نفرت، حقارت اور غصے میں کمی آنے کے بجائے بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ اس لیے سانسوں کے تلاطم پر وہ پوری طرح قابو نہ پاسکی تھی۔ یہ نظارہ لوگوں کے لیے بڑا ہچان خیز تھا۔ جو اس سے محظوظ ہو رہے تھے۔ وہ چور نظروں سے دیکھتے ہوئے بھی ڈر رہے تھے کہ اگر اس عورت نے ان کی نظر بازی کو محسوس کر لیا تو وہ ان کے کھال اڈھڑ دے گی۔ پھر وہ نظریں ہٹا کر لاش کو دیکھنے کے بجائے باز نہیں آ رہے تھے۔

قصے کے لوگوں نے تھانے دار کی لاش کو کسی مردہ کتے کی لاش کی طرح دونوں ہاتھوں اور دونوں ٹانگوں سے پکڑ کے اٹھا لیا تھا۔ ایک شخص نیچے لٹکتے ہوئے سر کو سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسرا کمر کے نیچے سے لاش کو اٹھا رہا تھا۔

اب دس پندرہ کے بجائے جلوس میں پچاس ساٹھ افراد شامل ہو چکے تھے اور یہ جلوس تھانے کی طرف چل پڑا تھا۔

”حوالدار۔“ کلد پیپ نے زیر لب معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اسے مخاطب کیا۔ ”تم نے وہ عبارت دیکھی جو لاش پر چسپاں تھی اور نمایاں تھی؟“ ”جی۔۔۔“ حوالدار نے رخ لہجے میں کہا۔ قوت برداشت کا مسلسل مظاہرہ اس کے اعصاب کو متاثر کر رہا تھا۔ ”اس کاغذ پر لکھا تھا کہ یہ ہے دخل در مقتولات کا نتیجہ۔“

کلد پیپ کی جو بڑی زہریلی تھی۔ اس کا گداز پر شباب بدن شاخ گل کی طرح چمک کر سیدھا ہو گیا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔ وہ سرخ رنگ کیا تھا۔۔۔؟“

”لب اسٹک جناب!“ حوالدار نے طنز سے کہا۔ ”آپ نے تو پہچان لیا ہوگا۔ دور سے ہی۔۔۔

سفید پتلون، شرٹ اور سفید پگڑی کے ساتھ بیچ کرتی ہوئی سفید لمبی لمبی موچیں لیے ایک شو فرمودہ کھڑا تھا۔ اس نے ونود کو دیکھتے سرخم کیا اور ہاتھ لہرا کے تشریف لائے گاگل دیا۔

”تمہیں کس نے بتایا کہ میں اس گاڑی سے پہنچ رہا ہوں۔“ ونود نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”کنور صاحب نے حضور۔“ شو فر نے جواب دیا۔

پھر وہ مود بانہ انداز سے دروازہ کھولے منتظر تھا کہ ونود بیٹھ جائے دروازہ بند کر دے۔

ونود تھوڑی دیر تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ شو فر سے یہ سوال کرنا بے معنی تھا کہ کنور صاحب کو یہ اطلاع کیسے ملی۔

اگر اسٹیشن پر کوئی تاگلہ، یکہ یا سائیکل رکھا ملتا تو وہ اس مہمان نوازی کے بجائے احسان مند کرنے کی پیش کش کو مسترد کر دیتا۔ دور دور تک کسی کوئی سواری کا نام و نشان نہیں تھا۔ بیل گاڑی بھی دکھائی نہیں دی۔

وہ خصوصاً کنور وجے سنگھ کی خاندانی تاریخ۔۔۔ ان کی خاندانی روایت۔۔۔ عادت و اطوار۔۔۔ مزاج اور فطرت سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لینے کے بعد۔۔۔ مگر اب اسے کسی نہ کسی طرح تیج پور تو پہنچنا ہی تھا جو اس کی اطلاعات کے مطابق تین میل تک جنگل سے گزرنے والی سڑک پر ناک کی سیدھ میں چلنے کے بعد آتا تھا۔

وجے سنگھ کی بیٹی کلہ پپ نے اس سڑک پر اپنے شوہر کو کتے کی موت ماری تھی اور اس کی لالہوں کی جائیداد قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ چالاکند وہ اس کی قانونی وارث تھی۔ وہ چالاک عورت تھی بلکہ بے حد خطرناک کسی ڈان کی طرح۔۔۔ اور پھر اس کے قہے بھی سنے تھے کہ وہ نوجوان لڑکوں کے ساتھ موج اڑاتی ہے اور اس نے جنگل میں کسی ایسی جگہ عشرت کدہ بنا رکھا ہے جو ہر کسی کے علم میں نہیں ہے۔ صرف وہی جانتے ہیں جو اسے سرفراز کرتے

منڈیروں اور پگڈنڈیوں پر قدم رکھتا اپنی منزل کی جانب گامزن تھا۔ ٹرین نے آخری وسل دی اور موڑ کاٹ کے پہاڑ کے پیچھے غائب ہو گئی تو فضا میں اس کی چھک چھک کا شور بھی نہ رہا۔ دور ایک سیاہ دھوئیں کا مرعولہ گہرے سیاہ بادل کی طرح رہ گیا جو آسمان کی طرف کسی آندھی کی طرح اٹھ رہا تھا۔

اسٹیشن کی انتظامیہ ایک فرد پر مشتمل تھی جو۔۔۔ لائن میں۔۔۔ بنگلہ کلرک۔۔۔ ٹکٹ چیکر اور اسٹیشن ماسٹر کے تمام فرائض ایک تنخواہ بطریق احسن پورے کر رہا تھا۔

”دیکھیے۔۔۔ مجھے تیج پور جانا ہے۔“ ونود نے سلاخوں والی کھڑکی کے نیچے والے شکاف کے سامنے منہ لے جا کر کہا۔

”ضرور جائیے سرکار عالی! یہاں کسی دیزے، این اوسی۔۔۔ پرمٹ اور اجازت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

اس نے خوش طبعی سے جواب دے کر قدرے اس لیے دیکھا کہ تیج پور جانے والے اس سے اجازت نہیں لیتے تھے۔ یہ مود بانہ انداز محاط کچھ تو اس معزز اجنبی کی شخصیت سے متاثر ہونے کا نتیجہ تھی اور خوش مزاجی کچھ اسٹیشن ماسٹر کی عادت تھی۔ وہ کیا کرے۔ اس طرح اپنی بوریت بھی دور کرتا تھا۔

”غالباً آپ ہی کے انتظار میں ایک گاڑی باہر موجود ہے۔“ اسٹیشن ماسٹر نے اس مرتبہ بنجیدگی سے کہا۔

”کیا سرکاری گاڑی ہے۔۔۔؟“ ونود نے حیرانی سے کہا۔

”سرکاری تو نہیں ہے۔۔۔ البتہ سرکار کی گاڑی ہے۔ کنور وجے سنگھ کی۔“ اسٹیشن ماسٹر نے اسے بتایا۔ ونود باہر نکلا تو اسے شان دار بیوک نظر آئی۔ جس کا ایک ایک حصہ صاف و شفاف شیشے کی طرح دکھ رہا تھا اور پرانی ہونے کے باوجود اس کے رنگ و روپ پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ اس پر کسی نئی نویلی دھن کا سا دھوکا ہوتا تھا۔



میں رہائش میرے لیے مسئلہ نہیں ہے اس لیے کہ میں اکیلا مرد آدمی ہوں۔“

”ڈاک بنگلہ تحصیل میں ہے۔“ شیاما بولی۔  
”تھانے میں صرف حوالدار رہتا ہے جو خود پکا تاکھاتا اور صفائی بھی کرتا ہے۔ آپ کا اس جیسے ماتحت پر بوجھ بننا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ نمبر دو یہ کہ آپ جس قتل کی تفتیش کے لیے آئے ہیں۔۔۔“

”آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں کیوں آیا ہوں۔۔۔“ وود نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔  
”گویا پل پل کی خبر ہے۔۔۔ کیا آپ کے پاس کوئی سراغ رساں بھی موجود ہے۔۔۔؟“

”جی ہاں۔۔۔“ وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی جل ترنگ کی طرح بج اٹھی تھی۔ ”کوئی سراغ ہے نا جاسوس۔۔۔ تحصیل سے یا ضلع کچہری سے۔۔۔ کسی نے پایا کو فون کر دیا ہوگا۔۔۔“ شیاما بولی۔

”جسٹریٹ صاحب۔۔۔ ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر اور ڈی ایس پی وغیرہ بھی آتے رہتے ہیں جو پاپا کے بڑے دوست ہیں۔ وہ میری سالگرہ میں بھی آئے تھے۔ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ روابط صرف رخی نہیں ہیں۔۔۔ اس کے علاوہ پہلے شکار کھیلنے بھی آچکے ہیں۔“

”اچھا۔۔۔ اچھا۔“ وود نے بات کو سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔ اس خاندان کے اثر و رسوخ کے بارے میں کبھی ہوئی باتیں غلط نہیں تھیں۔ ”اس کے علاوہ بھی کوئی خاص وجہ ہوگی۔“

”جی ہاں۔۔۔“ شیامانے اثباتی انداز میں اپنا خوش نما سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نمبر تین یہ کہ تیج پور میں کسی اور سے ملنے اور ہمارے بارے میں غلط رائے قائم کرنے سے پہلے ہم خود آپ سے ملنا چاہتے تھے۔“ شیامانے توقف کر کے شانے اور سینے سے پھسلا ہوا پلو سنبھالا۔ پل کی تاخیر ہوتی تو وود کو دوبارہ نظارہ محظوظ کر دیتا۔۔۔ وہ یہ سمجھتا کہ شیامانے غیر محسوس انداز سے یہ حرکت کی ہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ گاڑی جو کسی موٹر پر تیزی سے گھومی تھی جس سے

شیاما کے بدن نے جھٹکا سا لیا تھا۔ اگر دانستہ یہ حرکت ہوتی تو وہ بجلی کی سرعت سے پلو نہ سنبھالتی بلکہ اسے گود میں گرنے دیتیں۔ پھر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اگر آپ حوالدار سے پہلے ملتے تو وہ اپنی کہتا جو کسی بھی لحاظ سے مناسب اور موزوں نہ ہوتی اور ہمارے خلاف ایک غلط تاثر پیدا ہوتا۔۔۔ جاہل اور غریب لوگ ہیں مگر وہ دل کے برے نہیں۔ سیدھے سادے۔۔۔ مگر ہمارے اور ان کے رہن سہن اور انداز فکر میں بڑا فرق ہے۔ اس کی وجہ ان میں علم کی کمی اور صلاحیت ہے۔ آپ سمجھ گئے نا۔۔۔ ہم حاکم ہیں یا تھے۔۔۔ وہ محکوم۔۔۔ وہ اس گاؤں سے آگے تحصیل تک ہو آتے ہیں اور کچھ لوگ ضلع کے صدر مقام تک بھی نہیں گئے ہیں جسے یہ لوگ شہر کہتے ہیں۔“ وہ تھوہرہ مار کے ہنسی۔ ”دہلی، بمبئی، مدراس اور بنگلور ان کے لیے ولایت ہیں۔ جب کہ ہم واقعی ولایت پلٹ ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ ہمیں جھپٹی۔۔۔ خردماغ۔۔۔ فرعون مزاج۔۔۔ چنگیز اور ہلاکو۔۔۔ بلکہ یہاں تک ہمیں بدرکردار اور بدقماش بھی سمجھتے ہیں کیوں کہ ان کی پسماندگی اور اخلاقی قدریں۔۔۔ وہ لوگ کسی اور دنیا میں رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ولایت میں بدرکرداری، فحاشی اور عریانی بہت زیادہ ہے۔ اور وہ ان کی عورتوں۔۔۔۔۔“

”مس شیاما۔۔۔!“ وود نے درمیان میں اس کی بات کاٹتے ہوئے پہلو بدلا۔ اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کر کے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”یہ سب تفصیل آپ مجھے کیوں بتا رہی ہیں۔ اگر آپ کے گھر میں نے امر مجبور ہی قیام کیا تھی تو میرا پیش تروقت تھا نہ ہی میں گزرے گا۔ لوگوں کے بیانات لینے۔۔۔ میں یہاں آیا ہوں تفتیش کرنے۔۔۔ یہاں کے غریب لوگوں کی سوچ اور ان کی قابلیت اور سماجی حالات کا تجزیہ کرنے نہیں۔۔۔ تفتیش کا ایک اپنا الگ انداز ہوتا ہے۔۔۔ اور پھر لوگوں کے بیانات لینے اور ان سے سوالات کرنے کے بعد جانے واردات کا معائنہ بہت ضروری ہے۔ اس کے

شوخی میں انداز دلربائی کا رنگ گہرا ہوتا جا رہا تھا اور آنکھوں شراب کا سما نظر آنے لگا تھا۔

دوند نے اسے پہلے آزاد خیال خاندان میں پرورش اور ولایت کی تعلیم کا اثر محسوس کیا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ اسے یوں لگا جیسے یہ وہی پرانا حربہ ہے۔۔۔ یعنی ایک نوجوان حسین عورت کو مرد کی جذباتی کمزوری بتا کے اسے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا۔ وہ یک نخت ایسا محتاط ہو گیا تھا کہ یہ جیسے کوئی زہریلی ناگن ہو اور اسے ڈسنے کے لیے اپنا چھن لہرا رہی ہو۔

”مس شیاما۔۔۔!“ دوند نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔ ”میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آخر آپ کی دیدی کو خود سری کے اس مظاہرے کی کیا ضرورت تھی جب کہ وہ تعلیم یافتہ، سمجھ دار اور سوچ بوجھ رکھنے والی ہیں۔۔۔ کیا انہیں اس بات کا کوئی علم نہیں کہ قانونی فراکٹس کی ادائیگی میں مزاحم ہونے اور جانتے بوجھتے شہادت کے آثار مٹانے پر انہیں گرفتار بھی کیا جاسکتا تھا اور اب بھی کیا جاسکتا ہے۔ وہ ایک معمولی سا اقدام ہوا تو کیا ہوا۔۔۔ بہر حال جرم جرم ہے۔ ایک معمولی حوالدار تو کیا ہوا۔۔۔ قانون ایک عام سپاہی کو بھی بہت اختیار اور اہمیت دیتا ہے۔“

”ایس پی صاحب۔۔۔!“ شیاما ہنسی۔ ”ایسی معمولی باتوں پر کنور وجے سنگھ کے خاندان پر کون ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ کس میں اہمیت ہے؟“

”کیا آپ کے نزدیک قتل ایک معمولی جرم ہے۔۔۔؟ ایک انسان کا قتل۔۔۔ کسی بھی شخص کو چاہے وہ غریب مفلس اور تنگ دست اور مزدور ہی کیوں نہ ہو۔ وہ راستے کا پتھر نہیں ہوتا ہے جسے ٹھوکر مار کر ہٹا دیا جائے۔“

دوند نے توقف کر کے انصاف کی ترازو تھامے بے حس مجسمے کو دیکھا۔ پھر اس نے مجسمے سے نگاہ ہٹا کر شیاما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے سنا ہے کنور صاحب اس علاقے میں تھانہ قائم کرنے کی تجویز کے سخت خلاف تھے۔۔۔

بغیر کوئی کارروائی مکمل نہ سمجھی جائے گی۔ قتل کا سراغ لگانے کے چکر میں ادھر ادھر خوار تو ہونا پڑے گا۔۔۔ مجھے اس بات سے کیا غرض کہ لوگ آپ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ یہ ان کی ذاتی رائے اور سوچ ہوگی جس پر آپ پہرے نہیں بٹھا سکتے۔ آخر آپ کو ان لوگوں کے بارے میں اتنی فکر اور پریشانی کیوں ہے؟ ان کی بلا سے وہ جو کہتے ہیں۔ آپ ان کی زبان پکڑ نہیں سکتیں۔“

گاڑی کسی جھگڑے کے بغیر رک گئی۔ شیاما نے ایک شیشہ نیچا اتارا پردہ کھینچ دیا۔

”یہ میرے دادا کا مجسمہ ہے جسے آپ اپنی زبان میں جائے واردات کہیں گے۔ کنور بچ سنگھ۔۔۔“ دوند نے محسوس کیا کہ ڈرائیور کو پہلے سے سب کچھ سمجھا دیا گیا تھا کہ اسے کہاں رکنا ہے اور کس راستے سے گزرتا ہے۔

”آپ نے واردات کا ذکر کیا ہے تو میں کیا پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو اس کے بارے میں کیا معلوم ہے۔۔۔؟ میں حوالدار یا کسی اور سے بعد میں یہ بات سنوں گا۔“ دوند نے مجسمہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

شیاما نے اسے من و عن سب کچھ بتا دیا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی اور مبالغہ آمیزی بھی نہیں کی نہ اس کی وہ ضرورت سمجھتی تھی۔

شکر کی لاش کو سب سے پہلے دیکھنے والی بات سے کل دیپ کے وہاں سے لاش ہٹا دینے کی بات تک۔۔۔ اس تھانے دار کی لاش کی کسی بے حرمتی کی گئی۔ حوالدار کو کارروائی کرنے کی اجازت تک نہیں دی گئی۔۔۔ جلوس کی شکل میں اسے تھانے پہنچا دیا گیا تھا۔ حوالدار بے بسی سے ساری کارروائی دیکھتا اور بے بسی سے برداشت کرتا رہا تھا۔

دوند حیرانی اور دلچسپی سے سنتا رہا۔ اسے اپنی ساعت پر اعتبار نہ آیا کہ شیاما اس قدر صاف گوئی سے کام لے گی۔

شیاما آہستہ آہستہ اور غیر محسوس انداز سے اس سے بے تکلیف ہونے لگی تھی اور اس کے انداز کی

دیر سے کہاں غائب تھیں۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے لڑکے آئی ہو۔۔۔ عطیہ کو دیکھو۔“

”ارے دیدی۔۔۔“ شیا غصے میں آنے کے بجائے کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی کا ترم نضا میں بکھر گیا۔ آپ تو اپنی دھن میں بولتی ہیں تو کسی کو جواب کا موقع نہیں دیتی ہیں۔ اچھا، آپ ان سے تو ملو۔

”یہ کون ہے۔۔۔۔۔ تمہیں شرم آنی چاہیے ہر ایرے غیرے کے ساتھ پھرتے ہوئے۔۔۔ تم یہ بات کیوں بھول جاتی ہو کہ تمہاری مفتنی ہو چکی ہے۔ تمہارے منکیت کو علم ہو گیا تو مفتنی ٹوٹ جائے گی۔“

شیا پھر ساہتہ انداز سے ہنسی۔

”میری مفتنی پکی ہے دیدی! یہ کوئی دھماکا نہیں ہے۔۔۔۔۔ لوہے کی زنجیر ہے جس میں باندھ دیا گیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”یہ کوئی غیر نہیں ہیں۔ ایس بی مسٹر ونود کمار ہیں۔ شہر سے تفتیش کے لیے آئے ہیں۔“ پھر اس نے ونود کی طرف گھوم کر کہا۔ ”ونود صاحب! آپ میری بڑی دیدی کلدیپ کور سے ملیے۔“

”کون سے محل کی تفتیش کے لیے۔۔۔“

کلدیپ نے چونک کر لمحے کے لیے غور سے ونود کی شکل دیکھی۔ ”اچھا۔۔۔ وہ تھانے دار کا قتل۔۔۔“

”جی ہاں۔۔۔!“ ونود نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس کے بعد تو یہاں قتل کی کوئی واردات نہیں ہوئی ہے۔ کیا پہلے بھی کوئی قتل ہوا تھا کسی کا۔۔۔“ اس نے سوالیہ نظروں سے کلدیپ کور کو دیکھا۔

”گڑے مردے اکھاڑو گے ایس بی صاحب تو قدم قدم پر آ سیب ملیں گے۔“ کلدیپ نے اس پر نگاہ جما کے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ تھانے دار کو کس بات کی سزا ملی تھی۔۔۔۔۔ دخل در مقولات کی۔۔۔۔۔ اگر تم نے اس کی لاش کا عبرتاک تماشا دیکھا ہوتا تو۔۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔۔ اب بھی وقت ہے۔ تفتیش کے چکر میں مت پڑو۔ جس طرح آئے ہو اس طرح لوٹ جاؤ۔“

اپنے اثر و رسوخ سے اسے قائم ہونے نہیں دیا تھا۔ اب تک تھانے دار خود تھے اور ایک نیام میں دو تلواریں کیسے رہ سکتی ہیں۔۔۔ کیا وہ اسی کیے اتنے متفکر تھے کہ انہوں نے بطور خاص آپ کو بھیجا ہے۔ ویسے تو شوفر بھی مجھے لے جاسکتا تھا۔“

شیا نے اسے مسکرا کر ترجیحی نظروں سے دیکھا۔ ”کیا میں اتنی ہی بری ہوں۔“ اس نے شیشہ گرا کے پردہ برابر کیا اور آگے کھسک آئی۔ ونود کو ایسا محسوس ہوا کہ شیا کے وجود سے انہی سوئدھی سوئدھی مہک اسے معطر کر رہی ہے۔

”یہ میں نے کب کہا ہے۔۔۔۔۔؟“ ونود نے خود کو محصور پا کر کہا۔

شیا نے شوفر کو حکم نہیں دیا تھا۔ مگر گاڑی چل پڑی تھی۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوتا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ پہلے ہی سے منصوبے کو سوچ بچار سے بنایا گیا ورنہ شوفر کی گاڑی کا خود ہی رکنا اور چل پڑنا۔ ونود نے خود کو کھڑی کے جال میں پھنس جانے والی کبھی کی طرح بے بس محسوس کیا۔ کنور سنگھ کے شیا طرنے جو مہرہ استعمال کیا تھا اور جو چال چلی تھی وہ واقعی اسے مات دے جاسکتی تھی۔ لیکن اس نے بھی کبھی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ اس کی پیشہ وارانہ زندگی میں مجرم بساط بچایا ہی کرتے تھے۔ اسے بساط اللٹا آتا تھا۔

ونود کور اتے یا فاصلے کا قطعی اندازہ نہ ہو سکا۔ گاڑی تھی کہ تیزی رفتاری سے سبک خراہی کے سے انداز چلی جا رہی تھی۔ جب شوفر نے دروازہ کھولا تو بوک پرانی وضع کی ایک حویلی کے پورچ کے نیچے کھڑی تھی جو تین محرابی دروازوں پر قائم تھی۔ زرد پتھر کی عمارت پورچ کے دونوں طرف تقریباً سو گز تک پھیلی ہوئی تھی۔ ناہموار دیواروں پر عشق چچاں کی پرانی بیلین بل کھاتی اور پرکیز منزل تک پہنچ گئی تھیں۔ گھر کی ایاں اور دروازے بھی پرانی طرز کے تھے۔

”شیا۔۔۔!“ کسی عورت نے تیز و تند لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا۔ ”کہاں گئی تھیں۔۔۔۔۔ اتنی

”میں اسے کیا سمجھوں۔۔۔۔“ ونود نے پوچھا۔ ”میں اسے کیا کہوں۔۔۔؟ دھمکی یا دوستانہ انتباہ!“

”تمہارا جی جو چاہے سمجھو۔۔۔ اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔“ پھر اس نے ونود کا چہرہ نظروں کی گرفت میں لے کر کہا۔

اپنی بات کہہ کر گھومی اور بڑے غرور سے چلتی ہوئی غائب ہو گئی۔ وہ اس کے جسمانی پیچ و خم دیکھتا رہا تھا۔

ونود نے دل میں اس بات کو بڑی فراخ دلی سے تسلیم کیا کہ۔۔۔ یہ عورت اپنے حسن کے خطرناک اسلحے کو جائز اور ناجائز کی پروا کیے بغیر حصول مقصد کے لیے موثر طور پر استعمال کرنے کی اہل تھی۔

وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کلدیپ کے اس رویے کے بعد اسے کیا کرنا چاہیے۔۔۔۔ اس کے ذہن میں ایک کشمکش سی ہونے لگی۔

وہ شیاما کی نظر سے بے خبر تھا۔ جو اس کا باغور مشاہدہ کر رہی تھی کہ اوپر کی ایک کھڑکی کھلی اور ایک لڑکی آدمی باہر تک آئی۔ اس کے بال پریشان تھے۔ بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی صورت کے نقوش مختلف نہ تھے۔ مگر وہ زرد اور بیمار سی نظر آتی تھی۔ گو اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور بے حد سیاہ تھیں لیکن ان کی گہرائیوں میں ایک وحشتانہ چمک تھی اور وہ تسخّرانہ انداز میں نیچے دیکھ رہی تھی۔

”ایس بی صاحب۔۔۔! یہ میری دوسری بہن ہے۔۔۔ سر جیت کور ہے جسے ہم سب اسے پیار سے سر جو کہتے ہیں۔“ شیاما بولی۔

”ہیلو۔۔۔!“ سر جو کھل کھلا کے ہنسی اور اس نے اوپر ہی سے ہاتھ ہلایا۔ پھر اس نے یک لخت مڑ کے اپنے پیچھے دیکھا۔

ونود نے اس کی ہر نی جیسی آنکھوں میں خوف کے سائے اترتے دیکھے۔ چہرے پر جو دمک سی تھی وہ کافور ہو گئی۔ وہ سہم کر اس طرح سے پیچھے ہٹی جیسے اس نے کسی عفریت کو دیکھا ہو۔ پھر کھڑکی ایک

دھماکے سے بند ہو گئی۔

ونود کو سر جو کی یہ حرکت نہ صرف کچھ اور پراسرار سی لگی۔ دماغ پر زور دینے کے باوجود اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

”سر جو تھوڑی سی وہ ہے۔۔۔“ شیاما نے سوچ کر کہا اور پھر انگلی کو سر کے قریب پکٹی پر رکھ کر لگایا۔

”کریک تو نہیں کہنا چاہیے۔“ وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ”مگر لوگ کہتے ہیں۔ کہتے ہیں تو کہنے دیں۔ کیا فرق پڑتا ہے۔“

”ایسا کسی وجہ سے ہوتا ہے۔“ ونود نے کہا۔

”اسے کریک وغیرہ کہہ کر اور کریک نہیں کرنا چاہیے۔“

”میں نے اسے کریک کبھی نہیں کہا بلکہ اس سے کہتی ہوں کہ سر جو تم ایک فرسٹ کلاس ہو۔ لوگوں کی باتوں کا کوئی خیال نہ کیا کرو۔“

”آپ بہت اچھا کرتی ہیں۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ ویسے انہیں زیادہ مصروف رکھیں۔“

”اب چلیے۔۔۔ خاندان کے دو افراد سے تو آپ کی صبح ملاقات ہوگی۔ باقی سے بھی ہو جائے گی۔ مگر نہادھو لیجیے۔“ ونود نے محض سر ہلا دیا۔ پھر ادھر دیکھا۔ مگر اس کا سوٹ کیس پہلے ہی ادھر اندر پہنچ گیا تھا۔

”مس شیاما۔۔۔!“ وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ۔۔۔ میں اپنے قیام کا کہیں اور بندوبست کر لوں۔“

”میں نے آپ کو بتایا تھا کہ یہاں ہوٹل تو کیا سرائے تک نہیں ہے۔“ شیاما بولی۔ ”اس لیے کہ یہاں اس کی کوئی ضرورت تک نہیں ہوتی ہے۔ بالفرض کوئی مسافر آ گیا تو یہاں کے لوگ اسے مہمان بنا کر کھہرا لیتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ مجھے بن بلائے مہمان کی حیثیت سے مجبوراً قبول کیا جا رہا ہے۔“ ونود نے کہا۔

”مجھے ایک قتل کی نقیشتیں کرنی ہے۔ تمہارے گھر والوں

کے رویے سے ظاہر ہوتا ہے کہ۔۔۔ کہ یہ دخل در معقولات ہے۔۔۔“

”آپ نے دیدی کی بات کا برامانا ہے اور اس لیے جذباتی ہو گئے ہیں۔“ شیاما نے اداسی سے کہا۔ ”وہ تو سب کے ساتھ ایسی ہی پیش آتی ہیں۔۔۔ سر جو بھونکی تھی وہ آپ پر نہیں ہنسی تھی۔۔۔ اسے بلاوجہ ہنسنے کی عادت ہے۔۔۔ اسے کتنا بھی منع کیا جائے وہ اس سے باز نہیں آتی ہے۔۔۔ رعبی بات تفتیش کی۔۔۔ آپ شوق سے تفتیش کیجیے۔ کوئی آپ کے کام میں مزاحمت نہیں ہوگا۔۔۔ بلکہ میرا اپنا مشورہ یہ ہے کہ یہاں آپ کو ہر ممکن سہولت حاصل ہوگی۔۔۔ اس گھر سے باہر شاید آپ کو کسی کا تعاون نہ ملے گا۔“ پھر اس سے توقف کر کے اپنی آواز دہی کر کے راز دارانہ لہجے میں اس طرح سے کہا جیسے دیوار بھی سن رہے ہوں۔

”میں ایک بات بتاؤں آپ کو۔۔۔؟ ہو سکتا ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو۔۔۔ لیکن لوگوں کا اور خود میرا خیال یہ ہے کہ تھانے دار کا قاتل اسی حویلی میں موجود ہے۔۔۔ وہ ہم میں سے ہے۔۔۔ آپ یہاں رہ کر آسانی سے پتا چلا سکتے ہیں کہ وہ کون ہے۔۔۔؟“

وود بھونچکا ہو کر شیاما کی شکل دیکھنے لگا۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا کہ گھر کا بھیدی لٹکا ڈھائے۔ لوگوں کی یہ بات شاید غلط نہیں تھی کہ۔۔۔ اس گھر کے لوگ خطی اور سنگی ہیں۔

شیاما کو اب تک سب بہنوں کے مقابلے میں زیادہ متوازن کی مالک سمجھ رہا تھا۔۔۔ کتنی بے خوبی سے تسلیم کر رہی تھی کہ تھانے کے قتل میں ان کے گھر والوں کے ملوث ہونے کی خبر بے بنیاد نہیں ہے۔

اس کی جیسے رہنمائی ہو رہی تھی۔ یہ بات اس کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ یہ لڑکی جتنی حسین اور پرکشش ہے اتنی ہی بے خوف اور نڈر ہے۔۔۔ باغی بھی ہے۔ اس کے باغیانہ خیالات کہیں اس معصوم لڑکی کے لیے کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دیں۔ شیامانے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ حیرانی سے دیکھنے لگا۔

”ایسی حیرانی سے مجھے مت دیکھیے۔۔۔“ شیاما کے ہونٹوں پر ایک ایسی پیاری دل کش مسکراہٹ ابھر آئی جس نے شیاما کے حسن کو نکھار دیا۔ اس کے جی میں ایک حسرت بھرا خیال آیا۔ ”کاش۔۔۔ اس مسکراہٹ کی دل فریبی کو اپنے ہونٹوں میں جذب کر سکتا۔۔۔ یہ ہونٹ بھی کیسے رسیلے اور گداز تھے۔ ان میں کتنی مٹھاس ہوگی۔

پھر شیاما ایک دم سے کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ وود کچھ کہتا اس سے پہلے بول پڑی۔ ”میرا دماغی توازن بالکل درست ہے۔ میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گی نہ مجھ میں جھوٹ بولنے کی ہمت ہے۔۔۔ میں جھوٹ نہیں پوتی۔۔۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی کسی موقع پر جھوٹ بولا ہو۔۔۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ۔۔۔ تفتیش کے لیے شہر سے آنے والے افسر کی بطور خاص خاطر مداخلت کروں۔ بطور خاص کا مطلب آپ کی سمجھ میں آیا اب۔۔۔ اگر کوئی ایسا دیا۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ الونائپ کا شخص ہوتا تو وہ میرے چکر میں پڑ جاتا۔ میری صاف گوئی کو آپ میری بے حیائی تو نہیں سمجھ رہے ہیں نا آپ؟ یہ چھوڑیے کہ کس نے کیا کہا۔ آپ کو دیکھنے کے بعد میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔۔۔ اس لیے کہ آپ مجھے ذہین آدمی لگتے ہیں۔۔۔ میں باتوں اور بشرے سے پہلی نگاہ میں پتا چلا لیتی ہوں کہ سامنے والا شخص کیسا ہے۔ آپ کی قوت ارادی کو ٹھست دینا۔۔۔ معاف کیجئے گا۔۔۔ درغلنا آسان نہیں ہے۔۔۔ دیکھئے نا۔۔۔ آپ نے گاڑی میں مجھ سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔۔۔ نہ مان مانی کی۔۔۔ آپ من مانی کرتے تو میں قطعی کوئی تعرض نہیں کرتی۔۔۔ مجھے دشواری ہے کہ آپ شاید معلوم کر لیں گے کہ قاتل کہ کون تھا۔۔۔ پھر میں سازش میں شریک ہو کر مجرم کیوں بنوں۔۔۔؟“

وہ وود کو ذیوان عام جیسے ہال سے گزار کے قالین بچھ ہوئے زینے کے راستے اوپر لے گئی۔ ”اگر یہ معاملہ تحصیل کے تھانے والوں پر چھوڑ



دیا جاتا تو آسانی سے دب جاتا بالکل اسی طرح جیسے میرے چچا کی پراسرار موت کا معاملہ دبا دیا گیا تھا حالانکہ وہ بھی قتل تھا۔“

ونود کے قدم بے اختیار رک گئے۔ وہ چونک گیا۔ اس نے اپنا بازو غیر محسوس انداز سے پھڑوایا۔ ”کیا کلدیپ کور نے اسی لیے پوچھا تھا کہ کون سا قتل۔۔۔؟“ ونود نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں۔۔۔“ شیاما نے پھر سے اس کا بازو تھام لیا اور اسے اپنے ساتھ کشاں کشاں لے جانے لگی۔ ”ان کی دیہانت کو اور سواگ باش ہوئے اور انہیں جو قتل کیا گیا وہ کوئی زیادہ پرانی بات نہیں۔ میرا ایک ہی چچا تھا۔ بہت شان دار رئیس اور ذہین اور اعلا صلاحیت کے مالک تھے۔ ان میں جو قابلیت، دور اندیشی اور سمجھ داری تھی المیہ طور پر خاندان کے کسی فرد کو نہیں دی تھی۔۔۔ اگر وہ زندہ رہتا تو اس خاندان کے نہ صرف بگڑے حالات بلکہ افراد کو بھی سدھار دیتا۔ میں اس کی کتنی خوبیوں کے بارے میں بتاؤں اور تحریف کروں۔ وہ ہندی میں ڈوب گیا تھا اور اس کی لاش ایک ایسی جگہ سے ملی تھی جہاں کوئی نہیں جاتا۔۔۔ لہذا مہندر انکل کے ڈوب کر مرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن پولیس کو قاتل نہ ملا۔ انہوں نے آسانی سے حادثاتی موت قرار دے دیا۔ یہ پولیس کی نا اہلی سہی اور غفلت تھی۔ بے زاری تھی۔۔۔ یا پھر قاتل نے ان کی مٹی گرم کر کے تفتیش سے روک دیا تھا۔“

”تھانے دار کی موت کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔“ اس نے قدرے توقف کے بعد اپنی بات جاری رکھی۔ اس نے ایک دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو گئی۔

ونود نے حویلی کی قدامت اور ریکسانہ شان کے مطابق سچے سجائے بیڈ روم کو دیکھا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن الجھن اور تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ

خود شیاما جو اس گھر کی ایک بیٹی ہے، خاندان کے دیگر افراد کی طرح اس کے ناموس کی پاسبان بھی جاسکتی ہے یہ بات کیوں یقین دلانے پر مصر ہے کہ ان کا عزت دار گھر اندر حقیقت قاتلوں کی ٹیم ہے۔

اگر وہ اس خاندان کو رسوا کرنا چاہتی ہے تو کیوں۔۔۔؟ کیا اس لیے کہ اس کے چچا کے قاتل کو کیفر کر دیا تک پہنچائے۔

شیاما نے اپنے چچا سے جن جذبات کا اظہار کیا تھا اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے چچا سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ اسے آج بھی اس کی موت پر گہرا صدمہ ہے جیسے اس کی موت قاتل کے ہاتھوں کل ہی ہوئی ہے۔

اسے اپنی بڑی بہن کلدیپ سے وہ انسیت نہیں ہے جو بہنوں میں ہوتی ہے۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے ونود نے شیاما کی طرف دیکھا۔ شیاما ہاتھ باندھے کھڑی اسے اپنی طرف متوجہ بنانے کی منتظر تھی کہ وہ کچھ کہے۔ اس لیے کہ اسے جو کچھ بھی کہنا تھا وہ کہہ چکی تھی۔ اب اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ مگر ونود اسے منگلی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے آرٹ کا کوئی شاہکار دیکھ رہا ہو۔

”مس شیاما۔۔۔؟“ ونود نے بالا آخر خاموشی کے ساتھ اس جمود کو توڑا اور پھر جیب سے سگریٹ نکالا۔ ”آخر آپ چاہتی کیا ہیں؟ سگریٹ پینے کی اجازت ہے مجھے۔۔۔؟“ اس نے اخلاقا پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر سگریٹ لائٹر سے سلگائی۔

”میں کیا چاہتی ہوں۔۔۔؟“ وہ سپاٹ لہجے میں ونود کے الفاظ دوہرا کے بولی۔ ”یہ پوچھیے کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔۔۔ کنور وجے سنگھ ہی نہیں، اس حویلی میں رہنے والوں نے اتفاق رائے سے مجھے سفیر بنایا تھا اور یہ اعتبارات دیے تھے کہ میں آپ کو رشوت دے کر اس تفتیش سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں۔ رشوت کی رقم پچاس ہزار تک ہو سکتی

زیادہ لڑکے، مرد آ رہے ہوں۔۔۔ ان میں دو ایک ہندوستانی اور مقامی بھی تھیں انہیں اس بات کا طعنہ دیا جاتا تھا کہ کوئی لڑکا یا مرد دوست نہیں ہے۔۔۔ صرف اس لیے کہ ہم بد صورت اور بے کشش ہیں۔ کلاس میں بچہ ہوتی لڑکے لڑکیاں جذباتی انداز سے ایک دوسرے سے پیش آتی تھیں۔ شاید میرے گھروالوں کو شک تھا کہ میں وہاں کے ماحول، آزادی اور تنہائی سے فائدہ اٹھا کر دولت مند اور ہم جماعت لڑکوں پر مہربان ہوتی رہی ہوں۔ میں نے ان سب پر غیر محسوس انداز سے واضح کر دیا کہ میں نے مشرق اور ہندوستان کی لاج رکھی۔ کبھی بھی بھولے سے کسی لڑکے کو دوست نہیں بنایا۔ اس کے ساتھ ہوٹل بازی یا سیر و تفریح اور پکنک تک نہیں منائی۔۔۔ وہاں بوسہ بازی عام تھی۔۔۔ بوسہ بازی دور کی بات ہے۔ میں نے بھی کسی بھی ہم جماعت لڑکے سے مصافحہ نہیں کیا۔ اس لیے مجھے میرے خاندان والے مجھے مہرہ بنانا چاہ رہے تھے۔“

”اگر یہ ذمے داری کلدیپ کے سپرد کی جاتی تو۔۔۔ اس لیے کہ وہ بھی تو ولایت پلٹ ہے۔“ وہ وہ اپنی حیرانی پر قابو پا چکا تھا۔ ادھر شیاماسے وہ بڑا متاثر سا ہو گیا تھا۔ جس کا ماضی آئینہ کی مانند ہاتھا۔

”وہ اس کام کے لیے نہایت موزوں اور مناسب عورت تھی۔۔۔ اگر آپ نے اسے ایک مرد کی نظر سے دیکھا تھا تو۔۔۔ وہ مغرور سے مغرور مرد کا سرخم کر سکتی تھی۔ اس پر اس قدر فیاضی سے مہربان ہو جاتی کہ مرد کی کم زوری بن جاتی۔ ایسی عورت کو یورپ میں کسی کہا جاتا تھا جس کے معیار پر وہ پوری اترتی ہے۔ وہ ایسا گداز پر شاب بدن۔۔۔ نشیب و فراز رکھتی ہے کہ مرد اسے دیکھ کر پاگل بن جاتے ہیں اور۔۔۔“

”پھر اسے کیوں نہیں منتخب کر کے مہرہ بنایا گیا۔ مچھلی کے لیے اس سے بہتر چارہ کوئی اور نہیں تھا۔“ وہ نوے درمیان میں کہا۔

”اس لیے کہ وہ اتنی مغرور ہے کہ اس نے اپنی

ہے۔ ویسے تو مجھے اشاروں میں یہ بھی سمجھا دیا گیا تھا کہ۔۔۔ اگر پچاس ہزار لینے کی بجائے کوئی میرا طلب گار ہو تو میں اسے آپ کو بھی خاندان کی عزت بچانے کے لیے قربان کر دوں۔۔۔ اس پر مہربان ہو جاؤں۔۔۔ کسی قیمت پر خاندان پر آج نہ آئے۔۔۔ مجھ پر آج سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔۔۔ اس لیے کہ خاندان کی عزت اور عظمت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کے لیے جتنی بھی قربانی دی جائے کم ہے۔۔۔ ایک مرتبہ خاندان کی عزت، وقار اور عزت کو داغ لگا تو پھر دوبارہ نہیں مل سکتی اور نہ ہی اسے ملایا جاسکتا ہے۔ اس امر کو پیش نظر رکھا جائے۔ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔

قربانی بھی تو ایک طرح سے رشوت ہی ہوتی ہے۔ خواہ وہ انسانوں کے حضور پیش کی جائے یا دیوتا کو دی جائے۔ لیکن میں نے اس دوسرے خیال سے اتفاق نہیں کیا۔۔۔ اس لیے کہ میں ذرا مختلف قسم کی لڑکی ہوں اور عصمت اور عفت کے فرسودہ سبھے جانے والے نظریات پر اب تک قائم ہوں۔۔۔ حالانکہ میں نے یورپ میں تعلیم پائی۔ وہاں جو میں نے آزادی خصوصاً لڑکیوں، عورتوں میں محسوس کی یہاں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔۔۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی معاشرہ مادر پدر آزاد ہوتا ہے۔۔۔ وہاں میری ہم جماعت لڑکیاں جو چودہ پندرہ اور سولہ برس کی تھیں ان کے نزدیک عورت کی آبرو کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔۔۔ ہر ایک لڑکی کے دوستوں میں مرد زیادہ ہوتے تھے۔ وہ لڑکی جس کے لڑکے، مرد زیادہ دوست ہوں خوش نصیب بھی جاتی تھی۔ لڑکیاں جو میری ہم جماعت تھیں ایک دوسرے سے بے حد بے تکلف، فری، بے حجاب اور بے شرم تھیں۔ ان کی باتیں سن کر میری پیشانی عرق آلود ہو جاتی تھی۔ وہ بتاتی تھیں دولت مند لڑکے اور مردانہیں سرفراز کرتے ہیں۔۔۔ ان کے نزدیک وہ لڑکی بڑی رشک و حسد سے دیکھی جاتی تھی جس کی زندگی میں

پیربان رہتا سطور نہیں کیا۔ جب کہ وہ بہترین چارہ تھی۔“ شیاما بولی۔

شیاما اب اس کے مقابل آ بیٹھی تھی۔ اس کے سگریٹ لائٹر کو بے مقصد جلا بھجار رہی تھی۔ وہ لائٹر تمام کر بولی۔

”چنانچہ قریباً میرے نام نکلا۔ آپ رشوت لینے کے قائل ہیں یا نہیں۔۔۔؟ پچاس ہزار ایک بڑی رقم ہے۔“

”میں آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں۔“ وود نے سگریٹ کی راہ سگریٹ کی پیکٹ میں جھاڑی کیونکہ ارد گرد ایش ٹریے نہ تھی۔ ”مجھ جیسے ایک سرکاری ملازم کے لیے یہ رقم بہت بڑی ہے۔ خواب میں بھی میرے لیے اس کا حصول ناممکن ہے اور پھر میں اتنی رقم دس برس میں بھی پس انداز نہیں کر سکتا۔۔۔ اور اس سرمایہ سے آج کوئی منافع بخش کاروبار کر کے اس نوکری پر لخت بھیج سکتا ہوں۔ جس میں چور، ڈاکو، قاتل اور بدعاش ہر وقت جان کے درے رہتے ہیں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید یہ پیش کش رائیگاں نہ جاتی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ شیاما نے لائٹر رکھ کے اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا اور اپنے گورے گلابی باؤں جو تے سے نکال کر میز پر پھیلا دیے۔ جو وود کے ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے سفید کبوتروں کی طرح لگے۔

”آپ میری طرف متوجہ نہیں ہیں۔“ شیاما نے غور سے وود کو دیکھا۔

وود خفت سے مسکرایا۔ کیوں کہ ان گورے گورے گلابی گلابی کبوتروں کو وہ جویت سے دیکھنے لگا تھا۔ ”جی۔۔۔ آگے کہیے۔۔۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔“

”کنور وجے سنگھ کی کابینہ کے اجلاس میں رشوت مسترد کیے جانے سے پیدا ہونے والی صورت حال کو بھی زیر بحث لایا گیا تھا۔“ شیاما نے پوری سنجیدگی سے کہا اور پھر یہ طے پایا تھا کہ بغرض محال

آپ اصول پرستی اور فرض شناسی کے ناقابل علاج جنون میں مبتلا ہوں اور یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ قاتل کون ہے۔۔۔ تب بھی اس صورت میں پچاس ہزار کی پیشکش برقرار رہی جائے۔

ایک بار پھر وود کی عقل چلرائی۔ اسے یاد آیا کہ بڑے شہروں میں پولیس کے حکمے میں کتنی کالی بھیڑیں ہوتی ہیں۔۔۔ چوں کہ وہاں ہر منٹ جرائم ہوتے ہیں۔۔۔ نوخیز عمر کی لڑکیوں کی بے حرمتی۔۔۔ لٹل کی وارداتیں۔۔۔ بیکوں اور گھروں میں ڈکیتیاں۔۔۔ رہزنی اور لوٹ مار۔۔۔ وہاں ہر وقت لوٹ کھسوٹ اور رشوت کا بازار گرم رہتا ہے۔۔۔ ضروری نہیں چالیس چالیس، پچاس پچاس ہزار دس بیس ہزار، صرف سینکڑوں میں رشوت دے کر مجرم بچ جاتے ہیں۔ پچاس ہزار کی رقم صرف اعلا افسروں کو قانون شکنی پر ملتی تھی۔ وہ پچاسی والے مجرم کو تختہ دار سے بھی اتار لیتے تھے۔

”گویا رشوت کی جگہ انعام۔۔۔ وود نے طنز کیا۔“ (یعنی صرف لیبل بدل دیا جائے گا۔ کیوں؟) ”یہ انعام نہیں بلکہ یہ بھی رشوت ہوگی۔“ شیاما نے کہا۔ ”اس بات کی کہ آپ قاتل کے نام کی تصدیق نہیں کریں گے۔۔۔ اسے قانون کے حوالے کرنے کے بجائے ہمارے نظام انصاف کے سپرد کر دیں گے اور ہم قاتل کو باعزت طور پر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لینے کا موقع فراہم کریں گے۔“ مقدمے سے سزا سن کر عدالتی کارروائی میں جو رسوائی ہوتی ہے وہ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔“

”فرض کیجیے۔۔۔ میں یہ بات مان لیتا ہوں۔“ وود نے کہا۔ ”تو اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ۔۔۔ قاتل بھی آپ کی بات مان لے گا اور فرار نہیں ہوگا۔۔۔ اس پہلو پر بھی غور کیا گیا؟“

”اس کی ضمانت بھی دے سکتی ہوں۔ پایا لے سکتے ہیں۔“ شیاما نے پورے اعتماد سے یقین دلایا۔ ”یہ تو آپ اپنے طور پر کہہ رہی ہیں۔۔۔ اگر کنور وجے سنگھ اس بات سے مکر گئے تو۔۔۔“ وود

نے اپنے شک کا اظہار کیا۔

دانتہ یہ حرکت نہیں کی۔ جب وہ کھڑی ہوئی تو تیزی سے پھسلے ہوئے پلو کو تھام نہ سکی تھی۔ دروازہ بند کر کے نکل گئی۔ جاتے جاتے اپنی سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک چھوڑ گئی۔

دودو جلتی ہوئی سگریٹ کا آخری حصہ انگلیوں میں تھامے بیٹھا رہا۔ اس عجیب و غریب لڑکی نے اپنے حسن و شباب کی رعنائی سے ہی نہیں بلکہ اپنے کردار سے بھی اسے متاثر کیا تھا۔ وہ اسے پسند کرنے لگا تھا۔ غلط ماحول نے اس کی سوچ کو تھوڑا سا غلط کر دیا تھا۔ ورنہ شیاما اب ملنے والی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کے تصور سے قریب ترین تھی جو دودو کے ذہن نے مثالی عورت کے پیکر میں ڈھال رکھا تھا۔ اور جس کے ساتھ زندگی گزارنے کی تمنا کی جاسکتی تھی۔ سگریٹ کے جلتے ٹوٹے سے انگلیاں جھلیں تو وہ چونک کر اٹھا۔

پھر وہ غسل خانے میں گھس گیا جو نہایت خوب صورت اور کشادہ تھا۔۔۔ مغربی طرز کا۔۔۔ شاور کے علاوہ وہاں ہاتھ شب تھاجس میں بیک وقت دو آدی نہا سکتے تھے۔ شاور بھی تھا، واش بیسن۔۔۔ اسٹینڈر پر شیمپو اور کئی اقسام کے لوشنز بھی تھے۔ صابن کی ایک ٹکیہ۔۔۔ کھوٹی پرفروش تو لیا لگا ہوا۔ غسل خانہ خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔

وہ شاور کے نیچے رم بھم برستے پانی سے بھیگتے ہوئے اس نے بوئے اسوس سے سوچا۔

ایسے تو شیاما کی سازش کامیاب ہو جائے گی۔۔۔ نہیں شیاما کی نہیں۔۔۔ کنور دے سنگھ کے گھرانے کی سازش۔۔۔ مجھے زیادہ دفا ٹی ٹھیل کھیلنا ہوگا۔۔۔ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہوگا۔

لباس بدل کے اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ دوپہر کے بارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اب اسے اپنے کمرے میں بیٹھ کے صورت حال کا جائزہ لے کرنا چاہیے جو خاصا واضح ہو چکی تھی۔ تفتیش کا آغاز کر دینا چاہیے اور تھانہ پہنچ جانا چاہیے یا پھر دوپہر کے کھانے تک کچھ آرام کر لینا

”ہم قول پر جان دینے والے لوگ ہیں۔ عزت نہیں۔۔۔ ہمیں عزت جان سے زیادہ پیاری ہے۔ عزیز ہے۔۔۔ اس لیے کہ ہم خاندانی لوگ ہیں۔۔۔ انکار کی صورت میں ہم خود بھی قاتل کو سزائے موت دے سکتے ہیں اور فرار کی صورت میں رضا کارانہ طور پر ہم میں سے کوئی بھی مکمل اعتراف جرم کی تحریر آپ کے حوالے کرنے کے بعد اپنی زندگی کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ آپ کا قانون بھی تو ضامن کو پکڑتا ہے۔۔۔ اور قاتل کو سزائے موت دیتا ہے۔ کسی اصول کی خلاف ورزی نہیں ہوگی ایس پی صاحب!“

”میں فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ دودو نے کہا۔ ”مجھے حالات کا جائزہ لینے تو دیجیے۔۔۔ فیصلہ میں اس کے بعد ہی کر سکوں گا۔ میں جلد بازی اور غفلت کا قائل نہیں ہوں۔ اس وقت میں چوں کہ لمبے سفر سے آیا ہوں، اس لیے نہ صرف جسم بلکہ دماغ بھی تھکا ہوا ہے۔۔۔ میں ذرا تھک رہا ہوں اور پھر تازہ دم ہو جاؤں اور دوسرے لوگوں سے بھی مل لوں۔“

”مجھے منظور ہے۔“ شیاما نے کہا۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک بار پھر ساڑی کا پلو شانے اور سینے پر سے پھسلا۔ اس طرح جیسے مرد کا پاؤں پھسل جاتا ہے۔ دودو کی نگاہ یوں پھنکی کہ وہ بل بھر کے لیے سب کچھ بھول گیا۔ اس کے دل پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی اس نے سوچا۔ دنیا میں ایک تو قدرتی نظارے ہوتے ہیں جو دل کو کیف و سرور اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں۔۔۔ اس نے کیسے نظارے نہیں دیکھے اور دیکھتا رہتا تھا۔ اس کا دل کرتا تھا کہ اس کی تصویر کشی کر لے۔

لیکن عورت جیسا نظارہ۔۔۔ کیا ہیجان خیز، دل نش اور رعنائیاں لیا ہوتا ہے۔ اس نے دیکھا اور سوس کیا تھا ہر لڑکی، عورت اپنا ایک الگ نظارہ رکھتی ہے۔۔۔ ایسا نظارہ جو دل کو گرما دیتا ہے۔

شیاما دل فریب انداز سے مسکرائی۔ اس نے

چاہیے۔  
دروازے پر دستک ہوئی پھر اس نے آگے

بڑھ کر دروازہ کھول کر دیکھا تو شیاما سفید شلوار قمیص میں۔۔۔ بالوں میں موتیوں کے سفید پھول سجائے اور کانوں میں چاندی کے جھل مل کرتے سفید آویزے پہنے کھڑی تھی۔ لباس کے ساتھ ہی اس کے حسن و دل کشی کے انداز میں حیرت انگیز انقلاب رونما ہوا جو سادگی میں حسن کا نظر نواز نمونہ تھی۔

پہلے اس کے جمال میں قطرہ سیما کی جب و تاب اور تڑپ تھی تو اب قطرہ شبنم کی طہارت اور ٹھنڈک۔

”برانہ مانیں تو ایک بات کہوں ایس پی صاحب! بلکہ دو باتیں۔“ وہ مسکرائی تو اجالا اور بڑھ گیا۔

”ایک دو نہیں بلکہ آپ دس باتیں بھی سن سکتی ہیں۔“ وندو بھی مسکرائے بغیر نہ سکا۔ ”نہ ماننے والا گناہ گار۔۔۔ پانی۔“

وہ ہنسی تو اس کی کھنک پھر فضا میں گونج اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے برقی تھمتے جل اٹھے۔ وہ بولی۔

”ایک تو یہ کہ آپ صورت سے ذرا بھی ایس بی نہیں لگتے۔۔۔ ہمارا خیال تھا کہ کوئی بھاری بھر کم خوف ناک شکل کا۔۔۔ بڑی بڑی مونچھوں والا خرائٹ افسر آئے گا۔۔۔ عموماً پولیس افسران کی وضع قطع سفاک ڈاکو کی طرح ہوتی ہے۔۔۔ اگر میں آپ کا نام لے کر مخاطب کروں تو کیا کہوں۔۔۔ وندو کمار صاحب یا صرف وندو۔۔۔؟“

”مجھے بھی تکلف اچھا نہیں لگتا اس لیے کہ اس میں ایک اجنبیت ہی محسوس ہوتی ہے۔“ وندو نے محتاط ہو کر کہا۔ ”مگر بے تکلفی کے مظاہرے سے غلط تاثر قائم ہو سکتا ہے آپ کے گھر والوں پر۔۔۔ اور باہر بھی۔۔۔ میں یہاں سرکاری کام سے آیا ہوں۔ اس کی نوعیت سے بھی اور آپ بھی واقف ہیں۔۔۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے خاندان سے میری

کوئی مراسم نہیں۔۔۔

پروف

اور اگر پہلے ہی دن سے آپ نے مجھے وندو اور میں نے آپ کو شیاما کہا تو ممکن ہے کہ غلط سمجھنے والے میری غیر جانب داری ہی پر شکوک میں مبتلا ہو جائیں۔ ہم لاکھ روشن خیالی سہی۔ رہتے ہیں تو ہندوستان میں ہی ہیں۔۔۔ اور خصوصاً یہاں۔۔۔“

”میں سمجھ گئی مسٹر وندو۔۔۔!“ شیاما نے ہنچے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ لندن نہیں ہے۔ وہاں تکلفات نہیں ہوتے ہیں۔ یہاں کا ماحول اور معاشرہ اور اس کے انداز کو مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔۔۔ آئیے میں آپ کو پایا سے ملاؤں۔ کھانے میں ابھی ذرا دیر ہے۔ آپ کو کافی بھی مل سکتی ہے اور دل چاہے تو آپ پایا کے ہم مشرب بھی بن سکتے ہیں۔“

”کیا کہانی واقعی کافی ہوگی۔۔۔؟“ وندو نے کہا۔ ”ویسے اچھی کافی میری بہت بڑی کم زوری ہے۔ مجھے اس کا بڑا نفیس ذوق بھی ہے۔“

شیاما کے ساتھ اسے نیچے جاتے ہوئے اسے اطمینان ہوا کہ وہ اس شوخ اور بے باک لڑکی کی پیش قدمی روکنے اور درمیان میں رسمی ادب و آداب کی دیوار کھڑی کرنے میں کامیاب رہا۔۔۔ اور اگر یہ اسے اپنے حسن میں اسیر کر لینے کی کوشش تھی تو شیاما ناکام رہی تھی۔

وہ اس کے ساتھ اتنے کم فاصلے پر چلتی رہی کہ وندو کو ایک عجیب سی ہيجان انگیز حواس پر چھا جانے والی نرم و لطیف خوشبو کا احساس ہوا۔ ہلکی سی ضرب آفریں مہک جو کسی قیمتی کلون کی بھی ہو سکتی تھی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ نہیں یہ تو بھی اور لطیف سی سوندھی سوندھی خوشبو کنواری بدن کی ہے جو کسی پرنیوم میں نہیں ہو سکتی اور اس کے گلستان کی بھی۔

نیچے پہنچ کر اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا جیسے وہ کسی جادوگر کی کے حصار سے نکل آیا ہو۔

کمرے میں دو افراد موجود تھے۔

ساتھ برس سے زائد عمر کا سرخ و سفید بارعب

”میں سمجھا نہیں۔۔۔ اس لب و لہجے میں یہ بات کہنے کا مقصد کیا ہے۔“ ونود نے متانت آمیز خشک لہجے میں کہا۔

بلونت اٹھ بیٹھا۔ ”یہ تحقیق و تفتیش کا چکر یہاں نہیں چلے گا۔۔۔ اس حویلی میں در معقولات۔۔۔“  
 ”قتل کسی کا کئی معاملہ نہیں۔۔۔ بلونت!“ ونود نے سخت لہجے میں کہا۔ ”نہ قانون کی نظر میں۔۔۔ نہ میرے لیے۔۔۔ لہذا قتل ایک سنگین اور وحشیانہ فعل ہے۔ مجرم کو تختہ دار پر پہنچانا۔۔۔“

”ہمارے لیے ہے۔۔۔“ بلونت سرکشی سے بولا۔ ”اس حویلی میں ہے اور اس حویلی میں ہمارا راج ہے۔ آپ کون ہوتے ہیں؟“

”بار بار حویلی میں میرے قیام کا حوالہ مت دیں۔“ ونود نے بگڑ کر برہمی سے کہا۔ ”تمہاری بہن خود مجھے لے کر آئی۔ اسٹیشن پر گاڑی لے کر آئی تھی۔۔۔ میں نے کوئی درخواست نہیں کی تھی اور رہائش میرے لیے مسئلہ نہیں تھی۔ اب بھی نہیں ہے۔“  
 ”تھانہ موجود ہے جس میں حوالدار بھی موجود ہے۔“

”تمہارا خیال رکھنے والی کتنی اچھی بہن ہے۔“ ونود چوس ہو کر کہنے لگا۔ ”آج کل ایسی بہنیں کہاں ہیں جو بھائیوں کا اتنا خیال رکھتی ہیں۔۔۔ انہیں اپنی گڑیاؤں اور سہیلیوں سے بھی فرصت نہیں ہوتی ہے۔ ویسے تم بڑے خوش نصیب ہو کہ تمہاری پیاری بہن تمہاری بوریٹ اور تنہائی اس طرح دور کرتی آ رہی تھی۔۔۔ دیری گڈ!“

بلونت گولو کے لیے طرح اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور چہرہ نفرت اور غصے سے چھتر کی طرح ہو گیا تھا۔

ونود نے اس کے بشرے سے بھانپ لیا تھا۔ اس لیے وہ اس سے پہلے کھڑا ہو چکا تھا۔ بلونت کے جست لگاتے ہی ونود نے خود کو بچا کے پوری قوت سے اس کے حکار رسید کیا جو اس کے سر پر لگا جس نے اس کی کھوپڑی سنسنادی۔

وہ چکر کر پیچھے گرا اور کنور صاحب کے پیانے

چمڑے والا بوڑھا کنور وجے سنگھ تخت پر قیمتی شال اوڑھے گاؤں تک لگائے نیم دراز تھا۔ اس کے قریب ہاتھی دانت کے کام والی میز پر پورا اہتمام تھا۔

دوسرا تیس برس کا لالہ بابلی سانو جوان تھا۔ جس نے رنگین کھلے گریبان والی قمیص اور ڈیٹیم کی نیلی پتلون پہن رکھی تھی۔ وہ صوفے پر دراز تھا۔ سگریٹ پی رہا تھا۔

ونود کے اندر آنے پر بھی اس کے انداز بے رخی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اس طرح سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ سگریٹ پینے کا انداز نشہ بازوں کا سا تھا۔ پھر وہ ونود کو مشتبہ نظروں سے دیکھتا رہا۔

”یہ میرے پاپا ہیں۔۔۔ کنور وجے سنگھ۔“ شیا مانے تعارف کر لیا۔ ”پاپا یہ ہیں۔۔۔ آپ مسٹر ونود کمار ہیں۔“ کنور وجے سنگھ نے اٹھنے کی کوشش کی اور اپنا بھاری بھر کم ہاتھ بڑھا کے مسکرایا۔

”آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔ ایس بی صاحب۔۔۔! معاف۔۔۔ معاف کرنا۔۔۔ میں اٹھ کے تمہارا استقبال نہیں کر سکتا۔ کنور وجے سنگھ۔۔۔ وجے یعنی فتح۔۔۔ اور سنگھ۔۔۔ چون کہ آپ سنگھ نہیں ہیں اس لیے بتا دیتا ہوں۔۔۔ شیر۔۔۔ مگر یہ شیر بوڑھا ہو گیا ہے۔۔۔ یہ اس کی فتوحات کا نہیں۔۔۔ شکست کا دور ہے۔“

پھر توقف کر کے جام اٹھا کے حلق میں اٹھیل لیا۔ پھر خالی گلاس رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا پیو گے۔۔۔؟ کس ملک کی۔۔۔ کس سن کی۔۔۔؟ کون سی شراب بولو؟ کون سی ایسی شراب ہے جو میرے پاس نہیں۔“

”کنور صاحب۔۔۔! میں کافی کی درخواست کر چکا ہوں۔“ ونود اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس لا پروا فوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”غالبا یہ آپ کے ولی عہد ہیں۔ کنور بلونت عرف بی۔“

”بریفنگ تمہاری اچھی کی گئی ہے۔“ بلونت نے طنز یہ لہجے میں کہا۔ ”مگر ایس بی بہادر۔۔۔! یہ سب نہیں چلے گا۔“

سمیت فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

وہ اس کے دوسرے حملے کے لیے سکون اور اعتماد سے کھڑا ہوا تھا اور منتظر تھا۔ بلونت سنگھ کو فیصلے کی مہلت دے رہا تھا۔

مگر شیا ما ایک ہڈیانی چیخ مار کر تیزی سے ان کے درمیان آگئی تھی۔ اس کا چہرہ حق ہو رہا تھا۔  
نشتے میں دھت کنور جی وجے سنگھ نے ایک زور دار قہقہہ مار کر دوسرا جام حلق سے اتارا۔

”کم آن بلی۔۔۔ ایک راؤنڈ اور۔۔۔ طاقت ور نو جوانوں کو لڑتے دیکھ کر۔۔۔ میری بوڑھی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔۔۔ مگر اب ادھر مت گرنا۔۔۔ سب تجلیہ کر دیا۔

کنور وجے سنگھ نے تالی بجائی ”یہ صاف کراؤ۔۔۔ ہمارے لیے نیا جام لاؤ۔۔۔ پرانی شراب لاؤ۔“ اس نے پھر ایک زوردار قہقہہ مارا۔ ہنسا پھر اس نے بلونت سنگھ کو لکھارا۔

”اٹھ بھائی۔۔۔ شیر کی اولاد۔۔۔! تو نے تو ناک کٹوا دی اس خاندان کی۔۔۔ ایک مکا کھا کر تختہ ہو گیا۔“ بلونت دیوار کے سہارے بیٹھا وود کو خون آ شام نظروں سے گھور رہا تھا اور اس کے چہرے پر درندگی تھی۔

مگر ناز و نعم میں پلے ہوئے شہزادے کو پہلا مظاہرہ مہنگا پڑا تھا۔ اب تک اسے کمزوروں سے اور غلاموں سے واسطہ پڑا تھا جو اس کے لائقوں، جوتوں اور گھونسلوں کو اس لیے برداشت کرتے تھے کہ وہ رعایا تھے۔ زر خرید غلاموں کی طرح۔۔۔ اس نے کسی کو سفاکی سے نشانہ ہی کیوں نہ بنایا جو اس پر ہاتھ اٹھانے کی جرات ہی نہیں کی تھی۔ اب کسی نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا تو اس کے اپنے گھر پر۔۔۔ وہ بھی اس کے باپ کے سامنے۔

بلونت سنگھ نے اندازہ کر لیا تھا کہ مقابلہ بے سود ہے۔ اس کا دشمن سرکاری حیثیت ہی میں نہیں بلکہ جسمانی طور پر بھی اس سے بہت برتر تھا۔ اب وہ دوسرا مکا کھانے کی تاب نہیں لاسکتا تھا۔ اسے اپنے

دانت ٹوٹنے کا خدشہ تھا۔ اس کا متاثرہ جیزا بری طرح دکھ رہا تھا۔ وہ سہلانے لگا تھا۔

شیا ما نے وود کو بازو تھام کر کھینچا۔ وہ خائف اور سراپیمہ تھی کہ اس کے بھائی نے ماحول میں بد مزگی پیدا کر دی تھی۔

”پلیز۔۔۔ وود۔۔۔ مسٹر وود کمار۔۔۔! چلیں۔۔۔ اوپر کمرے میں چلیں۔۔۔ کافی وہیں آ جائے گی۔ باپا ہوش میں نہیں ہیں۔“  
”اس بلونت کے ہوش تو ٹھکانے آ گئے ہیں۔“

وود نے اپنا بازو چھڑا لیا۔ ”طاقت ور کو بلونت کہتے ہیں نا۔۔۔ اسے اپنی طاقت تو آزمانے دیں۔ ورنہ یہ کہے گا کہ بزدل تھا بھاگ گیا۔ میری بہن اسے بچا کے لے گئی۔“

”پلیز۔۔۔ وود سر وود کمار!“ وہ روتے ہوئے گڑ گڑائی۔ ”اس بے وقوف کو معاف کر دیجیے میری خاطر۔“

”آپ کی خاطر۔۔۔“ وود نے پلٹ کر تلخی سے کہا۔ ”اس سب خرابی کے باوجود جس کی ذمے دار آپ ہیں۔ یہ بے وقوف ہرگز نہیں ہے۔۔۔ بزدل ہے۔ اس نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی۔

مگر اس کے باوجود وہ شیا ما کے ساتھ کسی فرماں بردار بچے کی طرح چل پڑا اسے خود پر تعجب ہوا۔

شیا ما کے پھول جیسے گالوں پر آنسوؤں کو پھسلتے دیکھ کر وہ پھل گیا تھا۔ اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس نے کہا۔

”آئی ایم سوری۔۔۔ لیکن دیکھیے نا۔۔۔ اس نے بکواس کی۔۔۔ طعنہ دیا اور پھر مجھ پر حملہ آور ہوا۔۔۔ میں نے صرف اپنا دفاع کیا۔“

”میں آپ کو الزام نہیں دے رہی ہوں۔ شیا ما دوپٹے میں آنسوؤں کو جذب کر کے مسکرائی۔

”آپ کچھ خیال نہ کریں۔“  
وود کو یوں لگا جیسے بادلوں کے برستے برستے دھوپ نکل آئی ہو۔ بادل ایک ایک کر کے چھٹ گئے ہوں۔

”میں تو شکر گزار ہوں کہ بات بڑھانے کے بجائے تم نے میری بات مان لی۔۔۔ چلو۔“ وہ پھر اس کا بازو تھام کر زینے کی طرف بڑھی۔ اس وقت اور سے کسی عورت کی چیخ سنائی دی۔۔۔ ہڈیانی۔۔۔ پاگل ہسٹریائی چیخ سنائی دی۔ وودو کے قدم بے اختیار رک گئے۔ اس نے شیاما کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”سرجیت ہے۔“ شیاما نے اسے اطمینان بھرے لہجے میں بتایا۔ ”پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اسے چھپنے چلانے کی عادت ہے۔“ ”تمہارا یہ گھر نا صرف عجیب ہے بلکہ ایک معمر ہے۔“ وودو نے کہا۔ ”مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہاں سب پاگل ہیں۔۔۔ کسی پاگل خانے سے کم نہیں ہے۔۔۔ تم سمیت یہاں سبھی پاگل ہیں۔۔۔ اس بات کو جانتے ہوئے بھی تم مجھے یہاں لائیں اور میں بھی یہاں سے گیا تک نہیں۔“ اس کا موڈ اب تک خراب تھا۔

دوسری منزل پر کلدھ پپ نے سرجیت کو دیوچ رکھا تھا۔ کلدھ پپ صحت مند عورت تھی۔ اس نے دہلی پتلی بیمار نظر آنے والی سرجیت کی نازک کلائی موڑ دی۔ کلدھ پپ کے ہاتھ خوب صورت اور مضبوط بھی تھے۔

شکاری چاقو سرجیت کے ہاتھ میں تھا۔ بڑی آواز کے ساتھ راہ داری کے ریلین ٹائلوں والے فرش پر گرا۔

کلدھ پپ نے فوراً ہی سرعت سے جھک کر چاقو اٹھایا اور سرجیت کو ایک طرف زور سے دھکا دے دیا۔

”سرجو۔۔۔ شیاما ایک دم سے چلائی۔ یہ کیا ہو رہا ہے دیدی۔۔۔ کیا بات ہے؟“ سرجیت کے لمبے لمبے گہرے ریشی سیاہ بال بکھر گئے تھے۔ اس کے رخسار پر خراش لمبائشان سرخ ہو رہا تھا۔ وہ دیوار سے لگ کر ہانپنے لگی۔

”شیاما۔۔۔ شیاما۔۔۔ دیدی۔۔۔ دیدی

میرے کمرے میں سے میری دوا چرا کر لے جا رہی تھی۔“

”کیا۔۔۔؟“ شیاما پولی۔ ”دیدی تمہاری کیا چیز چرا کر لے جاسکتی ہے۔ تمہیں شک ہو رہا ہے۔ تمہارا وودو ہم ہے۔“

”دیدی میرے کمرے میں ہے میری دوا چرا کے لے جا رہی تھی۔۔۔ یہ کچی چور ہے۔ چوری چکاری اس کی پرانی عادت ہے۔ اپنی سسرال سے جیسی کیسی چیزیں چرا کے لاتی تھی۔ آج بھی اس سے باز نہیں آئی ہے۔“ سرجیت نے فریاد کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کمپنی سے کہو کہ میری دوا واپس کر دے۔۔۔ میری گولیوں کی شیشی مجھے واپس کر دے۔۔۔ ورنہ میں مرجاؤں گی۔ میرا دماغ سن ہو رہا ہے۔۔۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔“ سرجیت نے اپنے بالوں کو پچھے کیا۔

سرجیت کی گالیاں اور اتنی ساری تیز و تند باتیں سننے کے باوجود کلدھ پپ کی متانت اور وقار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ سرجیت کو نفرت اور تحقارت آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی اور غصے میں اور بھی حسین لگ رہی تھی۔ وودو کو اس کے حسن و شباب نے بڑا متاثر کیا تھا۔ اس کا گداز جسم اور پیچ و خم قیامت کے تھے۔

”دوا کی گولیاں۔۔۔۔۔ کس بیماری کی دوا ہے یہ۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔“ کلدھ پپ نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”اس کا نام شیشی کے لیبل پر لکھا ہوا ہے۔۔۔ تم کون ہوئی ہو پوچھنے والی۔“ سرجیت نے بگڑ کر جواب دیا۔

”دیدی پلیز!“ شیاما نے لجاجت سے پوچھا۔ ”ان باتوں کا کیا فائدہ۔۔۔ تم جانتی ہو۔“

”کیوں کمرے میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں اور اس لیے اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتی۔“ کلدھ پپ بولی۔ ”باپ کے سفید بالوں پر خاک کوئی نہیں ڈال سکتا۔۔۔ اسے اپنے باپ پر بھی رحم نہیں آتا اور نہ ہی



اس خاندان کی عزت کا کوئی خیال ہے۔ میں بلونت سے بھی سمجھ لوں گی۔ جو اسے یہ زہر لا کر دیتا ہے۔۔۔۔۔  
تو سچ میں مت بول شیاما!

”دیدی۔۔۔! میں مر جاؤں گی۔“ سرجیت نے نرم پڑ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”صرف ایک گولی۔۔۔ اچھا ایک گولی۔“

ونود آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور کلدیپ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ جیسے آتش فشاں تھی۔ وہ دھک رہی تھی۔ اس کی پیش اسے جیسے ہلکانے لگی۔ اس کے قریب سے لگا وہ بجلی بن کر گر رہی ہے۔

”کیا بات ہے۔۔۔۔۔“ کلدیپ نے چونک کر اسے گھورا۔ اس کا لہجہ کرخت تھا۔

”کیا میں دیکھ سکتا ہوں کہ یہ کیا زہر ہے؟“ ونود نے اس کے گورے گورے خوب صورت اور گداز ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ کلدیپ نے شیشی پیچھے کر لی۔ پھر اس کے چہرے پر سختی اور آنکھوں میں وحشیانہ چمک سی کوندی تیز لہجے میں بولی۔

”آپ یہاں قتل کی تفتیش کرنے آئے ہیں۔۔۔ ہمارے معاملات میں دخل دیئے نہیں۔ اس بات کا خیال رکھیں۔“

”مجھے اوپر کی منزل پر قدم رکھتے ہی جس کی بو محسوس ہوئی تھی۔“ ونود نے اس کے لہجے کی تیزی تندی اور کرخت آواز کو نظر انداز کر دیا۔ ایک لحظہ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی آواز بھی اس کی طرح کتنی خوب صورت ہے۔ اگر شیریں گفتار کرے تو کانوں میں رس گھول دے۔ دل کو چھو لے۔ لیکن اس عورت کو کون سمجھائے۔ پھر اس نے پوچھا۔

”کون پیتا ہے جس۔۔۔؟“

مگر یہ سوال اسے غیر ضروری سا لگا۔ سرجیت کی صورت اور صحت سے اس کے جرم کی ناقابل شہادت ملتی تھی۔

”میں۔۔۔ میں مجبور ہوں۔۔۔ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔“ سرجیت نے شرمساری سے کہا۔ ”مجبور ہوں۔۔۔“ وہ سسک ہی پڑی۔

”اب میں دیکھتی ہوں کہ تو کیسی مجبور ہے۔۔۔۔۔ کیسے زندہ نہیں رہے گی۔“ کلدیپ نے سختی سے کہا۔ ”ایک دو دن تڑپے گی۔۔۔۔۔ چیخے چلائے گی۔۔۔۔۔ مکار۔۔۔۔۔ مگر میں اب تیرے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گی۔۔۔۔۔ میں تجھے ہاتھ روم میں بند کر دوں گی۔۔۔۔۔ یہ منحوس عادت تجھے برباد کر رہی ہے۔“

”میری عادت تو مجھے ہی برباد کر رہی ہے نا۔۔۔۔۔“ سرجیت نے چیخ کر کہا۔ ”کسی کا گھر تو برباد نہیں کر رہی ہے۔۔۔۔۔ تو کیا کر رہی ہے فاحشہ۔۔۔۔۔ چھوٹی بہن کے منگیت پر ڈورے ڈال رہی ہے۔۔۔۔۔ تجھے روکنے والا کوئی نہیں۔“

کلدیپ کا ہاتھ گھوم کر پوری قوت سے سرجیت کے چہرے پر پڑا۔ وہ لڑکھائی، گری اور پھر کھڑی ہو گئی۔

”میری ساری گولیاں دے دے مجھے ذلیل۔۔۔۔۔ کمینہ۔۔۔۔۔ چڑیل۔“ سرجیت وحشیانہ لہجے میں بولی۔ ”ورنہ میں تیرا شروع سے آخر تک کچا چٹا کھول دوں گی۔۔۔۔۔ پڑھنے لندن گئی تو وہاں کیا گل کھلائی رہی۔۔۔۔۔ صرف لڑکوں سے دوستی رکھی۔۔۔۔۔ سنا تو نے۔۔۔۔۔ میں سب کچھ بتا دوں گی۔۔۔۔۔ ورنہ مجھے شیشی واپس کر دے۔۔۔۔۔ یہاں بھی رنگ رلیاں مٹا رہی ہے۔۔۔۔۔ ایس بی صاحب۔۔۔۔۔! میں جس بھرے سگریٹ پیتی ہوں۔۔۔۔۔ جس مجھے میرا بھائی لا کر دیتا ہے۔۔۔۔۔ کالج میں میری ہم جماعت لڑکیوں نے جن کا تعلق اعلیٰ گھرانوں سے تھا۔۔۔۔۔ وہ نشہ کرنی تھیں۔۔۔۔۔ مجھے سب سے پہلے انہوں نے ہی اس نعمت سے متعارف کرایا تھا۔۔۔۔۔ اب میں اس کی عادی ہو گئی ہوں۔۔۔۔۔ تو میرے اخلاق کی ٹھیک داریں کر کھڑی ہو گئی ہے۔ بس اپنا اخلاق اور کردار کسی طوائف سے کم نہیں۔۔۔۔۔ وہ سوپرے سوپرے گھوڑے پر سوار جنگل کے اندر کیوں جاتی ہے۔۔۔۔۔ کہتی ہے کہ مجھے گڑ سواری کا شوق ہے۔۔۔۔۔ یہ جنون ہے۔۔۔۔۔ مگر یہ

سپوت تھے۔“ وہ یاد ماضی میں کھو گئی تھی۔ ماضی حال بن کر اس کی نظروں کے سامنے آ کھڑا تھا۔

”بونی مجھے بہت جانتا تھا۔ اس کا باپ انڈین سول سروس کا اعلیٰ ترین رکن تھا۔ بونی کا پورا نام کنور بلیر سنگھ تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میرے ساتھ چلو۔ ہم سول میرج کر لیتے ہیں۔۔۔ لعنت بھیجو ان اوجھی ناک والے بزرگوں کے غرور پر۔۔۔ یہ ہمارا بال تک بیک نہیں کر سکتے، میں جانتا ہوں کہ ان سے کیسے سامنا اور مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ میں کم زور نہیں ہوں۔۔۔ لیکن میں ڈر گئی تھی۔

سنڈریلا کے بوائے فرینڈ نے۔۔۔ اس کے بوائے فرینڈ نے محبت کے نام پر۔۔۔ اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے۔۔۔ اس نے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ کھلونا بنایا ہوا تھا کیوں کہ نشہ کا دھواں سنڈریلا کے لیے ناممکن تھا۔ وہ نشے کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔۔۔ وہ سنڈریلا سے کہتا تھا کہ محبت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔۔۔ فراق اور جدائی۔۔۔ چوں کہ سنڈریلا کو نشے کی ضرورت ہوتی تھی اس لیے وہ بڑی فیاضی سے اس پر مہربان ہوتی رہی تھی۔ میں تم سے سچی بات کیا چھپاؤں۔ بونی بھی سنڈریلا کے بوائے فرینڈ کی طرح خود غرض اور بھونڑا تھا۔۔۔ بونی مجھے نشہ لاکر دیتا تو اس سے جی بھر کے فائدہ اٹھاتا۔۔۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔۔۔ لیکن جب میں نے بونی اور سنڈریلا کو غلامت کے دلدل میں دیکھا تو میرا دل ٹوٹ گیا۔ بونی سے نفرت ہو گئی۔ سنڈریلا نے مجھ سے کہا تھا کہ میرا بوائے فرینڈ کسی اور لڑکی سے دوستی کر کے فائدہ جوانی کا کھیل۔۔۔ کھیل رہا ہے۔ چوں کہ مجھے نشہ چاہیے تھا۔ اس لیے بونی نے میری ضرورت اور کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ تم جانتی ہو کہ نشے کے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔“

سر جیت نے سانس لینے کے لیے توقف کیا۔ اس کے سینے میں سانسون کی تلاطم چھلکے کھارہا تھا۔ نوڈ نے اسے خاموش پا کر کہا۔

جاتی ہے مہربان ہونے۔۔۔ اور پھر اسے شرم نہیں آتی کہ اپنی چھوٹی بہن کے منگیت پر ڈورے ڈال کر ڈاکہ مار رہی ہے۔۔۔ وہ درمیان میں قہقہہ مار کے ہنسی۔ ”یہ سب مجھے پاگل سمجھتے اور کہتے ہیں۔ حقیقت میں یہ خود ہی پاگل ہیں۔ مجھے ہر کسی کے بارے میں خبر ہے۔۔۔ کون کیا کرتا ہے۔۔۔ کیا کل کھلا رہا ہے۔۔۔ موج اڑا رہا ہے۔۔۔ یہ سب لوگ مجھے پاگل بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ میں ان سب کے بارے میں جانتی ہوں۔ ان کی رگ رگ سے واقف ہوں۔۔۔ میں سچ بولنے کی ہمت رکھتی ہوں۔۔۔ لیکن میں کسی وجہ سے سچ ہرگز نہیں بولوں گی۔۔۔ بس مجھے میری گولیاں واپس کر دو۔۔۔ میری زبان بندی کر دو۔۔۔ ورنہ آئینہ دکھا دوں گی۔“

کلدیپ کا چہرہ سرخ ہو کر اور حسین دکھائی دینے لگی۔ اس نے گولیوں کی شیشی سر جیت کے ہاتھ پر رکھی اور پلٹ کر پورے وقار اور تمکنت کے ساتھ راہ داری عبور کر کے پیچھے اتر گئی۔ نوڈ نے پلٹ کر دیکھا تو شیا ماغائب تھی۔

”سر جیت۔۔۔!“ نوڈ نے نرمی سے کہا۔ ”کلدیپ کو تم غلط اور اپنا دشمن نہ سمجھو۔۔۔ وہ تمہارا بھلا چاہتی تھی۔“

وہ ہنسی۔۔۔ ”میرا بھلا چاہتی تھی۔ نہیں جناب! کلدیپ نے کبھی اپنا بھلا نہیں چاہا۔۔۔ کسی اور کی بھلائی سے اسے کیا غرض۔۔۔ کیا واسطہ۔۔۔“

نوڈ کو وہ بات یاد آئی کہ جو اسے یہاں لانے سے قبل بتا دی گئی تھی کہ کلدیپ نے خود اپنے شوہر کو گولی مار دی تھی۔

”پھر بھی تمہیں یہ بری عادت ترک کر دینا چاہیے۔“ نوڈ نے کہا۔ ”کیا تم یہ بتانا پسند کرو گی کہ کہاں سے بڑی تھی بہت۔۔۔؟“

”کراؤسٹ کالج میں بونی تھا۔ اور راج کمار رتا کر تھا، سنڈریلا۔۔۔ بڑے بڑے جاگیرداروں اور خواہوں کے اعلیٰ خاندانوں کے

”کیا تم اس عادت کو ترک نہیں کر سکتیں۔ اس لیے کہ تمہاری صحت اور گرتی رہی تو تم ایک دن مر جاؤ گی۔“

سر جیت قہقہہ لگا کر دوہری ہو گئی۔ ”میں مر جاؤں گی۔ پھر کیا ہوا۔۔۔ کسے چاہیے یہ بے مصرف زندگی اور کسے دکھ ہو گا میرے نہ رہنے کا۔۔۔ ویسے بھی اس پاگل خانے میں سب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔۔۔ ان کے لہو سے نفرت کی بو نہیں آئی تمہیں۔۔۔ یہ سب ایک دوسرے کو مار ڈالیں گے۔۔۔ میں۔۔۔ میں نے کئی بار سوچا کہ میں بھاگ جاؤں۔۔۔ اس قید سے نکل جاؤں۔۔۔ کیا مزہ آئے گا کہ جب سارے زمانے کو معلوم ہو گا کہ کتور دے سنگھ کی بیٹی بھاگ گئی ہے۔ ان کی کھوکھلی آبرو کا اونچا نچل دھڑام سے گر جائے گا۔“ وہ توقف کر کے پھر گئی۔

”پھر میں نے سوچا کہ میں جاؤں گی کہاں۔۔۔ باہر کی دنیا بہت بڑی ہے۔ اس میں میرا کون ہے۔۔۔ وہاں بھی بھیڑیے رال پکاتے پھر رہے ہیں۔۔۔ چنانچہ میں قید ہوں۔ تم نے دیکھا ہے نا۔۔۔ محسوس کیا ہے نا کہ قیدیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔“

”کلدیپ تمہاری دھمکی سے ڈر گئی تھی کیوں۔۔۔؟“ ونود نے اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کر کے پوچھا۔

وہ آہستہ آہستہ خوف زدہ سی ہو کر اس طرح پیچھے ہٹنے لگی جیسے ونود اسے خطرناک آدمی سا دکھائی دینے لگا ہو۔

”میں۔۔۔ میں نہیں بتاؤں گی۔ تم پولیس والے ہو۔۔۔ کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟“

ونود نے اسے راہ داری کے آخری کمرے میں داخل ہو کے دروازہ بند کرتے دیکھا اور پلٹ کے وہ اپنے کمرے کی جانب چلنے لگا۔ اس کی پوزیشن بڑی عجیب ہو گئی تھی۔ وہ اس گھر میں مہمان تو تھا مگر اس لیے کہ میزبان اسے کہیں اور جانے کی اجازت دینے

کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ وہ انہی قاتلوں کے درمیان موجود تھا جو بہت جالاک اور بااثر ہونے کے علاوہ آن پر جان دینے یا لینے والے لوگ تھے۔ انہوں نے اجتماعی طور پر قتل کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔

یہ معمہ اس کے لیے حل طلب چھوڑ دیا تھا کہ وہ اصل قاتل کا پتا لگا سکتا ہے تو مشروط طور پر اس کی اجازت ہے۔ بچ پور آنے سے پہلے اس کا خیال تھا کہ قتل کی یہ تفتیش بھی صابلی کی کارروائی ہوگی۔ حرم میں وہی بیانات۔۔۔ جائے واردات کا معائنہ اور سراغ کی جستجو کا سلسلہ ہوگا اور اسے متعلقہ وغیرہ متعلقہ افراد سے حاصل ہونے والی گواہی سے قاتل کا پتہ چل جائے گا۔ نہ چلا تو یہ کوئی انوکھی بات نہ ہوگی۔

ایسی تفتیش وہ کئی بار کر چکا تھا جس میں کامیاب اور ناکامی کا تناسب فنتی فنتی رہتا تھا۔۔۔ مگر اب تفتیش کا دائرہ سمٹ کر چند افراد پر مشتمل ایک جاکر دارانہ ذہنیت کے مالک خاندان تک محدود رہ گیا تھا اور اس خاندان کو بھی گردش حالات روایات اور اقدار سے انحراف کرنے والوں کے چیلنج کے معاش بد حالی کے اور سیاسی تبدیلی کے خلفشار میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ ذہنی طور پر انتشار کا شکار تھے اور اخلاقی طور پر دلیالیہ ہو چکے تھے مگر اپنی شکست تسلیم نہیں کرتے تھے۔ خاندان کے اس کھوکھلے تماشے نے ان کو مضحکہ خیز ہی نہیں بلکہ قابل رحم بنا دیا تھا۔

اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تو اسے چی یقین نہیں آیا۔ شیا باستر پر اڑی پڑی تھی۔

چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے زار و قہر روٹی نظر آئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی ہوئی تھی۔

سر جیت نے اس کے منگیتور اور اس کی بہن بارے میں جودل شکن اور دل آزار باتیں کی تھیں ونود کے لیے یہ طے کرنا بھی مشکل تھا کہ دل آزار سبب جھوٹ تھا یا سچ۔۔۔

کلدیپ میں جو بے پناہ کشش اور جاذبہ

اور پھر قتل کے مسئلے پر بھی وہ کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرے گا جس سے ان کی رسوائی کا تماشا بن سکے۔ آہستہ آہستہ شیا ما کے ہسٹریائی کیفیت کی شدت میں کمی آنے لگی اور اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو تھمنے لگے۔

بالآخر وہ پرسکون ہو کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں نہ جانے کون کس وقت کافی رکھ گیا تھا۔ مگر اب کافی پینے کا وقت نہ تھا اور نہ ہی موڈ۔۔۔ اس نے شیا ما سے وعدہ کیا کہ کھانے کی میز پر کسی نا خوشگوار رد عمل کا مظاہرہ نہیں کرے گا اور کسی بھی بات کا برا نہیں مانے گا۔ کیوں کہ وہ سب کی فطرت کو سمجھ چکا ہے۔

”معافی تو مجھے۔۔۔ مجھے مانگنی چاہیے ونود۔“ شیا ما رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں نے تمہیں آزمائش اور پریشانی اور اذیت میں مبتلا کیا۔ لیکن میں کیا کرتی۔۔۔ میں مجبور تھی۔۔۔ مجھے مجبور کر دیا گیا تھا۔“ اس نے توقف کر کے گہرا سانس لیا۔ پھر وہ اپنی لائبنی پلکیں جھپکا کر بولی۔ ”تم مجھ پر خفا ہونا۔۔۔؟“

”خفا ہوں تو نہیں۔۔۔ البتہ تھا۔“ ونود نے جواب دیا۔ ”اب تو حقیقت یہ ہے کہ اب تک تو میں موجود ہوں تو محض آپ کے خیال سے۔۔۔“

اس بات کا غلط مطلب نکال کے شیا ما مسکرائی تو ونود کو اپنے جھوٹ پر شرمندگی کے بجائے خوشی ہوئی۔ شیا ما کے جانے کے بعد وہ سگریٹ سلگائے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ صورت حال واقعی بہت پیچیدہ تھی۔ قاتل اسی گھر میں موجود تھا اور اسے فیصلہ کرنا تھا کہ فرض کے تقاضوں کو اہمیت دے یا مجبوریوں کو۔۔۔

ایک مجبوری یہ تھی کہ وہ شیا ما کو پسند کرنے لگا تھا لیکن وہ پسند کو چاہت یا محبت کا رنگ دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے کہ شیا ما کسی کی محبت تھی۔ اس کی منتہی محبت ہو چکی تھی۔ ایک لڑکی ہونے کے ناتے اپنے منگیتر سے محبت اور جذباتی لگاؤ ایک فطری امر تھا۔ اسے وہ ایک مخلص دوست کی طرح پسند کرنے لگا تھا۔

حالاں کہ حالات اور واقعات کی شہادت سے

تھی۔ اس کے نشیب و فراز جو توبہ شکن تھے وہ ہر مرد کو اپنی طرف متوجہ اور اسیر کر سکتے تھے۔ وہ اس پر مہربان ہو کر شیا ما سے اس کا تعلق توڑ سکتی تھی۔ لیکن یہ کوئی ضروری کام بھی نہیں تھا ہر مرد کلد پپ کی طرف جھک جائے۔ شیا ما کا منگیتر ضروری نہیں تھا کہ وہ شیا ما کی بجائے کلد پپ سے دل بہلائے۔۔۔ سر جیت کے اس الزام میں اسے بظاہر یقین نہیں آیا۔ وہ دونوں شاید ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہوں گے۔

تاہم ان فضول باتوں اور سر جیت کے بے سرو پا الزامات سے ہٹ کر اخلاقی طور پر اس کا یہ فرض تھا کہ وہ شیا ما کی دل جوئی کرے۔۔۔ دلاسا دے اور سمجھائے کہ سر جیت کے بے سرو پا باتوں کو دل پر نہ لے۔ اس نے جو کلد پپ سے بلواس اور بے ربط باتیں کیں وہ کلد پپ کو تپانے کے لیے تھیں تاکہ اسے گولیوں کی شیشی واپس کر دے۔

وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے شیا ما کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کے بالوں کے گداز اور ریشمی سے لمس نے ونود کو بڑی لطیف سی مسرت کی سنسنی بخش کیفیت کا انوکھا احساس عطا کیا۔ ”شیا ما۔۔۔ ایلین۔۔۔! دیکھو مجھے معلوم ہے کہ سر جیت ہوش میں نہیں تھی اور اس کا داغی توازن درست نہیں تھا۔ تم خود بھی جانتی ہو کہ وہ کیوں کلد پپ کے خلاف زہر افشانی کر رہی تھی۔۔۔ اس کا ہدف تم نہیں تھیں۔۔۔ اور اگر اس کی بات کا برا مانا تو شاید اس کا سر پھوڑ دیتی۔۔۔ مگر وہ جھٹکتی تھی کہ نشے کے ٹوٹنے سے آذنی پاگل ہو جاتا ہے۔ قابو میں نہیں رہتا۔ تم تو سمجھ دار ہو۔۔۔ پھر یہ روٹا کیسا؟“

بشکل تمام وہ شیا ما کو یقین دلانے میں کامیاب ہوا کہ اس کی دونوں بڑی بہنوں، بھائی اور باپ کے جارحانہ اور احقنا نہ رویے کے باوجود وہ اس گھر کی عزت کو اپنی فرض شناسی سے اہم تر سمجھتا ہے۔ جو کچھ بھی اسے معلوم ہوا ہے یا ہوگا۔۔۔ وہ کسی اور کو معلوم نہ ہوگا۔ وہ اس بات کو راز رکھے گا۔

بے تو یوں ہی سہی۔۔۔ صبح و حوال دار سے ملے گا اور پھر تفتیش کا آغاز باقاعدہ کرے گا۔

کھانے کی میز پر وہ سب اکٹھے ہوئے تو ونود یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان میں سے کسی کی صورت پر ان واقعات کے ناخوشگوار اثرات کا سایہ تک نہیں تھا۔ وہ سب نارمل تھے۔ مسکرا رہے تھے اور میزبانی کے آداب کو پوری طرح نبھانے کے لیے کوشاں تھے اسے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ وہ سب کچھ بہت کم بولتا تھا اور ذہنی طور پر غیر حاضر نظر آیا تھا لیکن کسی بات پر اچانک تہقیر مارتا تھا تو اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی ہیں اور کان سب کچھ سن رہے ہیں اور وہ کسی بات اور کسی کے حرکات و سکنات سے غافل نہیں لگتا تھا۔

کھانے کی میز پر اس کا تعارف ایک اجنبی سے بھی کرایا گیا۔ پینتیس سے چالیس برس کی درمیانی عمر کا آدمی جو جوان اور بے حد صحت مند بھی تھا جس کی شخصیت میں وجاہت اور جامہ زہبی نے دل کشی پیدا کر دی۔ وہ بڑے سلیقے کے کپڑوں میں ملبوس تھا اور اس کا رویہ بھی انتہائی مہذب تھا۔ لیکن ونود کو یوں لگا جیسے اس کے انداز و اطوار میں قصع ہے۔ یہ شائستگی فطری نہیں اور اس پر کشش صورت پر ایک نقاب ہے جس کے نیچے بالکل مختلف چہرہ ہے جو اس کا جانا پہچانا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اعلیٰ ترین شخصیت ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ وہ اندر سے کھوکھلا تھا۔

اس نے اپنے ذہن پر بہت زور دیا مگر اسے کچھ یاد نہ آیا۔ ونود کو بتایا گیا کہ وہ منبر ہے اور کنوڑے سب کچھ کا سیکرٹری بھی۔ لیکن اس کی شیاما میں دل چسپی اور شیاما کی حیا سے جھکی ہوئی نظریں دیکھ کر ونود کو کچھ اور شبہ ہوا۔ پھر بے خیالی میں یا عہد سرچیت نے اسے بھائی جی کہہ کے مخاطب کیا اور کلدیپ کوڑ نے مسکرا کے اسے ٹوکا تو ونود کو یقین آ گیا کہ چندر سنگھ شیاما کا وہ منگیتر بھی ہے جس کے بارے میں سرچیت نے نہ صرف افسوسناک بلکہ شرمناک تبصرے کئے تھے اور پھر کلدیپ کوڑ پر الزام عائد کیا

مشتبہ افراد میں سرفہرست یہی تین لڑکیاں تھیں۔ جن میں سے کسی ایک نے اپنی لپ اسٹک سے لاش کے ساتھ دخل در معقولات کے انجام کی وارننگ چھوڑی تھی۔

لپ اسٹک اس گاؤں میں بھلا کون استعمال کرتا ہوگا۔۔۔ اور لپ اسٹک کے شیڈ سے بھی کیا معلوم ہو سکتا ہے۔

ہر جگہ وہی ہوتے ہیں۔۔۔ ان امکانات کو بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کسی نے عہد لپ اسٹک استعمال کر کے ان لڑکیوں کی پوزیشن مشتبہ بنادی۔۔۔ یا پھر ایک بہن نے دوسری بہن کے خلاف نفرت کے رد عمل کا عملی اظہار کیا۔

معلوم پھر کے اس کا شک سرچیت یا کلدیپ پر جاتا تھا۔

کلدیپ اپنے کردار کے پیش نظر قتل کرنے کی اہل تھی تو۔۔۔ سرچیت بالکل نظر آنے اور بننے کے باوجود اتنی سیانی تھی کہ کلدیپ ایک داستان ماضی کے باعث مجرم بن سکتی تھی۔

اس سے بھی بڑھ کر انا کا وہ مسئلہ تھا جس نے پورے خاندان کو اس بحران سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہم خیال اور متحد کر دیا تھا۔ اور وہ سب مل کر قتل کے ذمے دار بھی ہو سکتے تھے اور قتل کے الزام سے اپنے آپ کو بچا بھی سکتے تھے۔

وہ اپنی غیر موجودگی اس گاؤں سے بھی باہر ثابت کر سکتے تھے۔ جیسا کہ کلدیپ نے اپنے شوہر کو قتل کیا تو اس کی موجودگی میں ظاہر کی گئی تھی۔ گواہوں کی بڑی تعداد سے کلدیپ بچ سکتی تھی۔

اس حد تک شیاما بھی ان کے ساتھ تھی تو واقعی اس کی یہ مجبوری تھی۔۔۔ لیکن اس کے شریک جرم ہونے کا خیال ونود کے لیے ناقابل قبول ہوتا جا رہا تھا۔

وہ دلدل میں اتر گیا تھا جس سے لکلنا اب اس کے اختیار کی بات نہ رہی تھی۔ ”خیر اس نے اپنے آ۔۔۔ سہ کر۔۔۔ آگ کا درماے اور ڈوب کے جانا

تھا کہ وہ اس پر ڈورے ڈال رہی ہے۔

رہا۔ اسے ونود کے غسل خانے سے نکل کر اپنے پیچھے

آ جانے کی خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔

”فیجر صاحب۔۔۔!“ ونود نے کہا۔ ”کیا

مہمانوں کے سامان کی تلاشی لینا بھی آپ کے

انتظامی فرائض میں شامل ہے؟“

چندر سنگھ چونک کے اٹھا اور ایڑیوں پر گھوم

گیا۔ ونود کا ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا اور ریوالور کا

رخ ونود کے سینے کی طرف تھا۔

”بہ کیا حرکت ہے؟“ ونود نے تیز و تند لہجے

میں کہا۔ ”اگر کوئی چل گئی تو میں اس مضحکہ خیز حالت میں

مارا جاؤں گا۔“

چندر سنگھ کے خنجر چہرے پر مسکراہٹ نمودار

ہوئی اور اس نے ریوالور نیچے کر لیا۔

”میں معذرت چاہتا ہوں۔۔۔ دراصل میں

یہ دیکھنے آیا تھا کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو

نہیں۔۔۔ تو لیا۔۔۔ شیونگ کریم اور بلیڈ۔۔۔“

”اول تو میں یہ ساری چیزیں ساتھ رکھتا ہوں

اور نہ ہوں تو مانگنے کے بجائے خریدنا پسند کرتا ہوں۔“

ونود نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن اس کے

باوجود میں یہ کہوں گا کہ تھینک یوسٹر چندر سنگھ۔۔۔!“

اب آپ یہ بتائیے کہ آپ نے ریوالور کیوں اٹھایا

تھا؟“

”اٹھایا نہیں تھا۔۔۔ ہاتھ میں آ گیا تھا۔“ وہ

بولا۔ ”آپ نے اچانک پیچھے آ کے سوال کیا تو

میں۔۔۔ بس ایک فطری رد عمل تھا کہ میں ریوالور

لے کر کھڑا ہو گیا۔“ اس نے رومال سے ریوالور کو

صاف کیا اور واپس سوٹ کیس میں ڈال دیا۔

”آپ بہت احتیاط پسند آدمی ہیں مسٹر چندر

سنگھ۔“ ونود نے کہا۔

”حالات کا تقاضا ہے ایس پی صاحب۔“ وہ

بولا۔ ”کل کلاں کو کسی نے ریوالور سے کوئی قتل کر دیا

اور میرے فنگر پرنٹ مل گئے تو میں خواجہ پھنس

جاؤں گا۔ آپ بھی احتیاط پسند ہوتے تو کھلے سوٹ

کیس میں ریوالور یوں چھوڑ کے نہ جاتے۔“

بلاشبہ کلدیپ کو ایک ایسی عورت تھی جو سب

کچھ کر سکتی تھی۔ مگر تالی ایک ہاتھ سے تو نہیں بچ سکتی

اور ڈورے ڈالنے کا الزام اس صورت میں درست ہو

سکتا تھا جب خود چندر سنگھ نے کلدیپ کو موانع

فراہم کیے ہوں۔ اس پہلی ملاقات میں چندر سنگھ کے

بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی تھی اور

بہر حال یہ ونود کا دردمس بھی نہیں تھا کہ ایک بھائی اپنی

بہن کو چرس کیوں لا کے دیتا ہے اور کنور دے سنگھ

جانتے بوجھتے انجان بنے ہیں۔ فائدہ نظر آتا ہے یا

واقعی انہیں کچھ خبر نہیں۔۔۔ اسے تو کلدیپ اور چندر

سنگھ کے رومانس اور تعلقات سے بھی سروکار نہیں ہونا

چاہیے۔ کیوں کہ وہ صرف قتل کی تفتیش کرنے آیا تھا

مگر چندر سنگھ کا شیا کو یوں منگلی باندھ کے دیکھنا اسے

اجھا نہیں لگا۔ کئی بار اسے یہ احساس بھی ہوا کہ چندر

سنگھ اسے غور سے اس طرح دیکھ رہا یوں جیسے اس کے

ارادے اور عزائم کا اندازہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے

بشرے پر اس کے احساسات اور خیالات کو پڑھنا

چاہتا ہے کہ کہیں رقیب تو نہیں ثابت ہوگا اور مہمان

بن کے میزبان کے اعتماد کی شکست کے درپے تو نہیں

ہوگا۔

ونود نے کھانا ختم ہوتے ہی ایک لمحہ بھی بیٹھنا

گوارا نہیں کیا اور معذرت کی اور آرام کرنے کے

بجائے اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔

☆☆☆

وہ غسل خانے میں تھا جب اسے یوں لگا جیسے

کوئی اس کے کمرے میں داخل ہوا ہے۔ دروازے کو

احتیاط اور غیر محسوس انداز سے کھولنے کے باوجود کھٹکے

کی ہلکی سی آواز ونود کے کان تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے

غسل خانے کے دروازے کی جھری سے جھانک کر

دیکھا۔ شیا کا منگیت اور کنور دے سنگھ کا نیچر چندر سنگھ

اس کے سوٹ کیس کے قریب بیٹھا کچھ تلاش کر رہا

تھا۔ ونود نے صابن لگے جسم پر تولیہ لپیٹا اور باہر آ

گیا۔ چندر سنگھ فرش پر لیٹا اپنی کارروائی میں مصروف

و نوڈ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چندر سنگھ نے غلط نہیں کیا تھا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔ اچھا دو منٹ بیٹھو مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“  
پھر وہ مڑ کے غسل خانے میں گھس گیا اور پانچ منٹ بعد کپڑے بدل کے نکل آیا۔ چندر سنگھ نہایت اطمینان سے صوفے پر بیٹھا سگریٹ کا دھواں چھت کی طرف چھوڑ رہا تھا۔ ایک خادم اندر آیا اور کافی کی ٹرے رکھ گیا جو شاید چندر سنگھ نے طلب کی تھی۔  
”تم اس گھر میں رہتے ہو۔۔۔“ و نوڈ نے کہا۔

”گھر کے حالات سے زیادہ خبر ہو۔۔۔ مجھے یہ بتاؤ یہ کیا چکر ہے۔ ان لوگوں کا قل سے کیا تعلق ہے۔ یہ باضابطہ تفتیش نہیں ہے اور تمہارا بیان ریکارڈ پر نہیں رہے گا۔ یہ ایک طرح سے تبادلہ خیال اور رسمی بات ہے۔“

”یہ آپ نے اچھا کیا کہ بات صاف کر دی۔“  
چندر سنگھ بولا۔ ”اتنا تو آپ کو معلوم ہی ہو چکا ہے کہ تھانے دار کے قتل میں اس گھر کا کوئی فرد ملوث ہے شکر نام کے ایک محبوبہ الحواس اور نشے کے عادی شخص نے لاش سب سے پہلے دیکھی تھی۔ شکر ساٹھ ستر سال کا لاوارث اور بے گھر آدمی ہے۔ بیوی اور پھر جوان بیٹے کی حادثاتی موت کے بعد اس کا کوئی نہیں رہا اور اس کا ذہن صدے سے اتنا متاثر ہوا کہ وہ نشہ کرنے لگا اور اس نے گھر کو بھی چھوڑ دیا۔ بعد میں اس کے گھر کو گرا کے وہ گردوارہ تعمیر کیا گیا جو کنور و جے سنگھ کے ہتاجی کی سادھی ہے اور اس جیسے کے بالکل ساتھ ہے جہاں تھانے دار کی لاش لٹکی ہوئی تھی۔ شکر وہیں ایک بیچ پر سوتا ہے جہاں پہلے اس کا گھر تھا۔ چنانچہ جج آفٹھ کھلتے ہی لاش اس نے دیکھی اور تھانے میں اطلاع دینے چلا گیا۔ کلہ بپ کو ہرج شہسواری کے لیے جانی ہے۔ اس نے مجمع دیکھا تو رک گئی اور لاش کو زبردستی وہاں سے ہٹانے میں کامیاب ہو گئی۔ واپس آ کے اس نے اپنے بابا کو بتایا اور بابا نے تحصیل میں کسی سے رابطہ قائم کیا لیکن مقامی سطح پر تفتیش کے

بعد معاملہ دہانے کی کوشش ناکام رہی۔ کسی نے انتظامیہ کو فون پر بتایا کہ کنور و جے سنگھ کا خاندان جو اپنے اثر و رسوخ سے پہلے بھی ناجائز فائدہ اٹھاتا رہا ہے اس قتل کو بھی نامعلوم قاتلوں سے منسوب کر کے داخل دفتر کرادے گا۔ نتیجہ یہ کہ تفتیش اور یعنی آپ کے سپرد ہوئی۔ یہاں خاندان کی کاہنہ کا ایک ہنگامی اجلاس ہوا جس میں صورت حال کو سنگین قرار دیتے ہوئے ایک لائحہ عمل تیار کیا گیا۔ شاید کو خاندان کی عزت کا واسطہ دے کر آپ کے استقبال کے لیے بھیجا گیا۔ اصل اغراض و مقاصد کچھ اور تھے۔“

”وہ سب مجھے معلوم ہے۔۔۔ شاید سب مجھے بتادیا ہے۔“ و نوڈ نے کہا۔

”ان لوگوں کے لیے خاندان کی آن کا مسئلہ دنیا کے تمام مسائل سے زیادہ اہم ہے۔“ چندر سنگھ کہنے لگا۔ ”چنانچہ ہر قسم کی رشوت سے قاتل کو بچانے اور بصورت دیگر افشائے راز کے خطرے سے نمٹنے کو جائز قرار دیا گیا۔ پچاس ہزار کی رقم اس وقت خرچ کر دینا بہتر تھا بجائے گرفتاری، مقدمے بازی، وکیل کی فیس اور قانونی اخراجات میں اتنی ہی رقم خرچ کرنے سے۔۔۔ اور اس طرح رسوائی سے بھی بچا جاسکتا تھا۔ یہ لوگ اس بات سے بھی ڈرتے تھے کہ عدالت میں مقدمے کے دوران دوسرے معاملات نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ جس پر اب تک پردہ ڈالنے میں بھی کبھی ناکامی نہیں ہوئی۔۔۔ مثلاً کنور و جے سنگھ کے بھائی کی پراسرار موت جو عدلی میں ڈوب کے مرا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سی باتیں ہیں جو منہ پر کوئی نہیں کہتا لیکن بعض عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر کہہ سکتے ہیں۔“

”اتنا تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ تفتیش کے لیے میرے آنے پر خوف زدہ بلکہ کچھ بدحواس ہیں۔“ و نوڈ نے کہا۔ ”اور یہ سب باتیں تو مجھے پتا چل ہی گئی تھیں۔ لیکن میں وہ بات جاننا چاہتا ہوں جو مجھے کسی وجہ سے نہیں بتائی گئی۔“  
چندر سنگھ بڑی شائستگی سے ہنستے ہوئے کہنے

دیکھتے ہی دود کو اندازہ ہو گیا کہ یہ گولی ابھی ابھی چلائی گئی ہے۔ بارود کی بو بہت نمایاں تھی۔ اس نے ریوالور کا رخ پورے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ چند رنگہ کی طرف کیا پھر اس نے بغیر کسی تذبذب اور جھجک کے کہا۔

”مسٹر منیجر۔۔۔! یہ ٹھیک ہے کہ میں ذرا دیر سے سمجھا مگر کئی اوقات دیر آید درست آید والا نظر یہ صحیح ثابت ہوتا ہے۔ میں فوراً سمجھ جاتا تو شاید اس وقت مارا جاتا۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ اس میں ایک گولی کم کیوں ہے؟ جب میں نہا رہا تھا تو کسی نے میرا ریوالور نکالا اور ایک گولی چلائی سائینسز لگا کے۔۔۔ چنانچہ میں آواز نہ سن سکا۔ غسل خانے میں شاور کی آواز بھی تھی۔ میں کچھ گا بھی رہا تھا اور دروازہ بند تھا۔ جب میں نے تمہیں دیکھا تو یہی سمجھا کہ تم ریوالور نکال رہے ہو حقیقت اس کے برعکس تھی۔ تم ریوالور رکھ رہے تھے۔ یہ گولی کس پر چلائی گئی ہے چند رنگہ۔“ چند رنگہ کا رنگ اڑ گیا اور اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ کسی مردے کی طرح دکھائی دینے لگا۔ وہ صوفے کے بازو پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے بیٹھا رہا اور دود کو گھورنے لگا۔ پھر اس نے سکرانے کی کوشش کی لیکن اس کی مسکراہٹ بے جان تھی۔ ویران قبر میں اترنے والی چاندنی کی طرح۔۔۔ پلاسٹک کے پھولوں کی طرح۔۔۔ وہ بولا تو اس کی آواز کسی خالی کونو میں سے آتی سنائی دی۔

”میں کیا بتا سکتا ہوں ایسی پی صاحب!“ آواز گلے میں پھنسنے لگی تو وہ کھار کے بولا۔ ”اچھا جو بتانا چاہتا تھا بتا دیا اب میں چلتا ہوں۔“

”ایسے نہیں چند رنگہ!“ دود فوراً ہی اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ ”مجھے میرے سوال کا جواب دیے بغیر تم کیسے جا سکتے ہو؟“

چند رنگہ کی نظریں منجمد ہو گئیں۔ یہ احساس کہ وہ دود کو نہیں بلکہ اس کے پیچھے کی کوڈیکھ رہا ہے، دود کو اس وقت ہوا جب سر پر ہونے والے وار نے اسے چکرا دیا۔ اس کی نظروں کے سامنے یک لخت اندھیرا

”تھانے دار کے بارے میں ایک بات سب ہی جانتے ہیں کہ کنورو بے سنگھ کو اپنے علاقے پر اپنی حاکمیت میں اس کا دخل در معقولات پسند نہیں تھا۔ انہوں نے تھانے کے قیام کی سختی سے مخالفت بھی کی تھی اور تھانے دار کو پہلے دن بلوا کے بری طرح جھاڑا بھی تھا کہ اپنی اوقات نہیں بھولنا۔ وہ کچھ کہے بغیر چلا گیا تھا جس کا کنورو بے سنگھ نے بہت برا مانا جیسے تھانے دار نے ان کی بات اور دھمکی کا کوئی اثر نہیں لیا اور اس کے کان پر جوں تک نہیں رہ سکی۔ لیکن اس طرح تھانے دار اور حاکم کے درمیان ایک سرد جنگ چھڑ گئی۔ قتل سے دو دن پہلے وہ یہاں آیا تھا اور اس نے کنورو بے سنگھ سے ان کے بھائی کی موت کے متعلق کچھ دریافت کیا تھا اور ان کی خاصی گرما گرمی ہوئی تھی۔ کنور صاحب نے بھی اس ملاقات کے دوران تھانے دار کو گالیاں دی تھیں اور اس نے دھمکی دی تھی کہ وہ ان کا ملازم یا حزارع نہیں۔۔۔ وہ انہیں تھانے میں بھی بلوا سکتا ہے۔ ایک پولیس افسر کو اتنا کمزور اور تابع نہ سمجھو پھر اس نے تھانے دار کی بے عزتی کی اور اسے دھکے دے کر نکال دیا۔

اس نے شاید حاکم ضلع سے اس رویے کی فریاد کی ہوگی تو اسے اندازہ ہوا ہوگا کہ دریا میں رہ کر مگر مجھ سے بیز نہیں رکھا جاسکتا۔ تاہم اس نے اپنے طور پر لوگوں سے پوچھ گچھ جاری رکھی اور اس جگہ بھی گیا جہاں سے کنور مندر سنگھ کی لاش مل گئی تھی۔ اس کی سرگرمی اور مصروفیات کی خبریں برابر کنورو بے سنگھ کو مل رہی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ عاقبت نا اعلیش تھا۔ اگر وہ محاذ آرائی کے بجائے مفاہمت سے کام لیتا تو مارا نہ جاتا۔ دود نے اس کا بیان بڑی دل چسپی اور نہایت غور سے سنا تھا۔ لیکن اسے کوئی بات کھلک رہی تھی لیکن اس نے اس بات کا اظہار کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ چند رنگہ کے خاموش ہوتے ہی اس نے سوٹ کیس میں ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال کے دیکھا۔ اس کے چیمبر میں ایک گولی کم تھی۔ نال کو سونگھ کر



پھیل گیا۔ اس کے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں اور اس کی ٹانگیں جسم کے بوجھ سے کانپنے لگیں۔ کرا اس طرح کھومتا لگا جیسے بھونچال آگیا ہو۔ پھر وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ پھر وہ ریوا اور سمیت فرش پر گر گیا۔

بے ہوشی سے ہوش کی دنیا میں لوٹنے کا وقفہ زیادہ نہیں تھا۔

جب وود نے آنکھیں کھولیں تو اسے ماحول کچھ بدلا بدلا سا لگا۔ اس نے اٹھنے سے پہلے اس تبدیلی پر غور کیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ وہ کمرے میں قائلین پر وہیں لیٹا ہے جہاں گرا تھا۔ ریوا اور بدستور اس کے ہاتھ میں ہے لیکن اس کے قریب ہی کوئی اور بھی دراز ہے۔ اس نے غور سے دیکھا تو اسے بلونت سنگھ عرف بلی کی کھلی آنکھیں اپنی طرف مرکز نظر آئیں۔ وود کے سر کی چوٹ کا اثر باقی تھا۔ مگر اب وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ بیٹھ سکے۔ بلونت سنگھ لیٹا رہا تھا اور اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ پیشانی کے وسط میں گولی کے سوراخ سے نکلنے والا خون دونوں کپٹنی تک بہہ کر سرخ لکیریں سی بنا رہا تھا۔ اس کے سر کے پیچھے دیوار پر پسٹرا کھڑ گیا تھا۔ شاید گول سوراخ کرنے کے بعد سر کے اوپر والے حصے سے نکل کر دیوار میں پیوست ہو گئی تھی۔ وود نے حیرانی سے اس ریوا اور کو دیکھا جو اس کے ہاتھ میں تھا اور پھر بلونت کی لاش کو دیکھا اور پھر اس جگہ کو دیکھا جہاں چندر سنگھ کھڑا تھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ اس کے سر پر پیچھے سے کوئی چیز مارنے والا بھی غائب تھا اور کمرے میں وہ تھا یا ایک لاش تھی جس کے بارے میں وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اسے گولی مارنے والا وہ خود نہیں ہے۔

اچانک کسی کے استہزاءیہ انداز سے ہنسنے کی آواز پروہ چونک کے پلٹا۔

”مار دیا اسے تم نے۔۔۔“ سر جیت کھل کھلا کے ہنسی۔ اس کی آنکھیں نیم واکھیں اور نشے سے اس کی آواز بھی ڈول رہی تھی۔ ”اچھا کیا۔۔۔ بہادر آدمی ہو تم۔۔۔ ہیرو ہو۔۔۔ تم نے کنور وجے سنگھ

کے جانشین کو زیر کر دیا۔۔۔ تم نے بلی کو مارا تھا نا۔۔۔ اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اب باتو وہ بے عزت ہو کر جی سکتا تھا جو اس کے لیے مشکل تھا۔۔۔ بالکل ناممکن۔۔۔ یا یہی کر سکتا تھا جو اس نے کیا۔ کہ مار دے یا پھر مرجائے۔ اس کی قسمت کے وہ مارنے آیا اور مارا گیا۔۔۔ وہ خالی تھا نا۔۔۔ بے وقوف۔۔۔“

”جو اس بند کرو، میں نے نہیں مارا۔۔۔ یہ سازش ہے تم سب کی۔“

سر جیت نے نفی میں سر ہلایا اور لمحاتی توقف سے کہنے لگی۔

”میں خوش ہوں۔۔۔ بلی کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ اس کا وجود ہمارے درمیان کسی ناسور کی طرح تھا۔۔۔ لیکن ہم اسے کاٹ کے نہیں پھینک سکتے تھے۔۔۔ ہم اس ناسور پر بھی کسی کو نفرت اور حقارت سے ہنستا نہیں دیکھ سکتے تھے۔۔۔ ہائے کیسی مجبوری تھی۔۔۔“ پھر وہ اس کے قریب آ گئی۔

”تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔۔۔ میرا ایک چچا تھا۔ کنور مہدر سنگھ۔۔۔ میرے باپ کا چھوٹا بھائی۔۔۔ جیسے اس نے اسے بیٹوں کی طرح بالا اور پڑا کیا تھا۔۔۔ ونڈر فل بیک مین۔۔۔ اسے بلی نے قتل کیا تھا۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔۔۔ لوگ تو باتیں کرتے ہیں۔۔۔ میں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا تھا۔۔۔ لیکن جب میں نے یہ بات ان سے کہی تھی۔۔۔ ان سے جو یہاں رہتے ہیں۔۔۔ تو انہوں نے کہا تھا کہ تمہارا دماغ خراب ہے۔۔۔ تم پاگل ہو۔۔۔ ہم تمہیں پاگل خانہ میں داخل کرادیں گے۔۔۔ میں ڈر گئی تھی کیوں کہ میں نے پاگل خانہ دیکھا ہے۔۔۔ پھر میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ یہ بات کسی کو نہیں بتاؤں گی۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ پاپانے کہا تھا۔۔۔ جو یہ بات اگر کسی کو معلوم ہوئی تو ہمارا سب کچھ چھن جائے گا۔۔۔ ہم فاتحے کریں گے اور سڑکوں اور فنٹ پاتھوں پر بھیک مانگتے نظر آئیں گے۔۔۔ میری مانتا ہی نہیں کوئی۔۔۔ وہ سب ایک طرف تھے۔۔۔ وہ مجھے جھوٹا

کہہ سکتے اور خود سچے بن سکتے تھے۔“ وہ ونود کے اور قریب آ گئی۔ اب وہ اس سے ایک قدم سے کم فاصلے پر کھڑی تھی۔

”تم نے یہ بات کیوں بتائی ہے۔۔۔ کیا اب تمہیں ڈر نہیں لگ رہا کہ تمہیں پاگل خانہ بھیج دیا جائے گا۔“ وہ بولا۔

سر جیت ہنسی۔ ”اب تم یہاں ہو۔۔۔ اور تم کوئی معمولی آدمی تو نہیں ہو۔۔۔ ایس پی ہو۔۔۔ کیا تم مجھے نہیں بچاؤ گے۔۔۔ بولو۔۔۔؟“

”اچھا۔۔۔ مجھے تم پوری بات بتاؤ۔۔۔ کیا دیکھا تھا تم نے۔۔۔“ ونود نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اسے اعتماد میں لے کر بہت کچھ آسانی سے معلوم کر سکتا تھا۔

”لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ۔۔۔ میں تمہیں کیسی لگتی ہوں۔“ اس کے قدم نشے میں ڈمک رہے تھے۔

”تم۔۔۔ تم بہت اچھی ہو۔۔۔ بہت خوب صورت ہو۔“ ونود نے دل پر جبر کر کے کہا۔

”دیدنی کلدیپ سے بھی زیادہ۔۔۔ شیا ما سے بھی زیادہ۔۔۔؟“ وہ اٹھلا کے بولی۔

”ہاں۔۔۔ ان دونوں سے کہیں زیادہ۔“ ونود نے اسے فوراً سنبھال لیا۔ ورنہ وہ گر جاتی۔ ”اب بتاؤ۔“

اس کا جملہ ناکھل رہ گیا۔ دروازہ دھماکے سے کھلا اور روشنی کا ایک کوندا اچکا جس نے ونود کو وقتی طور پر اندھا کر دیا۔ جب وہ سر جیت کو چھوڑ کے الگ ہوا تو اسے دروازے میں کلدیپ دکھائی دی۔ کمرہ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ فلیش لائٹ کے جل کر خراب ہو جانے والے بلب کو نکال رہی تھی۔ ونود کا وجود مفلوج ہو کے پتھر ہو گیا۔

”واہ۔۔۔ ایس پی صاحب!“ کلدیپ کور نے طنز یہ لہجے میں اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

”کیسی تصویر آئی ہوگی۔۔۔ ایک ہاتھ میں ریوالور دوسرے ہاتھ ایک لڑکی کی مرمریں اور گداز اور چمک دار کمر کے گرد جو ساڑی اور بلاؤز کے درمیان۔۔۔

لڑکی کی بغیر آستینوں کے بلاؤز میں عریاں، سڈول اور سنگ مرمر جیسی عریاں بانہیں۔۔۔ آپ کے گلے میں۔۔۔ انتہائی رومانی اور جذباتی منظر۔۔۔ اور دوسری طرف غیرت مند بھائی کی لاش جو خون آلود ہے فرش پر پڑی ہے جس نے شاید اس رومانی پیمان خیز منظر میں کسی ولن کی طرح مداخلت کی ہوگی۔۔۔ ہم اسے فریم کرائیں گے تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔۔۔ یہ کسی انگلش فلم کا سنسنی خیز منظر ہے نا۔“ وہ کسی زہریلی ناگن کی طرح بل کھا کے ہنسی۔

ونود نے آہستہ آہستہ ریوالور اٹھایا اور سنبھل کے بولا۔

”تم نے سب غلط اندازہ لگایا کلدیپ کور۔۔۔! کہ میں تم سب کے جال میں ایسے گرفتار ہو گیا ہوں جیسے مکڑی کے جال میں مکھی آ چھنسی ہے۔ میں سمجھا تھا یہ مہذب اور شائستہ گھرانہ ہے اور واقعی یہاں عزت دار لوگ رہتے ہیں۔ مگر یہاں جسے عزت سمجھا جاتا ہے وہ ایک پردہ ہے جو تم سب نے اپنے مکروہ چہروں پر ڈال رکھا ہے۔۔۔ تم بے غیرت اور بے عزت اور بے ضمیر لوگ ہو۔۔۔ خونی اور قاتل۔۔۔ نشے کے عادی ہو اور اخلاقی طور پر دیوالیہ۔۔۔ جہاں عورتیں طوائف سے بدتر کردار کی مالک ہیں اور مرد شیطان۔۔۔ تم نے سازش کا بہت اچھا حال پھیلایا تھا مگر میں اس میں گرفتار ہونے پر موت کو ترجیح دوں گا۔۔۔ کیوں کہ معاشرے میں میری واقعی عزت ہے۔۔۔ ایک مقام بھی ہے۔۔۔ میں تمہیں گولی مارنے کا اختیار بھی رکھتا ہوں۔۔۔ یہ کمر اچھے دے دو کلدیپ۔۔۔ میں تمہیں یہ موقع ہر گز نہیں دوں گا کہ تم مجھے بلیک میل کر سکو۔۔۔ اس لیے بھی کہ میں ایک پولیس افسر ہوں جو اس کا توڑ جانتا ہے۔“

کلدیپ نے تیزی سے ایک قدم پیچھے ہٹایا اور قہقہہ مار کے ہنسی۔

”آپ اس ریوالور پر اکڑ رہے ہو۔۔۔

گولی چلاؤ اگر چلا سکتے ہو۔۔۔ ریوالور میں گولی کہاں ہے ایس پی صاحب۔۔۔! جب آپ بے ہوش پڑے ہوئے تھے ناہم نے آپ کا ہاتھ تھام کے ریوالور کی سب گولیاں چلا دی تھیں۔۔۔ ان کے نشانات آپ کو دیوار پر ملیں گے۔۔۔ یا پھر اس لاش پر۔۔۔ آپ تو ایک سمجھ دار پولیس آفیسر ہیں۔۔۔ ذرا سوچیے کہ قانونی طور پر آپ کی کیا پوزیشن ہے۔۔۔ اگر تجزیہ کیا گیا تو کیا ثابت ہوگا۔۔۔ گولیاں آپ کے ریوالور کی ہیں اور آپ کے ہی ہاتھ سے چلائی گئی ہیں۔۔۔ بارود کے ذرات تو آپ کے ہاتھ پر مل جائیں گے۔۔۔ غالباً اسے پیرا فین ٹیسٹ کہتے ہیں۔۔۔ اس کے علاوہ یہ تصور ہوگی۔۔۔“  
 ونود نے بے یقینی سے اس آتشیں کھلونے کو دیکھا۔ اس نے کلدیپ کی بات کو غلط جان کر چار بار فائر کیا مگر ٹریگر کی خالی آواز پر وہ ہنسنے لگی۔ ونود نے ریوالور کو یوں دیکھا جیسے سیزر نے بروڈس کو دیکھا تھا اور کہا تھا۔

”بروڈس۔۔۔ تم بھی۔۔۔ سب دغا دے ہی رہے ہیں۔۔۔ تم بھی دغا باز ہو گئے۔۔۔“

ونود کچھ دیر شکست خوردہ سا کھڑا رہا۔ کلدیپ اس سے دوسری درندہ اسے ذبوح کے قابو میں کر لیتا اور بے بس کر کے کیمرا چھین لیتا۔ کلدیپ نے ایک چہرہ شناس کی طرح اس کے چہرے سے اس کے ارادے کو بھانپ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کیمرا چھیننے کے لیے قدم بڑھا تا وہ دروازہ باہر سے بند کر کے غائب ہو سکتی تھی اس لیے پھر اسے روکے اور باتوں میں الجھائے رکھنا ضروری تھا۔

”تمہارے لیے اب ہمارا ساتھ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ایس پی صاحب!“ کلدیپ کو رنے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو اس کا چہرہ دمک اٹھا۔  
 ”اسے۔۔۔ اپنے بھائی کو تم نے مارا ہے۔۔۔“ ونود کچھ دیر بعد کلدیپ سے بولا۔

”نہیں۔۔۔ اسے سر جیت نے قتل کر دیا تھا۔۔۔ وہ تمہارے سوٹ کیس سے ریوالور نکال کر

لے گئی تھی۔ آواز سن کر چندر سنگھ دوڑا۔۔۔ مگر چندر سنگھ کے پہنچنے تک بلونت سنگھ مر چکا تھا۔ سر جیت ریوالور واپس رکھنے جا رہی تھی۔۔۔ چندر سنگھ نے اسے تمہارے کمرے میں گھستے دیکھا اور اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گیا۔۔۔ جب تم غسل خانے سے باہر نکلے تھے تو چندر سنگھ ریوالور نکال نہیں رہے تھے۔۔۔ تمہاری نظر نے سر جیت کو نہیں دیکھا جو تمہارے پیچھے تھی اور پردے کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ اس نے اس مہلت سے فائدہ اٹھایا جب تم پانچ منٹ کے لیے پھر غسل خانے میں گئے تھے۔۔۔ اس کے علاوہ خوف سے اس کی بری حالت تھی۔۔۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ تمہاری اور چندر سنگھ کی گفتگو کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔۔۔ کہیں چندر سنگھ اس کا نام تو نہیں لیتا۔۔۔ اگر تم نے چندر سنگھ کو جانے دیا ہوتا تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔۔۔ اور ہمیں یہ موقع نہ ملتا جو تمہاری ذہانت نے فراہم کیا۔۔۔ سر جیت نے دیکھا کہ اب چندر سنگھ کے لیے افشائے راز کے سوانحیہ کی کوئی صورت نہیں رہی تو وہ پردے کے پیچھے سے نکل آئی اور پھر اس نے سرہانے والی میز پر سے ٹیبل لیپ اٹھا کے تمہارے سر پر دے مارا۔۔۔ چندر سنگھ سب دیکھ رہا تھا لیکن اس نے خاموش رہنے میں عافیت سمجھی۔۔۔ بعد میں ہم سب نے مل کر طے کیا کہ موجودہ حالات میں اپنے بھائی کو رونے پینے اور سر جیت کو مجرم بنانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔۔۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا اور ہمیں اس کی فکری یادہ چو اس کے بعد ہو سکتا تھا۔۔۔ اور ہم نے بلونت کے قتل کا الزام تمہارے سر منڈھ کے قسمت کے فراہم کردہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور بلونت کو لا کے تمہارے کمرے میں ڈال دیا۔۔۔ اب تمہاری بہتری بھی اس میں ہے کہ اس راز کو راز رکھنے میں ہماری مدد کرو۔۔۔ صرف یہی راز نہیں۔۔۔ ہر راز پر پردہ پڑا رہے دو۔“

”چندر سنگھ۔۔۔ اب کہاں ہے۔“ ونود نے کھوکھلی میں کہا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔

جان دار اور بھرپور ہونی چاہیے۔۔۔ کہیں بھی جھول نہ رہ جائے۔“

”اگر میں نے تمہاری حسبِ منشاء رپورٹ دینے کے بجائے حقائق بیان کر دیے تو۔۔۔؟“

”حقائق تو وہ ہوتے ہیں جن پر اعتبار کیا جائے۔“ کلدیپ کور نے تکرار کے سے انداز میں

کہا۔ ”اور اعتبار کرنا یا نہ کرنا دوسروں کی مرضی پر منحصر ہے۔ تم کسی کو مجبور تو نہیں کر سکتے کہ وہ تمہارے لکھے کو

سچ مانے اور زبانِ خلق کو جھٹلا دے۔۔۔ کیوں کیا تم اس بات سے اتفاق کرتے ہو یا انکار۔۔۔؟ اس میں

اختلاف کی کوئی گنجائش نظر آتی ہے؟“

ونود نے سر ہلایا۔ اس نے چند لمحوں بعد قدرے تدبذب سے جواب دیا۔

”ہاں۔۔۔ جھوٹا تو میں ہی ٹھہروں گا۔۔۔ پھر کلدیپ کے بجائے وہ تھوڑا سا گھوم کر سر جیت سے

مخاطب ہوا جو سبھی ہوئی سی چپ چاپ کھڑی تھی اور اس کا چہرہ متغیر سا تھا۔“ سر جیت۔۔۔! کیا یہ ٹھیک

ہے کہ تم نے اپنے بھائی کو قتل کیا ہے۔۔۔؟“

”میں نے۔۔۔؟“ وہ خشک حلق کو تھوک نکل کے تر کرتی ہوئی بولی۔ ”کیسی باتیں کرتے ہو۔۔۔

دید کی تو ہر الزام مجھ پر عائد کر دیتی ہے۔۔۔ بلونت کو تم نے مارا ہے۔ میں نے نہیں۔۔۔ دیدی نے تو اس

تھانے دار کے قتل کا الزام بھی مجھ پر لگا دیا تھا۔۔۔

لیکن یہ سب جھوٹ ہے میں نے ان دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں مارا۔۔۔۔۔ کیوں ماروں گی۔۔۔ کیا

بگاڑا تھا ان دونوں نے۔۔۔؟“

کلدیپ کور نے سر جیت کی طرف دیکھا اور اس کی ہنسی استہزائیسی تھی۔

”سر جیت کی یادداشت بھی ایسی ہی ہے۔۔۔ نشے کی حالت میں کچھ کر بیٹھتی ہے جو اسے یاد نہیں

رہتا۔۔۔ اچھا اس سے پوچھو کہ کیا ایک بار اس نے کھڑکی کھولنے کی کوشش میں ہاتھ مار کے پیشہ توڑا

تھا۔۔۔ اور کلائی کی ایک رگ شیشہ سے کٹی تھی تو اتنا خون نکلا تھا کہ لالے پڑ گئے تھے۔۔۔ گمراہ سے کچھ یاد

”پائیں باغ میں ایک قبر کھود رہا ہے۔“ کلدیپ بولی۔ وہاں ہمارے آباؤ اجداد کے دفتوں کی کچھ قبریں ہیں لیکن ان میں وہ خود دفن نہیں ہیں۔ وہ لوگ دفن ہیں جو اپنی شامت اعمال کے باعث مرنے آگئے تھے اور بس یوں سمجھ لو کہ کرہ ارض سے اچانک غائب ہو گئے۔

”تمہارا کیا خیال ہے کنور بلونت سنگھ کی موت پر کسی کو تشویش نہیں ہوگی۔“ ونود نے اسے سوالیہ

نظروں سے دیکھا۔ ”کیا اس پر سوال نہیں ہوں گے۔“ کلدیپ کور ہنس پڑی تو اس کے مولی جیسے

دانت دکھائی دینے لگے۔

ابیں پی صاحب۔۔۔! جب ہمیں تشویش اور پریشانی نہیں ہے تو کسی اور کو کیوں ہوگی۔۔۔؟ کیا

اس کے نہ ہونے سے کسی کا کام رکے گا۔۔۔؟ اور ہم موت کی بات کریں گے ہی نہیں۔۔۔ ہم کہیں گے وہ

ولایت پر چلا گیا۔۔۔ لوگ ہماری بات سچ مان لیں گے۔۔۔ تم یہاں تفتیش مکمل کرنے کے بعد جو

رپورٹ دو گئے اس میں تھانے دار کے قتل میں ہمارے کسی تعلق کی بات کو بے بنیاد افواہ قرار دو

گے۔۔۔ اور یہ لکھو گے کہ حاسد اور دشمنوں، پس ماندہ ذہنیت رکھنے والوں نے ہمارے بارے میں بے

سرو پایا تیں مشہور کر رکھی ہیں۔۔۔ تھانے دار کا قاتل ان بد معاش نو جوانوں میں سے کوئی ہو سکتا ہے جن کی

تھانے دار نے پٹائی اور سرزنش کی تھی۔۔۔ ایک آدھ کا حوالہ بھی دے دینا۔۔۔ اس کا جیسے چوک میں مرغا

بنے کے جوتے مارے گئے تھے۔۔۔ تحصیل اور ضلع کے حکام تمہاری رپورٹ سے بہت ہی خوش ہوں

گے۔۔۔ اور پایا کی کوشش سے اگر قاتل پکڑا نہ گیا۔۔۔ وہ مفتی خیز طور پر ہنسی اور اس کے سینے میں

سانسوں کا طعنے جھکولے کھانے لگا۔ ”دیکھو نا۔۔۔

یہی تو موقع ہوتا ہے کسی کو بتانے کا۔۔۔ کنور و جے سنگھ سے بیر رکھنے کا نتیجہ نکلتا ہے۔۔۔ کسی ایک کو دھر

لیا گیا قاتل کے جرم میں تو اس کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔۔۔ تو لہذا رپورٹ ہر لحاظ سے بڑی

نہیں تھا۔۔۔ بھلا یہ واردات جو اس نے کی ہے بھلا یاد رہے گی؟“

”وہ۔۔۔ وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر میں نے قتل کب کیا ہے۔“ سرجیت نے احتجاج کیا۔  
”قتل کیا ہوتا تو مجھے یاد نہیں رہتا۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔“

”تم۔۔۔ تم پاگل ہو۔۔۔“ کلدھپ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”دیکھنا۔۔۔ تم کسی دن اپنا نام بھی بھول جاؤ گی۔ مجھے کیا ضرورت پڑی کہ میں جھوٹ بولوں۔“

”میں پاگل نہیں ہوں۔۔۔ پاگل نہیں ہوں۔۔۔“ سرجیت ہذیانی لہجے میں زور زور سے چلانے لگی۔ ”صل بات یہ ہے کہ تم سب مجھے پاگل بنانے کا فیصلہ کر چکے ہو۔“

ان دونوں کو آپس میں ٹکرا کر تے اور الجھا پا کر اس وقت وفود نے جست لگائی لیکن کلدھپ اس کی توقع سے کہیں زیادہ چالاک عورت تھی۔ دروازہ ایک دم بند ہو گیا اور باہر سے کنڈی لگانے کی آواز کے ساتھ کلدھپ کا زوردار ہتھہ سنا دی۔

”سوری۔۔۔ ایس پی صاحب۔۔۔ ایسے تو آپ کیمرہ نہیں لے سکتے۔۔۔ منہ دھو رکھیے۔۔۔ آپ۔“ اس نے استہزاء لہجے میں کہا۔ غصے اور بے بسی کی انتہا سے وفود کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ پھر اس نے مکا مار کے شیشہ توڑا اور باہر ہاتھ نکال کے کنڈی کھولی۔ اتنی دیر میں کلدھپ زینے سے نیچے اتر چکی تھی۔ پھر بھی وہ اس کے تعاقب میں لپکا تا کہ اسے ہر قیمت پر پکڑ لے۔

کلدھپ نے آخری زینے سے راہ داری میں مڑتے ہوئے اسے چیلنج کے انداز میں دیکھا۔۔۔ ہنسی اور دروازہ کھول کے سامنے والے ایک کمرے میں گھس گئی۔ شاہ بلوط کا مضبوط دروازہ بند ہو گیا۔ کلدھپ کی ہنسی اس کا تسخیراڑتی رہی۔

”کلدھپ۔۔۔“ اس نے کچھ دیر کے توقف کے بعد دروازہ بجایا اور ٹکست خوردگی کے لہجے میں

بولی۔ ”مجھے تمہاری شرط اور بات منظور ہے۔۔۔ رپورٹ وہی ہوگی جو تم چاہتی ہو۔۔۔ یعنی تمہارے حسب منشا۔۔۔“

اندر سے کلدھپ کی مترنم ہنسی پھر سنائی دی جو اسے بڑی زہر لگی اور اس کا لہجہ بھی زہریلا لگا جو اس کے وجود پر ڈنک بن کر لگا۔ وہ بولی۔

”عقل ایسے ہی تجربات سے آتی ہے ایس پی صاحب۔۔۔ کیا آپ نے مجھے نادان بچی سمجھ لیا تھا۔۔۔“

وفود کے دل میں دروازے کو توڑ کے اندر گھس جانے کی وحشیانہ خواہش نے ایک بار پھر سر اٹھایا۔ مگر دروازہ ناقابل شکست تھا۔ وہ اپنی بے بسی اور احساس ذلت و ندامت پر پتچ و تاب کھا کے رہ گیا تھا۔ پھر اسے کنور و بے سنگھ کے چلانے کی آواز نے متوجہ کر لیا۔ ورنہ اس نے سوچا اور فیصلہ کیا تھا کہ وہ بڑے زور سے دروازے سے ٹکرائے گا۔۔۔ دھکا دے گا۔ شاید اندر کی چٹنی بیجے سمیت اکٹڑ جائے۔

پھر وہ تین دروازے چھوڑ کر پھر اسی کمرے میں داخل ہوا جس میں اس کی اور بلو کی پہلی ملاقات ناخوش گوار ماحول میں تصادم پر ختم ہوئی تھی اور اب بلو اس کے کمرے میں اس کے ریوالور کی گولی سے اور اس کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ حقیقت کچھ بھی ہو۔ ہر شہادت اسے مجرم ثابت کرتی تھی اور اس کی بے گناہی کا کوئی عینی گواہ نہیں تھا۔

کمرے میں نازک اندام شاما اپنے سے دگنی حیات کے اور شراب سے مدھوش کنور و بے سنگھ کو سنبھالنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔

”پاپا۔۔۔ پاپا۔۔۔! پلیز آپ ضرورت سے زیادہ پی چکے ہیں۔۔۔ چلیے اب سو جائیے۔“ وہ التجا کر رہی تھی۔ کنور و بے سنگھ نے اس کا نرم و نازک ہاتھ بری طرح جھٹک دیا اور پھر وہ غرائے اور شیر کی طرح دباڑے۔

”سو جاؤں۔۔۔ ابھی سے۔۔۔“ اس نے نفی میں زور زور سے سر ہلایا۔

کالے بانی۔۔۔ پھر ان کو اس حویلی کے عیش یاد آئیں گے۔۔۔ بس اسے چھوڑ دیجیے۔“  
پھر اس نے شیاما کے سر کو سینے سے لگایا اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔  
”یہ میری بیٹی ہے۔۔۔ کنور وہ بے سنگھ کی بیٹی۔۔۔ اس کی جانشین۔۔۔ چاند بی بی۔۔۔ رانی۔“

وہ بڑے زور سے قہقہہ مار کے ہنسا۔۔۔ ونود نے دیکھا کہ اس کی بوڑھی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کے چہرے کی جھریوں سے گزر کے اس کی جھاڑ جھنکار داڑھی کو تر کر رہے ہیں۔

”شیاما۔۔۔“ ونود نے نرمی سے کہا۔ ”میں کنور صاحب کو سنبھال لوں گا۔۔۔ تم جاؤ۔۔۔ آرام کرو۔۔۔ تم بہت تھکی ہوئی لگتی ہو۔“ لیکن اس کے باوجود شیاما وہیں کھڑی رہی۔ ونود نے وہ بے سنگھ کو سہارا دے کر صوفے پر لٹا دیا۔

”ایس بی صاحب۔۔۔!“ وہ بے سنگھ پھر اٹھ بیٹھا یہ آپ نے بی بی کو دیکھا ہے کہیں۔۔۔ بلونت سنگھ۔۔۔ میرے بیٹے کو۔۔۔ مجھے اس سے ایک بات کرنی تھی۔۔۔ اس ذلیل، کمینے۔۔۔ میرے سیکریٹری۔۔۔ تمہیں معلوم ہے وہ شیاما سے شادی کرنا چاہتا ہے۔۔۔ اس کی جرات دیکھو۔۔۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھنا چاہتی ہے۔۔۔“  
”مگر کنور صاحب۔۔۔ آپ تو اس کی منگنی کر چکے ہیں۔۔۔ شیاما کے ساتھ۔۔۔“

”کون۔۔۔ کون کہتا ہے یہ۔۔۔ میرے سامنے لا ڈالے۔۔۔ میں شوٹ کر دوں گا اسے۔۔۔ وہ میری شیاما کی جوتی کا غلام۔۔۔ وہ اس کا قاتل بھی نہیں کہ اس کے ساتھ شیاما کا نام لے۔۔۔ مگر یہ سب۔۔۔ کل دیپ اور بلونت۔۔۔ ان سب نے کہا تو میں نے کہا کہ اچھا۔۔۔ میں دیکھوں گا کہ وہ کون ہے۔۔۔ کس خاندان سے ہے۔۔۔ اس کا خاندان۔۔۔ کنور وہ بے سنگھ کے خاندان کا ہم پلہ ہے بھی یا نہیں۔۔۔ مگر بلونت کو بھی

”جی ہاں۔۔۔ میرے اچھے پاپا۔“ شیاما پھر گڑ گڑائی۔ ”آپ نشے میں ہیں۔“

”میں بالکل ہوش میں ہوں۔۔۔ تو جا۔۔۔ جا کے سو جا اگر نیند آ رہی ہے۔۔۔ دیکھو۔۔۔ یہ بوتل خالی ہو گئی ہے تو کیا۔۔۔ اس میں ایک گھونٹ بھی نہیں ہے۔۔۔ دیکھ رہی ہے نا۔۔۔“ اس نے جھک کر میز سے دوسری بوتل اٹھائی۔

”دوسری بوتل نہیں ہے پاپا۔۔۔ اور دوسری بوتل اتنی رات کہاں سے آئے گی۔۔۔ پلیز۔۔۔ پاپا۔۔۔! آپ سوچے گا۔۔۔ دکانیں بند ہوئی ہیں۔ اور سویرے دیر سے بھی کھلتی ہیں۔“ شیاما انہیں سمجھانے لگی۔

یہ سنتے ہی ان کا پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے بوتل گھما کے دیوار پر دے ماری۔

”جہنم سے آئے گی۔۔۔ جہاں مجھے۔۔۔ ہم سب کو جانا ہے۔ اس دھرتی پر پھر ایک بھی نہیں رہے گا۔“ وہ بگڑ کے برہمی سے بولے۔ پھر اس کی نگاہ نے ونود کو دیکھا اور چونک کے کھورنے لگا۔

”تم۔۔۔ تم کون ہو۔۔۔ کنور وہ بے سنگھ کی حویلی میں تمہیں قدم رکھنے کی جرات کیسے ہوئی تمہیں۔۔۔ شوٹ کر دوں گا۔“ پھر اس نے ہاتھ ماتھے پر ہاتھ رکھا اور چندھمائی ہوئی نظروں سے ونود کی صورت کو فوکس کرنے لگا۔ پھر اسے کچھ یاد آیا۔

”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ تم وہ ایس بی ہو۔۔۔

کیا نام ہے تمہارا۔۔۔ ونود سنگھ۔۔۔“ وہ ہنسا۔ ”دیکھ شیاما۔۔۔! تو کہتی ہے کہ میں ہوش میں نہیں مگر۔۔۔ مگر میں نے ایس بی صاحب کو پہچان لیا۔۔۔ ایس بی صاحب! آپ نے ان سب کو پکڑ لیا ہے۔۔۔ اگر نہیں پکڑا ہے تو فوراً پکڑ لیجیے۔۔۔ اور سب کو جیل بھیج دیجیے۔۔۔ تمام عمر کے لیے۔۔۔ دماغ درست ہو جائے گا۔ جب چلی پٹیس گے نا تو ان کو۔۔۔ یہ سب شہزادے سے۔۔۔ ہیں نا۔۔۔ ان کو۔۔۔ جو خود کو میری اولاد کہتے ہیں نا۔۔۔ ان تمام کو بھیج دیجیے جس دام۔۔۔ دریائے شور۔۔۔

ہیں۔“ وود نے اسے صاف صاف بتا دینا بہتر سمجھا۔  
اسے اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر اس نے  
بتایا۔۔۔ ”کسی نے تمہارے بھائی بلونت سنگھ کو قتل کر  
دیا ہے۔ اور اس کی لاش میرے کمرے میں پڑی  
ہے۔۔۔ یہ بات وجہ سنگھ کو معلوم نہ ہو اچھا  
ہے۔۔۔ ورنہ وہ اس صدمے کی تاب نہ لاسکے۔۔۔  
کیا تمہیں وہ بات معلوم ہے جو کنور وجہ سنگھ کو معلوم  
ہے جس کا تعلق چندر سنگھ سے ہے۔“

شیاما کا چہرہ کسی لاش کی طرح سفید اور بے لہو ہو  
گیا۔ ”بلونت۔۔۔ بلونت مر گیا۔۔۔ تم جھوٹ  
بولتے ہو۔۔۔ یہ غلط ہے۔“

”مجھے جھوٹ اور غلط بیانی سے کیا فائدہ ہوگا  
شیاما۔۔۔!“ وود نے کہا۔ ”لیکن تم حقائق کو  
چھپانے کی کوشش کرو گی تو۔۔۔“

”بلونت کو کس نے قتل کیا ہے۔“ وہ وود کی  
بات کاٹ کے دیوار کو گھورتے ہوئے بولی۔ آنسو  
خاموشی سے اس کے گالوں پر بہتے رہے۔

تمہاری دیدی کے بیان کے مطابق سرجیت  
نے۔۔۔ وود نے کہا۔ ”مگر مجھے اس کی بات کا یقین  
نہیں۔۔۔ مجھے اس کی بات جھوٹی لگی۔“

”دیدی۔۔۔“ شیاما نے نفرت کے زہر کی تنگی  
میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وہ تو سرجیت کے  
وجود کو بھی خض اس لیے برداشت کرتی ہے کہ ہر جرم و

گناہ اس کے نامہ اعمال میں لکھا جاسکے۔۔۔ اس  
نے سرجیت کو تو پاگل بنانا دیا ہے۔۔۔ اب خونی اور  
قاتل بننے کے مراد بننا چاہتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اب

سنگ پاگل نہیں ہوئی۔۔۔ وہ ہم سب سے زیادہ  
ذہین ہے اور سب جھٹکتی ہے۔ تھانے دار کے قتل کا  
ذمے دار اس نے سرجیت کو بنا دیا تھا۔۔۔ اب وہ  
بلونت کا قاتل بنتی ہے وود!“

پھر وہ توقف کر کے پھوٹ پھوٹ کے رونے  
لگی۔ آنسوؤں کی جھری لگ گئی۔

”مجھے معلوم ہے اس لیے میں بچ جانا چاہتا  
ہوں۔“ وہ ہولے ہولے اس کے سر کو ہٹنے لگا۔

معلوم ہو چکا ہے اور۔۔۔ اور میں اسے بتانا چاہتا  
ہوں کہ یہ غلط نہیں ہے۔۔۔ اس بد معاش چندر سنگھ  
کو۔۔۔ اس کا کیا خیال تھا کہ ہم اندھے ہیں۔۔۔۔۔  
وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔  
میں اسے بتا دوں گا۔ کنور وجہ سنگھ کون ہے۔۔۔۔۔  
وہ ابھی زندہ ہے۔۔۔ مگر پہلے مجھے اپنے بیٹے سے  
بات کرنی ہے۔۔۔ ابھی بلاؤ۔۔۔ بلی کو۔۔۔۔۔  
بلونت کدھر ہے۔۔۔ آج وہ مجھے دکھائی  
نہیں دیا۔۔۔ اس کی ایک جھلک بھی نظر نہیں آئی۔  
شیاما کا چہرہ جو پہلے سرخ پڑ گیا تھا زرد ہونے  
لگا۔ پھر سفید پڑنا لگا۔

”اس وقت کوئی بات ضروری نہیں پایا۔۔۔!“  
آپ کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔“ وہ بولی۔  
”آپ اپنے آپ کو ہلکان نہ کریں۔“ وود نے شیاما  
کی صورت کو غور سے دیکھا اور پھر وہ کہے بغیر نہ رہ  
سکا۔

”اگر کوئی بات چندر سنگھ کے بارے میں ہے  
تو۔۔۔ میرا خیال اس وقت ہو جانا چاہیے۔۔۔ اس  
لیے کہ بات عزت کی جو ہے۔“

”ایسی۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔“ شیاما  
نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ ”او۔۔۔ اور پھر  
بلونت۔۔۔“

کنور وجہ سنگھ آنکھیں بند کیے اپنے آپ  
سے باتیں کر رہا تھا۔۔۔ مسکرا رہا تھا۔۔۔ اور ہنس بھی  
رہا تھا۔۔۔ صرف اس کا دل اندر سے درد رہا تھا۔ اور  
اس کی آنکھیں رو رہی تھیں۔۔۔ کنور وجہ سنگھ کی  
جذباتی اور بیجانی کیفیت تھی۔

وود نے شیاما سے اشارے سے باہر آنے کے  
لیے کہا۔۔۔ شیاما نے ایک نظر اپنے باپ کو  
دیکھا۔۔۔ کچھ دیر تذبذب کی کیفیت میں کھڑی  
رہی۔ پھر جب اس نے محسوس کر لیا کہ اس کا باپ خود  
کلاسی میں دنیا مانہیا سے بے نیاز ہے تو پھر وہ وود کے  
ساتھ باہر آ گئی۔

”دیکھو شاما۔۔۔! حالات قابو سے باہر ہو گئے

دھمکی اور کسرے سمیت بھاگ جانے کا ذکر بھی کر دیا۔ اسے شاما اور بوڑھے کنورو بے سنگھ پر ترس آیا جو ذلت و رسوائی اور دکھ کی اس بارگراں کو اٹھانے کے جینے پر مجبور تھے اور چپکے آنسو بہانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

پھر کنورو بے سنگھ نے بے ربط جملوں۔۔۔ الفاظ میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ چند دن پہلے نیا تھانے داران کے پاس آیا تھا۔۔۔ اس نے کہا کہ بیج پور میں ایک ایسا شخص موجود ہے جو اشتہاری مجرم ہے۔۔۔ اس کا اصل نام دھرمیندر سنگھ تھا اور وہ میرٹھ سے آگے مرادنگری آرڈینس فیکٹری میں کیشیئر تھا۔ میرٹھ اور دہلی کے درمیان واقع آرڈینس فیکٹری میں مہندر ناتھ نام کا ایک اکاؤنٹس آفیسر بھی تھا۔ اس سے مل کر بوگس بل پاس کروائے جو کنٹرولر آف آرڈینس فیکٹری نے اس لیے پاس کر دیے کہ ان پر اکاؤنٹس آفیسر کے دستخط اور مہر اصلی ہوتے تھے۔ چونکہ کیشیئر کے دستخطوں کی تصدیق میں یہی اکاؤنٹس آفیسر کرتا تھا۔ اس لیے چیک بھی کیش ہو گئے اور ان دونوں نے مل کر پچیس لاکھ کی رقم کاغذ بنایا اور غائب ہو گئے۔ ان کا حلیہ اور تصویر مشہور بھی کیا گیا تھا مگر پولیس کو ان کا سراغ نہ ملا۔ عام خیال تھا کہ انہوں نے پولیس کو بھی رشوت دی اور ملک سے باہر نکل گئے۔

لیکن بیج پور کے تھانے دار کو پہلے کیشیئر دھرمیندر سنگھ نظر آیا۔۔۔ پھر اس نے مہندر سنگھ نام کے ایک شخص کے پراسرار حالات میں مر جانے کا ذکر کیا۔ اسے معلوم ہوا کہ کنورو مہندر سنگھ وہی کیشیئر کا ساتھی اکاؤنٹس آفیسر تھا اور وہ کنورو بے سنگھ کا چھوٹا بھائی تھا جس نے آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی مگر اس کی پوزیشن اچھی نہیں تھی چنانچہ اسے کلاس دن گریڈ پوسٹ کے بجائے کلاس نو آفیسر کا عہدہ پیش کیا گیا جو اس نے قبول کر لیا۔ مہندر سنگھ کا فرار ہو کر آنا تو سمجھ میں آتا مگر اس کے دوسرے دھرمیندر کا یہاں موجود ہونا بالکل

”تم چھتا مت کرو۔۔۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔ مگر مجھے پہلے اپنے پاپا سے بات کرنے دو۔۔۔ پھر میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔۔۔ اور ہاں اب خاموشی سے کافی بنا لاؤ۔۔۔ چینی اور دودھ کے بغیر۔۔۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ کسی کے علم میں یہ بات نہ آئے کہ میں کہاں ہوں۔“

”لیکن ونود۔۔۔! آپ نے کھانا بھی تو نہیں کھایا ہے۔“ وہ فکر مند سی بولی۔  
”مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں بس کافی پی لوں گا۔۔۔ جاؤ۔۔۔ شاباش۔“ اس نے شاما کو جدا کر کے رخصت کیا۔

دس پندرہ منٹ میں ونود نے کنورو بے سنگھ کے حلق سے سیاہ کائی کے دھگ زبردستی اتارے اور فربج میں سے برف نکال کے اس کی گردن کی پشت سے رگڑنا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کنورو بے سنگھ کا نشہ اترنے لگا۔

اس دوران وہ بار بار پوچھتا رہا کہ بلونت کہاں ہے۔۔۔۔۔

”وہ کس لیے۔۔۔؟“ ونود نے ٹالنے کے بہانے اس سے سوال کیا۔

”اس لیے کہ مجھے اس سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ کنورو بے سنگھ بولا تو وہ اسے پھر ٹالتا رہا۔

جب وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا تو ونود نے اسے چنی طور پر ایک بری خبر سنانے کے لیے بتا دیا۔ بالآخر بتایا کہ اس کے بیٹے کو بلونت کوئل کر دیا گیا ہے۔

وہ یہ خبر سن کے بت ہٹا بیٹھا رہا اور شاما کی موجودگی میں ونود نے بتایا کہ۔۔۔ کس طرح اس کے سوٹ کیس سے ریوا اور نکالا گیا۔۔۔ اور اسے کیسے بے ہوش کیا گیا اور بلونت کی لاش اس کے کمرے میں ڈال دی گئی۔۔۔ اور پھر کلدیپ کو رنے چالاکی سے اس کی اور لاش کی تصویر اتار لی جس میں سر جو بھی اس کے ساتھ ہے۔۔۔ اس نے کلدیپ کی



تا قابل فہم تھا۔ وہاں سے اٹھا کے اس دور افتادہ قصبے میں پھینک دیا

گیا تھا جہاں کنور و بے سنگھ جیسے لوگ اس کا دماغ درست کر سکیں۔۔۔ مگر نو د جانتا تھا کہ ایک کیا ہزار کنور و بے سنگھ بھی اس تھانے دار پر و بے نہیں پاسکتے تھے جس کی اصول پرستی اور ایمان داری اور فرض شناسی کتے کے دم کی طرح تھی جسے بارہ برس کی پوری عمر کوشش کر کے بھی سیدھا نہیں کیا جاسکتا تھا جب اس کے غلط رویے کے بارے میں پیچھے سے شکایات اور اوپر سے دھمکیاں موصول ہونے لگی تھیں۔۔۔ وہ اس تھانے دار کو بچپن سے جانتا تھا اس وقت سے جب وہ چھوٹا سا بچہ اور اس کے ساتھ اسکول جاتا تھا۔ اس وقت وہ کوئی تھانے دار نہیں تھا۔ نو د کا چھوٹا بھائی تھا۔ گو وہ تھانے دار بننا چاہتا تھا۔ لوگ انہیں سقراط یا بقراط کہتے تھے۔ بقراط بڑے بھائی کو اور سقراط چھوٹے میاں کو۔۔۔ بقراط تو سب ہیں مگر بیسویں صدی میں سقراط کون ہے۔

”شیاما۔۔۔!“ اس نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔ ”مجھے ایک رپوالور چاہیے ابھی اور اسی وقت۔۔۔“

”رپوالور تو کوئی نہیں۔۔۔ البتہ ایک شکاری بندوق ہے۔“ شیامانے کہا۔

”مگر اس کا تم کیا کرو گے۔۔۔؟“

”مجھے وہ بندوق چاہیے۔“ نو د نے سخت لہجے میں کہا۔

شیامانے اثبات میں سر ہلا دیا اور دیوار پر سے بارہ بور کی دو نالی بندوق اتار اس کے ہاتھ میں تھمادی۔

”تم یہ دروازہ بند کر لو۔۔۔ جب تک میں نہ کہوں اس دروازے کو مت کھولنا۔“ وہ باہر نکلتے ہوئے بولا۔ ”کسی کے لیے بھی نہیں۔۔۔ اور نہ اپنی دیدی کے لیے اور نہ سرجیت کے لیے۔۔۔۔۔“

☆☆☆

چندر سنگھ درخت کے نیچے مٹی کے ڈھیر پر بیٹھ

مہندر کے قتل کے بارے میں ابتدائی رسومات سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ غالباً مہندر پچیس لاکھ کی ساری رقم لے کر دھر میندر کو دغا دے گیا اور دھر میندر اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں آ پہنچا اور اس نے مہندر کو قتل کر دیا مگر اس کے باوجود وہ فرار نہیں ہوا۔۔۔ وہ مہندر کے خاندان میں چندر سنگھ بن کے شامل ہو گیا۔ غالباً مہندر نے وہ رقم اپنے خاندان کے حوالے کر دی تھی جن کی آمدنی کے سارے ذرائع محدود ہو چکے تھے مگر شاہانہ ٹھاٹ باٹ باقی تھے۔ ان کی گرتی ہوئی ساکھ اور مالی حالات کو سنبھالنے میں پچیس لاکھ کی رقم نعمت سے کم نہ تھی۔

کنور مہندر سنگھ خاندان کی عظمت کے مینار کو سر بلند رکھنے کے جنون میں اپنے آباؤ اجداد سے کم نہ تھا۔ اس نے اپنی زندگی قربان کر دی اور خاندان کی آن پر حرف نہ آنے دیا۔۔۔ تاہم دھر میندر سنگھ یعنی چندر سنگھ کو یقین تھا کہ ایک نایک دن اسے موقع ملے گا اور تقدیر نے ساتھ دیا تو وہ اپنا تمام تر حق معر سود وصول کر لے گا۔ تھانے دار نے قیاس آرائی کی بنیاد پر اصل حالات معلوم کر لیے تھے۔

کنور و بے سنگھ کا خاندان اس دولت پر عیش کر رہا تھا جو مہندر سنگھ نے اپنی زندگی دے کر حاصل کی تھی۔ مگر یہ ناممکن تھا کہ تھانے دار کو ان حالات پر سے پردہ اٹھانے کی اجازت دی جائے۔ کنور و بے سنگھ اور بلونت سنگھ نے پہلے رشوت دے کر اس کا منہ بند رکھنے کی کوشش کی تھی مگر وہ ایمان داری کے مرض میں مبتلا تھا۔ دھسکی بھی غیر موثر ثابت ہوئی اور وہ چندر سنگھ کے بارے میں قانونی کارروائی کی دھمکی دے کر چلا گیا۔۔۔ اگلے روز تھانے دار کی لاش و بے سنگھ کے دادا پنج سنگھ کے گھسے سے معلق پائی گئی۔

کنور و بے سنگھ نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اس نے تھانے دار کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا درست تھا۔ وہ آرڈینس فیکٹری مراد نگر میں تین برس سے تعینات رہا تھا اور محض اپنی ایمان داری کے جرم میں

لپے کھڑا تھا اور اس دونوں کی بدوق کو دیکھ رہا تھا جس کا رخ اس کے سینے کی طرف تھا۔

”انکار کی اب گنجائش ہی کہاں رہی ہے ایس پی صاحب!“ اس نے کہا۔ ”تھانے دار نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں اسے قتل نہ کرتا تو کیا کرتا۔۔۔ مجھے یہ غم نہیں تھا کہ وہ کدھا۔۔۔ کنورو جے سنگھ اور بلونت سے بھی بات کر چکا ہے۔۔۔ ان دونوں نے مجھ پر کچھ ظاہر ہونے نہیں دیا تھا۔ باتوں سے اور نہ رویے سے۔“

”پھر تم نے بلونت کو قتل کیوں کیا۔۔۔“ ونود نے رائفل کا رخ بدستور اس کی طرف رکھا۔

”آج تم نے اسے ذلیل کیا تھا۔ وہ بہت مشتعل تھا۔ اس نے بھی مطالبہ کیا تھا کہ میں اس کا ساتھ دوں۔۔۔“ وہ تمہیں اس قبر میں دفن کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ یہ بہت خطرناک اقدام ہو گا۔۔۔ ایک تھانے دار کی موت پر ایس پی آپہنچا ہے تو کیا اس ایس پی کی گم شدگی سے پولیس کا پورا محکمہ چیخ پور پر بلخا نہیں کرے گا۔۔۔ وہ میرے انکار پر مشتعل ہو گیا اور اس نے کہا کہ دھر میندر میرا ساتھ دو گے یا جیل جاؤ گے۔۔۔؟ میرے لیے یہ اطلاع کسی خوف ناک دھماکے سے کم نہ تھی کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔۔۔ میں نے جذباتی خطرہ مول لینے کے بجائے ٹھنڈے دماغ سے سوچا۔۔۔ اور اس سے وعدہ کر لیا کہ رات سوتے وقت ایس پی صاحب کا کام تمام کر دیا جائے گا مگر موقع ملتے ہی میں نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس طرح راستے کے ایک پتھر کو جیسے ٹھوکر مار کے ہٹا دیا۔ پھر میں نے کلدھ پیپ سے بات کی۔ وہ سب کچھ جانتی ہے۔

”کیا سرجیت نے تمہارے اور کلدھ پیپ کے تعلق کے بارے میں جو کچھ کہا تھا درست تھا۔“ ونود نے سوال کیا۔

”ہاں۔۔۔ دیکھو۔۔۔ ایس پی صاحب! شیاما بڑی اچھی لڑکی ہے۔۔۔ نہایت حسین و جمیل، محبت کرنے والی اور نیک سیرت ہے۔“ چندر سنگھ یعنی

دھر میندر بولا۔ ”مگر اپنے مطلب کی نہیں۔۔۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا۔۔۔ مجھے کلدھ پیپ جیسی عورت چاہیے۔۔۔ ہم فطرت اور مزاج کے اعتبار سے ایک ہیں۔۔۔ وہ جس محبت اور فیاضی سے مہربان ہوتی ہے وہ کوئی اور عورت نہیں ہو سکتی۔۔۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہیں۔۔۔ کلدھ پیپ نے اس عرصہ میں مجھ سے قریب اور بے تکلف ہونے پر اس بات کو محسوس کر لیا تھا اور پھر اس نے حل کر بات کی تھی کہ شیاما کو چھوڑ دو۔۔۔ وہ تمہارے لائق نہیں ہے۔۔۔ بھگوان نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے لیے بنایا تھا۔“

”کیا کلدھ پیپ نے تمہیں تیج پور کے کنورو جے سنگھ کا وارث بنانے کا موقع فراہم کرنے کی پیش کش بھی کی تھی۔ وچن دیا تھا۔“ ونود نے کہا۔

”نہیں۔۔۔ یہ موقع تو تقدیر نے تمہیں بھیج کر فراہم کیا۔“ چندر سنگھ بولا۔ ”کلدھ پیپ نے کہا تھا کہ جنگل کا ٹھیکہ لے لوں جو کئی برسوں سے پھیلتا جا رہا ہے۔۔۔ اس سے لاکھوں کمائے جاسکتے ہیں۔ جب میں نے بلونت کو مار دیا تو کلدھ پیپ نے اور میں نے مل کر طے کیا کہ اب حالات سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔۔۔ سرجیت کو کلدھ پیپ ہی تمہارے کمرے میں لے گئی تھی۔۔۔ ظاہر ہے اس وقت تک میں وہاں بلونت کی لاش ڈال آیا تھا۔۔۔ چنانچہ کلدھ پیپ کے لیے سرجیت کو یہ یقین دلانا مشکل ثابت نہ ہوا کہ بلونت کو تم نے قتل کیا ہے۔ وہ نشے میں تھی اور کسی بھی بات پر یقین کر سکتی تھی۔“

مگر اس نے یہ نہیں مانا تھا کہ وہ قتل کی ذمہ دار ہے۔۔۔ تھانے دار کے قتل کی۔“ ونود نے کہا۔ ”بند میں جب کلدھ پیپ نے جب اسے بھائی کا قاتل قرار دیا تو وہ ہسٹریا میں مبتلا ہو گئی تھی۔“

”وہ کلدھ پیپ کی غلطی تھی۔“ چندر سنگھ بولا۔ ”اگر وہ تمہیں مجرم رکھتی تو اچھا تھا۔۔۔ ایک قتل کا الزام سرجیت پر رہتا اور دوسرے قتل کا تم پر آتا۔۔۔ شاید اس نے سوچا ہو گا کہ ایک ایس پی کو قاتل ثابت

کرنا آسان نہ ہو۔ اس لیے اس نے تم سے دوسرا کام لیا۔۔۔ یعنی اپنی فشا کے مطابق رپورٹ حاصل کرنے کا۔ تم واپس چلے جاتے۔ سر جو گرفتار ہو جاتی اور بوڑھا وجہ سنگھ شاید اس صدمے سے مر جاتا اس کا دل پہلے ہی سے کمزور ہے اور کلدیپ ڈاکٹر کی ہدایت نظر انداز کر کے اسے خوب پلار ہی ہے۔ اس کی مرضی کے آگے شیا ما بے بس ہے ورنہ کلدیپ چاہے تو کمزور وجہ سنگھ کو ایک بوند شراب نہ ملے۔ شراب اس کے لیے زہر ہے۔ مگر اسے یہ زہر پی کے ہنسی خوشی مر جانا بہتر ہے۔ ہم اس کے خون سے ہاتھ رنگنے کے گنہگار کیوں بنیں۔۔۔ رہ جائے گی شیا ما۔۔۔ تو اس کا بندوبست بعد میں ہو جائے گا۔۔۔ دو چار برس بعد جب لوگ ان واقعات کو بھولی ہو چکے ہوں گے۔۔۔ جائیداد دونوں بہنوں میں تقسیم ہو چکی ہوگی اور میں شیا ما کا منگیتری رہوں گا۔ شادی کو دو چار برس ٹالنا میرے اختیار میں ہوگا اور جب وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر مر جائے گی تو کلدیپ اور بچ پوری وراثت دونوں پر میرا حق ہوگا۔ وہ کون چھین سکے گا۔۔۔ صورت حال اب بھی وہی ہے۔۔۔ تم مجھے شبن کے الزام میں گرفتار کروا سکتے۔ زیادہ سے زیادہ سات برس کے لیے جیل بھی بھجوا سکتے ہو۔۔۔ مگر سر جیت کو کہیں بچا سکتے اور خود بھی نہیں بچ سکے۔۔۔ تمہاری گواہی مجھے اور کلدیپ کی گواہی تم دونوں کو جیل بھیج سکتی ہے۔۔۔ انتخاب تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

دود نے بندوق کی نال پیچی کر لی۔ پھر اس نے چندر سنگھ سے کہا۔

”شاید تم نے انگریزی کا یہ محاورہ تو یقیناً سنا ہوگا کہ خیرات اپنی مرضی سے نہیں ملتی۔۔۔ انتخاب کا حق کلدیپ کو رہنے پہلے ہی چھین لیا ہے۔“

چندر سنگھ یعنی دھرمیندر نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا کہ دود کوئی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس وار سے کبھی نہ بچتا اور سر پھٹنے کے بعد سیدھا قبر میں جاتا مگر دود کو اس کے بیٹھے نے اچانک اور غیر متوقع

خطرات سے خبر آ زما ہونے کے لیے وہ چھٹی حس عطا کر دی تھی جو حیوانی جبلت ہے۔ وہ غوطہ مار گیا اور چندر سنگھ سسکھیل نہ سکا۔ وہ اپنے ہی زور میں گھوما اور توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اس نے سنہلنے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلائے مگر قدموں کے نیچے سے تازہ مٹی پھسل گئی۔ وہ منہ کے بل اس قبر کی طرف گیا جو اس نے دوسروں کے لیے کھودی تھی۔ اس کا سر ایک پتھر سے ٹکرایا اور پیلے اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ دود نے دیا سلائی جلا کے دیکھا تو دو تین فٹ قطر کے چار فٹ گہرے گڑھے میں نہایت مضحکہ طریقتے سے سٹھا پڑا تھا۔ اس کا سر پیشانی پر پہننے والے لہو سے سرخ ہو رہا تھا۔ کسی ہمارے پہلوان کی طرح چپٹ ہو گیا تھا۔

”چندر سنگھ۔“ حویلی کی طرف سے کلدیپ کی آواز آئی۔ ”کیا وہ ایس پی۔۔۔ ادھر آیا ہے۔۔۔ کیا تم نے اپنا کام ابھی تک ختم نہیں کیا۔۔۔ جلدی سے کرو۔۔۔ ہمیں تو بہت کچھ کرنا ہے۔۔۔“

دود اس کی طرف پشت کیے کھڑا رہا۔ آواز قریب آتی جا رہی تھی۔۔۔ لیکن کلدیپ مکار اور عیار صورت ہی نہیں بلکہ بڑی اچھی اداکارہ تھی۔ شاید اس نے اندھیرے کے باوجود پر چھائیں سے اندازہ کر لیا تھا کہ مٹی کے ڈھیر پر کھڑا ہوا شخص چندر سنگھ نہیں دود ہے۔ لیکن اس نے لہجے سے دود کو کچھ اندازہ نہ ہونے دیا۔ وہ اسے برابر جلدی کی تاکید کرتی رہی۔۔۔ عین اس وقت جب دود کھوم کر اسے پکڑنا چاہتا تھا۔ کلدیپ نے ایک جست لگا کے اسے دھکا دیا اور دود سیدھا گڑھے میں چندر سنگھ پر گرا اور بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹی گئی۔

”ایس پی کے بچے۔۔۔ ذلیل۔۔۔“

کینے۔۔۔ تو مجھے دھوکا دینا چاہتا تھا۔“

اس نے کلدیپ کی آواز سنی جو دھکا دیتے ہی ہلٹ کر بھاگ گئی تھی۔۔۔ اگر وہ اداکاری کا سہارا نہ لیتی تو دود اسے بندوق کی زد میں لے کر بے بس کر دیتا اور وہ کیرا چھین لیتا جو کلدیپ کے گلے میں لٹکا ہوا تھا۔ اس کے لیے آدھے راستے واپس لوٹنا بھی نا

ممکن تھا۔ اس چالاکی نے اسے فرار کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ شاید وہ یہ سمجھ گئی تھی کہ وود اس کے محبوب کو گولی مار چکا ہے۔

وود کا سر چند رنگھ کے لہوآلودہ سر سے ٹکرایا اور اسے چند رنگھ کے خون کی نمی اپنی پیشانی پر اور ہاتھ پر بھی محسوس ہوئی۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ چند رنگھ یعنی دھرمیندر زندہ تھا۔ اس نے گڑھے کے کنارے کو تھام کے نکلنے کی کوشش کی۔ مٹی کے ڈھیر پر پڑی ہوئی بندوق یوں نیچے آئی کہ اس کا دستہ وود کے سر پر لگا۔ وود پھر چند رنگھ پر گرا اور ساکت ہو گیا۔

کلدیپ نے بیوک کی ڈنگی میں سے پٹرول کے سر بند ڈبے کو نکال لیا۔

سر جیت اسی طرح بے سدھ پڑی تھی اور اسے بالکل خبر نہ تھی کہ نشے میں وہ کلدیپ کا سہارا لے کر اپنے پیردوں پر چلتی ہوئی کورو بے سنگھ کی خواب گاہ تک آ گئی ہے۔ وہ ہند دروازے کے باہر رنگین ٹائلوں کے سر دیش پر ٹھہری بنی پڑی تھی اور آہستہ آہستہ بڑبڑا رہی تھی۔

”دیدی۔! میں۔۔۔ میں نے بلی کو نہیں مارا۔۔۔ تم جانتی ہو کہ یہ جھوٹ ہے۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ کے سر کی سوگند۔۔۔ پاپا۔۔۔! میں قائل نہیں ہوں۔۔۔ بھگوان کی سوگند لے لیں۔۔۔ وہ جانتا ہے کہ میں نردوش ہوں۔“

لیکن اس وقت حویلی میں کوئی آواز سننے والا نہیں تھا۔۔۔ بوڑھا شوگر اور اس کی بیوی جن کے بال اس حویلی کا نمک کھاتے سفید ہو گئے تھے اپنے گوارٹر میں رات کی تنہائی میں اپنے ماضی کے ان خوابوں کو سیٹھ سورہے تھے جن کو تعبیر نہ ملی۔ اگر ان کے بچے جیت تو شاید زندگی کے یہ دن ان کی کمائی اور خدمت گزاری کے سہارے بسر ہو جاتے۔۔۔ مگر نصیب میں تو یہی غلامی کی زندگی تھی۔ بیٹے پوتوں، نواسے نواسیوں اور ان کے آباؤ گھروں کی مینا فقط سراپ تھی۔ زندگی تھی کہ بے جان گزر رہی تھی۔ نا آسودہ سی۔

اس سے اگلے گوارٹر میں بوڑھا مانی تھا جس نے بیٹے کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا اور آخری وقت اس حویلی میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ پرانے وفاداروں میں یہی تین اب تک حویلی میں موجود تھے۔ بانی دو خادم یعنی راجو اور اس کی بیوی جو صفائی کے کام پر مامور تھی۔ قصبے میں اپنے گھر میں رہتے تھے۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے آئے اور سورج غروب ہونے کے ایک گھنٹے بعد چلے جاتے تھے۔

حویلی کے ایک گھنٹے نے بارہ بجانے شروع کیے۔۔۔۔۔ کلدیپ نے ایک نظر اس طرف دیکھا جہاں درختوں کے جھنڈ میں چھپی ہوئی قبر میں بلونت کی جگہ خود چند رنگھ کی لاش پڑی تھی۔ اس لاش کے اوپر وہ ایس بی بے ہوش پڑا تھا جسے بروقت پہچان کے اس نے رائل سمیت گڑھے میں دھکیل دیا تھا۔ پھر وہ ریوالور لیے ایک درخت کی اوٹ میں کھڑی رہی تھی کہ وہ نکلے تو اس کے سر پر دستہ دے مارے اور پھر اس قبر میں ڈال دے۔ اس نے یقیناً چند رنگھ کو مار دیا تھا اور اب کلدیپ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ ان دونوں کو زندہ دفن کر دے۔

کل کیا ہو گا۔۔۔۔۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔۔۔ ایس بی نے چند رنگھ کو دھرمیندر کی حیثیت سے شناخت کر لیا تھا مگر وہ خود اس لیے بھاگ گیا کہ بلونت کو قتل کرنے کے بعد اسے اپنا انجام صاف نظر آیا تھا۔ تصویر کی گواہی اس کے جرم کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہوگی۔ یہ ایسا ٹھوس ثبوت ہے کہ اسے ہر گز ہرگز کسی قیمت پر جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

وہ کافی دیر تک انتظار کرتی رہی تھی اور اس کے بعد دبے پاؤں پوری طرح چوکس رہتے ہوئے اس گڑھے کے قریب گئی تو اسے چند رنگھ اور ایس بی دونوں یک جان دو قالب نظر آئے تھے۔ دونوں کے سر پھٹ گئے تھے اور وہ اگر مرے نہیں تھے بے ہوش تھے۔ ان پر بعد میں مٹی ڈال کر زمین برابر کی جاسکتی تھی۔ یہ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے کا کام تھا۔ قبر کھودنے کا مشکل کام تو چند رنگھ کر ہی گیا تھا۔ ایک

و نو دستگھ کو اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کی مھی اور بلونت مداخلت نہ کرتا تو کام یاب ہو جانی۔۔۔ مگر بلونت کو اس کی حمیت کی سڑا ملی اور ایس پنی نے۔۔۔ تصویر ملاحظہ ہو۔۔۔ سر جیت پر صدمے کا اثر تھا۔

اس نے پٹرول کا خالی ٹین اور ماچس سر جیت کے پاس چھوڑے اور اوپر اپنی خواب گاہ کی طرف چلے گئی۔ اس کے کان اب شیاما کی چیخ و پکار سن ہی نہیں رہے تھے۔۔۔ حویلی کے اندر پرانی لکڑی کے جلنے کی بو پھیلنے لگی تھی۔ شیاما دروازے کو توڑنے کی ناکام کوشش کے بعد اب باپ کو ہوش میں لانے کے لیے اسے پکار رہی تھی مگر پوری بوتل نی کے پھر مد ہوش ہو جانے والے کورو بے سنگھ کو اس جہنم کی قطعی فکر نہ تھی جس میں وہ جل کے خاکستر ہونے والا تھا۔ یہ کمر اس کے لیے چتا بننے کو جا رہا تھا۔

☆☆☆

و نو د آہستہ آہستہ اس گڑھے سے نکلا جو خوش بختی کے باعث اس کی ابدی آرام گاہ نہیں بنا تھا۔۔۔ ورنہ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اس بے ہوشی کے وقفے میں زمین اسے ڈھک لیتی۔ اس نے بندوق اٹھا کے ایک پیر چندر سنگھ کے کندھے پر رکھا اور رائل باہر پھینک کے دونوں ہاتھ کنارے پر مضبوطی سے جمادیے۔

باہر آ کر اس نے وہ شکاری بندوق پھر اٹھائی اور حویلی کی طرف چلنے لگا۔ درختوں کی آڑ میں پناہ لیتا کسی غیر متوقع گولی کا نشانہ بننے سے خود کو بچاتا وہ دے پاؤں آگے بڑھتا گیا۔ درختوں کی آڑ میں پناہ لیتا۔ کچھ چلنے کی بوا سے حویلی سے چند گز کے فاصلے پر محسوس ہوئی۔ اس نے غور کیا تو اسے چلی منزل کے سامنے والے حصے سے اٹھنے والا کثیف سیاہ دھواں بھی نظر آیا۔

وہ بے تحاشا اس سمت بھاگا۔ اس کے لیے کلدھپ کی مایوسی کا اندازہ کرنا دشوار نہ تھا۔ مایوسی اور شکست کا احساس اس سے ظاہر ہوتا تھا۔

چندر سنگھ کی ناکامی اس کے ارادوں کی اور اس

ڈرم کو کناروں پر لڑھکانے میں کلدھپ کو سخت محنت کرنی پڑی مگر وہ صحت مند عورت تھی۔ دس منٹ بعد وہ اٹھنے والی ڈرم کے پینڈے پر چڑھ گئی اور اس نے پٹرول کے ٹین کے ڈھکن کو کھولا۔ ڈبے کو اٹھایا اور جالی والے روشن دان میں سے پٹرول کی دھار اندر گرانے لگی۔

”دیدی۔۔۔ دیدی۔۔۔!“ شیاما نے ایک ہدیبانی چیخ ماری۔ ”یہ تم کیا کر رہی ہو؟“ دیدی۔۔۔! کیا تم پاگل ہو گئی ہو کیا۔ میں تمہاری چھوٹی بہن شیاما ہوں۔“ شیاما ہسٹریائی کیفیت میں چلائی۔ ”میں نے تمہارا کیا لگا ڈالا؟“ کلدھپ قہقہہ مار کے ہنسی۔ ”اگر کھول کے دروازہ نکل سکو تو نکل جاؤ۔ پہلے تم نے کڈی کھولنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب میں نے باہر سے تالا لگا دیا ہے۔“

”دیدی۔۔۔! اندر تمہارا باپ ہے۔۔۔ تمہارا بوڑھا باپ۔۔۔“ شیاما کی دہشت زدہ چیخ سنائی دی۔

کمرے میں پٹرول کی بو پھیل گئی۔ کلدھپ نے ایک کپڑا پٹرول میں بھگوایا۔ دیا سلائی دکھاتے ہی کپڑے نے آگ پکڑ لی۔ کلدھپ نے اسے جالی دار روشن دان میں سے اندر گرادیا۔ پھر شیاما کی آخری چیخ سنائی دی۔ پھر وہ دروازے سے ٹکرانے لگی۔ کلدھپ نیچے اتر آئی۔ آگ کمرے میں پھیل چکی تھی۔ کچھ دیر میں سب خاک ہو جائے گا۔ تمام فرنیچر، پردے اور قالین۔۔۔ کڑکیوں کے پٹ اور دروازے۔۔۔ پھر دروازے کی آگ سر جیت تک پہنچ جائے گی۔۔۔ اتنی دیر میں لوگ آجائیں گے۔ پٹرول کا ٹین قریب ہی رکھا ہوگا۔ وہیں ماچس بھی پڑی ہوگی۔۔۔ پاگل اور نشے کی عادی سرجو کا جرم ثابت ہو جائے گا جس نے دیوانگی کے دورے میں اس گھر کو آگ لگا دی جس کے مکین یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ سر جیت کو تھانے دار کے قتل کے جرم میں قانون کے حوالے کر دیا جائے۔۔۔ اس نے ایس بی

کے شاطر ذہن کی ناکامی تھی۔ فتح مندی کے احساس کو شکست کا خطرہ درپیش تھا۔ دوداب اس کی گرفت میں تھا مگر وہ جس کے لیے کلدیپ نے سب کچھ کیا تھا مارا گیا تھا۔ کلدیپ نے یہی سمجھا ہو گا کہ وہ مر گیا۔ اسے ایس بی نے جہنم دے کر دیا ہے۔ ایک بہن کو تختہ دار تک پہنچانے کا انتظام وہ پہلے ہی کر چکی تھی۔ چھوٹی بہن کو آج نہیں تو کل مرنا ہی مرنا تھا۔ باب کو وہ شراب پلا پلا کے تیزی سے موت کی طرف دھکیل رہی تھی۔ اب اس نے فیصلہ کیا ہو گا کہ آج کا کام مکمل نہیں چھوڑنا چاہیے۔۔۔ جو بہن ایک بھائی کی قاتل ہے وہ یا گل ہے اور نشے کی عادی ہے۔ آگ لگانے کا الزام بھی اس کی دیوانگی کے دورے پر عائد کیا جاسکتا ہے۔ سب مل کر راکھ ہو جائیں گے تو کلدیپ کے پاس دود کا منہ بند رکھنے کے لیے ایک تصویرہ جائے گی۔۔۔ اور اس کی اپنی گواہی۔۔۔ اس نے خود کو جس شکنجے میں جکڑا ہے وہ اس سے نکل جائے ناممکن ہے۔

عقی دروازے کو بند پا کر وہ سامنے پہنچا۔ صدر دروازہ بھی بند تھا اور اس بھاری بھر کم دروازے سے ٹکراتا بے سود تھا۔ دروازہ بجانے اور کنڈی کو زور سے کھٹکانے کے باوجود اندر داخل ہونے میں ناکام رہا۔ اس نے پلٹ کر اس کھڑکی کا رخ کیا جس کے شیشوں سے شعلوں کی چمک دکھائی دے رہی تھی۔ راکفل کے ایک وار سے اس نے شیشے توڑ دیے مگر اب اس کی راہ میں لوہے کی مضبوط سلاخیں حائل تھیں۔

”شیاما۔۔۔“ وہ بے اختیار پوری قوت سے چلایا۔ کمرے میں بھڑکتے شعلے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ بستر۔۔۔ چادریں، پردے اور صوفے سبھی جل رہے تھے اور کوئی بھی چیز اس سے محفوظ نہیں تھی۔ پھر دھوئیں میں شیاما کا ہیولا ابھرا۔

”دود۔۔۔ دود۔۔۔!“ شیاما نے ہڈیانی لہجے میں چیخا چاہا اس کی آواز حلق میں گولے کی طرح پھس گئی اور دھوئیں سے اس کا سانس پھول رہا تھا۔

”دیکھو شیاما۔۔۔! تم اس کھڑکی کے پاس رہو۔۔۔ سنا تم نے۔۔۔ میں دوسری طرف سے گھوم کے اندر گھستا ہوں۔۔۔ یہاں تازہ ہوا ہے۔۔۔ تمہارا دم نہیں گھٹے گا۔۔۔ اگر تم کو رصاحب کو لاسکتی ہو تو کسی نہ کسی طرح گھیسٹ کے ادھر لے آؤ۔ ہمت اور حوصلے سے کام لو۔“

”اس کا۔۔۔ اس کا کوئی۔“ شیاما کو کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کا سانس رک گیا۔ ”کوئی۔۔۔ کوئی فائدہ نہیں اب۔۔۔ دود۔۔۔“ اس نے کھڑکی کی سلاخیں بڑی مضبوطی سے پکڑ لیں اور اپنا سر کھڑکی پر لگا دیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگی تو سینے میں سانسوں کا حلاطم جھکولے کھانے لگا۔ دود نے راکفل نیچے رکھی اور شیاما کے پھول سے رخساروں پر پھسکی دبی اور آنسوؤں کو پونچھا۔

شیاما کا جسم ہچکیوں اور سسکیوں سے لرزنے لگا۔۔۔ دود سمجھ گیا کہ کنور بے سنگھ کو بچانے کا وقت گزر چکا ہے۔

اس کی نظر ڈرم پر گئی جو کھڑکی سے چند قدم کے فاصلے پر رکھا تھا۔۔۔ اوپر چھت کے قریب ایک روشن دان سا تھا جو اندھیرے میں ایک خلا کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ دود نے ڈرم پر چڑھ کے دیکھا۔ روشن دان میں موٹے تاروں کی جالی لگی ہوئی تھی۔ اس نے ہندوق کی مدد سے اسے توڑنے کا فیصلہ کیا اور ڈرم پر سے چھلانگ لگائی۔ عشق پچاں کی بیلیوں کے نیچے کیاری میں باغ بانی کے آلات رکھے تھے۔ دود کا بیبر اس پینچی پر پڑا جو شاخیں اور پتے چھانٹنے کے کام آتی تھی۔ اس نے جبک کر پینچی اٹھائی اور پھر ڈرم پر چڑھ گیا۔

موٹے تاروں کی پرانی جالی زنگ خوردہ تھی۔ اس نے پینچی سے وار کیا اور اس کے دونوں بلیڈ جالی میں سے گزر گئے۔ دونوں ہاتھوں کا استعمال روشن دان کی اونچائی کے باعث ممکن نہ تھا۔۔۔ اس نے پینچی کو ایک ہاتھ سے پکڑ کے تاروں کو کاٹنا شروع کیا۔ چند منٹ میں تار کٹ گئے مگر اس سخت کوشش

ہٹایا ہی تھا کہ اسے کلد پیپ نظر آئی۔

کلد پیپ کا ہاتھ فائر کرنے کے لیے اٹھ چکا تھا۔ ونود نے نیچے کی جدوجہد میں پھر غوطہ لگایا۔۔۔ مگر ریوالور کی پہلی گولی اس کے شانے میں پیوست ہو گئی۔ اس کے شانے کا گوشت جیسے آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔۔۔ مگر ونود نے دوسرے فائر سے پہلے ہی کلد پیپ کو جا لیا۔ ونود کی مکر سے وہ دیوار پر جا گئی اور اچھل گئے واپس آئی۔ دوسری گولی دیوار میں اتر گئی پھر ونود نے اس کی کلائی تھام لی۔۔۔ ایک جھٹکے میں کلائی ٹوٹنے۔۔۔ ریوالور کے نیچے گرنے اور کلد پیپ کے چیخنے کی آواز آئی۔ پھر ونود نے اسے بری طرح گھسیٹ کے مقابل کی دیوار پر بھی زور سے دے مارا۔

کلد پیپ صحت مند ہونے کے باوجود ونود جیسے مرد کی وحشیانہ موت کے سامنے کھلنا بھی۔ دیوار سے تصادم نے اسے پلٹنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ نیچے گری اور ساکت ہو گئی۔ ونود نے پلٹ کے دیکھا تو سر جیت کا وجود شعلوں میں چتا کی طرح جل رہا تھا۔ اس کے قریب رکھا ہوا پٹرول کا ڈبا گرنے سے رہا سپرول بہہ گیا تھا اور بائیں سر جیت بے ہوشی سے موت کی آغوش میں پہنچ چکی تھی۔ ونود نے اپنے دل کو آگ پر رکھے ہوئے شیشے کی طرح نکھلتے محسوس کیا۔ اس کے آنے کے بعد سے اب تک اس گھر کا مالک مر چکا تھا۔ اس کا بیٹا مر چکا تھا۔۔۔ اور ایک بیٹی بھی مر چکی تھی۔ بیچ پور کے گھرانے کی عزت کو آگ لگا کے خاک کرنے والی عورت زندہ تھی اور وہ شخص زندہ تھا جس نے اس عورت کو زندگی کے سفر میں شریک کیا تھا۔ مگر اب ان دونوں کی منزل ایک تھی۔

ونود نے وہ کیمرا اٹھایا جو کلد پیپ کے گلے سے اب بھی کسی سانپ کی طرح لپٹا ہوا تھا۔ اس نے کیمرے کو سر جیت کی چتا پر ڈال دیا اور اسے جلتا ہوا دیکھتا رہا۔ باہر کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ ونود نے شیا ما کو اٹھایا اور آگ سے دور لے گیا جو ابھی

میں ونود کے ہاتھ کی انگلیاں یوں درد کرنے لگیں جیسے کسی بھاری پتھر کے گرنے سے سن ہو گئی ہوں۔ اس نے خود کو اوپر اٹھایا اور روشن دان میں سر ڈال کے داخل ہوا۔ جگہ جگہ شکل اتنی تھی کہ اس کا جسم گزر سکے۔ اس نے روشن دان کی چوٹ کو پکڑا اور پھر ٹانگوں کو کسی بازی گری کی طرح ہاتھوں کے حلقے سے گزار کر لٹک گیا۔ روشن دان غسل خانے کا تھا مگر آگ نے اس کے دروازے کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ونود نیچے گرتے ہی اٹھا اور ایک جست میں دروازے سے گزر گیا۔ دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرے میں شعلوں کی چمک کے درمیان اسے شیا ما کا وجود کھڑکی پر جھکا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے سانس روکا اور دھوئیں کو ہاتھ سے ہٹاتا آگے بڑھا۔

”شیا ما۔۔۔!“ وہ چیخ کر جلتے ہوئے فرنیچر کے اوپر سے کود گیا۔ بے ہوش شیا ما کو ایک ہاتھ سے سمیٹ کر وہ واپس ہوا تو اسے اپنی راہ میں آگ کا دریا مائل نظر آیا جس کی طغیانی بڑھ رہی تھی۔ اگر شیا ما ہوش میں رہتی تو وہ اسے روشن دان سے نکال دیتا۔۔۔ مگر اب اسے دروازے سے گزرتا تھا جو دھڑا دھڑا جل رہا تھا اور بند بھی تھا۔ شاید دروازہ باہر سے بھی بند تھا۔ اس نے جلتے دروازے پر لات ماری۔ دروازہ باہر کی طرف ٹوٹ کے گرا۔ روشنی میں ونود کو یوں لگا جیسے جلتا ہوا پٹ کسی کے اوپر جا کر رہو۔

پھر اس نے سر جیت کی چیخ سنی اور ونود چھلانگ لگا کے اس کے اوپر سے گزر گیا۔ وہ اور شیا ما ایک ساتھ فرش پر گرے مگر اب وہ آگ سے نکل آئے تھے۔ تازہ ہوا میں ونود نے ایک گہری سانس لی اور شیا ما کو دیکھا جو صرف بے ہوش تھی۔ اس کے سینے میں سانس چل رہی تھی جس سے سینہ دھڑک رہا تھا۔ اس کی جلد کی نازک گلابی سطح شعلوں کی حدت سے دھک رہی تھی مگر جلد کہیں سے جھلسی نہیں تھی۔ ہاتھوں کے آبلوں کے سوا بظاہر اس کے جسم پر کہیں زخم نہ تھا۔ اس نے شیا ما کو چند گز دور

کنجوس لڑکے کو کنجوس  
لڑکی سے پیار ہو جاتا  
ہے۔

لڑکی: ”اتنی دیر کیوں لگا دی؟“

لڑکی: ”پاگل! وہ دھماکہ باندھ کر پھینکا تھا، واپس کھینچ لیا تھا۔“

پہلا دوست: ”یار! میں جس لڑکی کو پیار کرتا تھا اس سے میری شادی نہیں ہوئی۔“

دوسرا دوست: ”تم نے اس کو بتایا تھا کہ تمہارے ابو بہت پیسے والے ہیں؟“

پہلا دوست: ”ہاں یار.....“

دوسرا دوست: ”تو پھر؟“

پہلا دوست: ”تو پھر کیا! اس نے میرے ابو سے شادی کر لی۔“

☆☆☆

گھر کی مالکن بنی متوقع ملازمہ کو یہ احساس دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کے ہاں ملازمت کرنا اس کے لئے بہت آسان ہو گا اور اس گھر میں وہ خوش رہ سکے گی۔

اپنے گھر کی بہت سے خوبیاں گنوانے کے بعد  
 مائلکن بولی۔ ”اور یہاں بچے بھی نہیں ہیں جو تمہیں تنگ  
 کر س۔“

”اے بیگم صاحبہ! بچوں سے میں تنگ نہیں ہوتی.....  
آپ میری وجہ سے خواہ مخواہ فیملی پلاننگ کا تکلف مت  
کھیجیے۔“ متوقع ملازمہ نے فراغ دلی سے کہا۔

ایک ہی کمرے تک محدود تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور بوڑھے شوفر سے کہا کہ وہ فائر بریگیڈ کو فون کرے۔۔۔ مگر اس قہصے میں فائر بریگیڈ کا نام بھی لوگ نہیں جانتے تھے۔ تحصیل ہیڈ کوارٹر میں شاید ہو مگر ان کے آنے میں دیر لگے گی۔

”میں بستی والوں کو بلاتا ہوں۔“ بوڑھے شوہر نے کہا۔ ”وہی آگ بجھا سکتے ہیں۔“

مگر اسے کہیں جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کھڑکی سے نظر آنے والے شعلوں نے لوگوں کو متوجہ کر لیا تھا۔ آدھی رات کے وقت بھی کچھ لوگ کھیتوں کو پانی لگا رہے تھے۔ وہ اور ان کے ساتھی دوڑتے ہوئے جلے آ رہے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد گھر کے ہر برتن کی مدد سے پانی  
 ڈال کے اس کمرے کی آگ بجھائی جا چکی تھی جس  
 میں کنور و بے سنگھ کی سوختہ لاش بڑی تھی۔ نیچ پور کے  
 چوک میں کھڑا ہوا کنور و بے سنگھ کے دادا کا مجسمہ  
 انصاف کی ترازو ہاتھ میں لیے اس بے بسی کے ساتھ  
 سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ شیاما کو شوہر کے سپرد کر کے دونوں  
 اس گھرے کی طرف چل پڑا جس میں چندر سنگھ یعنی  
 دھرمیندر سنگھ بے ہوش پڑا تھا۔

”نود۔۔۔!“ شیا ما نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا دیدی کو پھانسی ہو جائے گی؟“

افق پر ایک سورج غروب ہو رہا تھا۔ تھانے دار کی موت سے شروع ہونے والا خونی ڈراما ایک دن میں ختم ہو گیا تھا۔ نو دہائیوں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کنوروں کے ساتھ کی چتا کی راہ سہرحیت کی راہ کے ساتھ گوردوارے کے آگن میں دفن کر دی گئی تھی جہاں اس کے ماتا پتا جی پہلے سے دفن تھی۔ پندرہ سترہ پولیس کی تحویل میں تھا اور کلدیپ کور کو ضلع کی زنانہ جیل بھیج دیا گیا تھا۔ تعزیت کے لیے آنے والے ابھی جا چکے تھے۔

”ہم صبح یہاں سے چلے جائیں گے نا۔۔۔“  
 ”نیا مابولی۔۔۔ تم مجھے چھوڑ کے تو نہیں جاؤ گے نا۔۔۔“  
 ”اب یہاں نہیں رہ سکتی۔۔۔ میں یہ سب چھوڑ



دوں گی وود۔۔۔! مجھے یہاں پھر لوٹ کے نہیں آنا ہے۔“

”تمہارا یہ سب قانونی حق ہے جو تمہیں مل ہی جائے گا۔“ وود کہنے لگا۔ ”مگر میں کل تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم میری ماں سے ملو گی تا تو۔۔۔ مگر میں یہ کیسے کہوں کہ وہ خوش ہو گی۔۔۔ مجھے اسے یہ بھی تو بتانا ہے کہ اس کے اب دو بیٹے نہیں رہے۔“

شیاما نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ وود غلا میں دیکھتا رہا۔

”ایک بات پوچھوں وود!“ شیاما بولی۔ ”تم نے شکر چاچا کو دس ہزار روپے کیوں دیے تھے۔؟“

”انصاف خریدنے کے لیے۔“ وود نے جواب دیا۔ ”اس کی گواہی کے بغیر چندر سنگھ یعنی دھرمیندر کو صرف جیل ہوتی۔۔۔ اب اسے پھانسی ہو گی۔۔۔ شکر نے گواہی دی تھی کہ اس نے چندر سنگھ کو قتل کرتے بھی دیکھا تھا۔۔۔ اس نے کلہ پیکے ساتھ مل کر تھانے دار کو اس مجسمے پر پھانسی دی تھی۔ اس گواہی کے بغیر قتل کا جرم ثابت نہیں ہوتا تھا۔۔۔ اگر انہیں پھانسی نہ ہوتی شیاما۔۔۔ تو یہ انصاف نہ ہوتا بلکہ انصاف کی بے بسی کا تماشا ہوتا اس لیے میں نے انصاف کو تماشا بننے نہیں دیا بلکہ درس عبرت بنا دیا۔۔۔ اس کے لیے گواہی خریدنا اور رشوت دینا جرم ہے تو میں مجرم ہوں۔ وہ اس رقم سے اپنے بیٹے کی سادھی بنوائے گا جس کی اسے بڑی آرزو تھی۔“

”کیا دیدی کے لیے بھی کوئی سادھی بنے گی وود!“ شیاما نے پوچھا۔

وود نے اس لڑکی کو بڑے دکھ سے دیکھا جسے نفرت کرنا آتا ہی نہ تھا۔ وہ اپنے بھائی کے اور باپ کے قاتل سے بھی نفرت کرنے کی اہل نہ تھی۔

”سادھی کیا ہوتی ہے شیاما۔۔۔! مر جانے والوں کی وہ نشانی جو وارث رکھتے ہیں۔“ وود نے

کہا۔ ”ان کو یاد رکھنے کے لیے تاکہ جب وہ خود نہ ہوں۔ تو ان کے وارث انہیں یاد رکھیں۔۔۔ مگر وہ تو دل میں رہتی ہے۔ سادھی ہو یا نہ ہو۔۔۔ قبروں کے نشان مٹ جاتے ہیں۔ زمین ہو جاتے ہیں اور سادھی بکھر جاتی ہے۔ مگر یاد دل میں محفوظ رہتی ہے۔۔۔ تم انہیں ان سب کو جو یہاں رہ جائیں گے یاد رکھنا چاہو تو ان سب کی سادھی اپنے دل میں تعمیر کر سکتی ہو۔“

شیاما نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے اب کوئی سادھی نہیں بنانی ہے۔۔۔ مجھے تو اپنا گھر بنانا ہے۔۔۔ حویلی نہیں ایک چھوٹا سا پیار بھرا گھر۔۔۔ سکون عافیت اور مسرت کا ضامن۔۔۔ میرا ایک ہم جماعت سریش ہے جو میرا جیون ساھی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔“

”ویسے تم مجھے بہت یاد آؤ گے۔ میں تمہیں عمر بھر نہیں بھولوں گی۔ تمہارا خلوص، جذبہ اور ایثار اور ایک دوست کی سی محبت۔۔۔ تم مجھ سے ملتے آتے رہنا۔۔۔ میں ہر پوچھا پاٹ میں تمہارے لیے پرارتا کروں گی تمہیں اپنی اور مثالی شریک حیات مل جائے۔ آیا کرو گے نا؟“

”تمہاری جیسی شریک جیون شیاما۔۔۔!“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر مسکرایا۔ ”تمہیں نیا جیون مبارک ہو۔۔۔ میں تمہاری شادی میں ضرور شرکت کروں گا۔۔۔ مجھے ایک خطرناک افوا کا قلع قمع کرنے کا حکم ملا ہے۔ اس کے بعد میں اپنا گھر بنانے کی سوچوں گا۔“

پھر شیاما کو قریب کر کے اس کے چہرے پر جھک گیا۔ اس بو سے میں میلا پن نہیں تھا۔ یہ دودھ کی طرح صاف اور اجلا تھا اس میں محبت کا گہرا، اچھوتا اور پاکیزہ جذبہ تھا۔

جب اس نے اپنا سر اٹھایا تو ان دونوں کی آنکھوں میں موتیوں جیسے صاف و شفاف آنسو چمک رہے تھے۔



## اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر



ایم الیاس

اس کے ماتحت نے جیسے ہی ان چاروں کو خون میں لت پت اور بے حس و حرکت دیکھا وہ حیرت اور خوشی سے اچھل پڑا۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا کہ چاروں اس آسانی سے موت کا نشانہ بن جائیں گے۔ وہ خوشی سے سرشار اور جھومتا ہوا ان لاشوں کی طرف بڑھا۔ وہ اسے روکتا ہی رہ گیا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان نوجوانوں کے ساتھی جو کہیں موجود اور چھپے ہوئے ہوں وہ نہ نکل آئیں اور.....!

## اس شمارے کی ایک دلگداز کہانی

کو بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ جب بھی جہاں بھی آزادی کی تحریک چلتی ہے وہ اس وقت تک چلتی ہے جب تک آزادی حاصل نہیں ہو جاتی۔ اس کے ملک میں دو سو برس تک تحریک آزادی چلی تھی۔ پھر بڑے خون خرابے اور عظیم قربانیوں کے بعد ملک انگریزوں سے آزاد ہوا تھا۔ اس ملک کی تاریخ بھی اس وادی میں

**جب** وہ دس برس پیشتر وادی جوں و کشمیر آیا تھا اس وقت بھی آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ یہ تحریک کوئی پرانی نہیں تھی۔ تقسیم ہند کے بعد سے چل رہی تھی۔ یہی تو یہ تحریک زوروں پر چلتی تو کبھی سرد پڑ جاتی تھی لیکن اس نے بھی دم نہیں توڑا تھا۔ بالکل ہی ختم نہیں ہوئی تھی مگر دس برس پہلے تحریک آزادی کچھ سرد پڑی ہوئی تھی۔ وہ اس بات



دھرائی جا رہی تھی۔ دو برس پہلے جب یہاں آیا تھا، وہ اس تحریک آزادی کو بچنے کے لئے نہیں بلکہ اس حسین خطے کی سیر و تفریح اور سیاحت کے لئے..... اس کی بڑی تعریف سنی تھی، ستار ہوتا تھا۔ اس کے ایک چچا نے اس وادی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں زمینداری کر لی تھی۔ اس کی حکومت نے، اس کی قوم کے لیڈروں نے ہمیشہ اس بات کی ترغیب دی تھی کہ اس وادی میں اس قوم کی جتنی اکثریت ہوگی، اس کے ملک اور قوم کے لئے اور تحریک آزادی کو ختم کرنے، بچانے اور پامال کرنے میں اتنی ہی مفید ثابت ہوگی۔ اس لئے اس کا چچا اس وادی کے ایک گاؤں میں آ گیا تھا۔

اسے دس برس پہلے کی باتیں آنے لگیں۔ وہ چچا کے گاؤں گیا تھا۔ اسے شروع ہی سے گاؤں اور اس کی فضا بہت پسند تھی۔ اس وقت اس پر بھرپور جوانی آئی ہوئی تھی۔ جیسے چری پر شگوفے آتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں پہلی بار کسی گاؤں میں آیا تھا۔ یہاں بالکل نئی زندگی تھی۔ کچھ عجیب طرح کی تیزی اور تندی اس کے بہاؤ میں تھی۔ جو کبھی بھی چلی وادیوں میں بھری برسات میں آتی ہے۔ بہار کے چمکتے ہوئے دن میں وہ گھومنے نکلا تھا۔ ابھی سیب اور آڑو کچے تھے، انجیر پھٹے تھے اور چیری کے رخساروں پر وہ گلابی رنگ بھی نہ تھا جو مثال کے طور پر اس وادی کی دو شیزاؤں کے چہروں پر اس نے کھیلنے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر گھاس بڑی لمبی، لچکدار اور خوشگوار تھی اور اس کے قریب سے گزرنے پر اسے گھاس سے وہی خوشبو آتی تھی جو اس کے بدن میں آرہی تھی۔ جوانی اور بہار میں ایک ہی خوشبو آتی ہے، جو شہروں میں بھی نہیں ملتی ہے۔

وہ بہت دور تک اونچی گھاٹیوں میں چلا گیا تھا۔ اس لئے کہ ایسی کھلی فضا، جس میں سکون ہی سکون ہو، اس کا شہر میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا

تھا۔ ندی کنارے سفیدے کے پیڑوں کی لمبی قطاریں اور گھاس کے ایک کونے قطعے میں گائیں چر رہی تھیں۔ بادلوں کے ٹکڑے شہر پہلوں کی طرح گھاٹیوں سے پھسل کر گاؤں کے مکانون تک آتے تھے..... اس کا چچا بہت چھوٹا زمیندار تھا۔ اسے اور اس کے دونوں بیٹوں کو اپنی زمینوں پر خود کام کرنا پڑتا تھا جس وقت وہ گھر سے نکل رہا تھا، اب اس کا چچا انگور کی بیکلیں اپنے باغیچے میں ٹھیک کر رہا تھا۔ وہ ایک گھوڑے پر سیر کے لئے نکلا تھا۔ اس کے چچا کے دونوں بیٹے کسی کام سے سری مگر گئے ہوئے تھے۔ اوپر گھاٹیوں میں جا کر اس نے جہاں گھوڑا باندھا تھا، اس سے آگے جانا بہت مشکل تھا۔ اس نے گھوڑے کو اخروٹ کے پیڑ سے باندھ دیا تھا اور پھر ادا پر چل دیا تھا۔ کہیں سفید بادل تھے، کہیں پھولوں کی بیکلیں تھیں، کہیں جھاگ اڑاتا ہوا آبشار تھا جو سفید موتی کی طرح تھا۔ وہ قدرت کے ان حسین نظاروں میں کھو کر دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ جیسے جنت میں آ گیا ہو۔

”گلتا ہے آپ پہلی بار اس وادی کی سیر و سیاحت کے لئے آئے ہیں۔“ اس نے اپنی پشت پر ایک میٹھی سی آواز سنی جس نے اس کے کانوں میں رس گھول دیا تھا۔

اس نے ایک دم سے چونک کر اور پلٹ کر دیکھا۔ اس آواز کو سن کر اس کے سارے بدن کو سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک نوجوان سالاکا کھڑا ہوا تھا۔ اس کی مسیں بھیک رہی تھیں۔ وہ بہت خوبصورت تھا۔ کشمیری سیب کی طرح سرخ تھا۔ اس نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ سفید کپڑی بھی باندھ رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بندوق تھی۔ اس کے چہرے پر نرمی و شائستگی تھی مگر اس کی عقابی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔

”جی ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ وہ

”زندگی بہت حسین ہوتی ہے۔ تم نے ابھی زندگی کہاں دیکھی ہے۔ اس کا لطف کہاں اٹھایا ہے۔ تمہاری عمر موت سے کھینکنا اور مفت میں گنوانے کی نہیں ہے۔۔۔۔۔ اور پھر تمہارا مقابلہ ایک بہت بڑے ملک کی فوج سے ہے جس کی تعداد کا اس کی طاقت کا تمہیں بالکل ہی اندازہ نہیں ہے۔ تم لوگ برسوں سے اس کے خلاف لڑ رہے ہو۔۔۔۔۔

آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہو۔ اس سے تمہاری قوم نے کہا حاصل کیا۔۔۔۔۔ کتنے سہاگ اجڑ گئے، گودیں خالی ہو گئیں۔ تمہاری عمر کے لڑکے لڑکیاں پیٹیم ہو گئے۔ لڑکیوں کے ہاتھوں میں مہندی کے بجائے خون رچ گیا۔ تم نے بھی یہ سوچنے کی ضرورت محسوس کی کہ آج اور کل میں کتنا فرق ہے۔ چھوٹی بڑی طاقت میں کیا فرق ہے۔“

”زندگی ایک بار ملتی ہے تو موت بھی ایک ہی بار آتی ہے۔“ لڑکے نے کہا۔ ”ہم موت سے اس لئے نہیں ڈرتے ہیں کہ اس کا ایک دن مہین ہے اور پھر موت ہماری حفاظت بھی کرتی ہے، کیونکہ ہم سب موت کی امانت ہوتے ہیں۔ ہمیں حسین زندگی سے زیادہ شہادت کی تمنا ہوتی ہے۔ شوق شہادت کی تمنا میں ہم دشمن کی صفوں میں جا گھٹتے ہیں۔ لگتا ہے کہ آپ نے تاریخ نہیں پڑھی۔۔۔۔۔ ایک ایسی قوم پر جس میں جذبہ آزادی بیدار ہو چکا ہے اس پر تسلط قائم نہیں رکھا جاسکتا۔

حریت پسندانہ تعداد سے ڈرتے ہیں نہ سامان حرب سے۔۔۔۔۔ جب کوئی موت سے نہیں ڈرتا ہے تو پھر کسی کے ساتھ نا انصافی کرنے اور ظلم و ستم روا رکھنے پر ڈرتے ہیں۔“

”یہ جذباتی باتیں ہیں۔“ اس نے اس لڑکے کو سمجھانے کی کوشش کی مگر لیکن وہ دل میں حیران تھا کہ اس نوجوان کو زندگی سے نہیں موت سے پیار ہے۔ وہ ایک خوبصورت زندگی پر موت کو ترجیح دے رہا ہے۔ یہ جذبہ اس میں کس بات نے پیدا کیا۔ پھر وہ بڑی نرمی اور شائستگی سے کہنے

لڑکے کے ہاتھ میں بندوق دیکھ کر کچھ خائف سا ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا ہوا تھا۔ ”میرے چچا پرکاش آئندہ گاؤں میں رہتے ہیں۔ زمینداری کرتے ہیں۔ میں اس حسین وادی کی سیر و سیاحت اور ان سے ملنے آیا ہوں مگر آپ ہیں کون۔۔۔۔۔“

”میں ایک مجاہد ہوں جو اپنی اس وادی میں آزادی کے لئے لڑ رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں یہاں سے گزر رہا تھا آپ کو دیکھا تو یہاں چلا آیا۔“

”لیکن یہاں دور دور تک فوج اور بی ایس ایف کے کسی کیمپ کا نام و نشان نہیں ہے پھر آپ نے یہ بندوق کس لئے اٹھا رکھی ہے۔“

”میں یہاں سے اپنے کچھ دوستوں اور رشتے دار جو انوں کو محاذ جنگ پر لے جانے آیا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ لوگ چونکہ چلنے کے لئے تیاری کر رہے ہیں، میں نے سوچا کہ جب تک کیوں نہ یہاں کی سیر کر لوں۔ میں نے گھوڑے کے جہنانے کی آواز سنی تو اس طرف چلا آیا۔ پھر آپ کو دیکھا۔“

”ابھی تو آپ کی عمر لکھنے پڑھنے کی ہے نہ کہ ہتھیار اٹھانے کی۔“ وہ حیرت سے بولا۔ ”اتنی سی عمر میں آپ نے بندوق اٹھالی۔۔۔۔۔“

”میں اور میرے ساتھی جو میرے ہم عمر ہیں وہ تحریک آزادی میں حصہ لے رہے ہیں ان کے ایک ہاتھ میں قلم بھی ہے۔“

”تمہیں موت سے ڈر نہیں لگتا۔۔۔۔۔“ اس نے تھیرزدہ لہجے میں پوچھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”ہم موت سے نہیں ڈرتے ہیں بلکہ اسے گلے لگا لیتے ہیں۔ ہم تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتے ہیں۔ اس کے حتمی ہوتے ہیں۔“

”زندگی ایک بار ملتی ہے۔“ اس نے کہا۔

ہوری تھی۔

اس نے اپنی ڈیوٹی سنبھالنے کے بعد ساری خفیہ رپورٹیں پڑھیں جو بڑی ہولناک اور لرزہ خیز تھیں۔ اس قوم کے ابھی دماغ درست نہیں ہوئے تھے جبکہ کتنے جوانوں کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔ دس موت کی آغوش میں جاتے تھے ان کی جگہ پندرہ جوان لے لیتے تھے۔ عورتوں کی بے حرمتی اور اغوا سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ جیلیں بھرنے سے ان کے عزم و حوصلے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ عام قسم کے ہتھیاروں سے مقابلہ کر رہے تھے۔

وہ ایک روز مختلف علاقوں اور بستیوں سے ہوتا ہوا ایک ایسے علاقے میں آیا تھا جو دور دراز تھا۔ ایک تجربی اطلاع کے مطابق یہاں کچھ ایسے نو جوان اس علاقے میں موجود تھے جنہوں نے فوج کو شدید ترین نقصان پہنچایا تھا۔ تین جرنیلوں اور پچاس کے قریب فوجیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے۔ دہشتی بھوں کے حملوں سے تین کیمپوں اور سات ٹرک جو اسلحے سے لدے ہوئے تھے تباہ کر دیا تھا۔ اس راستے سے فوجی دستے گزرتے ہوئے خوف کھاتے تھے۔ ان کی ہیئت فوجیوں کے دلوں میں ایسی بیٹھ چکی تھی کہ وہ راتوں کو سوتے میں بھی ڈر جاتے تھے۔ ایک اطلاع یہ بھی کہ ان کے ساتھ ایک جوان لڑکی بھی ہے جو ان کے دوش بدوش تحریک آزادی میں حصہ لے رہی ہے۔ اس نے بھی نجانے کتنے فوجیوں کو قتل کیا ہے۔

یہ راستہ بند ہو جانے کی وجہ سے اس کی فوج کو بڑی مشکلات پیدا ہو گئی تھیں۔ جب تک ان حریت پسندوں پر قابو نہیں پایا جاسکتا تھا اس وقت تک یہ راستہ کھل نہیں سکتا تھا۔ یہ راستہ فوجی اہمیت کا حامل تھا۔ اب اس کے لئے بہت ضروری تھا کہ ان جوانوں کو موت کی نیند سلا دے۔

لگا۔ ”تم ابھی نو جوان ہو۔ تمہاری عمر ستر اٹھارہ برس کی بھی نہیں ہے۔ زندگی صرف موت کی نذر کرنے کے لئے نہیں ہوتی ہے۔ تم جس دنیا میں رہ رہے ہو اس دنیا سے نکل کر یہ دنیا کتنی حسین اور رنگین ہے۔ یہ زندگی مزے اٹھانے اور عیش کرنے کے لئے ہے نہ کہ کسی کی زندگی سے کھیلنے کے لئے ہے۔“

”ہم مسلمان آخرت کی اس زندگی پر یقین رکھتے ہیں جو لافانی ہوگی۔ یہ دنیا فانی ہے۔ اس فانی دنیا میں کچھ نہیں ہے۔ ایک دن سب خاک ہو جائے گا لیکن آخرت کی دنیا اس وقت حسین پر کیف اور راحت بخش ہوگی، تم تصور نہیں کر سکتے ہو۔ یہاں زندگی ہی نہیں ہر چیز عارضی اور فانی ہے۔“

وہ اس نو جوان اور اس کی باتوں کو کبھی بھولا نہیں۔ دس برس گزر جانے کے بعد بھی اسے اسی طرح یاد تھا جیسے یہ کل کی بات ہو۔ آج دس برس کے بعد ایک اعلیٰ فوجی افسر کی حیثیت سے کشمیر آیا تھا۔ اس کا تبادلہ کشمیر کر دیا گیا تھا تا کہ وہ کشمیری حریت پسندوں کے خلاف جنگ میں حصہ لے سکے۔ تحریک آزادی کو چل سکے۔ حریت پسندوں کے جذبات کو تاراج کر سکے۔ ان حریت پسندوں نے اس کی فوج کا نا طبقہ بند کر رکھا تھا۔ لاشوں کا تحفہ بھیج رہے تھے جدید ترین ساز و سامان اور فوج کی اکثریت بھی ان مجاہدین کو جو تعداد میں بہت کم تھے، شکست نہ دے سکی تھی۔ جب کہ اس کی فوج نے وادی میں ان حریت پسندوں اور ان کی تحریک کو دبانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ بستیوں کی بستیاں جلادی تھیں، عورتوں کی بے حرمتی کی تھی، نہتے بوڑھوں اور جوانوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ سیکڑوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بھر دیا تھا۔ ان پر تشدد کیا جاتا تھا، پھانسی بھی دی گئی تھی لیکن یہ مجاہدین سبسہ پلائی دیوار بنے ہوئے تھے۔ اس کی فوج نے برسوں میں جانے کیا کچھ کیا تھا پھر بھی اسے ان مجاہدین پر فتح نصیب نہیں

وہ اپنے ماتحت کے ساتھ ان نوجوان مجاہدین کی تلاش میں نکلا جنہوں نے اس کی فوج کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ دراصل وہ ایک ایسی جگہ سے اپنے دشمن پر حملہ کرتے تھے کہ دشمن بے بس ہو کر رہ جاتا تھا۔ اس کے لئے ایک قدم آگے بڑھانا بھی ناممکن ہو جاتا تھا۔ وہ علی الصباح ہی آج اس علاقے میں آگیا تھا۔ وہ چاروں طرف دیکھتا رہا تھا۔ سہ پہر ڈھلنے کے بعد اس نے کچھ لوگ پہاڑی کے عقب سے نمودار ہوتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ ایک چٹان پر اپنی بندوقیں رکھ کر نماز پڑھ رہے تھے کہ اس نے اپنی جدید ترین ردی ساخت رائل سے انہیں باری باری بھون دیا تھا۔ یہ سب کچھ اس نے اس تیزی اور پھرتی سے کیا تھا کہ ان میں سے کسی ایک کو سمجھنے، جھننے اور بندوق اٹھانے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ یہ کل چار نوجوان تھے۔ اسے حیرت اس بات کی تھی ان چار نوجوانوں نے اس کی فوج کو کتنی کا ناچ نچا کر رکھا ہوا تھا۔ سیمہ پلائی دیوار بنے ہوئے تھے۔ ان چاروں نے جو نقصان پہنچایا تھا وہ چار سو آدمی بھی مل کر نہیں پہنچا سکتے تھے۔ انہوں نے اس کی فوج کے دانت کھٹے کر کے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے ماتحت نے جیسے ہی ان چاروں کو خون میں لت پت اور بے حس و حرکت دیکھا وہ حیرت اور خوشی سے اچھل پڑا۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا کہ چاروں اس آسانی سے موت کا نشانہ بن جائیں گے۔ وہ خوشی سے سرشار اور جھومتا ہوا ان لاشوں کی طرف بڑھا۔ وہ اسے روکتا ہی رہ گیا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان نوجوانوں کے ساتھی جو کہیں موجود اور چھپے ہوئے ہوں وہ نہ نکل آئیں اور اس کے ماتحت کو بھون کر رکھ دیں۔ ہر قسم کا خطرہ موجود تھا۔ وہ اپنی جھانڑیوں کے پیچھے اپنی رائل سے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اپنی دور بین سے مختلف سمتوں کا جائزہ لیا۔ شاید کوئی اس طرف آتا ہو دکھائی دے۔

اس وقت وہ جو خوشی محسوس کر رہا تھا ایسی خوشی تو اس نے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوتے وقت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے اپنی فوج کے راستے کا ایک ایسا پتھر ہٹا دیا تھا جو اس کی فوج کی بڑی تعداد اور جدید ترین ہتھیار بھی ہٹا نہیں سکے تھے لیکن اس نے اپنی اس خوشی کا اظہار ماتحت پر نہیں کیا تھا۔ صرف اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے ملک سے یہ تہیہ کر کے اس وادی میں آگیا تھا کہ اپنی تدبیر اور مشکل و فراست سے ان حریت پسندوں کو ختم کر کے دم لے گا۔ اس نے جو یہ کارنامہ انجام دیا تھا وہ اس کی فوج کے نزدیک نہ صرف بہت اہم تھا بلکہ عظیم تھا۔ اس کارنامے پر اسے مزید ترقی مل سکتی تھی۔ اس کا ماتحت ان لاشوں کے پاس پہنچ کر انہیں نفرت اور حقارت سے دیکھ رہا تھا کہ فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ماتحت کے ایک سنسناتی ہوئی گولی آ کر گئی تھی۔ پھر اس کے ماتحت کو جیسے بھون دیا گیا تھا۔ جس نے بھی اس کے ماتحت کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا اس نے اپنے ساتھیوں کی موت کا بڑا سفاکانہ انتقام لیا تھا۔ اس کے لئے یہ اندازہ کرنا بہت مشکل تھا کہ کس جانب سے اس کے ماتحت پر فائرنگ کی گئی ہے۔ چند لمحوں کے بعد پھر فضا پر سکوت چھا گیا۔

اسے خوف اور دھڑکا لگ گیا تھا کہ جس نے اس کے ماتحت کو قتل کیا ہے کہیں اب وہ اسے نشانہ بنانے کی سوچ نہ رہا ہو لیکن اس اندیشے کا کوئی جواز نہ تھا کیونکہ اس کے ماتحت کو لاشوں کے پاس دیکھ کر اسے ختم کرنے والا اس نتیجے پر پہنچا ہو گا کہ اس کے ماتحت کے سوا یہاں کوئی اور نہیں ہے۔ لہذا وہ اسے تلاش نہیں کرے گا۔ لیکن وہ کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ دشمن کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ اسے زرخے میں لے سکتا تھا۔ اس کا مشر بھی اس کے ماتحت جیسا عبرتناک ہو سکتا

تھا۔ ویسے اسے خطرے کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ یہاں ایک لمحہ رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

چند لمحوں کے بعد اسے شمال کی جانب سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز بہت دور سے آرہی تھی۔ شمال میں اس کی فوج نے کئی بستیاں کو نذر آتش کر کے انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا تھا۔ اب وہ اس علاقے پر قابض تھے اور انہوں نے وہاں اپنے کیمپ قائم کئے ہوئے تھے۔ اس نے اپنا تھیلا اور رائفل سنبھالی۔ پھر وہ جھاڑیوں اور پہاڑوں کے عقب سے نکلا۔ ایک محفوظ جگہ رک کر اس نے اپنی دوربین سے چاروں طرف کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ایک ہل گئے لئے اس کی دوربین اس کے ماتحت کی لاش اور چار جوانوں کی لاشوں پر مرکوز ہو گئی۔ اس نے ان چاروں کو غور سے دیکھا۔ ان کی عمریں زیادہ نہ تھیں۔ وہ سولہ برس سے لے کر بائیس تئیس برس کے نوجوان تھے۔ ایسے کم سن نوجوانوں نے اس کی فوج کو خیر کیا ہوا تھا۔

دس برس کے بعد یہاں آ کر اس نے خفیہ رپورٹیں دیکھیں تو اس میں یہ بات بھی لکھی ہوئی تھی کہ کم سن اور نوجوان لڑکے بھی خصوصی تربیت حاصل کر کے اپنے باپ، بھائیوں اور جوان مردوں کے دوش بدوش آزادی کے لئے برسرِ پیکار ہیں۔ ان کے دلوں میں موت کا کوئی خوف نہیں ہے اور نہ ہی دنیاوی زندگی کی رنگینوں سے کوئی دلچسپی ہے۔ وہ صرف اور صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس کی فوج اس وادی سے نکل جائے۔ انہیں خود مختاری اور آزادی مل جائے۔

اس کے ملک کے ایک اخبار کے صحافی نے جس نے وادی کا دورہ کیا تھا، جو حریت پسندوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا اور تین ماہ تک اس کا قیدی رہا تھا، اس نے ان حریت پسند نوجوانوں کے بارے میں لکھا تھا کہ مجاہدین میں اکثریت اُسے جوانوں کی ہے جس کی مسیماں ابھی بھگ رہی

ہیں۔ اس نے ان کے ساتھ محاذ پر جا کر یہ دیکھا تھا کہ وہ فوج کا کس بہادری سے مقابلہ کرتے ہیں۔ بے جگری سے لڑتے ہیں۔ شاہینوں کی طرح اپنے دشمن پر جھپٹتے ہیں۔

اچانک فضا گولیوں کی گونج سے لرز اٹھی۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ یہ جو فائرنگ ہو رہی ہے، وہ شاید اس کی فوج کے کسی قافلے پر ہو رہی ہے۔ یہ لوگ تعداد میں پانچ چھ معلوم ہوتے ہیں۔ اس نے چھپنے اور وہاں رہ کر انتظار کرنے کے بجائے وہاں سے فرار ہونے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ ان کے اوپر آنے اور اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھنے پر اس کے لئے کوئی خطرہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ وہ اس کی تلاش میں بھی نکل سکتے تھے۔

اس نے مشرق کی سمت تیزی سے دوڑ لگا دی تھی کیونکہ وہ اس جگہ سے بہت دور نکل جانا چاہتا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن اسے آلے کیا معلوم اس کا غیر محسوس انداز سے تعاقب کیا جا رہا ہو۔ اس کے لئے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ راستے سے ناواقف تھا۔ اس نے ایک دو جگہ رک کر دیکھا تھا۔ کوئی اس کے تعاقب میں نہیں آ رہا تھا۔ اگر کوئی اس کے تعاقب میں ہوتا تو اب تک گولیاں اس کا تعاقب کر کے اسے ختم کر چکی ہوتیں۔

وہ کدھر جائے۔ کس سمت جائے۔ اس کی فوج کے کیمپ کہاں ہوں گے، وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ دوربین کی مدد سے دیکھتا بھی جا رہا تھا کہ شاید کہیں کوئی کیمپ دکھائی دے جائے اور پھر شام بھی ہو رہی تھی۔ شام کے دھند لگے چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ دن اگر ہوتا تو وہ دوربین کی مدد سے راستے کا تعین کر لیتا۔ اس کے ماتحت کے بیگ میں نہ صرف نقشہ بلکہ خورد و نوش کا سامان اور پانی کی بوتل بھی رہ گئی تھی۔ نقشہ اس کے پاس ہوتا تو اسے اس قدر مشکل نہ پیش آتی۔ وہ جدھر منہ اٹھا، ادھر تیزی سے اور کرتا پڑتا چلا

ایسے سارے راستے میں نہ تو کوئی آبادی نظر آئی تھی نہ چشمہ ملا تھا نہ کوئی ندی یا نہریں، جھیل تھی۔ سنسان، ویران اور بیابان علاقہ تھا۔

اس نے سوچا کہ یہاں بیٹھ کر اپڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے تو بہتر ہے کہ وہ دشمن کے ہاتھوں بہادری کی موت کیوں نہ مرے۔ ایک فوجی کے شایان شان نہیں کہ کتے کی موت مرے۔ وہ ایک فوجی افسر بھی ہے۔ دشمن اسے مارنے سے پہلے ایک گلاس پانی تو پلاوے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دشمن اسے ہلاک نہ کرے اور اپنا قیدی بنا لے۔ دشمن کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہ ہوگا کہ اس نے چار نو جوان مجاہدین کو موت کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کی موت کی ساری ذمہ داری اس کے ماتحت پر آ جائے گی، جس کی لاش ان جوانوں کے قریب پڑی ہوئی ہے۔ دشمن اس کی فوج سے اپنے ساتھیوں کی رہائی کے عوض سودے بازی کر سکتا ہے کیونکہ بہت سارے مجاہدین اس کی فوج کی قید میں ہیں۔

سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب وہ بیدار ہوا تو سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ صبح ہو چکی تھی۔ فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ وہ بہ وقت تمام اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے جیسے چھپتے چلتے کھلے میدان سے ہو کر چلنے کو ترجیح دی۔ پھر اس نے ایک جگہ رک کر دور بین کی مدد سے مخالف سمت دیکھا۔ سب سے پہلے اسے ایک بہت ہی چھوٹی سی مسجد دکھائی دی۔ مسجد کے عقب میں کوئی دوسو قدم کے فاصلے پر اسے ایک بڑا سا مکان دکھائی دیا۔ اس مسجد اور مکان کے سوا اسے کوئی آبادی دکھائی نہیں دی تھی۔ یہ علاقہ پہاڑیوں اور جنگل سے گھرا ہوا تھا۔

وہ مکان زیادہ دور نہ تھا لیکن یہ مسافت اس کے لئے صدیوں کی بن گئی تھی۔ اس کے لئے ایک قدم بھی چلنا دو بھر ہو رہا تھا۔ اس میں اتنی

رہا تھا کیونکہ راستہ ناہموار تھا۔ راستے میں پہاڑی پتھر پڑے ہوئے تھے۔ چلتے چلتے وقت خاماگز رہ گیا تھا۔ شام کے سائے اندھیرے میں مدغم ہو رہے تھے۔ اس اندھیرے میں دو بین کی مدد سے دیکھنا کچھ فائدہ مند نہیں تھا۔

اس نے کسی جگہ رک کر اور صبح تک وقت گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جب وہ چلتے چلتے کسی جگہ سستانے کی غرض سے بیٹھ جاتا تو اسے قریب سے گولیوں کے چلنے کی آواز سنائی دیتی، جس کے باعث وہ چلنے پر مجبور تھا۔ وہ ساری رات اندھے میں چلتا رہا تھا۔ ٹھوکریں کھاتا رہا تھا۔ پگڈنڈیوں اور پہاڑیوں سے ہوتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس کی منزل کہاں ہے اسے معلوم نہیں تھا۔ کسی بھی جگہ رکنا اور رات کاٹنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ساری رات وہ فائرنگ کی آوازیں سنتا رہا تھا۔ قریب سے اور بہت دور سے بھی جیسے مجاہدین اس کی فوج سے برس رہے ہیں۔

پھر وہ ایک پہاڑی کے دامن میں تھک ہار کے بیٹھا تو اس نے صبح صادق کو طلوع ہونے ہوئے دیکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بہت دور سے ایک بہت ہی دھیمی سی آواز سنی۔ اس نے اپنے کان لگا دیئے۔ یہ اذان کی آواز تھی۔ اس نے اذان سے اندازہ لگایا کہ کوئی بستی قریب میں ہے۔ گہری خاموشی کی وجہ سے اسے آواز سنائی دے گئی تھی۔ وہ آپ ہی آپ دشمن کے حصار میں آ گیا تھا۔ یہاں سے نکلنے ہی بستی کے کسی شخص کی نظر اس پر پڑ سکتی تھی۔

اب اس کے بس میں نہیں رہا تھا کہ وہ اس جگہ بیٹھا رہے کیونکہ وہ نہ حال ہو رہا تھا۔ ٹھکن سے چور تھا۔ اس کے لئے بھوک پیاس ناقابل برداشت ہو رہی تھی، حلق سوکھ گیا تھا، حلق میں کانٹے چھ رہے تھے۔ اس کے جوتے گھس کر پھٹ چکے تھے۔ اس کی قمیض بھی کٹی جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ اس کے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ



نہ ہی وہ اسے ایک دشمن کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی سی طاری تھی۔ بڑی پروقاری لگ رہی تھی۔

وہ عورت اسے بیدار دیکھ کر خاموشی سے اندر کے ایک کمرے میں چلی گئی۔ اس نے سوچا کہیں وہ اسے ختم کرنے کے لئے اندر سے اسلحہ لانے تو نہیں گئی ہے۔ مگر وہ اسے دہلیز پر ہی ختم کر سکتی تھی۔ اسے اندر لا کر بستر پر تو نہ لٹانی۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ عورت دودھ کا گلاس لئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے خوبصورت اور سڈول ہاتھوں میں بندوق نہ تھی۔ اس کے ہاتھ میں دودھ سے لبالب بھرا ہوا بڑا گلاس تھا۔ وہ اس کے پاس آ کر بولی۔ ”دودھ پی لیں۔“

اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ وہ اس قدر بڑھ چلا تھا کہ اس کے لیے بیٹھنا دشوار ہو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر عورت نے دودھ سے بھرا گلاس مسہری کے سر ہانے والی میز پر رکھ دیا۔ پھر اسے اٹھ کر بیٹھنے میں مدد دی۔ جب وہ بیٹھ گیا تو عورت نے اس کی طرف دودھ کا گلاس بڑھا دیا۔ دودھ ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں غٹا غٹ پی کر اسے خالی کر دیا۔ اس ایک گلاس دودھ نے اس کے سارے جسم میں فروخت اور تازگی کی لہر دوڑادی۔ اس نے بڑی توانائی سی محسوس کی۔ اس کی تھکن اور تھکالی حیرت انگیز طور پر بہت کم ہو گئی تھی۔ یہ دودھ نہ تھا بلکہ امرت پانی تھا جس نے اسے ایک نئی زندگی دی تھی۔

جب عورت نے اس کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لیا تو اس نے عورت کی طرف ممنون نگاہوں سے دیکھا۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“

”اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم اپنے مہمانوں کی خاطر مدارت روا دیتی انداز سے کرتے ہیں۔ آپ ہمارے معزز مہمان ہیں۔“

سکت بھی نہ تھی کہ کچھ تیز ہی چل سکے۔ وہ کس طرح چل رہا تھا؟ یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ کیوں نہ وہ ایک ہوائی فائر کر دے۔ پھر اس خیال سے رک گیا کہ کہیں اس مکان کے اندر سے کوئی اس پر فائر نہ کر دے کیونکہ اس وادی کے ہر مکان میں ایک نہ ایک حریت پسند موجود تھا۔

اس مکان کے قریب پہنچنے ہی اس کے ہاتھ سے بیگ اور بندوق چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ اس نے دروازے پر دستک دینے کے لئے جیسے ہی اٹھ رکھا، دروازہ کھل گیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ غش کھا کر مکان کے اندر گرا۔ اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک لمبی چوڑی مسہری کے نرم و گداز بستر پر پایا۔ اس کے قریب ایک نوجوان عورت کھڑی تھی۔ اس کی عمر چوبیس، پچیس برس سے زیادہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اس کے رخساروں پر چیری کا گلابی رنگ تھا۔ وہ ایک صحت مند اور جاق دھو بند عورت تھی۔ دروازہ قند تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی تھی۔ جمیل کی سی بڑی بڑی آنکھوں میں بڑی گہرائیاں تھیں۔

اس عورت کو دیکھ کر اس کے دل میں خوف سی لہر اٹھی۔ وہ اس وقت ایک حریت پسند عورت کی قید اور اس کے رحم و کرم پر تھا۔ اس کی وردی اس کا تعارف تھی۔ اس وادی کی ہر عورت ’لڑکی‘ بوڑھی، بچہ، نوجوان اور مرد اس کی فوج کے بدترین دشمن تھے۔ خون کے پیاسے تھے۔ آج ایک دشمن کی عورت اس کی نظروں کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس گھر میں اس عورت کے سوا کوئی اور نہیں ہے اور پھر اس عورت کی نگاہ میں اس کے لئے نفرت اور تحارت بالکل بھی نہ تھی۔

## انتخاب

گزارشات  
ایک معروف

قانون دان عدالت

میں اپنے موکل کے حق میں دلائل کے انبار لگا رہے تھے۔ جب قانون دان کو دلائل پیش کرتے ہوئے چار گھنٹے ہوئے تو جج نے تنگ آ کر قانون دان سے کہا۔

”کیا فاضل وکیل یہ بتائیں گے کہ وہ کب تک اپنا شغل جاری رکھیں گے؟“  
وکیل نے برجستہ جواب دیا۔

”جناب والا! یہ تو فاضل عدالت پر منحصر ہے کہ وہ کتنی دیر میں اس نکتے کو سمجھتی ہے۔ ویسے ایک اور جج صاحب پانچ منٹ میں میری گزارشات کو سمجھ سکتے تھے۔“

### حق خدمت

ایک شخص کو شہر کے سب سے بڑے شعبہ جاتی اسٹور سے قیمتی اشیاء چوری کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ ضمانت پر رہا ہو کر اس نے ایک وکیل صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ وکیل صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ وکیل صاحب نے ایف آئی آر کا مطالعہ کرنے کے بعد سنجیدگی سے کہا ”میں دو شرائط پر آپ کا دفاع کر سکتا ہوں“ آپ کو مجھے یقین دلانا ہوگا کہ آپ بے گناہ ہیں اور یہ کہ مجھے دو ہزار روپے فیس کے طور پر ادا کریں گے۔“

مُزِم نے چند لمحے غور کیا اور بولا: ”میں آپ کو پندرہ سو روپے اور ایک سیکو گٹری پیش کر سکتا ہوں جو میں نے اس اسٹور سے دو ماہ پہلے اڑائی تھی۔ اب بتائیے کیا آپ میرا دفاع کریں گے؟“

”لیکن میں آپ کا مہمان کیسے ہو گیا۔“  
اس نے کہا۔ ”میں دشمن ہوں۔ فوج کا ایک افسر ہوں۔ ہماری فوج آپ کی قوم کے جوانوں کو موت کے گھاٹ اتار رہی ہے۔“

”ہر وہ شخص ہمارا مہمان ہوتا ہے جو گھر میں داخل ہو جاتا ہے۔ چاہے وہ شخص فوج سے یا ہمارے دشمن سے تعلق رکھتا ہو۔“ اس عورت نے جواب دیا۔

”نہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ نے مجھے قیدی بنا کر رکھ لیا ہے۔“ وہ بولا۔ ”پھر آپ مجھے مجاہدین کے حوالے کر دیں تاکہ وہ فوج سے سو دے بازی کر سکیں۔“

”آپ مسلمانوں کو نہیں جانتے ہیں اور نہ ہی آپ نے مسلمانوں کی تاریخ پڑھی ہے، ورنہ یہ بات آپ نہیں کہتے۔“ وہ عورت کہنے لگی۔ ”مسلمان کسی بھی خطے کا کیوں نہ ہو وہ اپنے گھر آئے ہوئے مہمان کو بہت عزت اور تعظیم دیتا ہے۔ ہمارا مذہب بھی یہی درس دیتا ہے۔ آپ میرے گھر کے اندر بے ہوش پڑے ہوئے تھے، گھر میں داخل ہو چکے تھے اس لئے آپ میرے مہمان ہوئے۔ آپ قید میں نہیں ہیں۔ نہ میں آپ کو مجاہدین کے حوالے کروں گی۔ آپ اس گھر میں جب تک قیام کریں گے اس وقت تک مہمان رہیں گے کسی کی مجال نہیں کہ آپ سے کچھ کہے۔ آپ پر انگلی اٹھائے۔“

پھر وہ عورت دودھ کا گلاس لے کر اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد آئی تو اس کے ہاتھ میں دو ابلے ہوئی انڈے اور دودھ کا گلاس تھا۔ جس وقت وہ انے کھا کر دودھ پی رہا تھا، اندر سے عورت اس کی قمیض لے کر آئی۔ وہ دھلی ہوئی اور صاف لگ رہی تھی۔ عورت نے قمیض کو کرسی پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بہت میل ہو گئی تھی، میں نے اسے اچھی طرح دھویا ہے۔ یہ سوکھ بھی گئی ہے۔ ذرا سی نم بھی ہے۔ تھوڑی دیر میں سوکھ بھی

جائے گی۔“

گھٹی سے بنی ہوئی تھیں۔ اس لئے اس میں سے خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس نے خوب سیر ہو کر کھایا کیونکہ اسے لبا سفر کرنا تھا۔

اس نے نہ چاہتے ہوئے پوچھا۔ ”اس وقت وادی کے حالات کیا ہیں۔ کیونکہ مجھے اس وادی میں آئے ہوئے تیسرا چوتھا دن ہے۔“

”وہی حال جو برسوں سے چلا آ رہا ہے۔“ عورت کہنے لگی۔ ”آپ کی فوج نے ہماری وادی کے چپے چپے پر قبضہ کر رکھا ہے۔“

وہ سمجھ گیا کہ یہ عورت کس لئے اس کے ساتھ اخلاق اور نرمی سے پیش آ رہی ہے۔ خاطر مدارات کر رہی ہے۔ اس لئے کہ اس کی فوج کی ہیبت اس کے دل پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اس نے بڑے متکبرانہ انداز سے کہا۔ ”جب بھی ہماری فوج نے اس علاقے کا محاصرہ کیا، آپ ان سے میرا نام لے دیں۔ میں آپ کو اپنا کارڈ دوں گا۔“

وہ دکھادیں، پھر کوئی آپ سے کچھ نہیں کہے گا۔ آپ کے ساتھ عزت کا سلوک کیا جائے گا۔“

عورت اس کی بات کی تہ میں پہنچ کر بولی۔ ”ہم مسلمان کسی کے ساتھ مہمان نوازی اس لئے نہیں کرتے کہ وہ اس کا صلہ کسی احسان کی شکل میں دے اور پھر ہم ایک ایسے شخص سے کسی احساس اور بھلائی کی توقع نہیں کرتے ہیں اور نہ خواہشمند ہوتے ہیں کہ اس کی نظر کرم ہو۔ مجھے کسی نرمی اور رعایت کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”معلوم نہیں کس لئے آپ لوگوں کو اپنی ذات پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے۔ آپ کی قوم اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتی نہیں ہے۔“ وہ شدید حیرانی سے بولا۔ ”کیا آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ ہماری فوج کی تعداد کتنی ہے۔۔۔۔۔ وہ کس قدر طاقتور اور مضبوط ہے۔ حریت پسند ہمیں یہاں سے نکالنے میں اب تک کامیاب نہ ہو سکے۔“

”ہم گھمنڈ اور تکبر بالکل بھی پسند نہیں کرتے ہیں کیونکہ اللہ کو یہ بات بالکل پسند نہیں

جب وہ انڈے کھا کر دودھ پی چکا تو وہ ٹرے اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”اب آپ آرام کریں۔ مجھے اجازت دیں تاکہ میں آپ کے لئے ناشتا تیار کر لوں۔ آپ سو جائیں تو بہتر ہے کیونکہ آپ کی آنکھیں سو جی ہوئی ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ آپ ساری رات ایک پل کے لئے بھی نہیں سوئے ہیں۔“

”آپ میرے لئے کوئی تکلف اور اہتمام نہ کریں۔“ اس کے چہرے پر عداوت کی سرخی پھیل گئی۔ ”اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں اپنے جسم میں اتنی طاقت اور توانائی محسوس کر رہا ہوں کہ اپنا سفر جاری رکھ سکوں۔ وہ انڈوں اور دو گلاس دودھ نے میری ساری تھکن دور کر دی ہے۔ مجھے اجازت دیں۔“

”آپ اس طرف کیسے آئیں گے۔۔۔۔۔“ عورت نے متعجب ہو کر پوچھا۔ ”کیونکہ یہ جگہ ایک ویرانے میں ہے۔ یہاں قریب میں کوئی بستی بھی نہیں ہے۔“

”میں کل شام اپنے ایک ماتحت کے ساتھ اس وادی کی سیر کو نکلا تھا۔ وہ راستے میں ایک مجاہد کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ میں کیپ کی طرف جاتے ہوئے راستہ بھول گیا۔“

”آپ کو ایک لبا سفر ملے کرنا ہے۔ آپ بغیر کھائے پئے جائیں گے تو راستے ہی میں تھکن سے برا حال ہو جائے گا۔ میں ناشتا تیار کئے لیتی ہوں۔“

معلوم نہیں وہ کتنی دیر تک گہری نیند سوتا رہا تھا۔ اسے عورت نے بیدار کیا۔ جب وہ بیدار ہوا تو اس نے اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کیا۔ سونے کی وجہ سے بہت فائدہ ہوا تھا۔ عورت نے دسترخوان پر ناشتا چنا ہوا تھا۔ ناشتے میں بہت کچھ تھا۔ مٹھن، بالائی، پراٹھے، تلی ہوئی مرغی، آلیٹ اور انڈوں کا حلوہ یہ ساری چیزیں اصلی

اشارے پر تخریبی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ آپ کیوں اور کس لئے علیحدگی پر تخریبی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ آپ کیوں اور کس لئے علیحدگی پسندی کی تحریک کو ہوا دے رہے ہیں۔ جبکہ ہمارے ملک کا انٹانگ ہے۔ ایک ریاست ہے۔ کیا اس وادی کے لوگ اپنا قیمتی وقت زندگی اور مستقبل تباہ و برباد نہیں کر رہے ہیں۔ کیا ایک مسلمان کے لئے یہ بات شایان شان ہے اور بہادری کی ہے کہ میرے ماتحت کو چھپ کر گولی مار دی گئی۔“

”یہ سرزمین ہماری اپنی ہے۔“ عورت جو اس کی باتیں بڑے غور ضبط اور تحمل سے سن رہی تھی، ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”ہم ایک الگ قوم ہیں، ہمارا دین، ایمان آپ لوگوں سے الگ ہے۔ اگر کسی اور قوم نے آپ کے ملک پر..... کسی نے آپ کے گھر پر قبضہ کر لیا اور آپ لوگوں کو باہر نکالنے کی کوشش کی تو کیا آپ اس بات کو برداشت کر سکیں گے..... کیا آپ اسے باہر نکالنے کی کوشش نہیں کریں گے..... آپ کے ماتحت کو اس لئے گولی ماری گئی تھی کہ وہ حملہ آور تھا۔ میدان جنگ میں تھا۔ جنگ اسی طرح لڑی جاتی ہے۔ کوئی حریف سامنے آ کر اپنے حریف کو نشانہ نہیں بناتا ہے۔“

وہ لا جواب ہو کر خاموش ہو گیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ ایک معمولی سی عورت ایک ایسی بات کہہ دے گی کہ اس کی زبان پر مہر لگ جائے گی۔ اب اسے احساس ہوا تھا کہ یہ عورت کوئی معمولی نہیں ہے۔ اس سے جیتنا اور بحث کرنا مشکل ہے کیونکہ اس عورت کے پاس ہر بات کا مدلل جواب موجود ہے۔

اسی اثناء میں اس نے مکان کے عقبی حصے میں آ آئیں اور بہت سارے لوگوں کی آوازیں سنیں۔ وہ بلند آواز میں کلمہ پڑھ رہے تھے۔ اس نے چونک کر حیرت اور خوف سے عورت کی

ہمیں اللہ کی ذات پر پورا بھروسہ اور توکل ہوتا ہے۔ کاش! آپ نے ہماری تاریخ پڑھی ہوئی..... مسلمان کبھی ساز و سامان اور دشمن کی تعداد سے خائف نہیں ہوا۔ اس نے اپنے سے دگنی، تینگنی اور چوگنی تعداد کے دشمن کو شکست فاش دی ہے۔ آج بھی تاریخ اس کی گواہ ہے..... اس وقت اس بحث سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ صرف سختی اور بد مزگی پیدا ہوگی۔ ہم مہمانوں کی بہت عزت اور احترام کرتے ہیں اور ان کی دل آزاری نہیں چاہتے ہیں۔ میں ایک میزبان ہونے کے ناطے یہ نہیں چاہوں گی کہ آپ دل میں ناگواری سی محسوس کریں۔ میں آپ کا لحاظ اور خاطر مدارت اس لئے اور اس خوف سے نہیں کر رہی ہوں کہ آپ ایک فوجی افسر ہیں۔ یہ کشمیری چائے پینے کی عہدہ ہے۔“

”ہاں..... یہ چائے بہت عمدہ ہے۔“ اس نے یکے بعد دیگرے دو گھونٹ لینے کے بعد تعریفی لہجے میں کہا۔ ”میں نے دارجلنگ کی چائے بھی پی ہے لیکن اس چائے کی سی بات میں نے آج تک کسی چائے میں نہیں پانی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ وادی کے پسماندہ اور دور دراز علاقے کی دیہاتی عورت اتنے اچھے عمدہ اور لذیذ کھانے پکالتی ہے۔ ذائقہ بھی خوب ہے۔ اصل بات ذائقے کی ہوتی ہے جو ہر عورت کے ہاتھ میں نہیں ہوتا ہے۔“

”آپ کی زبان سے تعریف سن کر مجھے اپنی محنت وصول ہوئی ہے۔ آپ ایک فوجی ہوتے ہوئے بھی کھانے کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں۔“

”آپ لوگوں نے جو خود مختاری اور ایک آزاد مملکت کے لئے جو جنگ شروع کر رکھی ہے، اسی آپ لوگ حریت پسند تحریک کا نام دیتے ہیں۔“ اس نے موضوع بدلا۔ ”کیا یہ دہشت گردی نہیں ہے کہ اس تحریک کی آڑ میں کسی کے

مردوں میں شمار نہیں کرتے ہیں۔“ عورت نے دل دہلا دینے والے سکون سے کہا۔

”سچ پوچھئے تو میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی عظیم بہن اور عورت کے بارے میں سنا نہ دیکھا..... آپ لوگ اپنے مذہب پر کیسا پختہ ایمان رکھتے ہیں۔“

”اصل چیز یقین ہے..... یہ یقین اللہ کی ذات پر ہوتا ہے یہ یقین ہوتا ہے جس سے دشمن دہل جاتا ہے۔“

”مجھے ان کی موت سے بڑا صدمہ ہوا ہے۔ اس لئے کہ آپ کے بھائی تھے۔ میں ایک مہمان کی حیثیت سے اپنے دلی صدمے کا اظہار کر رہا ہوں۔“

”جنگ اور محبت میں ہر چیز جائز ہوتی ہے۔“ عورت کہنے لگی۔ ”بڑے صدمات سہنے پڑتے ہیں۔ نقصانات اٹھانا پڑتے ہیں۔ جنگ یقیناً بہت بری چیز ہے، لیکن اس کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ اصول ہوتے ہیں لیکن آپ لوگوں نے تمام اصولوں کو روند دیا، پامال کر دیا۔ ہلاکو اور چنگیز خان کی روجوں کو بھی شرمندہ کر دیا..... جنگ میں بڑی قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ وہ ہم دے رہے ہیں، ہماری ماؤں کی گودیں خالی کی جا رہی ہیں، بہنوں کے سہاگ اجاڑے جا رہے ہیں، ہماری عورتوں کی عزتیں محفوظ نہیں رہی ہیں۔ نہتے فوجوانوں کو بھون دیا جاتا ہے۔ ہمارے خون سے ہماری ہی سرزمین سرخ کی جا رہی ہے..... درندگی اور بربریت کی ایک نئی تاریخ مرتبہ کی جا رہی ہے۔ اس کے باوجود ہم منزل کی جانب رواں دواں ہیں..... آخری سانس تک رہیں گے۔“

”مجھے اس بات سے خوف آ رہا ہے کہ آپ کے بھائیوں کے ساتھیوں اور دوستوں نے مجھے ان کا قاتل سمجھ لیا تو وہ مجھے.....“

”اگر آپ ان کے قاتل بھی ہوئے تو

طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ایسے ایسا لگا تھا کہ دس بارہ مجاہدین اس مکان کے عقبی حصے میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس کے سارے بدن میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔ عورت کمرے سے نکل کر دروازہ بند کر کے گئی۔ اگلے لمحے واپس آ کر اس نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ پھر وہ اس سے بولی۔ ”میرے چار جوان بھائیوں کو کل شام نماز کی حالت میں دشمن نے شہید کر دیا۔ ان کے دوست اور ساتھی ان کی مقبریں لے کر آئے ہیں۔ میں اپنے عظیم بھائیوں کا دیدار کر آؤں..... انہیں سلام کر آؤں..... خوش آمدید کہوں۔ کتنے عظیم ہیں میرے بھائی کہ انہیں شہادت نصیب ہوئی ہے۔ ان کی شوق شہادت کی تمنا پوری ہوئی..... اللہ کی بارگاہ میں ان کی دعا میں مستجاب ہوں۔ فرشتے بھی انہیں سلام کرنے اور ان کی روجوں کو لے جانے کے لئے آئے ہوں گے کیونکہ وہ اللہ کی راہ میں..... آزادی کی راہ میں شہید ہو گئے۔ انہوں نے اپنی بڑی بہن کو کیسی عزت، کیسا عظیم رتبہ اور اعزاز دیا ہے۔ آج انہوں نے مجھے سرخرو کر دیا ہے۔ ایسی عظیم سعادت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی ہے۔“

وہ بھونچکا سا ہو گیا۔ اسے یقین نہیں آیا۔ یہ عورت بڑے وقار اور تمکنت سے کھڑی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا، کہیں یہ عورت صدمے سے یا گل تو نہیں ہو گئی ہے۔ نہیں یہ یا گل نہیں ہوئی تھی۔ پاگل پن کی کوئی علامت اس کے بشرے اور آنکھوں سے ظاہر نہ تھی۔ وہ تھیر زدہ لہجے میں بولا۔ ”آپ کے جوان بھائیوں کو شہید کر دیا گیا، لیکن آپ کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔ چہرے پر ملال تک نہیں ہے۔ کیا آپ کو ان کی موت پر کوئی صدمہ نہیں ہوا ہے۔“

”اس لئے کہ وہ مرے نہیں زندہ ہیں۔ شہید مرتے نہیں، زندہ رہتے ہیں۔ ہم انہیں

## اندازِ فکر

ایک چوبہا اپنے تین  
نٹھے سنے بچوں کے  
ساتھ شام کی سیر کو نکلی  
کہ ایک بلی سامنے

سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس سے پہلے کہ بلی ان کی  
طرف جھپٹتی، چوبہا اپنی پوری طاقت سے چلائی۔

”بھول بھول..... بھول بھاؤں۔“

بلی ہکا بکارہ گئی اور اپنے قدموں واپس دوڑ گئی۔  
چوبہا نے اپنے بچوں سے کہا۔

”اب تم جان گئے ہو گے کہ اپنی مادی زبان سیکھنے  
کے علاوہ بھی کوئی اور زبان سیکھنا کتنا ضروری ہے۔“

خو لصورت باتیں

☆ جس طرح موسم بدلنے کا ایک وقت مقرر  
ہوتا ہے اسی طرح کے وقت کے بدلنے کا بھی ایک موسم  
ہوتا ہے حالات بدلتے ہی رہتے ہیں۔ حالات کے  
ساتھ حالت بھی بدل جاتی ہے۔ رات آجائے تو نیند بھی  
کہیں سے آئی جاتی ہے۔ وہ انسان کامیاب ہوتا ہے  
جس نے انتہاء کی تاریکیوں میں امید کا چراغ روشن  
رکھا۔ اور اُمید اس خوشی کا نام ہے جس کے انتظار میں غم  
کے ایام بھی کٹ جاتے ہیں امید کسی واقعہ کا نام نہیں  
ہے۔ یہ تو صرف مزاج کی ایک حالت ہے۔ قدرت  
کے مہربان ہونے پر یقین کا نام اُمید ہے۔

☆ انسان پریشان اس وقت ہوتا ہے  
جب اس کے دل میں کسی بڑے مقصد کے حصول کی  
خواہش ہو لیکن اس کے مطابق صلاحیت نہ ہو۔ سکون  
کے لیے ضروری ہے کہ یا تو خواہش کم کی جائے یا پھر  
صلاحیت بڑھائی جائے۔ ہر خواہش کے حصول کے لیے  
ایک عمل ہے۔ عمل نہ ہو تو خواہش ایک خواب ہے۔ ہم  
جیسی عاقبت چاہتے ہیں، ہمیں دیکھا ہی عمل کرنا چاہیے۔  
کامیابی تو ہے ہی محنت کرنے والوں کے لیے۔

گھبرا ئیں نہیں..... آپ میرے گھر میں بالکل  
محفوظ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مہمانوں کے ساتھ  
کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ کوئی آپ کی طرف آنکھ  
اٹھا کر نہیں دیکھے گا..... میں آپ پر آج نہیں  
آنے دوں گی۔ ان میں سے کوئی جذباتی ہوا تو  
میں اسے گولی مار دوں گی۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ لوگ اس  
قدر مہمان نواز واقع ہوئے ہیں۔ میں آپ کو  
یقین دلانا ہوں کہ ہماری فوج جیسی اس علاقے کا  
رخ نہیں کرے گی۔“

”یہ علاقہ ایک ایسی جگہ پر ہے کہ کسی کے  
خواب و خیال میں اس کی موجودگی نہیں آ سکتی  
ہے۔ اس کے دامن میں ایک بہت بڑی آبادی  
بھی ہے جو دنیا کی نظروں سے اوجھل ہے۔  
یہاں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی ہے۔ غلطی سے ادھر  
دشمن آ گیا تو وہ زندہ بچ نہیں پاتا ہے۔ بڑی  
بھول بھولیاں ہیں۔ اس لئے ہمیں فوج سے کوئی  
خطرہ نہیں ہے۔ نہ ہی کسی سفارش کی ضرورت  
ہے۔ ہم دشمن سے بھی زندگی کی بھیک نہیں مانگتے  
ہیں۔ صرف ایک ایسا راستہ تھا جس سے آپ  
اس علاقے سے نکل کر شمال کی طرف جاسکتے  
ہیں۔ شمال میں آپ کے دیکمپ تھے۔ رات  
انہیں مجاہدین نے اڑا دیا۔“

”مجھے جلدی سے یہاں سے نکال  
دیجئے..... کہیں ایسا نہ ہو کہ اندر سے کوئی  
آجائے۔ مجھے دیکھ کر بھول کر رکھ دے۔“ وہ  
دہشت زدہ ہو کر بولا۔

”آپ میرے گھر اور میرے علاقے میں  
بالکل محفوظ ہیں۔ جب میں آپ کو اپنے گھر اور  
علاقے میں زندگی کی ضمانت دے رہی ہوں تو  
آپ خوفزدہ کیوں ہو رہے ہیں۔ اس علاقے  
میں ایک جوان لڑکے کو اس کے کسی دوست نے  
کسی بات پر طیش میں آ کر قتل کر دیا تھا۔ پھر اس  
نے اس لڑکے کے ہی گھر پناہ لے لی۔ بیس برس

ساتھ کوئی چال تو نہیں چلی جا رہی ہے۔ ایسی بات نہ تھی۔

وہ عورت ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک پہاڑی پر رک گئی۔ پھر وہ اسے اشارہ سے بتاتے لگی۔ ”میرا علاقہ یہاں سے ایک فرلانگ پیچھے رہ گیا ہے۔ اب ہم دوسرے علاقے میں کھڑے ہیں۔ اب تم نہ میرے مہمان ہو اور نہ میں تمہاری میزبان..... تم اس وقت صرف اور ایک فوجی اور دشمن ہو..... میرے بھائیوں کے قاتل ہو۔“

”یہ بات آپ اتنے وثوق اور یقین سے کیسے کہہ سکتی ہیں کہ میں آپ کے بھائیوں کا قاتل ہوں۔ انہیں کسی اور فوجی نے گولی ماری ہوگی۔“

”جس وقت تم بے ہوشی کی حالت میں تھے میں نے تمہاری رائفل اور گولیاں چیک کی تھیں۔ میرے شہید بھائیوں کے جسوں سے تمہاری رائفل کی گولیاں نکلی ہیں۔“

اس نے اپنا بایاں ہاتھ چادر سے باہر نکالا۔ اس کی مٹھی میں رائفل کی گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ باہر نکالا تو اس میں ایک ریلو اور تھا۔ وہ سرد سفاک لہجے میں بولی۔ ”اگر تم میرے جوان بھائیوں کو نماز کی حالت میں شہید نہ کرتے تو شاید میں تمہیں معاف کر دیتی کہ جنگ اور محبت میں ہر چیز جائز ہے..... لیکن تم نے بزدلی کا ثبوت دیا جو ایک فوجی کے شایان شان نہیں۔ میرے اس ریلو اور میں صرف چار گولیاں ہیں۔ یوں تو تمہارے لئے ایک گولی کافی ہے لیکن میں تمہیں ہر ایک بھائی کا نام لے کر گولی ماروں گی تاکہ اپنے ایک ایک بھائی کا انتقام لے سکوں۔“

پھر اس کا ریلو اور شعلے اگلنے لگا۔

تک وہ اس گھر میں بالکل محفوظ رہا۔ وہ طبعی موت اسی گھر میں مرا۔ لہذا آپ کو پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔“

”اچھا تو پھر آپ مجھے اجازت دیں۔“ اس نے اپنی بندوق اور بیگ سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو اپنے بھائیوں کی آخری رسومات بھی تو ادا کرنا ہیں۔“

”چند لمحے صبر کیجئے.....“ وہ بولی۔ ”میں چادر اوڑھ کر آتی ہوں تاکہ آپ کو وہ راستہ دکھلا دوں جو شمال کی طرف جاتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ بھول بھلیوں میں پھنس جائیں۔ پھر کوئی حریت پسند آپ کو نشانہ بنادے..... پھر آپ کی لاش پڑی سڑتی رہے گی۔“

وہ اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد آئی تو اس نے اپنے آپ کو کالی چادر میں چھپایا ہوا تھا لیکن چہرہ بے نقاب تھا۔ وہ اسے لے کر مکان سے باہر نکلی۔ اس نے عورت کے چہرے کی طرف دیکھا۔ شاید وہ اپنے بھائیوں کے جس صدمے کو دل میں دبائے ہوئے ہے چہرے سے عیاں ہو جائے۔ آنکھوں سے جھلک جائے لیکن ایسی کوئی بات اس کے بشرے سے ظاہر نہیں تھی۔ البتہ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی دکھ تھی۔ آنکھوں میں چمک سی تھی جیسے اس نے بہت کچھ پالیا ہو..... اس کے دل میں شک کی لہر اٹھی۔ اس عورت نے جھوٹ بولا ہے کہ وہ چاروں لڑکے اس کے بھائی ہیں۔ یہ عورت ہر گز ان کی سگی بہن نہیں ہے۔ وہ سگی بہن ہوتی تو صدمے سے نڈھال ہو جاتی۔ ان کی موت کا ماتم کرتی۔ اسے گولیوں سے بھون کر رکھ دیتی۔

عورت اسے مکان سے باہر لے کر نکلی۔ عورت اس کے آگے آگے چلی جا رہی تھی۔ اس کی چال میں بڑی حکمت تھی۔ وقار تھا۔ اس نے چلتے چلتے کئی بار مڑنے کے دیکھا تھا کہ کہیں کوئی اس کے نقاب میں غور نہیں آ رہا ہے۔ اس کے

# پراسرار سینیہ سالیہ

ایم الیاس

ایک نوجوان کے گرد گھومتی ہوئی کہانی جس میں دو شیرہ کے حسن و عشق اور ہیجان خیز پر شباب اور گداز بدن کی حشر سامانیاں بھی ہیں ایک نوجوان دو شیرہ نے کس طرح اس کے جذبات اور خواہشات سے کھیلنا چاہا۔ بنگال اور آسام کے پس منظر میں لکھی ہوئی کہانی جو آج کل لکھی نہیں جا رہی ہیں۔ ایم الیاس نے اس کہانی کے جوتانے بانے بنے ہیں وہ آپ کو کچھ حیرت کر دیں گے اور آپ عیش عیش کر اٹھیں گے۔

نہایت حیرت انگیز، سنسنی خیز، پراسرار اور بے حد دل چپ کہانی جس کی سطر سطر آپ کو نہ صرف چونکا دے گی بلکہ روٹنے لڑے کر دے گی

ہم دونوں نے امیر کبیر گھرانوں کے لڑکوں سے ہم مذہب ہونے کے باوجود ان سے دوستی اس لیے نہیں کی تھی کہ ان میں دولت مند ہونے کا غرور اور جھمنڈ تھا۔ وہ امیر ہندو لڑکوں کی دوستی سے خوش اور نازاں تھے۔ یہی حال مسلمان لڑکیوں کا تھا جو امیر گھرانوں کی ہندو لڑکیوں سے دوستی کرنا فخر کی بات سمجھتی تھیں۔ ہمیں مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں سے دوستی سے فخر یا خوشی کی بات نہیں تھی۔ ہم دونوں کی دوستی پروان چڑھتی رہی۔ ہم نے اپنی ساری توجہ اور دل چسپی تعلیم

**میری** اور سیم کی دوستی کا آغاز اسکول کے زمانے سے ہوا تھا۔

ہم دونوں پانچویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ہم دونوں کا شمار ذہین اور باصلاحیت طالب علموں میں ہوتا تھا۔ اسکول میں نہ صرف ہندو لڑکے اور لڑکیاں بھی تھیں بلکہ مسلمان لڑکے بھی۔۔۔ مسلمان لڑکیوں کی تعداد صرف آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ وہ صرف بڑے گھرانوں سے تھیں۔ صرف بڑے گھرانوں کی لڑکیاں ہی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔





تک محدود رکھی تھی۔ کبھی ان سے دوستی کا خیال تک نہیں لایا تھا۔ پھر ہم دونوں نے ایک ساتھ ہی گریجویشن کیا تھا۔

ہم نے ملازمت کے حصول کے لیے بہت کوشش کی۔ ملک شہر میں بے روزگاری تھی۔ اگر روزگار ملتا بھی تھا تو ہندوؤں کو۔۔۔ کیوں کہ وہ انگریزوں کے بچوں کی اولاد تھی اور انگریزی مزاج مسلمانوں سے بہت نفرت کرتے اور خار کھاتے۔۔۔

البتہ مسلمان کے بڑے گھرانوں کے لڑکوں کو ملازمت مل جاتی تھی۔ کیوں کہ وہ انگریزوں کے غلام اور با حیثیت اور دولت مند تھے۔ متوسط طبقے کے مسلمان لڑکوں کو ملازمت کے لیے بڑے پاپڑ بیٹنے پڑتے تھے۔ نسیم ایک برس تک ملازمت کی تلاش میں خوار ہوتا رہا۔ جب اسے کہیں بھی کسی بھی محکمے میں ملازمت نہیں ملی تو اس نے ایک دن مجھ سے کہا کہ وہ شیلانگ میں ملازمت کی کوشش کرے گا۔ شاید اسے وہاں ملازمت مل جائے، شیلانگ پہنچنے کے دو ماہ بعد اسے ایک بینک میں ملازمت مل گئی۔ پھر اس نے مجھے خط لکھا کہ میں شیلانگ آ جاؤں تو مجھے بھی ملازمت مل سکتی ہے۔

میں شیلانگ اس لیے نہیں جاسکتا تھا کہ میں اپنی بیوہ اور بیمار ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کی مانتا اور بیماری میری ترقی کی راہ میں بڑی زبردست رکاوٹ تھی۔ میں خود غرض، بے پروا اور بے حس نہیں تھا کہ ماں جیسی عظیم ہستی کو مرنے اور حالات کے پھیڑوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔ دنیا میں ماں سے بڑی نعمت اور دولت کوئی نہیں ہے۔ ماں کی مانتا میرے لیے کسی انمول خزانے سے کم نہیں تھی۔ کوئی ایک برس کے بعد میری ماں کا طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا تو میں ان کی محبت، شفقت اور مانتا کے گھنے سائے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم اور بے سہارا ہو گیا۔ مجھے اپنی دنیا بھر کی میری اور اجازت نظر آنے لگی۔ میں نہایت اداس اور ملین رہنے لگا۔

نسیم سے میری خط و کتابت کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری تھا۔ جب اسے میری والدہ کی وفات کی اطلاع ایک دوست سے پہنچی تو اس نے مجھے لکھا کہ میں فوراً ہی اس کے پاس چلا آؤں۔ گویا ڈوبنے کو سہارا اور اندھے کو پیدائی ملی تھی۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ ایک بینک میں آسانی خالی ہے۔ میں ایک بچے کے پاس بچگی کا کام کر رہا تھا۔ بچے کی نوجوان نہایت حسین اور کم سن دوشیزہ مجھ سے عشق کرنے لگی تھی اور مجھے آلودہ کرنے اور ہر ماہ اس شرط پر تن خواہ سے دینی رقم دینے کو تیار تھی کہ میں راتوں کو اس سے پر ملا کروں اور اسے خوش کیا کروں۔ میں کسی قیمت اور کسی صورت میں اپنے آپ کو آلودہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مجھے یہ بھی دھمکی دی ہوئی تھی کہ میں نے اس کی بات نہیں مانی تو وہ انتقام لے گی۔۔۔ اس لیے میں نے آسام جانے اور اس بچے کی ملازمت کو خیر باد کہنے میں ایک ہل کی بھی دیر نہیں کی۔ بنیادیوں بھی مجھے بہت کم تن خواہ دیتا تھا جس سے گزر بسر مشکل سے ہوتی تھی۔ میں نے ماں کے زیورات فروخت کر دیے۔ کیوں کہ انہیں سنبھال کر رکھنا بہت مشکل تھا اور اس کی چوری کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ کوئی قابل اعتماد ایسا نہیں تھا جس کے پاس زیورات امانت رکھواسکوں۔

نسیم بہت خوش ہوا اور اس کی خوشی قابل دید تھی اور اس کے توسط اور سفارش سے مجھے ایک بینک میں ملازمت مل گئی تھی۔ اتنی اچھی اور ایسی ملازمت کی توقع نہیں تھی۔ نسیم کی محبت میں نہ صرف دو چننا اضافہ ہو گیا تھا بلکہ اس نے میری دل جوئی اور ہر طرح سے خیال رکھنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اس کے مکان میں تین کمرے تھے۔ اس نے مجھے رہائش کے لیے اوپر والا کمرہ دے دیا تھا۔ مگر میں یہاں آ کے ایک نئے مسئلے سے دوچار ہو گیا۔ اس کی وجہ نسیم کی آسانی بیوی ساحرہ تھی۔

ساحرہ آسانی حسن و جمال کا ایک نادر نمونہ تھی۔ وہ ایک پرکشش عورت تھی۔۔۔ ایک غریب

ماں باپ کی بیٹی تھی لیکن وہ اپنی اوقات پھول چکی تھی اور وہ ایک بد مزاج، پھوپھڑ اور تند خور عورت تھی۔ اس کی ایک چھوٹی بہن راہانہ تھی۔ ساحرہ چاہتی تھی کہ میں اس سے شادی کر لوں۔ میں اس سے شادی کر لیتا لیکن میں نے اس کی باتوں اور حرکات و سکنات سے صاف محسوس کر لیا تھا کہ وہ ایک خود سر لڑکی ہے۔ اس کے علاوہ اسے گھر کے اور خاندان داری سے ذرہ برابر بھی دل چسپی نہ تھی۔ اس کے خواب بہت اونچے تھے۔ میں ایک ایسی لڑکی سے شادی کر کے گھر کیسے بسا سکتا تھا جو ایک رنگین تلی کی مانند ادھر ادھر اڑتی پھرتی تھی اور اس میں شرم و حیا دور دور تک نہ تھی۔ میں نے یہ کہہ کر ساحرہ کو ٹال دیا تھا کہ ابھی میرا ارادہ شادی کرنے کا نہیں ہے۔

وہ میری اور نسیم کی محبت اور دوستی سے بدظن ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ میرے ساتھ سرد مہری سے پیش آتی تھی اور اس کا سلوک بھی حقارت آمیز ہوتا تھا۔ اس کے برعکس نسیم کا رویہ انتہائی محبت آمیز تھا اور اس کی ہر ممکن یہ کوشش ہوتی تھی کہ میں اس کی بیوی کی باتوں کا قطعی برانہ مانا کروں۔ اس کی باتیں اس کان سے سنوں اور اس کان سے نکال دوں۔

ایک دو دفعہ ساحرہ نے اپنی بہن کو نسیم کی غیر موجودگی میں ایسی بے جا جابی کی حالت میں میرے کمرے میں بھیجا تھا کہ میں اس کے حسن و شباب کے جادو میں جکڑ کر رہ جاؤں۔ میں ایک مرد تھا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ میری بیوی حسین نہ سہی شوہر پرست اور سیدھی سادی بھی ہو۔ سکھڑ اور خوب صورت بھی ہو۔ وہ اپنی بہن سے نہ صرف بہت حسین تھی اور بے پناہ رنگین بھی، اس کا سراپا بھی بڑا خوب صورت اور نمکنی خیز تھا۔ لیکن اس آوازی نے اس کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ میں کبھی کیسے نکل سکتا تھا۔ ایک روز وہ مجھ سے مایوس ہو کر کسی شادی شدہ مرد کے ساتھ بنکا گئی۔

ساحرہ کی بد مزاجی کم ہونے کے بجائے اور بدھتی چلی گئی۔ گھر کی فضا میں تلخیاں طفتی گئیں۔ میں

نسیم سے کہا بھی کہ میں ایک کمرے کا مکان لے کر کرایہ پر رہ جاتا ہوں۔ لیکن اس نے میری ایک نہ مانی، نہ ہی مجھے کہیں اور رہنے کی اجازت دی ہر وقت کی بک بک سے بکھرا جاتا۔ میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ میں دفتر سے واپسی اور چھٹی والے دن اپنا دل بھلانے اور وقت گزاری کے لیے شہر سے باہر نکل جاتا تھا کہ میاں بیوی کو تنہائی میسر ہو اور سکون و اطمینان سے محبت میں ڈوبے رہیں۔

آسام بہت ہی زرخیز ملک ہے۔ میں جہاں جاتا تھا وہاں نشیب زاروں کی خوش گوار تنہائیوں۔۔۔ پر سرور خاموشیوں اور سحر آمیز یکسوئیوں میں بیٹھ کر ہری بھری وادیوں کے قدرتی حسن و خط انھاتا اور ان میں کھو جاتا اور یہاں کی بیلوں سے لدی ہوئی خوب صورت جنگل میں سکون ہی سکون روح تلاش کرتا۔ ساگودانہ کے تناور اشجار اور پاری کی طرح دار درخت میرے ساتھی ہوتے اور میں اس وقت میزے کی نرم نرم آغوش کو آغوش مادری سمجھ کے ایک سکون سا محسوس کرتا۔ اس وقت ایک عجیب سی فرحت سے سرشار ہو جاتا۔

سواہ۔۔۔ شیلانگ سے ۱۸ کلومیٹر پر ایک ایسا گاؤں تھا جس کی خوب صورتی کے چرچے عام تھے۔ یہ جگہ مجھے دوسرے تفریحی مقامات سے زیادہ پسند تھی۔ یہ مقام گویا حسن و تجلیات کا منبج تھا۔ یہاں کے ذرے ذرے میں ایسی دل کشی اور جاذبیت تھی کہ وہ قدرت کا آئینہ دار معلوم ہوتی تھی اس کے اطراف و جوانب میں کوسوں تک بڑے کی روئیدگی کے لیے چوڑے دامن پھیلائے بشارت ریز تھی۔۔۔ جھیل نما چمکتی دکتی۔۔۔ رنگین شعاعوں سے کھلتی ہوئی سحر آفرین رنگینیاں بکھرتی تھیں جن کے کناروں پر لمبی لمبی تروتازہ گھاس پر چنیلے پروں والے جنگلی مرغ اپنے شوخ رنگ کے ساتھ سینہ تان کے نہایت خوش السانی سے بانگ دیتے اور بھی یونانی دیوتاؤں کی طرح حسین پروں کو ہوا میں پھیلا کر اڑنے لگتے۔۔۔ میں اکثر اتوار کے روز یہاں آتا تو

سر بڑا تھا۔ میں نے اسے ارادی طور پر اس لیے اٹھالیا تھا کہ اس میں پروں کو بھروں لیکن جب میں نے اس شغل سے فارغ ہو کے پر نکالے تو مجھے خیال آیا کہ یہ بھی ایک میرے جیسے کسی انسان کا سر ہوگا۔ یہ شخص اپنی زندگی میں اپنے سر کو کس قدر اونچا کر کے ادا کر کے چلتا ہوگا اور نہ معلوم اس کے دماغ میں کیا کیا سمایا ہوا ہوگا۔ انسانی زندگی کا ایسا دردناک انجام۔۔۔ ہم بھولے سے بھی اپنے اس انجام کے بارے میں نہیں سوچتے۔۔۔ میرا دل اندر سے بھج گیا اور میں دیر تک اس کا سر کو پکڑے اسرار عجیب پر غور کرتا رہا۔

دفعتاً مجھے ایک عجیب و غریب خیال آیا۔۔۔ امی جان! جب مجھے بچپن میں عجیب و غریب ڈراؤنی اور براسرار کہانیاں سنائی تھیں۔ تب وہ یہ بتایا کرتی تھیں کہ ہر انسان کی پیشانی کی ہڈی پر قسمت کا حال لکھا ہوتا ہے۔ اس تحریر کو پڑھنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ امی جان کی بات کا خیال آتے ہی میں نے فوراً ہی پیشانی کی ہڈی کو غور سے دیکھا۔

سچ بچہ پیشانی کی ہڈی پر کچھ حرف لکندہ تھے اور یہ حرف کسی نامعلوم زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا شاید یہ لکیریں ہڈی کے تڑخ جانے سے بن گئی ہوں۔ شاید یہ کوئی تحریر نہ ہو بلکہ مجھے بتو اور جسس ہوا تو میں نے دو اور کھوپڑیاں اٹھا کے ان کا معائنہ کیا۔ ان پر بھی پہلی کھوپڑی کی طرح کچھ مرقوم تھا۔ سب کا انداز تحریر ایک ہی تھا مگر حروف ہر ایک کے جدا جدا تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ان کی اپنی اپنی قسمت قدرے مختلف اور الگ تھی۔

میں تھوڑی دیر تک سوچ بچار کرنے کے بعد ان تینوں کھوپڑیوں کو ساتھ لے آیا۔ میں بچپن سے ہی پر جسس واقع ہوا تھا۔ جب کوئی نئی اور انہونی چیز میرے سامنے آئی تو اس کے بارے میں جاننے کے لیے میرا اشتیاق جنون اختیار کر جاتا تھا۔ میرے لیے فرصت میں ایک مشغلہ جیسے ہاتھ آ گیا تھا۔۔۔ میں روزانہ رات کے وقت تنہائی میں بیٹھ کے ان تحریروں

اس رومانی سر زمین اور خوب صورت خط و نشان تنہا بیٹھ کے قدرت کی صنائی کا مطالعہ کرتا۔ بعض اوقات میں یہ بھی دیکھتا تھا کہ کوئی جوڑا یہاں آئے ہوگا کہ اسے کسی بات کا ہوش نہ رہتا۔ جب میں انہیں دنیا و مافیہا سے بے نیاز اور طوفان کی زد میں لائے اور ان کی سی حالت اور حرکات کرتے دیکھتا، ہاں سے چل دیتا۔۔۔ عموماً ہندو طالبات اپنی مجبور حال کے ساتھ آ کے اپنی دوشیزگی بچھاؤ کر کے خوش ہوتی تھیں اور ساتھ میں وہ چادر یا چٹائی لا کے شام تک گویا بی مومن مانتے۔ گویا ان کا بہکنا اور لڑکیوں، عورتوں کا فطری حالت میں جو نظارہ ہوتا وہ اس قدر دل کش، رنگین اور کسی فلم کی طرح ہیجان خیز ہوتا تھا۔ میری جگہ شاید کوئی اور ہوتا تو ان سے محظوظ ہوتا۔ میں اس قماش کا نہیں تھا۔ کالج میں کچھ ہندو لڑکیوں نے، جن کا تعلق اونچے گھرانوں سے تھا مجھ پر مہربان ہونا چاہا اور چاہتی تھیں۔ اس لیے کہ میں ایک تو نہ صرف بہت خوب صورت، صحت مند، توانا مضبوط سینے اور بازوؤں کا تھا بلکہ میں کالج کے تمام لڑکوں میں سب سے دراز قد اور فٹ بال کا بہترین کھلاڑی بھی تھا۔ مسلمان لڑکیاں مجھے دیکھ کے آپہں بھرتی تھیں۔ اگر طبقاتی فرق نہ ہوتا تو وہ میری جھولی میں کسی کے پھل کی طرح گر جاتیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب آسامی قوم جو ہندو مذہب کے تھے ان لوگوں میں مردہ دفن کرتے یا جلانے کا رواج بالکل نہ تھا۔۔۔ یہ لوگ مردے کو آخری رسوم کی ادائیگی کے بعد کسی خوشنما گھنے بیڑ کے نیچے رکھ دیتے جہاں وہ جنگلی جانوروں کی خوراک بن جاتا تھا۔ مجھے اس بات پر سخت حیرت ہوتی اور دکھ بھی ہوتا تھا کہ وہ انسانی مردے کو جانوروں کی خوراک بناتے ہیں۔

ان بعض درختوں پر اکثر ڈھانچے بکھرے ہوئے اور شکستہ کھوپڑیاں پڑی ہوئی ملتی تھیں۔ ایک روز میں ایک خوب صورت وادی کے کنارے بیٹھا نسیم اور اس کی بیوی کے لیے سوچ رہا تھا کہ مجھے ایک

پردماغ سوزی کرنے لگا۔۔۔ میرے لیے وہ ایک معصہ تھے۔ میں نے اپنے کچھ دوستوں سے اس کا ذکر کیا اور ان کی توجہ مبذول کرائی لیکن وہ بھی کچھ سمجھ نہ سکے۔ یہ معصہ حمل نہ ہو سکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ نو ماہ کا عرصہ تیزی سے بیت گیا۔ اس دوران بینک کی جانب سے ایک منعقدہ تقریب میں میری ملاقات راحت سے ہوئی۔ اس کی عمر پچیس چھبیس برس کی ہو گی۔ وہ خوب صورت اور وجیہہ جوان تھا۔۔۔ اس کے والد تجارت پیشہ تھے۔ جب وہ دہلی سے تجارت کی غرض سے آئے تو انہیں آسام ہر لحاظ بہت پسند آیا کہ یہاں بڑا سکون ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی بلکہ دکان بھی خرید لی تھی۔

راحت نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دہلی میں محکمہ سراخ رسانی میں ملازم تھا۔۔۔ اس نے ایک بہت ہی حسین اور بے پناہ پرکشش بڑی لڑکی سے شادی کر لی۔۔۔ شادی کے بعد پتا چلا کہ وہ تپ دق کی مریضہ ہے۔ وہ صرف دو برس علاج معالجے سے زندہ رہی پھر دارفانی سے کوچ کر گئی۔۔۔ لیکن جاتے جاتے اسے تپ دق کی موذی بیماری دیے گئی۔۔۔ اس کی تعلیم وتر بیت اور پرورش پچانے کی تھی۔ کیوں کہ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے محکمے میں ایک قابل ترین سراخ رساں مانا جاتا تھا۔ اس بیماری کی وجہ سے اسے ملازمت سے سبک دوش کر دیا تو وہ آسام اپنی والد کے پاس چلا آیا۔

ڈاکٹروں نے اس کی صحت کے لیے یہاں کی آب و ہوا مفید قرار دی تھی۔۔۔ یہاں تپ دق کے مریض بلاشبہ صحت یاب ہو جاتے تھے۔ اس لیے اس کے باپ نے موضوع شہو سے قریب قدرتی مناظر سے سچی ہوئی جگہ پر خود رو پھولوں کے ایک خوب صورت اور بے ضرر جنگل سے قدرے فاصلے پر ایک دیدہ زیب جھوپڑا بنادیا تھا جس میں ہر طرح کی آزمائش اور سہولت تھی جہاں وہ ایک ملازم کے ساتھ رہتا تھا۔

اس سے میری دوسری مرتبہ ملاقات وارل پر ہوئی تھی جہاں وہ مرغ شکار کرنے آیا تھا۔۔۔ پھر ہم دونوں کی روزانہ ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ہماری ملاقاتیں بہت جلد گہری دوستی میں تبدیل ہو گئیں۔ میں نے ایک روز اس سے بھی باتوں باتوں میں اپنے خط کے بارے میں بتایا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں یہ کھوپڑیاں کسی مردہ زبانوں کے ماہر کے پاس بھیج دوں۔۔۔ وہی اس مسئلے کو حل کر سکتا ہے۔ اس وقت مجھے پروفیسر ولیم جوز کا خیال آیا۔ اتفاق سے وہ ان دنوں کلکتہ شہر میں ہی تھا۔ وہ لندن نہیں گیا تھا۔۔۔ میں نے اس کام میں دیر نہیں کی۔ میں نے چند کھوپڑیاں پارسل سے پروفیسر جوز کو بھیج دیں۔

میری پروفیسر ولیم جوز سے طالب علمی کے زمانے سے واقفیت تھی۔۔۔ اس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ مردہ زبانیں سیکھنے میں گزار دیا تھا۔۔۔ مجھے اس بات کی توقع تھی کہ اس فن میں اس بوڑھے پروفیسر سے بہت مدد ملے گی۔ اس لیے میں بے صبری سے اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

کوئی دو ماہ کے کرب ناک اور صبر آزما انتظار کے بعد پروفیسر کا خط آیا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے مجھے مفصل خط لکھا تھا۔۔۔ اس نے اپنے اس خط میں اپنی ناکامی کا اعتراف کیا تھا اور لکھا تھا کہ اس کی نظر سے پہلی بار ایسی تحریر گزری ہے۔ پھر بھی اس نے بہت تحقیق کی۔۔۔ یہ زبان نہ تو دنیا میں موجود ہے اور نہ ہی کسی کتاب میں اس کا ذکر ملا ہے اس کے باوجود وہ اس تحریر کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے ایک روز میں سویرے ہی گھر سے روانہ ہوا اور کوئی دس بجے میں شہو پہنچ گیا۔۔۔ راحت کا گھر یہاں سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ ہمیشہ داری پر بارہ بجے آیا کرتا تھا۔۔۔ میں اس کے انتظار میں ایک درخت کے نیچے سبزے کے مچھلیں فرش پر پاؤں پھیلا کے بیٹھ گیا جہاں میرے سامنے ایک کھوپڑی تھی۔۔۔ کوئی درخت ایسا نہ تھا جس کے سامنے اور نیچے کھوپڑیاں نہ پڑی ہوئی ہوں۔

بڑی وارفتگی سے بچھاؤ کر دیتی تھی۔ مرد بھی خوب تھے۔ انہیں سبز باغ دکھانے کے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس شکستہ کھوپڑی کے لمس میں جانے کیا بات تھی کہ مجھے سخت جاڑا محسوس ہونے لگا۔ میرے ہاتھ پاؤں اینٹھ گئے۔۔۔ خون کی گردش اور حرارت میں کمی آنے لگی۔۔۔ سانس بھی رک رک کے چلنے لگا۔ گو میری آنکھیں کھلی تھیں مگر اس پر ایک دھند سی چھائی تھی اور آنکھوں میں غنودگی برسنے لگی۔ پھر میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ میں غنودگی میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نرم نرم ریمیں گھاس پر دراز تھا اور میرا سر راحت کے زانوں پر تھا۔

وہ ایک پتے کو چھپتا کے میرے منہ میں پانی ڈال رہا تھا۔ اگر وہ پانی نہ پلاتا تو معلوم نہیں میرا کیا حشر ہوتا۔ یہ پانی میرے لیے امرت سے کم نہ تھا۔ جب میرے اڑے ہوئے جڑے زرا نرم ہوئے تو میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نقاہت سے پوچھا۔

”راحت۔۔۔! میں کہاں ہوں۔۔۔ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔۔۔ میں اس وقت بہت کم زوری محسوس کر رہا ہوں۔“

”خدا کا شکر ہے کہ تمہاری جان بچ گئی۔“ اس کے لہجے سے محبت نمایاں تھی۔ ”اگر میں وقت پر نہ آتا تو زندگی محال تھی۔۔۔ خدا کے لیے ان محسوس کھوپڑیوں کا خیال دل سے نکال دو۔۔۔ ورنہ تم آسب زدہ ہو کے رہ جاؤ گے۔“

میں نے اس کی بات کا جواب نہ دیا اور اس وقت خاموش رہا۔

اس موضوع پر اس سے کوئی تکرار اور بحث کرنا فضول تھا۔ واپسی سے کچھ دیر قبل ایک مرغ پکڑنے کے لیے تیزی سے دوڑا تو وہ کھوپڑی جس کے طلسمی اثر سے تھوڑی دیر پہلے میں بے ہوش ہوا تھا اسے اٹھا کے میں نے فوراً ہی اپنے سفری بیگ میں ڈال لیا۔ پھر میں گھر چلا آیا۔

میں نے دوسرے دن رات کو نیم خوابی کی

میرے سامنے جو کھوپڑی تھی وہ جسامت میں دوسری کھوپڑیوں کے مقابلے میں قدرے بڑی تھی۔۔۔ مجھے خیال آیا کہ یہ کھوپڑی کسی عالی دماغ شخص کی ہوگی۔ مگر اس کی شکستگی اور زبوں حالی سے میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔۔۔ مجھے ایسا صدمہ ہوا کہ اس نے میری آنکھیں نم ناک کر دیں۔۔۔ میں نے چند لمحوں کے بعد اسے اٹھا لیا اور پھر ایک پاگل کی طرح غناطہ ہو کے اس سے کہنے لگا۔

”اے دوست۔۔۔! تم کیوں اتنے خستہ ہو رہے ہو۔۔۔ وہ ایسی کون سی زبردست طاقت ہے جس نے تمہیں اس قدر ہسپا کر دیا آہ۔۔۔ تم موت کا زہریلا جام دیکھ چکے ہو۔ کیا تم مجھے یہ بتا سکتے ہو کہ اس کا ذائقہ کیا تھا۔۔۔؟“

عین اسی وقت ایک آبی پرندہ جو درخت کی ایک شاخ پر بیٹھا میری جانب دیکھ رہا وہ نہایت رقت آمیز آواز سے بے اختیار چیختے لگا۔۔۔ شاخ میں ایک دم سے کانپ اٹھا اور اس کی بے مانیگی پر بے اختیار روئے لگا۔

رات کے آنے کا وقت قریب تھا۔۔۔ میں نے سوچا کہ اس کھوپڑی کو پھینک دوں جب میں نے اسے پھینکنا چاہا تو ایسا محسوس ہوا کہ کسی انجانی طاقت نے میری ساری طاقت سلب کر لی ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ کھوپڑی مجھے اپنے اندر جذب کر رہی ہے۔۔۔ اس نے ایک پھندا میرے گلے میں ڈال دیا ہے اور میں اس کے شکنجے میں کستا جا رہا ہوں۔

اس وقت دوپہر ہو چکی تھی۔۔۔ سنیاں، سبزہ اور خاموشی جو سارے ماحول پر طاری تھی۔۔۔ وسیع داری، بے حس و حرکت ہوا میں ہلکی ہلکی سی کپکپاہٹ تھی جس سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہوا دم توڑنی چاہ رہی ہے۔۔۔ چاروں طرف سناٹا اور مکمل تنہائی تھی۔۔۔ اتوار کا دن تھا۔ ورنہ دو ایک نوجوان جوڑے تنہائی اور ویرانے سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہاں آ جاتے تھے اور حیوان بن جاتے۔۔۔ جذبات کی افرا تفری میں لڑکی ہو، عورت اپنا سب کچھ

حالت میں اپنے کمرے کے اندر ایک سفید سایہ پھرتا دیکھا۔۔۔ خوف سے میری آنکھ کھل گئی۔۔۔ مجھے اس کھوپڑی کے متعلق واہمہ پیدا ہوا۔۔۔ میں نے سوچا کہ کہیں یہ کھوپڑی کی کارستانی تو نہیں ہے۔۔۔ لہذا میں نے اس کھوپڑی کو باہر پھینکنے کے لیے ارادے سے بیگ کھولا۔۔۔ دوسرے لمحے میرا سینہ دھک سے رہ گیا۔ کیوں کہ کھوپڑی غائب تھی۔

میرے ذہن پر ایسا خوف چھا گیا کہ ساری رات ایک لمحے کے لیے بھی میری آنکھ نہیں لگی۔

میں ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔۔۔ آنکھیں بند کرتا تو وہ کھوپڑی دکھائی دیتی تھی۔۔۔ صبح میں نے کسی ضرورت سے بیگ کھولا تو کھوپڑی موجود تھی۔۔۔ سوچنے کے بعد اس فیصلے پر پہنچا کہ رات کو شاید شدید گھبراہٹ کی وجہ سے اچھی طرح نہیں دیکھا یا واہمہ کے اثر سے اس پر نظر نہ پڑ سکی۔ میں تمام دن اس خیال میں کھویا رہا۔۔۔ رات کو میرے ساتھ وہی معاملہ پیش آیا۔۔۔ میں نے اپنا شک رنج کرنے کی غرض سے فوراً ہی اٹھ کے بیگ کھولا تو اس میں کھوپڑی غائب تھی۔ رات جوں توں کر کے گزری۔۔۔ صبح جب میں نے آزمائش کرنے کے لیے بیگ دیکھا اس میں کھوپڑی موجود تھی میں بہت زیادہ دہشت زدہ ہو گیا اور اب اسے میں اپنے پاس ایک لمحے کے لیے بھی رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اسے اٹھا کے مکان کے پیچھے بدھوں کے شکستہ مندر کی طرف پھینک دیا مگر اس کے باوجود وہ سایہ نہ ملا جس کی وجہ سے میں بہت متفکر ہوا۔۔۔ خوف و ہراس میں مبتلا ہو گیا لیکن میں نے اس بات کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا۔

آخر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ۔۔۔ ڈر اور خوف تھا۔

میرے دل کو ایک کھٹکا لگا ہوا تھا کہ یہ کھوپڑی کسی دن کوئی گل کھلائے گی۔ ایک دن عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔۔۔ تھوڑی دیر پہلے ہی سویا تھا۔۔۔ نیم کی خواب گاہ سے ساحرہ کی

چینوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔۔۔ پورے گھر میں ایک کھلبلی سی بچ گئی۔۔۔ میں بدحواسی کے عالم میں ننگے پاؤں دوڑتا ہوا اس کے خواب گاہ تک پہنچا۔

اس لمحے میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ ساحرہ کیوں چیخ رہی ہے۔۔۔ کہیں کوئی سانپ یا ناگ تو کمرے میں گھس نہیں آیا۔۔۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔۔۔ کمرے میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔۔۔ نیم ساحرہ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔ ساحرہ بستر پر پڑی بے تحاشا چیخ رہی تھی۔ اس کی ہڈیاں چینوں سے کہہ اور فضا گونج رہی تھی۔ میں نے نیم کے کہنے پر اسے سنبھالنا چاہا تو اس کا بدن بج بستہ ہو رہا تھا۔

میرے کہنے پر نیم نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو کچھ دیر بعد اس کی حالت سنبھل گئی اور اس کی چیخیں بند ہوئیں۔

لیکن وہ بہت خوف زدہ تھی۔ اس کا چہرہ دھلی چادر کی طرح سفید پڑ گیا تھا اور لہو کی بوند تک نہیں تھی۔۔۔ پھر اس نے قدرے توقف کے بعد سینے میں سانسوں کے زیر و بم پر قابو پانے کے بعد نیم کے پوچھنے پر بتایا کہ اسے نیند کی حالت میں ایک دم سے خون نچھرد کر دینے والی سردی محسوس ہوئی جو اس کے لیے ناقابل برداشت ہونے لگی۔۔۔ جب اس نے کپکپا کے آنکھ کھولی اور لحاف چہرے سے ہٹایا تو دیکھا کہ ایک سفید سایہ اس پر جھکا ہوا ہے۔

میں نے کافی بنا کے ساحرہ اور نیم کو پلائی اور خود بھی پی اور ساحرہ کا واہمہ دور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب ساحرہ کی طبیعت قدرے بہتر ہو گئی تو میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ جب میں نے اپنے کمرے کے جانے والے زینے پر قدم رکھا تو میں نے ساحرہ کی آواز سنی جو وہ نیم سے کہہ رہی تھی کہ میں نے گہری نیند میں محسوس کیا کہ تم مجھے دیکھ کے بے قابو ہو کے چوم رہے ہو اور میں نے تمہارے بوسے پورے جسم پر محسوس کئے۔ انگاروں کی طرح دھکتے اور نشاط انگیز۔۔۔ میں نے تم سے کہا کہ سونے دو میں بہت

تھکی ہوئی ہوں۔ لیکن تمہاری من مانیوں حد سے تجاوز کرنے لگیں تو میں نے ایک طرف ہٹا دیا۔۔۔ چند لمحوں کے بعد پھر میں نے ایک دم سے سرد ہاتھ بدن پر محسوس کیا اور خون منجمد کر دینے والی سردی محسوس ہوئی۔

شاید اصل بات یہ تھی کہ ساحرہ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد راتوں کو بے لباس ہونے کی عادی تھی یہ بات پڑوسی اور محلے کی عورتوں کے علم میں تھی۔ سردی ہو یا گرمی کا موسم۔۔۔ رات شاید ہوا یہ کہ پڑوس کا کوئی مرد دھس آیا تھا۔ نسیم چوں کہ دن بھر کی تھکا ماندہ ہوتا تھا وہ بستر پر پڑتے ہی گہری نیند سو جاتا تھا۔ کمرے میں ایک کونے میں ساری رات دیا جلتا رہتا تھا کیوں کہ ساحرہ کو اندھیرے میں سونا پسند نہیں تھا۔ ٹائٹ بلب فیوز ہو جاتا تھا۔ وہ نیچے رہتے تھے۔ شاید کوئی راتوں کو چھپ کے کھڑکی یا دروازے کی جھریوں سے جھانکتا رہتا ہوگا۔ رات اس نے ساحرہ کو دیکھا ہوگا جس نے نیند کی حالت میں بلخاف اپنے اوپر سے ہٹا دیا ہوگا۔ رات سردی بہت کم تھی۔ اتفاق سے مچھن کی دیوار بھی چار فٹ کی تھی۔ پڑوسی مرد نے دیا بجھا دیا اور ساحرہ کو بے بس کر کے من مانیوں میں اور حد سے تجاوز کرنے والا تھا کہ سفید سایہ مچھن میں آیا تھا۔ اسے دیکھ کے پڑوسی بھاگ گیا۔ سفید سایہ اندر آیا۔ اس نے اپنا نچ بستہ ہاتھ ساحرہ کے بدن پر رکھا تو ساحرہ نے جاڑا محسوس کیا۔ جب میں کمرے میں پہنچا تو نسیم نے فوراً ہی اس کا جسم چادر سے ڈھک دیا تھا۔ کمرے میں روشنی بلب کی تھی۔ اس اندھیرے میں وہ مرد فائدہ اٹھالیتا تو ساحرہ بھی سمجھتی کہ نسیم اس کا شوہر ہوگا۔ میرے اس شک و شبہ کی تصدیق ایک طرح سے ہو گئی تھی۔ کیوں کہ ایک بوڑھے اور پرانے ملازم نے بھی انہی خیالات اور شک کا اظہار کیا تھا۔۔۔ میں نے اندازہ کیا کہ بوڑھا راتوں کو چھپ کے نسیم کے کمرے میں جھانکتا رہتا ہے۔ بوڑھے سے دو تین دن میری اس موضوع پر بات ہوئی تھی۔

میں ساری رات اس واقعے پر غور کرتا رہا کہ

اس سائے سے کیسے اور کیوں اور کس طرح سے چھٹکارہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔۔۔ چوں کہ میں اس گھو پڑی کو پھینک چکا تھا جس کا اس واقعہ سے تعلق جوڑا جاسکتا تھا۔

میں بستر سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ نسیم میرے کمرے میں آیا۔

وہ کچھ مغموم دکھائی دیتا تھا اور بہت پریشان تھا۔ پھر وہ مجھ سے سراپیسکی سے کہنے لگا۔

”رات والے واقعے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔ تم نے اس کے بارے میں کچھ سوچا۔۔۔ کس نتیجے پر پہنچے۔۔۔؟“

”کچھ بھی تو نہیں۔۔۔ بھابھی کسی واہمہ سے ڈر گئی تھی۔“ میں نے سنہلے ہوئے جواب دیا۔

”بھابھی نے شاید کوئی ڈراؤنا خواب۔۔۔“

”نہیں۔“ نسیم نے فوراً ہی میری بات درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا۔ ”صرف تمہاری بھابھی کے ساتھ ہی ایسا نہیں ہوا ہے بلکہ میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آچکا ہے۔ میں نے تمہیں اس لیے نہیں بتایا میں نے اسے اپنا واہم سمجھتے ہوئے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔“

میں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ پہلی بات جو میں اس سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم اپنی بیوی کو سختی سے تاکید کر دو کہ وہ رات کو بے لباس نہ سویا کرے۔ چلو سرد موسم میں یہ اس وقت مناسب ہے کہ کمرے میں روشنی نہ ہو۔ یہ فتنہ اس سائے سے پہلے ہوا ہے جو میں نے سنا، اندازہ کیا اور قیاس کیا۔۔۔ تمہاری بیوی نے تمہیں بھی بتایا تھا کہ سفید سایہ نے پہلے تو اس کی ساتھ دست درازیاں کیں۔ اوپر سے نیچے یوسوں کی بارش کر دی اور حد سے تجاوز کرنے والا تھا کہ تمہاری بیوی کو ہوش آ گیا تو اس نے سفید سایہ کو دھکا دے دیا۔۔۔ وہ سفید سایہ نہیں تھا بلکہ کوئی پڑوسی یا ملازم بھی ہو سکتا تھا جو اس بات سے بے خبر تھا کہ وہ بے لباس سوئی ہے۔ موقع ملا تو اس نے من مانیوں کر لیں۔ لیکن میں یہ بات کیسے

کرتا۔ جب میں ساحرہ کی چیخیں سن کے ان کے کمرے میں پہنچا تو تیز روشنی تھی۔ جتنی دیر میں نسیم نے اس کا بدن چادر سے ڈھکا اتنی دیر میں میں نے ساحرہ کو بے پروا سا دیکھ لیا تھا۔

آسام میں غربت و افلاس بہت زیادہ تھا۔ اس لیے انہیں کھانا نصیب نہیں تھا تو ڈھنگ کا لباس کہاں نصیب ہوتا۔ بنگالی عورتوں لڑکیوں کی طرح صرف ایک ساڑی میں ہوتی تھیں۔ پلو کو بلاؤز بنا کے فراز کو ڈھک کے اسے کمر میں اڑس لیتی تھیں۔ پلو کی وجہ سے نکل جائے تو انہیں کوئی شرم و حیا نہیں ہوتی تھی۔ تالاب اور ندی کنارے وہ بے لباس یا ساڑی میں ملبوس نہاتی تھیں۔ مردوں کی موجودگی کی پروا نہیں کرتی تھیں۔ آسام میں بدلائندہ بک کی اکثریت تھی۔ جو مرد اپنی بیٹی، بہن اور بیوی کا سودا کرتے تو وہ دودو کو ساتھ کر دیتے۔

ساحرہ واقعی ساحرہ تھی۔ میں نے اسے کبھی ایک مرد کے تاظر میں اس لیے نہیں دیکھا تھا کہ وہ میرے عزیز از جان دوست کی بیوی تھی۔ اس کا چہرہ خیز سراپا اور کشش زاہدوں کو بھی بہکانے والی تھی۔ سفید سایہ نے اسے جو بے لباس دیکھا تو وہ قریب اور غور سے دیکھنے کے لیے جھکا اور اس کے جسم پر ہاتھ رکھا۔ اس کے کیا ارادے تھے۔ معلوم نہیں۔

اب مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہ ساری مصیبت اسی کھوپڑی کی وجہ سے نازل ہو رہی ہے۔ نسیم کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

”دوست! میں سوچ رہا ہوں کہ اس مکان کو چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ مکان ضرور آسیب زدہ ہے۔۔۔ میں تو مکان فوراً ہی تبدیل کر دوں۔ لیکن دفتر میں کام کی اس قدر بھرمار ہے کہ سر کھانے کی فرصت تک نہیں ہے۔ اس لیے میں یہاں کچھ دن رہنے پر مجبور ہوں۔ مگر میں نے ساحرہ کے متعلق فیصلہ کر لیا ہے کہ اسے میکے بھیج دوں۔ جب تک دوسرا مکان تلاش نہیں کر لیتا اسے وہیں رہنے دوں۔۔۔ وہ

خوف زدہ ہے۔ مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی ہے۔۔۔ تم کیا کہتے ہو۔۔۔“

”مجھے تم سے اتفاق نہیں ہے۔“ میں نے اسے دلاسا دیا۔ ”تمہیں اور ساحرہ کو اس قدر گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”نہیں دوست۔۔۔!“ نسیم نے کہا۔ ”ساحرہ بھی یہاں رہنا نہیں چاہتی۔۔۔ میں بھی فرحت پاتے ہی دوسرا مکان تلاش کروں گا۔“

اس واقعے کے دوسرے تیسرے دن اس کے ملازمین بھی اس سفید سائے کی شکایت کرنے لگے۔ اس کے ملازمین اس کے گھر کے عقب میں ایک جھونپڑے میں رہتے تھے۔ تمام گھروں میں خوف اور اداسی کی لہر دوڑ گئی۔ کبھی دہشت زدہ اور سہمے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ سوائے اس بوڑھے ملازم کو جو حقیقت جانتا تھا جس سے میں تبادلہ خیال کر چکا تھا۔

ایک روز میں نے کسی خیال کے زیر اثر اپنا بیک کھولا تو اچھل پڑا۔۔۔ دہشت سے میرا بدن لرزنے لگا کیوں کہ وہ کھوپڑی بیک میں موجود تھی۔ پھر شاید اس کھوپڑی کو کس نے لا کے میرے بیک میں رکھ دیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اسے لانے والا کون تھا۔

☆☆☆

ساحرہ موضع شالنگ کے ایک زمین دار کی بیٹی تھی۔ اچانک اس کا باپ زمین دار کیسے بن گیا تھا۔۔۔ اس کے پاس دولت کہاں سے آئی۔۔۔ یہ راز تھا۔ موضع پتلنگ۔۔۔ شالنگ سے سات میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ نسیم اپنی بیوی کو لے کے سرال جا رہا تھا۔۔۔ سرشام ہی اسباب بندھ گیا تھا اور رات کو تمام لوگ سکھ اور آرام کی نیند سو گئے تھے۔ لیکن جب صبح سویرے وہ بے دار ہوئی تو اس نے دیکھا کہ الماری کھلی پڑی ہے۔

چابیوں کا گچھا تا میں لٹک رہا ہے۔۔۔ وہ ڈبا جس میں ساحرہ نے اپنے زیورات رکھے ہوئے تھے وہ ڈبے سمیت غائب تھے۔۔۔ یہ بہت قیمتی



زیورات جو شادی کے بعد اس کے باپ نے زمین دار بننے کے بعد دیے تھے۔

نسیم نے ایک روز مجھے اعتماد میں لے کے کہا تھا کہ اس کے سر کو کوئی مدفون خزانہ ملا ہے جس نے اس کی حالت ایک دم سے بدل دی ہے۔

اس نے دوبار ہی نہیں زمینیں بھی خریدیں اور وہ اب تک کچھ نہ کچھ خریدتا رہتا ہے اور اب وہ حویلی نما مکان میں رہتا ہے۔ اس نے اپنی بیٹی کو جو زیورات دیے ہیں وہ بے حد قدیم معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی بناوٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی شاہی محل سے چرا کر زمین میں دفن کر دیے گئے تھے۔۔۔ جس نے ان زیورات کو دفن کیا تھا وہ یا تو وہ جگہ بھول گیا یا پھر مر گیا۔۔۔ یہ زیورات اس لیے بھی قیمتی تھے کہ ان میں ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ بہت خوب صورت اور نادر قسم کے تھے۔

ساحرہ وہ زیورات کا ڈبانا پائے بے ہوش ہو گئی تھی اور پورے گھر میں ایک شور مچا گیا۔

اس کے ہوش میں آنے کے بعد تمام ملازمین کو بلا کے پوچھ گچھ کی گئی۔ اس کے علاوہ ملازم بہت ایمان دار تھے اور وہ ایسی مذموم حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ایسا کوئی راستہ نہ تھا کہ جس سے کوئی چور تو چور ملازم بھی داخل ہو سکے۔ ساحرہ نے بتایا کہ اس نے رات بستر پر دراز ہونے سے قبل زیورات اور ڈبے کو دیکھا تھا اور پھر اس نے چابیوں کا گچھا سرہانے رکھا تھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ اچھی طرح سے بند کر کے چھٹی بھی لگائی تھی۔ جب سے اس کے باپ نے اسے زیورات دیے تب سے وہ ان زیورات کا بڑا خیال رکھتی ہے اور حفاظت میں۔۔۔“

پھر پولیس کو بھی اطلاع دی گئی۔۔۔ پولیس نے آ کر ملازمین سے پوچھ گچھ کی۔۔۔ محل وقوع کا اچھی طرح سے جائزہ لیا۔۔۔ مکان کے اندر اور باہر ہیروں کے بھی نشان نہ ملے۔۔۔ پولیس نے تحقیقات میں کوئی تین گھنٹے صرف کیے مگر وہ کسی نتیجے

پر پہنچ نہ سکی۔ پھر وہ نادم اور مایوس چلی گئی۔ البتہ اتنا کہہ گئی کہ یہ کسی بہت بڑے چور کا کام ہے۔

ساحرہ روٹی دھوئی اور مایوس ہو کر میسے چلی گئی۔ اس کے سوا چارہ بھی تو نہیں تھا۔ کیوں کہ نہ تو زیورات مل سکتے تھے اور نہ چور۔۔۔ میرے دل میں ایک خوف بھی دامن گیر ہوا تھا کہ کہیں ساحرہ مجھ پر شک کا اظہار نہ کرے اور مجھے مورد الزام نہ ٹھہرا دے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔۔۔ پھر بھی دل خدا کا شکر بجا لایا۔ کیوں کہ اس کے دل میں میرے خلاف جو نفرت بھری تھی وہ کم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کئی بار غیر محسوس انداز سے مجھے دھڑلانا اور بہکانے کی کوشش کی تھی اور ایسی حالت اور لباس میں نسیم کی غیر موجودگی میں آتی تھی کہ میں غلاط کے دلدل میں گر جاؤں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کی عریانیت کے جال میں پھنس جاتا۔۔۔ لیکن میرے لیے نسیم محترم تھا۔ میرے نزدیک بھابھی کا رشتہ تقدس رکھتا تھا۔ اس کے اندازے غلط ثابت ہوئے تھے کہ میں قدم قدم پر فائدہ اٹھاتا رہوں گا۔ میں نے سکون اور اطمینان کا سانس لیا کہ اس رشتے اور دوستی کے تقدس پر آج نہیں آئی۔

نسیم کا معمول یہ تھا کہ وہ ہر ہفتہ کی شام اپنی سسرال چلا جاتا اور اتوار کا دن گزار کے وہاں سے پیر کی صبح واپس آ جاتا تھا۔ چونکہ پولیس کی تحقیقات کا سلسلہ ابھی جاری تھا اس لیے میرا گھر پر رہنا ضروری تھا۔۔۔ پولیس اس کیس میں اس لیے دل چسپی لے رہی تھی کہ ساحرہ نے زیورات کی بازیابی پر پولیس کو نقد انعام دینے کا اعلان کیا ہوا تھا۔ میں پولیس کی آمدورفت کے باعث کئی اتوار راحت سے ملنے نہ جاسکا۔ میرا دل اس سے ملنے کے لیے بے چین ہوتا تھا۔

آخر ایک روز میں نے پولیس انسپکٹر سے کہا کہ میں اس اتوار کو گھر پر نہیں رہوں گا۔ گھر کی چابی ملازم کے پاس ہوگی۔۔۔ آپ اس سے کہیں گے تو وہ گھر کھول دے گا۔ پھر میں اتوار کے دن راحت کے گھر

کی طرف چل دیا۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی اور دکھ بھی ہوا تھا کہ راحت مجھ سے ملنے کے لیے کیوں نہیں آیا۔۔۔ جب کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست بن چکے تھے۔۔۔ میرا نہ آنا اس کے لیے تشویش کا باعث نہ ہوا۔۔۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ نہ صرف شکوے شکایت کا پتارہ کھول دوں گا بلکہ اس کی خوب خبر لوں گا۔

جب میں نے دروازے پر دستک دی تو دروازہ تھوڑی دیر میں کھلا۔۔۔ دروازے پر لگا کہ کوئی لاش کھڑی ہے۔۔۔ اسے دیکھتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور ایک سنسنی میری ریزہ کی ہڈی میں کسی چاقو کی نوک کی طرح کاٹتی اتر گئی۔۔۔ اور میری رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اس بات کا احساس ہوا کہ پر لاش نہیں ہے بلکہ راحت ہے۔۔۔ وہ ایک سر پہچانا نہیں جاتا تھا۔۔۔ اس کا جسم سوکھ کر کاٹا ہو رہا اور وہ پڈیوں کا پتھر لگ رہا تھا۔۔۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے چہرے پر غیر معمولی رونق دکھائی دیتی تھی اور اس کی آنکھوں میں جی کی چمک تھی۔

جب اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ سر نہیں گرم تھا اور مجھے اندر لے گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا اس نے شکوے شکایتوں کا دفتر کھول دیا۔ جب میں نے اس سے یہ کہا کہ۔۔۔ اس نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تو اس نے کہا۔

”میں کوئی دس دنوں سے بخار کی حالت میں تپتا اور ہریانہ بکنا رہا ہوں۔۔۔ بخار تھا کہ اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ڈاکٹر کی دوا اور انجکشن سے بھی اتفاق نہیں ہوا۔ پھر میں نے ایک سنیا سی کو دکھایا اور اس کی صرف ایک پڑیا سے بخار اتر گیا۔۔۔ اب مجھے بھوک بھی خوب لگتی ہے۔۔۔ پیٹ بھر کے تینوں وقت کوئی تین دن سے کھانے لگا ہوں۔ صرف کمزوری باقی ہے۔ سنیا سی کا کہنا ہے کہ کم زوری رفتہ رفتہ دور ہو جائے گی اور مجھے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں چھ سات دن لگیں گے۔“

میں سورج ڈوبنے سے کچھ دیر پہلے تک اس کے پاس آیا۔۔۔ دوران گفتگو جب میں نے اسے نسیم کے ہاں پر اسرار اور سنسنی خیز چوری کا احوال سنایا تو اس نے ایک سراغ رساں کی حیثیت سے سارا واقعہ سنا۔ اس نے مجھ سے کچھ سوالات کیے۔ پھر وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کے میری طرف دیکھا اور پھر ایک سرد آہ بھر کے کہنے لگا۔

”کاش۔۔۔ مجھ میں اتنی سکت اور طاقت ہوتی کہ میں چل کے وہاں جاسکتا۔۔۔ پولیس اس پر اسرار واردات کی ساری زندگی سراغ نہیں لگا سکتی۔ گیوں کہ اس کی سوچ اور طریقہ تفتیش فرسودہ ہے۔۔۔ انہیں صرف شک کرنا اور بے مقصد لوگوں کو پکڑ کے حوالات میں بند کرنا اور تشدد کرنے اور ایذا پہنچانے کا فن آتا ہے۔۔۔ تم میری صحت یابی کے لیے دعا کرو کہ میں جلدی اچھا ہو جاؤں۔۔۔ وہاں آ کر نہ صرف چٹکیوں میں سراغ لگالوں گا بلکہ اس کا مسروقہ مال بھی برآمد کر دوں گا۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔“

اس نے مجھے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں پر اسرار چوریوں کے سنسنی اور ناقابل یقین قسم کے واقعات سنائے جس کے اس نے فوراً سراغ لگا لیے تھے۔۔۔ اس کے ان واقعات سننے میں وقت آسانی سے کٹ گیا۔۔۔ وہ واقعات نہ صرف پر بحس، حیرت انگیز اور بے حد دل چسپ بھی تھے۔ الف لیلہ کی رنگین اور حسین داستان کی طرح۔۔۔ میں اس کی ذہانت پر عش عش کر اٹھا تھا۔ اگر وہ بیمار نہ ہوتا اور ملازمت کر رہا ہوتا تو وہ یقیناً شریلاک ہومز جیسا مقام حاصل کر لیتا۔

راحت سے ملاقات کے پورے سات دن کے بعد یعنی ہفتہ کی سہ پہر کو نسیم اپنی بیوی کے پاس سرال چلا گیا۔ اس نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ میں اس کے ساتھ اس کی سرال چلوں۔ چون کہ ساحرہ کو ہم دونوں کی دوستی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی اور پھر

اسے اس بات کا غصہ، دکھ اور غم تھا کہ میں نے اس کے ارمان پورے نہیں کیے اور تنہائیوں سے فائدہ نہیں اٹھایا اور اسے مہربانی ہونے دیا کہ اس کے ساتھ محبت اور گرم جوشی اور وارفتگی سے پیش آؤں۔ جب کہ وہ شعلہ مجسم تھی اور اس نے اپنی انا کی توہین، ناتقدری اور بے عزتی محسوس کی تھی۔ دراصل وہ میری وچاہت اور خوب صورتی اور دراز قد پر مرئی ہوئی تھی۔

اس لیے میں نے نعیم کے ساتھ جانے سے گریز کیا اور پھر میں اتوار کا دن راحت کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔۔۔ میں اکیلا تھا۔۔۔ بینک سے فارغ ہو کے گھر آیا تو بے حد تھکا ہوا تھا۔ اس لیے سنانے کی غرض سے بستر پر دراز ہو گیا۔۔۔ ایسی گہری نیند سویا کہ کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔ رات دس بجے تک کھوڑے بیچ کے سوتا رہا تھا۔۔۔ اگر مجھے ملازم کھانے کے لیے نہیں جگانا تو شاید دوسرے صبح ہی آنکھ کھلتی۔

کھانے سے فراغت پانے کے بعد میں کھڑکی کے پاس بیٹھا مقامی سگاریں رہا تھا۔ یہ آبائی قبائل کا بنا ہوا سگار جو میں بھی بھی رات کے وقت شغل کر لیتا تھا اور اس سگاری بڑے بڑے ٹکوں میں بانگ تھی۔ ایک گاؤں تھا جس کی پوری آبادی میں ہر گھر میں مرد، لڑکیاں اور عورتیں یہ سگار بناتی تھیں اور اس بستی میں اس کے تمباکو کی کاشت بھی کی جاتی تھی۔

چاندنی رات تھی۔ چاند اپنے پورے جوہن پر تھا۔ فرحت بخش ہوا کے جھونکے جو بڑے لطیف اور سرور بخش تھے۔۔۔ نس نس میں ایک انوکھا اور تازگی کا احساس بھر رہے تھے۔۔۔ مجھ پر پرانی شراب کا خمیر چھایا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی پرشاپ دوشیزہ کے رس بھرے گداز ہونٹوں نے میرے لبوں میں اپنا سارا رس بھر دیا ہو۔۔۔ جب میں بینک سے گھر لوٹا تو راستے میں آسامی عورتوں کے علاوہ پرشاپ گداز بدن کی دوشیزائیں اپنے جسموں کی نمائش کر کے دل کو گرماتی تھیں کہ وقت گزاری کریں۔ آسامی عورتوں لڑکیوں کی رنگت گندی اور

صندل ہوتی تھی۔ جس میں بڑی جاذبیت اور نکھار ہوتا تھا۔ آدمی مضبوط کردار کا نہ ہو تو غلاظت کی دلدل میں گر جائے۔۔۔ اس وقت چشم تصور میں وہ دل و دماغ پر نشہ ساطاری کرتی تھیں۔ ان کے چشم تصور اور جسموں کی رعنائیوں اور شادابیوں میں ایسا کھویا کہ وقت گزرنے کا احساس نہ ہوا اور نہ ہوتا تھا۔ میں تقریبات ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہو جاتا تھا۔ ملازم بھی اپنے کمرے میں جا کے گہری نیند سو گیا تھا۔۔۔ دیوار گیر گھڑی ایک بج رہی تھی۔ دل میں ایک پراگندہ خیال سا آیا اور آتا بھی رہتا تھا کہ اس تنہائی کو دور کرنے کے لیے کسی لڑکی کو لے آؤں جو بستر کی زینت بنے۔ بنگالیوں اور آسامیوں میں لڑکیاں جوانی کی دلہیز پر اس لیے جلد قدم رکھ دیتی تھیں کہ ان کی بومیہ غذا میں مچھلی ضرور ہوتی تھی۔ اس کے بغیر کھانا حلق سے نہیں اترتا تھا۔ نو دس برس کی لڑکیاں بھی بلوغ کو پہنچ جاتی تھیں۔ کیوں کہ تالابوں کی مچھلیاں بہت گرم ہوتی تھیں۔ جب کہ سمندری معتدل۔۔۔

کمرے کی ویرانی اور تنہائی عورت کی طلب پیدا کرنے لگی تھی۔ لیکن میں نے اس خیال کو اس طرح جھٹک دیا جیسے کوئی کن سکھو میرے وجود پر چڑھنے لگا ہو۔ عورت لڑکی کی طلب اور خواہش اس لیے بھی اکساتی تھی کہ یہ انتہائی ارزاں ہوتی تھیں۔ ایک کپ چائے کی پیالی۔۔۔ اگر انہیں ایک وقت پیٹ بھر کے کھانا کھلایا جائے تو وہ ساری رات ہر طرح سے سیوا کرتی رہیں۔ ایک کوڑی بھی نہ لیں۔

دفعتاً مجھے ہوا کے سن سناتے جھونکوں سے ایک ملی جلی خفیف سی آواز سنائی دی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی میرا نام سرگوشی کے انداز میں پکار رہا ہو۔۔۔ میں نے سوچا کہ کون ہو سکتا ہے۔۔۔ اس وقت کون آ سکتا ہے۔۔۔ میں نے اسے اپنا واہمہ سمجھ کے جھٹک دینا چاہا۔۔۔ لیکن پھر دوسرے لمحے پھر خفیف سی آواز سنائی دی۔ میں نے سوچا کہ کہیں بینک میں کام کرنے والا کوئی ملازم نہ آیا ہو کیوں کہ

آج بینک کے ایک کھاتے میں گڑ بڑی ہو گئی تھی۔ اس کا خیال آتے ہی میں فوراً نیچے آیا۔۔۔ جب میں نے دروازہ کھول کے دیکھا تو وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ جب میں دروازہ بند کر کے جانے لگا تو پھر ایک ہلکی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ آواز مکان کے عقب سے سنائی دی تھی۔ کسی نے عقبی دروازے پر دستک دی تھی۔ پھر مجھے ایک خیال آیا تھا کوئی لڑکی یا عورت نہ ہو۔ کسی پیشہ ور لڑکی عورت کے علم میں یہ بات آ جانی کہ کوئی مرد مکان میں اکیلا رہتا ہے تو وہ رات کے کسی حصے میں آ کے دروازے پر دستک دیتی تھی۔ ایسی حالت میں کہ مرد کے جذبات بے قابو ہو جائیں۔ میں نے سوچا کہ اگر کوئی لڑکی ہوئی تو اسے کتیا کی طرح دھکار دوں گا۔ پھر میں کمرے اور صحن سے ہوتا دروازے پر پہنچا۔۔۔ میں نے یہ نہیں پوچھا کہ کون ہے۔ میں نے بے دھڑک دروازہ کھول دیا۔ ہمارے اس مکان کے پیچھے بدھوں کا ایک ویران قدیم اور شکستہ مندر تھا جس کے بیرونی احاطے میں بوڑھے منجیان درخت موجود تھے۔

خود رو گھاس اونچی اونچی اُگی ہوئی وہ بڑی بے ترتیب سی تھی گو کہ چاندنی رات تھی۔۔۔ تاحد نگاہ تک دو دھیا چاندنی کا جھمک دریا نظر آتا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید میری سماعت کا فتور تھا۔ جو میں نے اپنا نام سنا تھا اور پھر ایک آوارہ سا خیال آیا کہ کہیں ساحرہ کی بہن تو نہیں تھی جو کسی آشامرد کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔۔۔ وہ لوٹ کے آئی ہو اور کسی جگہ چھپ کے آوازیں دے رہی ہو۔ پھر یہ خیال آیا کہ وہ مجھے کیوں آوازیں دینے لگی۔ کیوں کہ میں اسے بری طرح دھکار چکا تھا اور اسے مہربان ہونے نہیں دیا تھا۔ جب کہ اس نے جانے کیا کیا جتن مجھے آلودہ کرنے کے لیے کیے تھے۔ وہ اپنی بہن کو ہی پکار سکتی ہے۔

جب میں چاروں طرف کا جائزہ لے چکا تو معامیری نگاہ مندر کے احاطے کی شکستہ دیوار کی منڈیر

پر پڑی تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔۔۔ میں نے ایک سفید سایہ دیکھا جو صاف اور واضح نہیں تھا۔ خوف کی لہر نے میرا خون خشک کر دیا۔ لمبے کے لیے میری نظروں کے سامنے دھند سی چھا کے چھٹ گئی۔ میں ہراساں ہو کے دروازہ بند کرنے والا ہی تھا کہ نادیدہ آواز نے پھر میرا نام لے لے پکارا۔

کیا یہ آواز کسی انسان کی ہو سکتی ہے۔۔۔؟ میرے دل نے کہا کیوں کہ یہ آواز ایسی بے رس، ویران اور کھوٹلی تھی جیسے قبر کی تہوں سے نکلے ہو یا کسی گہرے کنویں کی تہ سے پکارا گیا ہو۔ اس آواز کو سن کے میں دھشت زدہ ہو گیا اور میرا بدن لرزے کے مریض کی طرح لرزنے لگا۔ تاہم میں نے حوصلہ کر کے اپنے حواس قابو میں کیے۔ ہمت بچھ کی۔ پھر کھوپڑی کا خیال آیا کہ کہیں وہ تو پکار نہیں رہی ہے۔۔۔ میں نے سوچا کہ پوچھوں تو کسی وہ کون ہے جو مجھے پراسرار انداز سے پکارا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ ”تم کون ہو۔۔۔؟“ میں نے ہمت کر کے لرزیدہ سی آواز میں پوچھا اور ادھر ادھر دیکھا۔ ”تم کہاں ہو۔۔۔؟“

”میں راحت ہوں۔۔۔“ اس بھونڈی کرخت اور بے کس آواز نے جواب دیا۔ ”تم نے میری آواز نہیں پہچانی۔۔۔“

”راحت۔۔۔“ خوف اور تعجب کے ملے جلے احساس سے میں کانپ اٹھا۔۔۔ میں نے ایک لحظہ سوچا کہ کیا کروں۔۔۔ پھر مجھے دوستی اور مرمت کے خیال سے آواز کی سمت بڑھنا پڑا۔۔۔ سفید سایہ متحرک سا تھا۔ لیکن مجھے اس کے قریب جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں نے اپنی خوب نسل کر لی کہ میری سماعت کا فتور نہیں ہے۔

وہ سفید سایہ کسی بدروح کا نہیں تھا۔۔۔ وہ سچ سچ راحت ہی تھا۔۔۔ قریب پہنچ کے اس کی شناخت ہو گئی تھی۔ میں نے بمشکل اپنی آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یار راحت۔۔۔! تم اپنی رات یہاں کیسے آئے۔“

”میں تمہارے دوست کا مسروقہ مال برآمد کروانے آیا ہوں۔“ راحت نے چند لمحوں کے توقف کے بعد جواب دیا۔

”لیکن یار۔۔۔! کوئی یہ وقت ہے آنے کا۔۔۔ تم دن میں یا شام کے وقت بھی آ سکتے تھے۔۔۔“

”کیا میں نے تم سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ صحت یاب ہوتے ہی سب سے پہلے تمہارا یہ کام کروں گا۔“ راحت نے جواب دیا۔

”لیکن تم اس راستے سے اور اس قدر پراسرار انداز سے کیوں آئے۔“ میں نے کہا۔ ”سامنے والے راستے سے آتے اور دروازے پر دستک دیتے۔۔۔ کہیں ایسا تو نہیں تم رات کی وجہ سے راستہ بھٹک گئے ہو۔“

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ اس کی وجہ شاید کسی وجہ سے بتانا نہیں چاہتا تھا۔

”تم بتانا نہیں چاہتے ہو نہ بتاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہ تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے۔“

”میری آواز کو کیا ہو گیا ہے۔“ اس نے متعجب لہجے میں پوچھا۔ ”کیا تم میری آواز میں کچھ تبدیلی محسوس کر رہے ہو۔“

”دراصل میں تمہاری آواز پہچان نہیں سکا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں نے تمہاری آواز بیکسر بدلی ہوئی اور عجیب سی محسوس کی۔“

”ایک منٹ ابھی بتاتا ہوں۔“ اس نے

قدرے دیر بعد کہا۔ ”اس سنیا سی نے مجھے آج جو دوا دی وہ اس قدر کڑوی تھی کہ بتانا نہیں سکتا تھا۔۔۔ گھلے ہوئے سیسے کی طرح گرم تھی کہ اس نے میرے تن بدن کو جیسے گھولا دیا اور اس کے اثر سے میری آواز بھی بدل گئی ہے۔۔۔ اف اس کا رخ اور ذائقے کا اثر ابھی تک میری زبان پر موجود ہے۔“

”کیا تم نے سنیا سی سے مل کے اپنی اس کیفیت کے بارے میں نہیں بتایا۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”اس نے تمہارا گلا خراب کر کے رکھ دیا ہے۔“

”میں نے اس سے کہا تھا کہ تم نے میری یہ کیا حالت کر دی ہے۔“ راحت بولا۔ سنیا سی نے دلاسا دیا۔ ”تم پریشان نہ ہو۔ دو ایک دن بعد ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

”خدا کرے تم ٹھیک ہو جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ اس نے کوئی غلط دوا دے دی ہے۔“

”سنیا سی نہ صرف بہت تجربہ کار ہے بلکہ قابل بھی ہے۔ وہ ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ میں نے آج تک کسی مریض سے اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں سنی۔“

اس وقت مجھے راحت کا آنا سخت ناگوار گزرا تھا۔ عجیب اور پراسرار سا۔۔۔ اس کے علم میں یہ بات تھی کہ نیم سہ پہر کے وقت انہی سسرال چلا جاتا ہے۔۔۔ میں صبح سے شام تک گھر میں اکیلا ہوتا ہوں۔ میں اتوار گھر پر گزرتا ہوں۔ میں چوری کے اس واقعے کے بعد کئی اتوار اس سے ملنے نہیں گیا۔ اس بات نے اس کے دل میں شک پیدا کر دیا تھا کہ میں ہفتہ کی رات اور اتوار کا دن اور رات شراب اور شباب سے دل بہلاتا ہوں۔ کیوں کہ میں مرد ذات ہوں۔ آسام میں بہت غربت ہے۔ دلی سلی کا سامان بھی بہت ہے ہر قسم کی لڑکیاں عورتیں کوڑیوں کے مول مل جاتی ہیں۔ لیکن میں اس فحاشی کا قائل نہیں ہوں۔۔۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ آسام اور بنگال میں عورت نہ صرف حقیر بلکہ ارزاں بہت تھی۔ مگر میں نے بھی اپنے آپ کو بھولے سے بھی آلودہ نہیں کیا تھا۔۔۔ میں ہر لڑکی عورت کو عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ میری اس شرافت کی وجہ سے یہاں میری بہت عزت تھی۔ شاید راحت یہ دیکھنے کے لیے اور غیر متوقع طور پر آیا تھا کہیں غلاطی کے دلدل میں دھنسا ہوا تو نہیں ہوں۔

”چلو۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”گھر میں چل کے بیٹھو میں تمہارے لیے کافی بناتا ہوں جو خاص طور پر کلکتہ سے منگوائی ہوئی ہے۔“

”نہیں دوست۔۔۔!“ وہ بولا۔ ”میں نہ تو اندر جاؤں گا اور نہ ہی کافی پیوں گا۔ سنیاسی نے مجھے چائے اور کافی سے سختی منع کیا ہوا ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ میں نے تعجب لہجے میں کہا۔ ”آخر گھر کے اندر چلنے میں حرج ہی کیا ہے؟“

”دراصل میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں صبح تک رہوں۔ مجھے پو پھینے سے پہلے ہر قیمت پر گھر پہنچنا ہے۔“

”اگر ایسی بات تھی تو تم آئے کیوں۔۔۔“ میں نے کہا۔ ”تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔“

”میں نے ابھی ابھی تم سے کہا ہے تاکہ تمہارے دوست کی بیوی کا مسروقہ مال برآمد کرانے آیا ہوں۔“ وہ بولا۔

”مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم گھر والوں سے چوری چھپے آئے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تمہارے گھر والے دہلی سے آئے ہوئے ہیں۔“ وہ میری بات سن کے خاموش رہا۔ اس نے جواب دینا نہ جانے کیوں مناسب نہیں سمجھا تھا۔

میں نے چند ثانیوں کے بعد اس سے کہا۔ ”کیا تم ابھی اور اسی وقت واپس چلے جاؤ گے۔“

”ہاں۔“ راحت نے سر ہلا دیا۔ ”ایسا کرو تم میرے ساتھ چلو۔“ اس کی آواز بہت پست تھی۔

نہ جانے کیوں مجھ پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔۔۔ جب میں اس کے ساتھ چلنے لگا تو میرے قدم لڑکھڑانے لگے۔۔۔ اس نے میری حالت بھانپ لی۔ پھر اس نے افسوس ناک لہجے میں کہا۔ ”کیا تمہیں میری ذات سے کوئی خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔“

”نہیں دوست۔۔۔“ میں نے دل کڑا کے کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ نیند کی وجہ سے غنودگی ہو رہی ہے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ جانا کہاں ہے۔“

”بس تم میرے سگ خاموشی سے چلو۔“ وہ ہنسنا تو اس کی ہنسی بھونڈی اور بے ہنگم ہی تھی۔ ”تمہیں

خود ہی جلد معلوم ہو جائے گا۔“

میں لا جواب ہو گیا۔ چوں کہ چلنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ اس لیے طوہا کر ہاں کے ہمراہ ہولیا۔

بدھ کا یہ شکستہ، ویران اور غیر آباد مندر اپنی قدامت کے لحاظ سے مافوق الفطرت خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں بہت ساری کہانیاں زبان زد عام تھیں۔ لوگ اسے بھوت پریت کا مسکن کہتے تھے۔ یہاں خوف ناک قسم چڑیلیں چاندنی راتوں میں آتی ہیں اور مندر کے ہال میں صبح ہونے تک رقص کرتی ہیں اور لاشیں لا کے ان کا خون پیتی رہتی ہیں۔ اگر کسی نے بھولے سے کسی چڑیل کو دیکھ لیا وہ اس کی خوف ناک اور مکروہ شکل دیکھ کر نہ صرف بے ہوش ہو جاتا بلکہ اسے ایسا تیز بخار چڑتا کہ ہفتوں اترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

یہ بخار ایک طرح کا عذاب ہوتا تھا جس سے سارا بدن ٹوٹ جاتا تھا۔ ہاتھ پیروں کی طاقت توڑ کے رکھ دیتا تھا۔۔۔ کئی ایک یہ بھی کہتے تھے کہ اس مندر میں ایک چڑیل کا بئیرا ہے جو رات کے وقت حسین اور بے پناہ پرکشش دوشیزہ کا روپ دھار کے اور نہایت نامناسب حالت میں احاطے کی منڈیر کے قریب کھڑے ہو کے ان راہ گروں کو پکارتی ہے جو جوان اور خوب صورت ہوتے ہیں، ان سے اظہار محبت کرتی ہے۔۔۔ نہایت وارثی فیاضی اور خود سپردگی سے خود کو ان کے حوالے کر دیتی ہے۔۔۔ وہ محبت کا جواب محبت سے پا کے خوش ہو جاتی ہے۔۔۔ اگر اس راہ گیر نے ہر طرح سے اسے خوش کیا تو اسے حلوہ پوری پیش کرتی ہے۔۔۔ پھر وہ حلوہ پوری ایسی گندگی میں بدل جاتی ہے کہ کھانے کے قابل نہیں رہتی ہے۔

اس کے علاوہ اس آبادی کے بڑے بوڑھے حلیفہ کہتے تھے کہ انہوں نے دن دھاڑے درختوں پر سیکڑوں اور ہزاروں چراغ جلتے دیکھے ہیں۔ ان کی روشنی اس قدر تیز ہوتی ہے کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اس کے متعلق بہت ساری روایتیں مشہور تھیں۔

ان میں ایک روایت کو اکثر لوگ بیان کرتے ہیں کہ مندر کے تہ خانے میں خزانہ دفن ہے اور ایک بہت بڑا سانپ اس پر بطور نگہبان پہرہ دے رہا ہے۔ اس سانپ کی لمبائی چالیس فٹ ہے اور موٹائی بارہ فٹ ہے۔۔۔ اگر دشمن وہاں چالیس دن تک ایک ٹانگ پر کھڑا رہے تو سانپ اس پر مہربان ہو کے اسے مالا مال کر دیتا ہے۔ کئی لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ مندر کسی راجہ نے بدھ مذہب کے پرستاروں کے لیے بنوایا تھا۔

میں نے ہمیشہ ان روایات کا مذاق اڑایا تھا۔ کیوں کہ عقل انہیں تسلیم نہیں کرتی تھی۔ میں تو ہم پرست نہیں تھا۔ میں نے جدید اعلا تعلیم حاصل کی ہوئی تھی۔ میں فرسودہ باتوں اور واقعات کو من گھڑت قرار دیتا تھا لیکن اس وقت راحت مندر کے احاطے میں داخل ہو رہا تھا تو وہ تمام روایتیں نقوش ذہن کی سطح پر ابھر ابھر کے پایہ استقلال کو لڑکھڑا رہے تھے۔ میں خوف زدہ ہو رہا تھا کہ میں جو بڑا تیس مارخان بننا تھا اب میری حالت ایک بزدل کی سی ہو رہی تھی۔

وہاں ایسی ہیئت خاموشی، ہولناک سناٹا اور بھیاںک دیرانی تھی کہ میرے لیے ایک قدم اٹھانا بھی منوں بھاری لگ رہا تھا۔ ایسی پراسرار فضا تھی کہ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں نے کس مصیبت کو دعوت دے دی ہے۔ مجھے مسروقہ مال سے زیادہ اپنی جان عزیز تھی۔ مجھے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ میں نے کس لیے اس کے ساتھ چلنے کی حامی بھر لی۔

میں چلتے چلتے رک گیا راحت نے بھی رک کے حیرت سے میری شکل دیکھی۔

”کیا ہوا میرے دوست رک کیوں گئے۔۔۔“

خیریت تو ہے۔

”یار! لعنت بھیجو مسروقہ مال پر۔“ میں نے کہا۔

”چلو واپس چلتے ہیں۔ مجھے جانے کیوں بہت خوف محسوس ہو رہا ہے۔“

”جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو اس میں

ڈرنے اور گھبرانے کی کیا بات ہے۔“ راحت نے ہمت بندھائی، خاموشی سے چلتے رہو۔ تمہارا بال تک بیکا ہونے نہیں دوں گا۔ اس مندر کے متعلق جو روایات مشہور ہیں وہ سب جھوٹی اور من گھڑت ہیں۔ ان کے بارے میں مت سوچو۔“ راحت نے میرا ایسا حوصلہ بڑھایا تھا کہ میں اس کے ساتھ چلنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کی موجودگی سے حوصلہ بھی ہو رہا تھا۔

مندر کے احاطے میں درختوں کی کثرت جھاڑیوں اور بیلوں کی افراط کی وجہ سے گھپ اندھیرا تھا۔ ایسا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھی نہیں دیتا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑے دیکھتا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ ادبچی اوچی گھاس جو قد آدم تھی اس میں چلنا سخت دشوار تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔۔۔ چل رہا تھا اور بچپور اور بے بس سا بھی تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ راحت اس طرح سے چل رہا تھا جیسے وہ تارکول کی میڑک پر چل رہا ہو۔ اسے کوئی رکاوٹ نہیں لگ رہی تھی اور نہ ہی اس پر کسی چیز کا اثر ہو رہا تھا۔

لیکن میں اس کے پیچھے اندھوں کی طرح ٹٹولتا قدم اٹھاتا ہوا چلنے لگا۔ خاردار جھاڑیوں کی رگڑ سے میرے کپڑے پھٹ گئے۔ جب کہ راحت کے کپڑے بالکل محفوظ رہے تھے۔ میرے منہ اور ہاتھوں پر بھی خراشیں آ گئیں اگر وہ اپنے آپ کو سنبھال کے نہیں چلتا تو میری طرح زخمی ہو جاتا۔ کبھی کبھی میں اس طرح جھاڑیوں کے ساتھ ٹکراتا کہ جنگلی برندے خوف زدہ ہو کر پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے گھونسلوں سے باہر نکل آئے۔

آخر ایک جگہ راحت اچانک میری نظروں سے گدھے کے سر کے سینک کی طرح غائب ہو گیا۔ کس سمت میں، کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔ جیسے اسے کسی بھوت نے غائب کر دیا ہو۔ میں دم بخود سا تھا کہ وہ اچانک اس طرح سے غائب ہو گیا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینک۔۔۔ میں نے سنا تھا کہ اس مندر میں بھوت بیسرا کرتے ہیں۔ انہیں کسی انسان کا مندر کے احاطے میں قدم رکھنا سخت ناگوار لگتا تھا۔ اس لیے

مجھے ایسا لگا کہ کسی نادیدہ طاقت نے مجھے بے بس کر کے رکھ دیا ہے۔ میں اس کے رحم و کرم پر ہوں۔۔۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے راحت کو دو مرتبہ اس خیال سے آواز دی کہ وہ اندھیرے کے باعث مجھ سے پچھڑ کے بھٹک گیا ہے۔ شاید اندھیرے میں مجھے تلاش کر رہا ہے۔ مجھے میری اس آواز کا جواب نہیں ملا۔ شاید اس تک میری آواز نہ پہنچ سکی ہو۔

تھوڑی دیر تک میں خود فراموشی کی حالت میں کھڑا رہا۔ میرے دل کی حالت غیر ہو رہی تھی اور بعض ڈوبتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک عجیب سی بات یہ ہوئی کہ میں نے جب آگے کی جانب قدم بڑھایا تو کوئی رکاوٹ نہ ہوئی اور نہ ہی اس نادیدہ طاقت نے مجھے روکا۔۔۔ لیکن جب میں نے واپس ہونا چاہا تو اس طاقت نے مجھے واپس نہ ہونے دیا۔ اس نے مزاحمت کی تو میں ایک قدم بھی بڑھانہ سکا۔۔۔ وہ طاقت مجھے کشاں کشاں آگے کی جانب کھینچ رہی تھی اور میں مجبور تھا۔

یہ ایک اس خاموشی اور ہول ناک فضا میں چیخوں کی آواز بلند ہوئی۔ میں ایک دم سے اس طرح اچھل پڑا جیسے ہزار وولٹ کا شدید جھٹکا لگا ہو اور پھر کسی نے مجھے گڈے کی طرح اچھال دیا۔ یہ آواز کچھ ایسی دل خراش اور لرزہ خیز تھی کہ کوئی کمزور دل کا آدمی سنا تو یقیناً بے ہوش ہو جاتا۔۔۔ اس آواز پر دھوکا ہوتا تھا کہ کسی متورم گلے یا زخمی ذہن سے نکل رہی ہو۔۔۔ میرا دل اچھل کے حلق میں دھڑکنے لگا اور میرے ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے۔ یہ جو پہنچ تھی کسی انسان کی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔۔۔ کوئی زخمی درندہ تھیا پھر کوئی بدروح۔۔۔ میرا خیال یہاں تک راحت کی طرف چلا گیا۔ کیوں کہ اس کی بدلی ہوئی آواز ایسی بھونڈی، کرخت اور بے روح تھی کہ ساعت پر بہت گراں گزرتی تھی۔

چند لمحوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ نادیدہ طاقت مجھے کشاں کشاں آگے کی طرف لے جا رہی

انہوں نے راحت کو غائب کر دیا تھا کہ وہ مجھے لے کر آیا تھا اور بے خوف اور غدر ہو کے چل رہا تھا۔۔۔ بھوتوں کو ہر ذرا ذرا سی بات کا فوراً ہی علم ہو جاتا ہے۔ میں نے چاہا کہ میں بھاگ جاؤں لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کس سمت جاؤں اور واپسی کا راستہ کون سا ہے؟

گھپ اندھیرے کے باعث باہر نکلنے کا راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔۔۔ درخت، گھاس اور جھاڑیاں سب سے بڑی رکاوٹ تھیں اس مندر کا احاطہ بہت بڑا تھا۔ اس میں اتنے درخت اور جھاڑیاں تھیں کہ اس کی عمارت نظر نہیں آتی تھی۔ میں نہ صرف حیران اور پریشان تھا بلکہ خوف زدہ بھی تھا۔۔۔ کہ اگر کسی بھوت نے مجھے دیکھ لیا تو غائب کر کے نہ لے جائے یہ ایک امکان تھا کہ جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ خدا جانے بھوت نے راحت کا کیا حشر کیا ہو۔

پھر اس جڑیل کا خیال آیا جو حسین دوشیزہ کا روپ دھار کے راہ گیروں کو پکار رہی تھی۔ جس وقت میں راحت کے پیچھے پیچھے چل رہا

تھا۔ اس وقت شاید میں نے ایک مترنم آہوائی آواز سنی تھی۔ اس آواز میں بڑی مٹھاس اور تنگی سی بھی تھی۔ شاید راحت اس آواز کو سنتے ہی اس سمت لپک گیا تھا۔ اس کی اس خود غرضی اور بچ منہ ہار میں چھوڑ کے جانے پر سخت غصہ آیا تھا۔ اب وہ اس کے ساتھ عمارت کے اندر جا کے فائدہ اٹھا رہا ہوگا اور اس دوشیزہ کو خوش کر رہا ہوگا۔ پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ راحت کا انتظار کرنے کے بجائے واپس جانا چاہیے۔۔۔ اس سے جلد واپسی کی توقع بے کار ہے۔ وہ دونوں صبح ہونے تک نشاط انگیز لمحات میں ڈوبے رہیں گے۔۔۔ اندازے سے میں واپس جاسکتا ہوں۔ چاند کی دودھیا روشنی جو درختوں سے چھن چھن کے زمین پر پڑے گی وہ میری رہنمائی کرے گی۔ پھر میں اس احاطے سے باہر نکل جاؤں گا۔ جب میں نے واپسی کی کوشش کی تو باوجود پوری طاقت صرف کرنے میں مڑ نہ سکا۔



ہے۔ مجھے اپنے آپ پر بالکل اختیار نہیں رہا تھا۔۔۔  
 یہ اسرار میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں نے اپنے آپ  
 کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے اپنی پوری  
 طاقت جمع کر لی۔ لیکن اس سے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔  
 ہر کوشش اور جدوجہد بے سود ثابت ہوئی۔ عجیب سی  
 بات یہ تھی کہ میں نے اپنے بدن اور ہاتھ پیر پر کچھ بھی  
 محسوس نہیں کیا تھا۔ جو مجھے سمجھنے کے لیے چاہا ہو۔ میں  
 چٹا گیا۔۔۔ میری حالت ایسی ہو رہی تھی کہ میں کسی  
 بھی لمحے زمین پر کسی کئے ہوئے درخت کی طرح گر  
 سکتا تھا۔ مجھے کچھ دور جا کے زمین صاف دکھائی دی۔  
 یہاں جو فرش تھا وہ پتھر کا تھا جس کے درمیان بوسیدہ  
 اور قدیم ترین مندر کھڑا تھا۔ عین اس وقت چاند نے  
 اپنے اوپر سے نقاب کا کونا سرکایا تو چاروں طرف  
 دودھیا چاندنی کا جال بکھر گیا۔ اس کی کچکپائی تھرکتی  
 چاندنی میں میں نے جو کچھ دیکھا اس نے مجھے بھونچکا  
 کر دیا۔ وہ منظر میرے لیے ناقابل یقین تھا۔۔۔  
 میں نے دیکھا کہ راحت ایک تناور درخت کے قریب  
 کسی سے دست و گریبان ہے۔ میرے دل کی  
 دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔ ایسا لگا میرا سینہ شق  
 ہو جائے گا۔ دل پھڑ پھڑاتا ہوا باہر نکل آئے گا۔  
 میرے پاؤں کو زمین نے جیسے اپنے شکنجے میں لے لیا  
 تھا اور میں جنش تک نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ دل  
 خراش چیخوں کی آواز انتہائی خطرناک حد تک تھی۔  
 یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی خبیث روح آتشیں  
 زنجیروں میں جکڑی ہوئی چیخ رہی ہے۔ میں ایسا  
 حواس باختہ اور دہشت زدہ ہوا کہ ایک قدم بھی نہ جا  
 سکا۔ راحت چوں کہ سفید براق لبادے میں تھا اس  
 لیے وہ سفید سائے کی طرح دکھائی دے رہا تھا لیکن وہ  
 جس سے دست و گریبان تھا وہ اس لیے دکھائی نہیں  
 دیتا تھا کہ اس کا لباس سیاہ تھا اور شاید وہ خود بھی سیاہ  
 تھا۔ اس کے علاوہ اسی جانب گھٹا درخت اور اندھیرا  
 تھا۔۔۔ وہ یقیناً کوئی خبیث روح ہی تھی۔۔۔ کیوں  
 کہ میں نے دو ایک مرتبہ اس کے سفید چمکیلے دانت  
 اندھیرے میں چمکتے دیکھے تھے۔۔۔ لیکن کیا ایک

انسان خبیث قسم کی روح سے نبرد آزما ہو سکتا  
 ہے۔۔۔ وہ حریف شاید روح نہ ہو اور اس نے ایسا  
 لبادہ پہن رکھا ہو کہ اندھیرے میں مجھے اس کے  
 دانت ایک روح کی طرح محسوس ہو رہے ہوں۔ پھر  
 بھی یہ ماجرا کچھ سمجھ میں نہ آ سکا۔ تھوڑی دیر بعد  
 راحت کا حریف چیتا چلاتا بھاگ گیا۔ پھر فضا پر سناتا  
 چھا گیا تو میں راحت کی جانب تیزی سے بڑھا۔  
 راحت نے درخت کی کھوہ میں ہاتھ ڈال کے کچھ  
 نکالا۔۔۔ وہ کیا چیز تھی۔۔۔! مجھے اندھیرے کے  
 باعث نظر نہ آ سکی۔ پھر وہ تیزی سے گھوما اور بجلی کی سی  
 سرعت سے واپس چلنے لگا۔ واپسی میں کوئی دشواری  
 پیش نہیں آئی۔ میں نے راحت سے چلتے ہوئے دو  
 ایک سوال کیے۔ اس نے میرے ایک سوال کا جواب  
 بھی نہیں دیا۔ اس کی خاموشی نہ صرف بہت پر اسرار  
 تھی بلکہ مجھے زہر بھی لگ رہی تھی۔

جب ہم دونوں مندر کے احاطے سے باہر  
 آئے تو اس نے ایک چری تھیلی میری طرف بڑھا  
 دی۔  
 ”یہ تو میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر  
 دیا۔“

”کیسا وعدہ۔۔۔؟“ میں نے اس کے ہاتھ  
 سے چری تھیلی لیتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ تھیلی  
 پھولی ہوئی اور وزنی تھی۔

”اس میں تمہارے دوست نسیم کی بیوی ساحرہ  
 کے چوری ہونے والے زیورات ہیں۔“ راحت نے  
 جواب دیا۔ چور نے زیورات ڈبے میں سے نکال  
 لیے تھے۔ یہ زیورات اس تھیلی میں ہی تھے۔

میں نے تھیلی کا منہ کھول کے اندر جھانکا۔۔۔  
 خوب صورت اور قیمتی زیورات و جواہرات جو ہیرے  
 کے تھے وہ جگ مگارہے تھے۔

”کیا چور نے یہ زیورات اس مندر کے  
 احاطے میں چھپا رکھے تھے۔“ میں نے تھیلی کا منہ بند  
 کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ کیوں کہ اس سے محفوظ جگہ کوئی اور

”گھر میں نہ بیوی اور بچے۔“ میں نے کہا۔  
 ”صرف تمہارے والدین آئے ہیں۔ شاید تم اس  
 لیے صبح جانا نہیں چاہتے ہو کہ انہیں شک ہو جائے گا  
 کہ کہیں تم اپنی محبوبہ سے ملنے چلے گئے ہو۔“  
 ”تم یہی سمجھو۔“ اب جو وہ مسکرایا تو اس کی  
 مسکراہٹ معنی خیز تھی۔

”جب میں نے اس جادوگر لڑکی کا علاج کرایا  
 اور وہ صحت یاب ہو گئی تو مجھ سے اتنی خوش اور متاثر ہو  
 گئی تھی کہ محبت کرنے لگی تھی۔۔۔ یہ آسامی لڑکیاں  
 عورتیں جب محبت کرنے لگتی ہیں تو بڑی فیاضی سے  
 مہربان ہو جاتی ہیں۔ ان کے نزدیک محبت میں ہر  
 بات جائز ہوتی ہے۔ کوئی رات ایسی نہیں تھی کہ وہ  
 میسرے ہاں آ کے صبح نہ چلی جاتی ہو۔ وہ نہایت حسین  
 تھی۔ اس سے ایک لڑکا محبت کرتا تھا۔ اس نے ان  
 دنوں میرے والد سے میری شکایت کر دی تھی۔  
 حالانکہ وہ ہم دونوں کی مشترکہ محبوبہ تھی۔ میرے والد  
 نے میری سرزنش کی اور مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اسے  
 نہ ملوں گا۔ میں اپنے والدین سے کیا وعدہ نبھاتا آ رہا  
 ہوں۔ اس لیے میں جلدی واپسی جانا چاہتا ہوں۔“  
 ”لیکن تو بتاتے جاؤ کہ چور کون تھا۔۔۔!“  
 میں نے بے تابی سے دریافت کیا۔ ”کیا تم بتا سکتے  
 ہو۔“

”تم چور کے بارے میں جان کے کیا کرو  
 گے۔۔۔“ راحت نے جواب دیا۔ ”کیا یہ کافی نہیں  
 کہ زیورات مل گئے۔“  
 ”یہ نہایت ضروری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ایک  
 تجسس سا ہے اور اشتیاق بھی ہے چور کے بارے میں  
 جاننے کے لیے۔“

”اچھا۔۔۔!“ وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔  
 دیوار کے ساتھ جو چوہ ترہ تھا مجھے لے کے اس پر بیٹھ  
 گیا۔ ”سنو۔۔۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ کچھ توقف  
 کے بعد وہ گویا ہوا۔

”آج سے دس برس پہلے کی بات ہے۔ موضع  
 شانگ میں ایک لڑکی رہتی تھی۔ وہ بہت ہی حسین و

نہیں ہو سکتی تھی۔“ راحت نے کہا۔ ”پولیس کو کیا اس  
 کے فرشتوں کو بھی خیال نہیں آ سکتا تھا کہ مسروقہ مال  
 یہاں چھپایا جا سکتا ہے۔“  
 ”لیکن تمہیں اس بات کا کیوں کر خیال آیا کہ  
 یہ مسروقہ زیورات یہاں چھپائے گئے ہوں گے۔“  
 میں نے سوال کیا۔

”تم یہ بات جانتے ہو کہ میں ایک بہترین  
 سراغ رساں رہ چکا ہوں اور دوسرے سراغ رساںوں  
 سے ہٹ کے سوچتا ہوں۔“ راحت نے جواب دیا۔  
 ”پولیس کی کھوپڑی میں عقل نہیں ہوتی ہے۔۔۔ وہ  
 شواہد کی روشنی میں مجرم کو پکڑتے ہیں۔ اس طرح  
 ایک ڈاکٹر ٹیسٹ کے بعد مرض کی تشخیص کرتا  
 ہے۔۔۔ جب کہ ایک حکیم نبض دیکھ کے بتا دیتا ہے  
 کہ کیا مرض ہے۔۔۔ تم مجھے ایک حکیم سراغ رساں  
 سمجھ لو۔ میں نے تمہاری زبانی چوری کا احوال سنا تو  
 میرا ذہن مندر کی طرف چلا گیا۔“

”لیکن تمہاری یہ باتیں مجھ سے بالاتر ہیں۔“  
 میں نے کہا۔ ”تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔۔۔ آج  
 میں نے تمہارا اپنا اور غیر معمولی روپ دیکھا ہے اور  
 تمہاری صلاحیت بھی زبردست ہے۔“

”درست۔۔۔! بات صرف اتنی ہی ہے کہ میں  
 کچھ سلفی علم بھی جانتا ہوں۔“ راحت مسکرا دیا۔ اس کی  
 مسکراہٹ بڑی عجیب اور معنی خیز تھی۔ ”میں نے ایک  
 آسامی جادوگر سے کچھ پراسرار علوم سیکھے۔ اس نے  
 یہ علوم مجھے اس لیے سکھائے کہ میں نے اس کی  
 نوجوان بیٹی کا علاج کرایا تھا جو دو برس سے بیمار چلی آ  
 رہی تھی۔ اس سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ اچھا  
 اب میں چلتا ہوں۔“

”ایسی بھی کیا جلدی ہے صبح چلے جانا۔“ میں  
 نے کہا۔ ”گھر چلو۔۔۔ وہاں چل کے بیٹھتے ہیں اور  
 باتیں بھی کرتے ہیں۔“

”نہیں۔۔۔ میں صبح تک کسی حالت میں نہیں  
 رک سکتا۔“ راحت نے کہا۔ اس کے سراپے میں ایک  
 ارتعاش سا اٹھا۔ ”یار! مجبوری ہے۔“

جھیل تھی۔ اس کے چہرے کے خدو خال میں ایسا  
 نیکھا پن اور ایسی جاذبیت تھی کہ وہ دل کی اتھاہ  
 گہرائیوں کو چھو لیتی تھی۔ اس کی ستواں ناک اس  
 کے چہرے کی سندرتا میں اضافہ تھی۔ اس کی آنکھیں  
 بہت ہی سیاہ اور بہت بڑی بڑی اور چمک دار تھیں۔  
 اس کی چاندنی پیشانی تھی۔ اس کے ریسی سیاہ بال  
 اتنے لمبے تھے کہ کمر پر چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی  
 طرح بل کھاتے تھے۔ اس کے حسن کی کرشمہ  
 سازیاں واضح تھیں وہ سراپا بے مثال تھا۔ وہ حسن و  
 جمال ایسا شاہکار تھی کہ اسے جو دیکھتا تھا دل تھام لیتا  
 تھا اور اس کی راتوں کی نینداڑ جانی تھی۔ اس کی ایک  
 جھلک دیکھنے کے لیے صرف لڑکے ہی نہیں شادی شدہ  
 مرد بھی بے تاب رہتے تھے۔

اس میں پندار حسن بھی اس قدر تھا کہ وہ کسی کو  
 خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس کے عشق میں بہت  
 سارے جوان گرفتار تھے۔ اسے کوئی جوان کیا ہی  
 خوب صورت، وچیرہ اور دراز قد کیوں نہ ہو پسند نہ  
 تھا۔ وہ اپنے آپ کو شہزادی یا مہارانی سے کم نہیں سمجھتی  
 تھی۔ اس نے بڑے بڑے زمین داروں، جاگیر  
 داروں اور دولت مند گھرانوں کے لڑکوں کے رشتے  
 بھی ٹھکرا دیے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے شادی  
 کرنے کے لیے خوابوں کا کوئی شہزادہ آئے گا۔  
 ایک تو وہ گھر سے بہت کم نکلتی تھی۔ وہ جب کبھی  
 نکلتی تو جوان لڑکوں اور مردوں کے دل دھڑکنے بھول  
 جاتے تھے۔ جو لڑکے اس کی محبت کی آگ میں جل  
 رہے تھے وہ یک طرفہ عشق تھا۔۔۔ محبت پر کسی کا زور  
 نہیں چلتا۔ دو ایک وچیرہ لڑکیوں نے دل، جذبات  
 اور اس کے ہجیان خیز اور قیامت انگیز سراپا اور حشر  
 سامانیوں۔۔۔ اور اسے دو ایک مرتبہ تالاب پر تنہائی  
 میں اکیلے نہاتے تیرتے دیکھا تو خود پر قابو نہ پاسکے۔  
 اسے دبوچ لیا۔ قابو پا کے بے بس کرنے لگی۔ وہ  
 حسین ہی نہیں ذہین بھی تھی۔ چوں کہ کڑیل مردوں  
 سے وہ نازک اندام مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔۔۔ اس  
 نے فریب سے کام لے کے من مانیاں کرنے دیا اور

خود سپردگی سے پیش آنے لگی۔ لڑکے اس کے فریب  
 میں آ گئے تو اس نے انہیں اچانک دھکا دے کے  
 تالاب میں گرادیا۔ پھر کنارے پڑے پتھروں سے  
 انہیں ابولہان کر دیا اور اپنے کپڑے اٹھا کے گھر بھاگ  
 آ گئی۔ وہ لڑکے شدید زخمی ہوئے اور مرتے مرتے  
 بچے تھے اور دو مہینے تک بستر پر لگے رہے۔ لڑکوں پر  
 اس کی ہیبت ایسی طاری ہوئی تھی کہ کوئی بھی لڑکا مرد  
 قریب سے گزرتا ڈرتا تھا۔ کیوں کہ وہ کسی غضب  
 ناک ناگن کی طرح پھنکارنی لگتی تھی۔

محبت ایک ایسا جذبہ ہے کہ اس پر بس نہیں چلتا  
 ہے۔ بد قسمتی سے اس لڑکی کے عشق میں ایک ایسا  
 جوان بھی گرفتار ہو گیا تھا جس کا تعلق اچھے گھرانے  
 سے تھا۔ لیکن وہ مفلس اور فلاں تھا۔ مگر وہ بہت خوب  
 صورت اور وجیرہ تھا۔ اس میں جو بے پناہ سحر تھا وہ اس  
 کا دراز قد تھا۔ پوری آبادی میں اس کا ساق آؤر کوئی  
 مرد نہیں تھا۔ بستی کی نہ صرف دو شیرا میں اس پر فدا  
 تھیں بلکہ جوان سال شادی شدہ عورتیں بھی۔۔۔ وہ  
 اس کی جھولی میں یکے آم کی طرح ٹھکنے کے لیے ہر  
 وقت بے تاب رہتی تھیں۔ وہ نہ تو ان لڑکیوں، عورتوں  
 کی طرف متوجہ ہوتا تھا بلکہ نگاہ اٹھا کے بھی نا دیکھتا  
 تھا۔ وہ لڑکی اس پر دل و جان سے چھا گئی تھی۔

ایک روز دوپہر کے سنائے میں ویرانے میں  
 موقع پا کے لڑکی کو روک لیا۔ لڑکی کا خیال تھا کہ وہ  
 اسے اس ویرانے میں دل بہلانا اور پامال کرنا چاہتا  
 ہے۔ لیکن اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ چاہتا تو  
 لڑکی کو بڑی آسانی سے قابو میں کر کے بے بس کر سکتا  
 تھا۔ وہاں اس کی چیخ و پکار اور مدد کے لیے آنے والا  
 کوئی نہیں تھا۔ لڑکا شریف تھا۔ اس نے ایسی کوئی  
 حرکت نہیں کی جو معیوب اور ناشائستہ ہو۔ اس لڑکی  
 نے ٹھٹھک کے اس سے کہا۔ ”میرے سامنے سے ہٹ  
 جاؤ۔“

”میں ایک شرط پر تمہارے سامنے سے ہٹ  
 سکتا ہوں۔“ لڑکے نے اس کے غصے کی پروا نہ کرتے  
 ہوئے کہا۔

”کیا شرط ہے تمہاری۔۔۔“ لڑکی پھٹکاری۔  
”جلدی سے بتاؤ اور نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔“

”میری شرط یہ ہے کہ تمہیں میری پوری بات سننا ہوگی۔“ لڑکے نے جواب دیا۔ ”میں اس وقت تک تمہیں جانے نہیں دوں گا جب تک تم میری پوری بات نہیں سن لوگی۔۔۔ میں صرف پانچ سات منٹ لوں گا۔ پھر میں کبھی تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔“

”تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو وہ جلدی سے بکو۔“ لڑکی نے نہ صرف تیز رفتاری سے بلکہ بدتمیزی سے کہا۔

”میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

”مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔“ اس نے ہمت کر کے دربار حسن و شباب میں عرض کیا۔ ”میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”محبت۔۔۔“ وہ تہتہ مار کے بڑے زور سے ہنسی۔ ”کیا تمہیں محبت کے لہجے بھی معلوم ہیں۔۔۔ کیا تم جانتے ہو کہ محبت کسے کہتے ہیں۔“

”محبت ایک پاکیزہ اور اچھوتے جذبے کا نام ہے۔“ لڑکے نے اس کی خوب صورت بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ محبت کسے کہتے ہیں۔۔۔! جب دل سے دل مل جاتے ہیں تو محبت دل کی گہرائیوں سے جنم لیتی ہے۔۔۔ تم نے میرے دل میں محبت کی جوت جگادی ہے اس لیے مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔“

”لیکن میرے دل کے کسی کو نے میں تمہارے لیے کوئی محبت نہیں ہے۔۔۔“ وہ مسخر سے بولی۔ ”تم اپنی ہوس کو محبت کا نام دے رہے ہو۔۔۔ کیا میں ہوس پرستوں مردوں کی فطرت اور ان کی میل گھورتی آنکھوں سے واقف نہیں۔۔۔ تم محبت کے نام پر میری عزت سے کھیلنا چاہتے ہو۔۔۔ تم میرے گداز پر شباب بدن کو دیکھ کے کسی بھیڑیے کی طرح لپچا رہے ہو۔۔۔ چوں کہ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔۔۔ تم نہ صرف اس دیرانے میں مجھے تنہا پا کے ہلکی ہلکی باتیں کر رہے ہو مجھے بے وقوف بنا رہے

”ہو۔“

”بستی میں تم کسی لڑکی عورت اور لوگوں سے معلوم کر لو کہ میرا کردار کیسا ہے۔۔۔ میں لڑکیوں عورتوں کو نگاہ اٹھا کے دیکھتا بھی نہیں ہوں۔“ وہ کہنے لگا۔ ”اگر میں ہوس پرست ہوتا تو اب تک جانے کتنی لڑکیاں عورتیں آلودہ ہو چکی ہوتیں۔ اگر میں چاہوں تو تمہیں اس لمحے بھی بے عزت کر دوں۔۔۔ تم ان تک نہیں کر سکو گی اور نہ ہی اس دیرانے میں کوئی تمہاری عزت بچانے آئے گا۔ بہر کیف تم مجھے اپنے دل میں جگہ دو محبت کرنا کوئی مشکل نہیں۔۔۔ میں تمہارے لیے کسی تصوراتی محبوب کی طرح مثالی ثابت ہوں گا۔“

”لگتا ہے کہ تم نے کبھی آئینے میں اپنی شکل نہیں دیکھی۔“ لڑکی نے استہزائی لہجے میں کہا۔ ”تم خوب صورت اور وجہ ہو تو میری جوتی۔۔۔ میرے دل میں تمہارے لیے محبت نہیں نفرت ہی جنم لے سکتی ہے۔۔۔ میں تم سے محبت نہیں بلکہ نفرت کر سکتی ہوں۔۔۔ تم سے محبت کیوں اور کس لیے کروں۔۔۔ تم ایک مفلس و فلاح شخص ہو۔۔۔ دو وقت پیٹ بھر کے کھا نہیں سکتے۔۔۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔“

”محبت اندھی ہوتی ہے۔“ لڑکے نے جذباتی لہجے میں جواب دیا۔ ”وہ ذات، پات اور دولت نہیں دیکھتی ہے۔“

لڑکی نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس کے منہ پر ایک زوردار پھٹر دے مارا۔ پھر وہ فوراً تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی بڑھ گئی۔ اسے اس لڑکے کی جرات پر بہت غصہ آیا تھا لیکن وہ اس کی ہمت بے باکی اور صاف گوئی پر دل میں بہت حیران ہوئی تھی۔۔۔ کیوں کہ یہ پہلا لڑکا تھا جس نے اس سے نہ صرف بات کرنے کی کوشش کی تھی بلکہ اظہار محبت بھی کر دیا تھا۔ آج تک کسی لڑکے کا اس سے بات کرنا تو درکنار اس کے سامنے آنے کی ہمت بھی نہیں کی تھی۔ وہ اسے دور سے دیکھ کے شہنشاہی آہیں

زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ وہ جوں کہ بہت حسین و جمیل تھی اس لیے ایک حسین زندگی کی تمنا کی تھی۔ ایک روز رات کے وقت وہ اپنے گھر میں اکیلی تھی۔ اس کی بوڑھی ملازمہ دوسرے کمرے میں سو رہی تھی۔ اس کے گھر والے ایک رشتہ دار کے ہاں شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ وہ شادی بیاہ کی تقریبات میں جانے سے احتراز کرتی تھی۔ کیوں کہ اس کا حسن و شباب اس کا ایک مسئلہ بن جاتا تھا۔۔۔ لڑکے، مرد اور عورتیں لڑکیاں اسے اس طرح گھیرے رہتی تھیں جیسے وہ کوئی مہارانی ہو۔

وہ گہری نیند میں غرق اپنے تصوراتی محبوب کے تصور میں تھی جس نے اسے اپنی آغوش میں لپا ہوا اس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی گرم گرم سائیں اس کے رخساروں کو مہکا رہی تھیں۔ پھر اس کے ہونٹوں کی شیرینی اپنے ہونٹوں میں جذب کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ اس نشاط انگیز لحاظ میں ڈوبی رہی۔۔۔ یہ سہنا اس کے رگ و پے میں سنسنی دوڑا رہا تھا اور خون کی حرارت تیز کر رہا تھا۔۔۔ پھر کسی نے اسے جگایا۔ اس نے دیکھا کہ وہ لڑکا اس کی نظروں کے سامنے اور اس کے کمرے میں ہے تو حیران رہ گئی اور برہم رہ گئی۔۔۔ پھر وہ سمجھ گئی کہ نیند کی حالت میں لڑکے نے اس کے ساتھ من مانیاں کیں۔۔۔ پھر اس نے اپنے آپ کو دیکھا۔ وہ نہ صرف بستر پر آڑھی ترچھی پڑی ہوئی تھی بلکہ اس کا لباس بھی بے ترتیب سا ہو کے اسے بے نیام توار کی طرح نامناسب کر رہا تھا۔

”تم۔۔۔“ فوراً ہڑا کے بستر سے نکل آئی۔ اپنا لباس اور بال درست کیے۔ ایسے یہ بات سمجھتے دیر نہیں لگی کہ وہ جو خواب دیکھ رہی تھی وہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ اس لڑکے نے اس کی مدہوشی کی نیند سے فائدہ اٹھایا۔ لیکن اب وہ کیا کر اور کہہ سکتی تھی۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ نفرت سے بھرے لہجے میں بولی۔ ”تم نے میرے گھر میں گھسنے کی جرات

بھر کے رہ جاتے تھے۔۔۔ وہ اسے اس وقت دیکھتے رہتے جب تک وہ ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتی تھی لیکن دل سے نہیں پ۔۔۔ اب اسے اس بات کی امید نہیں تھی کہ وہ لڑکا اس کے سامنے آئے اور اس سے اظہار محبت کرے۔ کیوں کہ اس نے اس لڑکے کے منہ پر ایک پتھر رسید کر کے اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیے تھے۔ اس کے نزدیک اس لڑکے کی محبت بے حقیقت اور بے قیمت تھی۔۔۔ اور پھر اس لڑکے کے اظہار محبت کو خلل دماغ سمجھ کے خاموشی اختیار کر لی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ لڑکی اسے قابو میں کر کے بے بس کر دیتا تو۔۔۔ اسے پتھر نہیں مارنا تھا۔ اس نے دل میں شکر ادا کیا کہ اس کی عزت محفوظ رہی۔ اگر وہ لڑکا غصے میں آ جاتا تو دو کوڑی کی ہو جاتی۔

پتھر کھانے کے بعد پھر تنہائی میں اس سے مل کے نہ صرف اظہار محبت کیا تھا بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ وہ اسے ہر قیمت پر اپنا بنا کر رہے گا۔ اس لڑکی نے نہ صرف اس کی توہین و تذلیل کی تھی بلکہ اس کے منہ پر طمانچے بھی رسید کئے تھے۔۔۔ اس سے تنہائی میں ملنے اور بات کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ دل میں ڈرتی تھی کہ لڑکا فائدہ نہ اٹھالے۔ اس کے ساتھ حقارت آمیز سے پیش آنے پر اس لڑکی نے بھی اسے پھول کی طرح مسلاتھا۔

لڑکی نے اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا وہ اس لڑکے سے جتنی نفرت کرنے لگی ہے لڑکا اس کے برعکس شدت سے چاہنے لگا ہے۔۔۔ وہ اس بات سے سخت پریشان ہو گئی تھی کہ یہ اس کے لیے ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔۔۔ اور وہ اس لڑکے کو باز رکھے گو کہ بہت خوب صورت تھا۔ ایک طرف تو اس لڑکے پر دل آ گیا تھا۔ وہ بھی چاہتی تھی کہ لڑکا اس سے جی بھر کے من مانیاں کرے گا تو وہ تعرض نہیں کرے گی۔۔۔ لیکن وہ یہ چاہتی تھی کہ اس کا جو بھی جیون ساسھی ہو وہ دولت مند ہو۔۔۔ وہ ایک خواب ناک اور پریش

لیسے کی۔۔۔ تم یہاں کیوں آئے۔“

”اس لیے کہ میں نے تمہیں دو دن سے نہیں دیکھا۔“ لڑکے نے سینے پر ہاتھ رکھ کے عاشقانہ انداز سے کہا۔ ”تم نیند کی حالت میں کتنی حسین لگتی ہو اور چاند سے کہیں حسین دکھائی دیں۔ میں بستر پر تمہارے پاس بیٹھ کے تمہیں دیکھتا رہا۔ تم نے میرے ہوش اڑا دیے۔ میں نے پھر تمہیں۔۔۔“

”میں بہتی ہوں کہ تم چلے جاؤ۔“ لڑکی کا غصہ انہما کو پہنچ گیا پھر اس نے دیوار پر لٹکی ہوئی شکاری بندوق اٹھالی۔ ”اگر تم نہیں گئے تو میں تمہیں گولی مار کے موت کی نیند سلا دوں گی۔ تم نے میرے کمرے میں قدم رکھنے کی جسارت اور مجھے نیند میں پا کے ناشائستہ حرکات کرنے کی جسارت کیسے کی۔۔۔ رذیل۔۔۔ کمینے۔۔۔ میرا بدن اور انگ انگ کیسا درد کر رہا ہے۔“

”چلو۔۔۔ مجھے گولی مار دو۔“ لڑکا اس کے سامنے سینہ تان کے کھڑا ہو گیا اور اس نے بڑے پر جوش اور جذباتی لہجے میں کہا۔ ”محبت کرنے والے موت سے نہیں ڈرتے۔۔۔ میں آج فیصلہ کر کے آیا ہوں کہ میں تم سے شادی کر کے رہوں گا۔۔۔ اگر تم نے شادی سے انکار کیا تو پھر میں تمہیں اٹھا کے لے جاؤں گا۔۔۔ بولو تم شادی کرو گی نہیں۔“

”لیکن تم نے مجھے گہری نیند میں دیکھ کے میرے ساتھ ناشائستہ حرکات کیوں کی۔۔۔؟“ لڑکی نے موضوع بدل کے اسے ٹالنا چاہا۔

”اس میں میرا نہیں تمہارا۔۔۔ تمہاری جوانی اور حسن و شباب کی حشر سامانیوں کا دوش ہے۔ کیا نو جوان لڑکی اس طرح سے سوئی ہے۔ تمہارے جسمانی تشیب و فراز اور انگ انگ سے اپنی مستی مجھے دعوت دے رہے تھے۔ شکر کرو کہ میں نے اپنے جذبات پر قابو پایا اور حد سے تجاوز نہیں کیا۔۔۔ تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ مجھ سے شادی کرو گی نہیں؟“

لڑکی نے دیکھا اور سوچا کہ اگر اس نے شادی

سے انکار کر دیا تو وہ اسے اٹھا کے نہ لے جائے اور پھر نامعلوم جگہ پر لے جا کے اس کے ساتھ بغیر بیاہ کے سہاگ راتیں مناتا رہے اور کسی کو معلوم بھی نہ ہوگا۔ کیوں کہ رات کا وقت ہے۔ اسے لے جانے والے کو دیکھنے والا کوئی نہیں ہے۔۔۔ گواہ اور ثبوت بھی نہیں ہے۔۔۔ اس کے منہ پر کپڑا باندھ دے گا تاکہ چیخ اور چلا نہ سکے۔ ہاتھ پیر بھی باندھ کے بے بس کر دے گا۔ جانے کب تک اس سے کھلونے کی طرح دل بہلاتا رہے گا۔ وہ لڑکے کے تیور دیکھ کے بری طرح گھبرا گئی۔ ایک تو وہ لڑکی ذات بھی اور پھر گھر میں اکیلی تھی۔۔۔ بوڑھی ملازمہ کا ہونا نہ ہونا بے کار ہی تھا۔ یہ کوئی عام قسم کا جوان لڑکا نہ تھا۔ وہ بے حد مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کا چوڑا چکلا سینہ اور بازو فولادی تھے۔ وہ ایسے ایک بچی کی طرح اٹھا سکتا تھا اور پھر بندوق جو بھی وہ خالی تھی۔ اس پر کار تو س نہ تھے اگر اس میں کار تو س ہوتے تو لڑکے کو گولی مارنے میں تامل نہ کرتی۔ بے دریغ بھون کے رکھ دیتی۔

لڑکی نے دل میں وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے سوچا کہ اسے اس وقت نرمی اور محبت سے کام لے کے لڑکے کو بگڑا دینا چاہیے۔ سختی اور انکار سے معاملہ بگڑ جائے گا اس کے ذہن میں ایک تدبیر کوندا بن کے لپکی تھی اس نے کہا۔

”میں تمہاری اس محبت اور عظیم جذبے کی قدر کرتی ہوں۔۔۔ میں اس بات کی قائل ہوگئی ہوں کہ تم مجھ سے سچی محبت کرتے ہو اور اس میں کھوٹ نہیں ہے۔۔۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک میری عزت پر آج آچکی ہوتی۔۔۔ تم مجھے اپنے والدین سے اجازت لینے کے لیے دو دن کی مہلت دو۔ تیسرے دن سہ پہر کے وقت جھیل پر ملونا کہ تمہیں خوش خبری سنا سکوں۔“

یہ سن کے لڑکا خوشی سے پاگل ہو گیا اور جانتے جانتے جی بھر کے من مانیاں کر کے چلا گیا۔ اس نے تعرض اس لیے نہیں کیا کہ لڑکا بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔ اس کی مزاحمت پر حد سے تجاوز کر کے رہتا۔

لگی۔ ”دراصل میں اور میرے والدین چاہتے ہیں کہ شادی کے بعد ہم ایک خوش گوار اور پر مسرت زندگی گزاریں۔۔۔ اس کے لیے دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔ جب تم کثیر دولت بینک میں جمع کرادو گے تو بینک اس رقم پر ہر ماہ جو منافع دے گا اس سے ہم ایک خوش حال زندگی گزار سکتے ہیں۔۔۔ پھر تمہیں محنت مزدوری اور مشقت یا کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہمارے رات دن خواب ناک اور نکلن ہوں گے۔“

لڑکے کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن تم اپنی زبان سے صرف ایک بار کہہ دو کہ مجھے تم سے محبت ہے۔“

لڑکی یہ بات بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ لڑکا ساری زندگی اور خواب میں بھی ایک کثیر رقم کا بندوبست نہیں کر سکتا۔۔۔ اس نے سوچا کہ زبان سے اقرار محبت کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔۔۔ اگر اس نے اظہار محبت نہیں کیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس تنہائی اور ویرانے میں شیطان بن جائے۔ ان دونوں کے سوا یہاں کوئی نہیں اور نہ ہی کسی کے آنے کا کوئی امکان ہے۔ اسے فریب دینے کے لیے لڑکی نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”میں دل سے اقرار کرتی ہوں کہ میں تم سے سچی محبت کرتی ہوں۔ تم میری زندگی کی کائنات ہو۔ تم سے پہلی اور آخری محبت ہے۔“

”تم نے اقرار محبت کر کے میرا دل جیت لیا میرے دل اور خوابوں کی رانی۔“ لڑکے نے سرشاری سے کہا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا کہ دنیا کی حسین لڑکی اس سے اقرار محبت بھی کر سکتی ہے۔

”تم اس محبت اور اپنے اقرار پر حصول دولت تک قائم رہو گی نا۔۔۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھے دولت کے حصول میں کچھ تاخیر ہو جائے تو تم کسی اور سے شادی کر کے گھر بسالو۔“

”ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔۔۔“ لڑکی نے اسے بڑے اعتماد سے دلاسا دیا۔ یہ ایک حربہ تھا لڑکے کو

تیسرے دن لڑکی جھیل پر سہ پہر کے وقت پہنچی تو لڑکا بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ لڑکی نے رکی باتوں کے بعد اس سے کہا۔ ”دنیا میں اس کی کوئی عزت نہیں جو مفلس اور فلاح ہو۔ یہ بتاؤ کہ مجھ سے شادی کرنے کے بعد ہم گزارہ کیسے کریں گے؟“

”میں محنت مزدوری کر کے گھر چلاؤں گا اور تمہیں بھوکا بھی نہیں رکھوں گا۔ ایک شہزادی کی طرح رکھوں گا۔“ لڑکے نے پر عزم لہجے میں کہا۔

”محنت مزدوری سے پیٹ نہیں بھرتا ہے۔۔۔ پھر تم مجھے ایک شہزادی کی طرح کیسے رکھ سکتے ہو۔“ لڑکی بولی۔

”تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔۔۔ یہ چتا کرنا میرا کام ہے۔“ لڑکا بولا۔ ”میں نہیں نہ کہیں سے دولت لا کے تمہارے چروں میں ڈال دوں گا۔“

”میرے والدین اس شادی کے لیے راضی ہیں اور میں بھی تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ لڑکی بولی۔ ”مگر اس شادی کے لیے ایک شرط ہے کہ تم شادی سے پہلے ایک کثیر رقم لا کے بینک میں میرے نام جمع کر دو۔ اس کے بغیر میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔“

”تمہارا یہ وعدہ بکا ہے نا۔۔۔؟“ لڑکے نے مشکوک ہو کے کہا۔ ”نہیں تمہارے والدین اور تم عین موقع پر مکر تو نہیں جاؤ گی۔ میں ہاتھ ملتا رہ جاؤں۔“

”میں اور میرے والدین مکر کرنے کیوں لگے۔“ لڑکی بولی۔ ”تمہارے دل میں ہمارے خلاف شک کیوں پیدا ہو رہا ہے؟“

”اس لیے کہ تمہیں اور تمہارے والدین کو نہ صرف دولت کا لالچ ہے بلکہ ہوس بھی ہے۔“ لڑکا کہنے لگا۔ ”جنہیں دولت کی بھوک اور لالچ ہوتا ہے وہ قائل بھروسہ نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے تمہارے والدین براعتا نہیں ہے۔“

”تم ہمیں غلط سمجھ رہے ہو۔۔۔“ لڑکی کہنے

بے وقوف بنانے کے لیے۔۔۔ میں تم سے سچی محبت کرتی ہوں۔ تمہارے لیے نہ صرف تن من حاضر ہے بلکہ میری جان بھی حاضر ہے۔“

پھر ان دونوں کے بیچ شیطان آ گیا۔ لڑکی اور لڑکے کی وجاہت اور خوب صورتی نے کچھ ایسا جادو کیا کہ اس کے جذبات قابو میں نہ رہے۔ دونوں جب دھول بھرے راستے سے واپس پلٹے تو لڑکی کو جیسے ہوش آیا۔ چپچٹاوا سا ہوا۔ وہ نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

”یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔۔۔ میری عزت تمہارے ہاتھوں برباد ہو گئی۔“

”اب تم صرف میری، صرف میری ہو گئی ہو۔۔۔“ لڑکے نے کہا۔ ”اب ہم دونوں ایک مضبوط بندھن میں بندھ گئے ہیں۔ اب تم میری ملکیت ہو گئی ہو۔۔۔ اپنا تن من مجھ پر نچھاور کیا اس نے ہماری محبت کی جڑیں مضبوط کر دی ہیں۔ اب تم کسی اور کی ہو نہیں سکتی ہو۔۔۔ تمہارے دل میں میری محبت پرورش پائی رہے گی۔۔۔ میں نے تم پر نہ کوئی جبر کیا اور نہ زیادتی کی۔۔۔ تم نے خود اپنی مرضی، خونی اور خود سپردگی سے اپنے آپ کو میرے حوالے کیا اور میری جھولی میں بچے پھل کی طرح ٹپک پڑی ہو۔۔۔ تم نے کسی اور سے شادی کرنے کی خوشی کی تو میں اسے بتا دوں گا کہ تم میری ہو چکی ہو۔۔۔ تم اس بات کا اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکتی ہو۔۔۔ اگر تم نے جھولی سو گند کھائی تو یاد رکھو۔۔۔ اریانہ دیوتا غضب ناک ہو کے تمہیں چڑیل بنا دے گا۔“

آسام میں یہ دستور ہے کہ جب کوئی آسامی دوشیزہ اپنا تن من کسی کو خوشی اور خود سپردگی اور والہانہ پن سے سونپ دیتی ہے تو اس کی مثال ایک بچی کی سی ہو جاتی ہے پھر وہ کسی دوسرے مرد سے نہ تو محبت کر سکتی ہے اور نہ ہی شادی۔۔۔ اگر اس نے بے وفائی کی تو پھر ان کا اریانہ دیوتا غضب ناک ہو کے اس عورت کو چڑیل بنا دیتا ہے۔ یہ آسامیوں کا عقیدہ

ہے اریانہ محبت کا دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ لڑکی کو اس بات کی توقع نہیں تھی کہ لڑکا اس قدر ہوشیار، چالاک اور شاطر ثابت ہوگا۔ اسے غیر محسوس انداز سے جبر و زیادتی سے اپنا بنالے گا۔۔۔ اب وہ کسی لڑکے یا مرد سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اب وہ مجبور اور اس لڑکے کے رحم و کرم پر ہو گئی تھی۔۔۔ لڑکا جب اور جس وقت اور جس گھڑی چاہے اس کے ساتھ وقت گزاری کر سکتا تھا۔ وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ اب اسے ایک بچی اور زرخیز باندی کی طرح خدمت کرنی تھی۔ وہ اس کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ لہذا لڑکے نے تین دن تک اس سے خوب دل بہلایا۔ ایک طرح سے اس نے ان دنوں کا جی بھر کے بدلہ لیا جو وہ لڑکے کے ساتھ بدتمیزی اور جھڑکیوں سے پیش آتی اور نفرت اور تحارت آمیز سلوک کر کے اہانت کرتی رہی وہ ایک گدھ بنا رہا۔۔۔ لڑکی سرد لاش کی طرح پش آتی تھی۔ اس کے باوجود لڑکا اس پر فدا تھا۔ بہر حال لڑکی پر اس لڑکے کا جادو چل گیا تھا اور وہ اس دن کا انتظار کرنے لگی کہ لڑکا رقم لیتا آئے۔ اس نو جوان لڑکے نے مطلوبہ رقم کے لیے سر دھڑکی بازی لگا دی۔ کیونکہ اس کے لیے اتنی بڑی رقم کا حصول ممکن نہیں تھی لیکن اس کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ عجب حوصلے کا آدمی تھا۔ اس نے دولت کے حصول کے لیے بڑی تدبیریں کیں۔۔۔ قسمت اور حالات اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ وہ جتنا جلد ہو سکے اس لڑکی سے شادی کر کے اسے اپنا بنانا اور گھر لانا چاہتا تھا۔ اس روز سے جب لڑکی نے اپنا سب کچھ سونپ دیا اور تین دن جو اس نے سہاگ راتوں کی طرح گزارے تھے تو لڑکی کے حسن و شباب کے جادو اور خود سپردگی نے ایسا دیوانہ بنا دیا تھا کہ اس کے لیے ایک ایک دن کی جدائی بھی شاک اور رروح فرما تھی۔۔۔ فراق کی آگ اسے جیسے بھسم کئے دے رہی تھی۔ اس نے مطلوبہ رقم کے لیے خون پانی ایک کر دیا لیکن ایسی کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ صرف ایک دو سو روپے ہو سکے۔ لڑکی نے اس رقم کے



بارے میں اس کا خوب مذاق اڑایا اور کہا کہ پھر کی جوتی کے لیے بھی یہ رقم نا کافی ہے۔ لڑکی کے دل میں اس کے خلاف اس لیے بھی نفرت بڑھتی گئی تھی کہ وہ جب اس سے جھیل پر ملتا تو محبت کے نام پر فریب دیتا تھا۔ گھڑیوں جی بھرنے تک اس کھیلتا رہا۔ وہ دیوتا کے قہر سے بچنے کے لیے اس کے رحم و کرم پر چلی۔

ایک روز لڑکی نے اس سے صاف صاف مافیہ کہا دیا کہ اگر اس نے ایک مہینے کے اندر اندر رقم کا بندوبست نہیں کیا تو وہ شلائنگ کے زمین دار کے بیٹے مادھو سے شادی کر لے گی اور وہ دیوتا کے قہر کی پروا بھی نہیں کرے گی۔۔۔ وہ جانوروں کو بھگوان کی بھینٹ چڑھا کے دیوتا کے قہر سے بچ جائے گی۔ اب اگر اس نے اپنی محبت کی حد سے تجاوز کرنے کی کوشش کی تو وہ نشاط انگیز لمحات میں اس کے سینے میں خنجر پھونک دے گی۔

وہ کسی قیمت پر اس حسن کی دیوی کی رفاقت سے محروم ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے کراتے دن جو اس نے اس کے ساتھ گزارے تھے لڑکی کے بدن کے جادو۔۔۔ شادابیوں اور رعنائیوں اور کشش کے خزانوں نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ وہ اس سے ایک دن کیا ایک گھڑی بھی جدار ہٹا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک ایسی پرانی شراب خور تھی جس کا خمار اس کا ذہن سے اترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

اور پھر اس لڑکی کی دھمکی نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔۔۔ بے در پے نا کامیوں سے اس کے خیالات باغیانہ ہو گئے۔ پھر سوچ بچار کے بعد اسے ایک آسمان اور شارٹ کٹ راستہ یاد آیا۔ پھر اس نے چوری اور رہزنی کا پیشہ اختیار کیا۔۔۔ اسے کچھ رقم اور زیورات ہاتھ لگے جس سے اس کا حوصلہ اور بڑھا۔ ایک روز اس نے ایک سنار کی دکان پر نوٹوں کی بہت ساری گڈیاں دیکھیں۔۔۔ ایک زمین دار نے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے اس سنار سے شادی کے زیورات بنوائے تھے وہ ان زیورات کی رقم بھی اور پھر ایک یہ بات اس کے علم میں آئی تھی کہ زمین دار

اپنی جمہوری میں نہ صرف رقم بلکہ ہیرے جواہرات کے قیمتی زیورات بھی رکھتا ہے۔۔۔ یہ بات سنتے ہی اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے چشم تصور میں اس لڑکی کو دلہن کے روپ میں دیکھا۔ اس نے لڑکی کو رہزنی کی رقم اور زیورات دکھائے تھے تو لڑکی کو اس پر اعتبار آ گیا تھا کہ اس کا محبوب دولت کے حصول کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ جب ان کی ملاقات جیل پر ہوتی تھی لڑکی اسے ہر طرح اور خود پسندی سے خوش کرتی تھی۔ وہ نہایت فیاضی سے مہربان ہو جاتی تھی۔

اس رات اس نے سنار کے گھر پر ڈاکا مارنے کا منصوبہ بنا لیا۔۔۔ وہ رات کے وقت چوروں کی طرح سنار کے کمرے میں گھس گیا۔ اس وقت سنار اپنے کمرے میں بیٹھا رقم گن رہا تھا۔ اس کی جمہوری کھلی پڑی تھی۔۔۔ اس نے یہ نہیں دیکھا کہ سنار کی جواں سال بیوی کہاں ہے۔۔۔ اس وقت وہ رسوئی میں اپنے پتی کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ اس نے موصول جانا چوں کہ سنار اسے جانتا تھا اور پہچانتا بھی تھا۔ اس وقت وہ اپنے منہ پر دوپٹا باندھے ہوئے نہیں تھا اس لیے اس نے سنار پر بخبر سے پے در پے وار کر کے اسے قتل کر دیا۔۔۔ اس کی بیوی پتی کی چھین سن کے بھاگی ہوئی آئی۔۔۔ جب اس نے لڑکے کو بے دردی اور بے رحمی سے اس کے پتی کو قتل کرتے ہوئے دیکھا تو وہ خوف زدہ اور دہشت سے بے ہوش ہو گئی۔ چوں کہ لڑکے نے سنار کی بیوی کو نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ لڑکے کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ گئی۔ ورنہ لڑکا اسے بھی قتل کر دیتا۔ لڑکے کو گرفتار کر کے پولیس نے رقم اور زیورات بھی برآمد کر لیے۔ پھر اس لڑکے پر مقدمہ چلا۔ پھر عدالت نے اس لڑکے کو سنار کے قتل کے جرم میں سزائے موت سنادی۔

اس حسین لڑکی کو اس لڑکے سے جیسے سدا کے لیے نجات مل گئی جو اس کے لیے کسی طرح سانپ سے کم نہیں تھا اور وہ اسے تین مہینے تک کسی نہ کسی

شوہر اس کی بات کا یقین کب کرتا۔۔۔ ایک بدروح کسی کو آلودہ بھی کر سکتی ہے۔ اتفاق سے ایک روز اس کے شوہر نے روح کو دیکھ لیا تو اس نے ایک پجاری کی خدمات حاصل کیں۔ پھر وہ اپنی بیوی کو لے کے کسی دوسری جگہ چلا گیا۔

جب تم اس نوجوان لڑکے کی کھوپڑی لے کے آئے تو اس روح نے اس گھر کا رخ کر لیا۔ تمہاری بیگ سے اس کی کھوپڑی غائب ہو جانی اور آ جانی تھی۔۔۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ساحرہ بے لباس رات کو بستر پر دراز ہوئی تھی۔ وہ ساحرہ کو اس حالت میں دیکھ کے اپنی نظروں کی پیاس بجھاتا اور دیر تک محظوظ ہوتا رہتا تھا۔۔۔ دنیا میں قدرت کے بدن کے نظارے سے زیادہ دل کش۔۔۔ بھجان خیز۔۔۔ اور قیامت انگیز کوئی نہیں ہوتا ہے۔۔۔ تم نے اسے ایک روز مندر کے احاطے میں پھینک دیا۔ لیکن روح اس گھر میں آئی۔۔۔ اپنی محبوبہ کو نہ پا کے مشتعل ہو گئی۔ وہ اس موقع کی تلاش میں تھی کہ کسی دن ساحرہ کو نشانہ بنائے۔۔۔ کیوں کہ ساحرہ بھی اس کی محبوبہ کی طرح گہری مشابہت رکھتی تھی اور اس پر جڑواں بہن کا دھوکا ہوتا تھا۔۔۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے مذموم ارادے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔

اس روز رات کے وقت روح پھر آئی تاکہ ساحرہ کو نشانہ بنا سکے۔ جب اس نے سیم کو بیوی کے ساتھ دیکھا تو ہمت نہ ہوئی۔ البتہ اس نے صرف من مانی حرکتوں سے ساحرہ کے بے لباس بدن سے فائدہ اٹھایا تھا اور حد سے تجاوز اس لیے نہیں کر سکتا تھا کہ سیم ساتھ سو رہا تھا۔ پھر جب وہ دوبارہ آیا تو ساحرہ کو ہر قیمت پر جذبات کا نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ چوں کہ اس وقت وہ سیم کی آغوش میں گہری نیند سو رہی تھی۔ پھر معاً اسے چابیوں کا گھنٹا نظر آ گیا لہذا وہ چوری کر کے ساحرہ کو ستانے پر مجبور ہو گئی۔ چوری کے بعد اس نے مال مسروقہ پرانے مندر کے احاطے میں درخت کی کھوکھو میں چھپا دیا۔ میں نے اسی آوارہ اور چور روح سے یہ صندوق چھینا۔

بہانے سے ڈستا اور کھلونے کی طرح کھیل رہا تھا۔ اس سے جی بھر کے فائدہ اٹھایا تھا اس لیے لڑکے کو سزائے موت ہونے کا سن کے اس نے پوری ہستی میں مٹھائی ہانٹی تھی۔ اب وہ کہیں بھی اور کسی سے بھی شادی کرنے کے لیے آزاد ہو گئی تھی۔ پھر اس لڑکی کی شادی ایک بہت بڑے گھرانے میں بڑی دھوم دھام اور رواجی انداز سے ہو گئی۔ وہ دلہن کے روپ میں اس قدر حسین لگی تھی کہ جس نے بھی دیکھا اسے دیکھتا رہ گیا۔ بستی میں آج تک اتنی حسین اور دل کش دلہن کسی نے نہیں دیکھی۔ وہ پونم کا چاند تھی۔

اس لرزہ خیز قتل نے لوگوں کے دلوں پر خوف و دہشت کو ایک عرصہ تک مسلط کیے رکھا تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ خونی واردات دلوں سے محو ہو گئی۔۔۔ وہ قصہ پارینہ بن گیا۔۔۔ لیکن کسی کو یہ واقعہ یاد آتا تو وہ دانستہ اس کے ذکر سے گریز کرتا تھا۔

محبت بڑی نازک اور عجب اور اچھوتی شے ہے۔۔۔ وہ مٹ کے بھی فنا ہو کے اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی ہے۔ اس نے آخر اپنا اثر دکھایا۔ ایک سفلی علم کے ماہر لڑکے کو اس کی کھوپڑی مل گئی۔ ہوا یہ تھا کہ اسے پھاسی دینے کے بعد اس کی لاش آسام کے رسم و رواج کے مطابق ایک جیل کے قریب میں لا کے رکھ دی گئی تھی۔ یہ وہی جیل تھی جہاں اس لڑکی اور لڑکے کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔۔۔ اتفاق سے وہ گھر جس میں وہ شخص اس کھوپڑی کو لے کے آیا تھا اسی گھر میں اس نوجوان کی محبوبہ رہتی تھی۔

اس نوجوان کی روح اپنی کھوپڑی کی تلاش میں اس جگہ پہنچا اور اپنی محبوبہ کو دیکھا۔

اس وقت یہ مکان تمہارے دوست نے کرائے پر نہیں لیا تھا۔۔۔ اس روح کے مجرمانہ جذبات عود کے آئے کیوں کہ مرتے وقت جو انسانی خیالات انسانی دماغ میں ہوں۔۔۔ موت کے بعد بھی روح پران کا اثر رہتا ہے۔ اس کی روح نے نوجوان محبوبہ کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس لڑکی نے شوہر کو اعتماد میں نہیں لیا۔ بھلا وہ کیسے اور کیوں کر لے سکتی تھی۔ اس کا

”کیا کہا۔۔۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ وہ کوئی روح تھی۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں میرے عزیز دوست۔۔۔!“ راحت نے پراعتماد آواز میں کہا۔  
”میں جھوٹ نہیں بولتا اور اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔۔۔؟“

”لیکن درست۔۔۔! روح تو ایک لطیف اور غیر مرئی چیز ہے۔ بھلا اس سے کون لڑ سکتا ہے؟“  
”روح کی لطافت اور کثافت۔۔۔ نیکی اور بدی پر منحصر ہوتی ہے۔“ وہ بے پروائی سے اپنے شانے اچکا کے بولا یہ گناہ گاروں کی روح کثیف اور بو جھل ہوتی ہے۔ وہ مقام بالانتک نہیں جاسکتی۔۔۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے بہت کم لوگ جانتے اور سمجھتے ہیں۔“

”لیکن تم نے مجھے جو باتیں بتائی ہیں وہ کیوں کر اور کیسے تمہارے علم میں آئی ہیں۔“ میں نے بے اعتباری سے پوچھا۔

”ایک تجزیہ کار سراخ رساں کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔“ وہ کہنے لگا۔ ”اگر اس وقت وہ کھوپڑی تمہارے پاس موجود ہوتی جس کے اثر سے تم ایک دفعہ دلدل کے کنارے بے ہوش ہو گئے تھے تو میں اس کی پیشانی پڑھ کے تمہیں مطمئن کر دیتا۔“

”کیا تم ان ہیروں کے راز سے واقف ہو۔۔۔!“ میری حیرت دوچند ہو گئی۔ ”کیا تم نے ان تحریروں کا راز پالیا تھا؟“

”ہاں دوست۔۔۔!“ راحت نے سر ہلا دیا تھا۔ ”اب میں ہر کھوپڑی کی پیشانی پر لکھی تحریروں کو پڑھ سکتا ہوں۔“

میں اس کی بات سن کے سخت متحیر ہوا۔ ”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔۔۔ اب بتا رہے ہو۔ کیا یہ کوئی راز ہے؟“ راحت نے میرے کسی سوال کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے اس وقت موقع کی نزاکت کے سبب کریدنا مناسب بھی خیال نہیں کیا۔ میں نے اپنی

نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ اس دودھیلا چاندنی میں جو چاروں طرف کھل کے برس رہی تھی اس کا چہرہ ایسا مدقوق، لاغر اور خوف ناک لگا کہ میرے روکنے کھڑے ہو گئے اور رگوں میں لہو جمند ہونے لگا۔۔۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ قبر سے نکلا ہوا مردہ ہے۔ دراصل وہ ابھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا تھا۔ بیماری نے اسے دیمک کی طرح چاٹ لیا تھا۔

راحت نے میرے چہرے سے بھانپ لیا تھا کہ میں اس کی صورت دیکھ کے خوف زدہ ہو رہا ہوں وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا اور دھیرے سے بولا۔  
”اچھا دوست۔۔۔! کہانی سنانے میں خاصا وقت لگ گیا۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

اس نے مجھ سے مصافحہ بھی نہیں کیا۔ جب وہ مخالف سمت بڑھا تو ایک آوارہ بادل کے ٹکڑے نے چاند کو کسی عورت کی طرح اپنی آغوش میں لے لیا۔۔۔ اور ایسا گپ اندھیرا اچھا گیا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھٹائی نہیں دیا۔ جب چاند بادل کی آغوش سے نکلا تو وہ نظر نہیں آیا۔۔۔ وہ میری نظروں سے ادھل ہو چکا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مجھ پر لرزہ خیز خوف طاری ہو گیا۔ جانے میں کس طرح اپنے کمرے تک پہنچا۔ میں نے بستر پر دراز ہو کے سوچا کہ ایک نظر زیورات تو دیکھ لوں۔ پھر اٹھ کے بیٹھ گیا اور چربی ٹھیلی کا منہ کھول کے اسے بستر کی چادر پر الٹ دیا۔۔۔ ان زیورات کو دیکھ کے میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں کب ایسے خوب صورت اور شان دار زیورات دیکھے تھے۔ راحت نے مجھے سختی سے تاکید کی ہوئی تھی کہ اس مسروقہ مال کے بارے میں پولیس کو کچھ نہ بتایا جائے۔۔۔ ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔۔۔ تم پولیس کو نہیں جانتے ہو۔ ان سے زیادہ ذلیل اور کمینہ کوئی نہیں ہے۔ وہ بہت تنگ اور ہراساں کریں گے۔

☆☆☆

خوف ناک رات کا سحر ٹوٹتے ہی صبح کے

## اندھا

ایک اندھے فقیر نے  
ایک راگبیر سے بھیک  
مانگی تو اس راگبیر نے

اس سے اس کے اندھے ہونے کا ثبوت مانگا تو فقیر نے  
کہا۔

”تمہیں وہ سامنے برگد کا درخت نظر آرہا ہے؟“  
راگبیر نے کہا۔ ”ہاں۔“

فقیر نے کہا۔ ”اس کے نیچے ایک گدھا بیٹھا ہوا  
ہے۔“ راگبیر نے کہا ”ہاں۔“

فقیر نے کہا۔ ”اس گدھے کے اوپر چڑیا بیٹھی  
ہوئی ہے۔“ تمہیں نظر آرہی ہے؟“

تو راگبیر نے کہا ”ہاں۔“

اس فقیر نے کہا۔ ”مجھے نظر نہیں آرہی ہے۔“

جائے کم ہے۔

نیم کی سرال میں دوپہر کا کھانا کھانے کے  
بعد میں رات سے متعلق حالات دریافت کرنے کے  
تجسس اور اشتیاق میں موضع شوع کی طرف روانہ ہو  
گیا۔ کیوں کہ راحت نے مجھے وضاحت سے کچھ نہیں

بتایا تھا۔ بہت ساری باتیں راز میں اور عمدہ تھیں۔  
دو تین دن پہلے جو موسلا دھار بارش ہوئی تھی

اس وجہ سے راستے ابھی تک خراب ہو رہے تھے۔۔۔  
ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔۔۔ بوجھل ہوا، گندے پانی

میں مڑی ہوئی گھاس اور تالابوں کی مچھلیاں جو  
کنارے پر مری پڑی تھیں اس کی بساند طبیعت کو مکدر

کر رہی تھی۔۔۔ مینڈکوں کے شور نے تمام وادی سر  
پاٹھا رکھی تھی۔

میں نے نصف راستہ طے کرنے کے بعد سوچا  
کہ واپس چلا جاؤں۔۔۔ نیم کے ہاں رات

گزارنے کے اس کے ہمراہ صبح اپنی ڈیوٹی پر چلا  
جاؤں۔ نیم کے ہاں جانا مناسب نہیں تھا۔ اس سے

بہتر تھا کہ گھر چلا جاؤں۔ لیکن دل واپس جانے کو نہیں  
چاہ رہا تھا۔ گھر جا کے بوریت ہی ہوئی۔ اس لیے

اجالے کے حسن نے ساری دنیا کے دامن کو جیسے نور  
سے منور کر دیا تھا۔ نیم سحر کے تروتازہ جھونکوں نے  
میرے سوئے ہوئے دماغ میں نہ صرف ایک نئی  
روح بھونک دی تھی بلکہ وہ لوریاں دے کے تھپک  
کے سلا رہی تھیں۔ جب سورج کی تیز کرنیں میرے  
چہرے پر پڑیں تو میں جیسے مدھوشی کی کیفیت سے نکل  
پڑا۔ بدن ٹھن سے چور تھا اور جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔  
میں کچھ دیر تک خالی الذہن تھا۔۔۔ خلا میں گھورتا  
رہا۔ تھوڑی دیر بعد رفتہ رفتہ یکے بعد دیگرے مجھے  
رات کی ساری باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے  
لگیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ رات میں نے کوئی  
ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ لیکن جب میری نگاہ زیور  
کی تھیلی پر پڑی تو مجھے یقین کرنا پڑا کہ وہ خواب نہیں  
ایک حقیقت تھی۔ میں رات کے واقعے کے بارے  
میں سوچ ہی رہا تھا کہ ملازم میرے لیے چائے لے  
کے آ گیا جس کے پینے سے دماغ کے انتشار میں  
کچھ کمی وافی ہوئی۔

میں ناشتا کرنے کے فوراً بعد ہی زیورات لے  
کے نیم کے سرال کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں نے اس ڈر اور خوف سے گھر میں رکنا اور  
نیم کا انتظار کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ کہیں وہ بدروح

مجھ سے زیورات چھین کے نہ لے جائے۔ زیورات کا  
ایک خالی ڈبا گھر میں موجود تھا۔۔۔ میں نے

زیورات تھیلی سے نکال کے اس ڈبے میں رکھ دیے۔  
جب تک نیم کی سرال نہیں پہنچا اس وقت تک

بدروح کے خیال سے خوف و دہشت میں مبتلا  
رہا۔۔۔ ساری راستے مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا تھا

کہ۔۔۔ وہ بدروح ڈبا چھینے کے لیے میرے تعاقب  
میں لگی ہوئی ہے جب میں نے نیم کی سرال میں

قدم رکھا تو میری جان میں جان آئی۔ زیورات دیکھ  
کے سبھی بہت خوش ہوئے۔۔۔ جب مجھ سے

دریافت کیا گیا کہ زیورات کہاں سے اور کیسے ملے تو  
میں نے اسے صرف اتنا کہا کہ یہ میرے ایک سراغ

رساں دوست کا کارنامہ ہے جس کی جتنی تعریف کی

میں نے واپسی کا خیال ترک کر دیا اور راحت کے گھر کی طرف تیزی سے قدم اٹھانے لگا۔

کئی ایسی جگہوں پر جہاں دلہل، جھیل اور درخت تھے وہاں انسانی کھوپڑیاں بکھری پڑی نظر آئیں جنہیں دیکھ کے ایسا لگ رہا تھا جیسے ان میں اس لڑکے کی کھوپڑی ہے جس کی روح اپنی محبوبہ کی تلاش میں ہے۔ راحت نے اس روح کو بھگا تو دیا تھا لیکن اس بات کا کوئی امکان تھا کہ وہ روح دوبارہ آجائے اور شاید اس کی کھوپڑی بھی تنگ کرے۔ لیکن میں یہ جانتا تھا کہ آیت الکرسی اور آیت کریمہ کی وجہ سے روح اور کھوپڑی گھر میں ٹھس سکتی ہے اور نہ ہی تنگ اور پریشان کر سکتی ہے۔۔۔ میں کھوپڑی جس دن مندر کے احاطے میں پھینک کے آیا تھا اس دن سے کھوپڑی نظر نہ آئی تھی۔

اس کی وجہ یہ بھی کہ رات سوتے وقت کلام الہی پڑھ کے اپنے اوپر دم کر لیا کرتا تھا۔ اگر میرا یہ عمل جاری نہ رہا ہوتا تو پھر وہ کھوپڑی اور بدروح شاید میرا اور نسیم کا بچپنا حرام کر دیتی۔ میں بلا خوف و خطر راحت کے مکان کی طرف کشاں کشاں چلا جا رہا تھا۔

میں نے کیسے اور کس طرح یہ ناہموار، دشوار گزار اور پانی اور بچپڑ سے بھرا راستہ طے کیا یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ جب میں نے اس کے گھر کے سامنے رک کے سانس درست کی تو قدرے سکون سا محسوس ہوا۔۔۔ جب میں اس گھر کے احاطے میں داخل ہوا تو اس کا نقشہ یک سر بدلا ہوا پایا پہلے تو یہ خیال آیا کہ میں غلطی سے کسی اور گھر پر آ گیا ہوں۔ لیکن ایک نشانی ایسی تھی کہ جس سے میں دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ اس کے دروازے کے پاس ایک چوڑا ہاتھ ہوا تھا۔

منڈیر پر بھی تنگی ہو رہی تھیں۔ سبزہ اجاڑ اور بیابان ہو چکا تھا۔ بارش نے کسی مفتوح علاقے کی طرح اسے تاخت و تاراج نیل پوش کے رکھ دیا تھا اور کثرت بارش سے پھول دار پودے زمین پر نیچے لیٹے ہوئے تھے۔۔۔ بدشگونوں کے آثار دیکھ کے نہ صرف میرے دل پر چوٹ لگی بلکہ میں سخت بدحواس

اور پریشان بھی ہوا تھا۔ پھر میں وحشت زدہ ہو کر جھوپڑے کی طرف لپکا۔۔۔ مگر جھوپڑا اس طرح ویران، اجاڑ اور سنسان سا تھا جیسے یہاں کبھی انسان کا گزر رہی نہ ہوا ہو۔ ہر طرف موت کی سی خاموشی اور قبر کا سا سکوت طاری تھا۔۔۔ تمام کمرے بند تھے اور جو کمران سب میں بڑا تھا اس کے دروازے پر باہر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ راحت کی اس کمرے میں رہائش تھی اور شاید وہ کہیں گیا ہوا تھا۔

میں کنڈی کھول کے جیسے ہی کمرے میں گھسا ایک دم سے اچھل پڑا۔ کیوں کہ اس کمرے میں ایک بڑی سی قبر دکھائی دی جو بالکل تازہ بنی ہوئی تھی۔ اس قبر کو دیکھ کے میں کانپ گیا۔۔۔ طرح طرح کے دوسوں اور اندیشوں کے زہریلے ناگ پھکارنے لگے۔۔۔ میرا دماغ ماؤف ہو گیا اور آندھیاں چلنے لگیں۔۔۔ یہ کس کی قبر ہو سکتی ہے۔۔۔ میں سوچنے لگا۔

چند لمحوں کے بعد راحت کا بوڑھا ملازم کمرے میں داخل ہوا۔۔۔ اس کی آنکھیں سوچی ہوئی تھیں جیسے وہ کثرت سے روتا رہا ہو۔

”آپ۔۔۔“ جب اس نے مجھے مخاطب کیا تو اس کا گلا بٹھا ہوا تھا۔

”راحت کہاں ہے۔“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہ کس کی قبر ہے؟“

”راحت کا انتقال ہو گیا ہے یہ قبر راحت کی ہی ہے۔“

”کیا۔۔۔؟“ مجھے اس کی بات کا یقین نہیں آیا۔۔۔ مجھے اپنے سینے میں چھری اترتی محسوس ہوئی۔ ”کب انتقال ہوا؟“

”کل شام۔۔۔“ اس نے بتایا۔ ”آج صبح فجر کی نماز کے بعد ان کی تدفین ہوئی۔ ان کی والدہ

صدے سے بیمار ہوئیں تو ان کے والد انہیں اسپتال لے گئے ہیں۔۔۔ وہ مجھے یہاں قبر کی نگہبانی کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ اس لیے میں یہاں رہ گیا ہوں۔

﴿.....﴾

# سفرِ شریک

ایم الیاس

مسقط کے اڈے پر جہاز کا تو اس کے دمچکے سے ہامیلا  
کسی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو اس نے چونک کر ادھر ادھر  
دیکھا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ ذرا سا مسکرائی۔ کسمسا  
کمر مجھ سے اور قریب ہو گئی۔ جیسے انگور کی بیل  
اپنے سہارے سے پھٹ جاتی ہے۔

ہمارے معاشرے کا المیہ..... ایک دلگداز تحریر

انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کا تناسب چہرہ پر بدن  
جس میں قیاسیں تھیں اور رنگ رنگ سے جیسے مستی  
اہل پڑی تھی۔ اس کے نقش و نگار معمولی تھے۔ سانولی  
رنگت میں نمک تھا۔ ایسا نمک اگر گوری لڑکیوں میں  
آجائے تو کیا کہنا..... لیکن یہ نمک گندی اور سانولی  
رنگ کی عورتوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔ اس کی  
آنکھیں بہت بڑی خوب صورت اور سیاہ تھیں۔  
جب ہم دونوں کی نظریں پیوست ہوئیں تو میں اخلافا  
مسکرایا۔

”کہاں جا رہے ہیں آپ.....“ اس نے  
سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کی آواز بڑی شیریں  
تھی۔ اس کے شیریں لبوں کی طرح۔  
”بہن.....“ میں نے اس کا سراپا اپنی نظروں  
میں جذب کرتے ہوئے جواب دیا۔  
”ویری گڈ.....“ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔  
”میں تو یہ بھی سمجھی کہ آپ.....“

میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ”کیا  
آپ کے خیال میں میں افغانستان جا رہا تھا.....“  
”افغانستان وہی جاتے ہیں جو احمق ہوتے

وہ مجھے ایئر پورٹ پر ملی تھی۔ ایسا لگا تھا کہ وہ  
خواب میں نظر آنے والی لڑکی کی طرح ہے۔  
میں کاؤنٹر پر کھڑا کٹ چپ کر رہا تھا اور اس  
لڑکی کو بھی چپ کر رہا تھا جو میرا کٹ چپ کر رہی  
تھی۔ ایئر لائنز والے مسافروں کا کتنا خیال رکھتے  
ہیں۔ قدم قدم پر ان کی تفریح کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ  
منٹ کی تفریح بھی۔ نظروں میں جذب ہو رہی تھی اور  
دل کو برا رہی تھی۔ میں اسے ایک کتاب کی طرح  
پڑھ رہا تھا۔

وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے  
محسوس کر لیا تھا کہ میرے پاس کوئی عورت آ کر کھڑی  
ہو گئی ہے۔ کیوں کہ اس کے بدن سے پھوٹی ہوئی  
سوندمی سوندھی خوشبو اور تپش دیتا ہوا بدن..... وہ  
تقریباً مجھ سے ہٹ کر کھڑی تھی۔ اس سے پہلے بھی  
میں نے اسے دیکھا تھا۔ لیکن گہما گہما اور بھی پر شباب  
بدن کی لڑکیوں اور عورتوں کی وجہ سے اس پر توجہ نہ  
دے سکا تھا۔

اب ذرا میں نے اسے غور سے دیکھا۔ گو وہ  
بہت حسین نہ تھی۔ لیکن اتنی پرکشش تھی کہ اسے نظر

ہیں۔“ وہ بولی۔ ”اس وقت دنیا میں امریکیوں سے زیادہ احمق، بزدل اور ڈرپوک کوئی نہیں ہیں۔۔۔۔۔ وہ وہاں دردناک موت مر رہے ہیں۔۔۔۔۔ وہاں کے ہتے مردوں، عورتوں اور بچوں پر ڈرون حملے کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔۔۔۔۔ اس مجرم امریکی قوم کو سزا دینے والا کوئی نہیں ہے۔۔۔۔۔ لیکن انعام دینے والا ہے۔۔۔۔۔ اس کا لے کلوٹے صدر کو نوٹیل پر از دے دیا گیا۔“ وہ جذباتی سی ہو رہی تھی۔

”گلتا ہے تمہیں سیاست سے بڑی دل چسپی ہے۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔ ”دنیا میں کمزور اور غریبوں کے لیے کوئی قانون اور انصاف نہیں ہوتا ہے۔ وہ طالبان اور القاعدہ سے جنگ لڑنے کے بہانے افغانستان پر حکومت کر رہے ہیں۔“

”بس لیے کہ میں ایک اخبار میں ایک برس تک سیاسی کالم لکھتی رہی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”ویسے امریکہ افغانستان میں بھی جیت نہیں سکتا۔۔۔۔۔ اس نے جس طرح ویت نام میں ہزیمت اٹھائی، ذلیل ہوئی اور

گھسٹ کھائی یہاں بھی ایسا ہی ہوگا۔“

جہاز کی روانگی میں کبھی معمولی فنی خرابی کے باعث ابھی کافی وقت تھا۔ وہ اس وقت کی بوریت دور کرنے کے لیے ہم ایک طرف جا کر بیٹھ گئے۔ لیکن موضوع سیاسی نہیں تھا۔ پہلے تو زیادہ باتیں نہیں ہوئیں۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کی بھجک دور ہوتی گئی۔ اس کی بے تکاں باتیں ہو رہی تھیں۔ جیسے حزا آ رہا تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ ایک عورت تھی۔ مجھ سے ہٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ باتیں کرتے کرتے میرے زانو پر رکھا ہاتھ بھی بھی تمام لیتی یا اس پر ہاتھ بھی مار دیتی۔ اپنی بات کی داد وصول کرنے کی غرض سے وہ حسین نہ ہوتی تو کیا ہوا۔ کشش تو اتنی تھی کہ اس کے جسمانی تشیب و فراز سے نظریں ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

”بے تکلف اور بہت ہی خوش مزاج لڑکی ہے۔۔۔۔۔ سفر کا لطف اس کے قرب سے دو بالا رہے گا۔“ میں نے خوش ہو کر سوچا۔

ہوائی جہاز میں ہم دونوں کی نشستیں الگ الگ

ہیں۔“ وہ بولی۔ ”اس وقت دنیا میں امریکیوں سے زیادہ احمق، بزدل اور ڈرپوک کوئی نہیں ہیں۔۔۔۔۔ وہ وہاں دردناک موت مر رہے ہیں۔۔۔۔۔ وہاں کے ہتے مردوں، عورتوں اور بچوں پر ڈرون حملے کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔۔۔۔۔ اس مجرم امریکی قوم کو سزا دینے والا کوئی نہیں ہے۔۔۔۔۔ لیکن انعام دینے والا ہے۔۔۔۔۔ اس کا لے کلوٹے صدر کو نوٹیل پر از دے دیا گیا۔“ وہ جذباتی سی ہو رہی تھی۔

”گلتا ہے تمہیں سیاست سے بڑی دل چسپی ہے۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔ ”دنیا میں کمزور اور غریبوں کے لیے کوئی قانون اور انصاف نہیں ہوتا ہے۔ وہ طالبان اور القاعدہ سے جنگ لڑنے کے بہانے افغانستان پر حکومت کر رہے ہیں۔“

”بس لیے کہ میں ایک اخبار میں ایک برس تک سیاسی کالم لکھتی رہی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”ویسے امریکہ افغانستان میں بھی جیت نہیں سکتا۔۔۔۔۔ اس نے جس طرح ویت نام میں ہزیمت اٹھائی، ذلیل ہوئی اور



میرے ساتھ دیکھ کر وہ میرے متعلق جانے کیا سوچا ہوگا۔۔۔۔۔ یہ میرا خیال فضول تھا۔ کیوں کہ آج وقت ایسا تھا کہ مرد کا کسی غیر عورت کے ساتھ۔۔۔۔۔ کسی عورت کا غیر مرد کے ساتھ میل جول حیران یا شک والی بات نہ تھی۔ چوں کہ میں شادی شدہ تھا اور تین بچوں کا باپ اس لیے میرے دل میں چور تھا کہ انہوں نے سوچا ہوگا کہ میں اس لڑکی کے سنگ اس طرح سے بیٹھا ہوں کہ رہا ہوں کہ اس کے اور میرے درمیان تعلقات ہیں۔ میرے دل میں جو پریشانی وہ چہرے پر عود آئی تھی اور اس لڑکی نے وہ کیسے بھانپ لی تھی۔

میں نے سوچا اسے بازوؤں کی گرفت میں لے کر اس کے چہرے پر چند لمحوں تک جھک کر بولوں۔ ”یہ تمہارا وہم ہے۔“

تھوڑی ہی دیر میں ایئر انڈیا کا بونگ آسمان کی وسعتوں میں پرواز کر رہا تھا۔ دن تھک ہار کر شام کی آغوش میں سو گیا تھا۔ اجالا آہستہ آہستہ اند میرے میں مدغم ہو رہا تھا۔ جہاز کے اندر زندگی کا حسن بھرنے لگا۔

مسافروں میں سے کچھ نے شراب پی۔۔۔۔۔ پھر سب نے کھانا کھایا اور پھر اونگھنے لگے۔ جہاز کی روشنیاں مدغم کر دی گئیں۔ دو ایک غیر ملکی سیاح جوڑے جوان اور شراب کے نشے سے بہک رہے تھے۔ اپنے ہم سفر کے چہروں میں جذباتی حالت میں جھکے ہوئے تھے۔

اس نے اب بھی میرے ہاتھ کی کلائی مضبوطی سے تھام رکھی تھی۔ لیکن کھانے کے بعد جو تھا تو وہ اب تک اس کے ہاتھ کی گرفت میں تھی۔ اس کے گداز بدن کا ریشم جیسا بوجھ پوری طرح میرے کندھے پر تھا۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ ساڑی کا پلو اس کی گود میں گرا ہوا تھا۔ شاید اس نے دانستہ گرا دیا تھا تا کہ میرے جذبات بھڑک اٹھیں۔ نگارہ بڑا چہچہان خیز تھا۔ لیکن ایسے نظارے عام تھے۔ لیکن مرد کا دل کہاں بھرتا ہے۔۔۔۔۔ میں دیر تک محظوظ ہوتا رہا۔

تھیں۔ باتوں میں دھیان نہ رہا۔ ورنہ کاؤنٹر سے ایک ساتھ نشستیں حاصل کر لیتے۔ اس کی نشست چھپلی تظار میں تھی۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ اس کا قرب رہتا تو لطف تو رہتا۔ بیٹھنے کے بعد جب میں نے گھوم کر دیکھا تو وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک غیر ملکی مسافر سے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ مسافر مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ شخص میرے پاس آیا اور اس نے بڑی خندہ پیشانی سے کہا۔ ”آپ میری سیٹ پر چلے جائیں۔“ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا جو اس نے مجھ پر بہمان کی تھی۔ اگر میں اس سے الگ تھلگ رہتا تو سفر کا لطف عارت ہو جاتا۔ سفر تو کسی نہ کسی طرح کٹ جاتا۔ جیسے زندگی کا سفر کتنا ہے۔ جب میں اس کی طرف بڑھا تو اس کے سر بھرے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ ابھرا آئی۔

”تم نے اس سے کیا کہا تھا جو اس نے تمہاری بات فوراً مان لی۔“ میں نے اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

لیکن اس نے بتایا نہیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ریگ مٹی۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر میری کلائی تھام لی۔ جیسے میں اس کے پاس سے اٹھ کر کہیں اور نہ چلا جاؤں۔ میرے سارے جسم میں میٹھی منفی دوزخی۔ میں نے کلائی اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکالنے کی کوشش اس کے نرم و نازک ہاتھ کی گرفت زرا مضبوط ہو گئی۔ اس سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میرے بازوؤں کی گرفت میں سما جانا چاہتی ہو۔ میں نے چونک کر آس پاس اس طرح دیکھا جیسے مجھ سے کوئی بڑا گناہ مزد ہو گیا۔

”تم مرد ہو کر ڈر کیوں گئے۔۔۔۔۔“ وہ ہنس کر بولا۔

اس نے بحرین ایئر پورٹ کے لاؤنج میں شاید اس وقت کی بدلی ہوئی حالت کو دیکھ لیا تھا۔ جب اقوام متحدہ کے ایک افسر جن سے میری بڑی پرانی شناسائی تھی مجھے دیکھ کر مجھ سے بات کرنے کے لیے رک گئے تھے اور میں سوچنے لگا تھا کہ اس لڑکی کو



ہوا بس میں سوار ہوا۔ بس بھر چکی تھی۔ اس نے اپنی سیٹ کے برابر دتی بیگ رکھ چھوڑا تھا۔ مجھے دیکھا تو اٹھالیا تھا۔ یہ میرے لیے واضح اشارہ تھا کہ اس نے یہ جگہ میرے لیے روکی ہوئی تھی۔ میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

جہاز میں بھی ہم ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ ہم دونوں آپس میں اس طرح باتیں کرنے لگے جیسے جہم جہم کے ساتھی ہوں۔ وہ دھکی معلوم ہوتی تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ وہ ممبئی کی رہنے والی ہے۔ دمشق میں اپنے شوہر کے پاس جا رہی ہے۔ یہ اس کا پہلا ہوائی سفر تھا۔ اس لیے وہ کچھ ڈرسی رہی تھی..... معلوم نہیں اس نے مجھ میں کیا بات محسوس کی کہ مجھ سے دوستی کر لی تھی۔ اتنی جلدی گہری دوستی ہو جانا بڑے تعجب کی بات تھی۔ ناقابل فہم..... اس نے مجھے اپنے اعتماد میں لے کر بتایا کہ اس کی محبت کی شادی کی ہے۔ شادی کے ایک برس بعد اس کا پتی ملازمت کے لیے گیا۔ دو برس تک اسے اپنے پاس بلانے سے ٹالتا رہا۔ اسے پتا چلا کہ اس کا پتی اپنے دفتری ایک لڑکی نیا کے ساتھ رہ رہا ہے۔ اپنا وجود اور محبت کو بھی میلا کر رہا ہے۔ آخر اس نے لکھ دیا کہ وہ آ رہی ہے..... کیا وہ

اس بات کا ادھیکار نہیں رکھتی ہے کہ وہ بھی اپنا حق کسی غیر مرد سے میلا کرے جس طرح اس کا پتی ایک عورت سے میلا کر رہا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو اختتام سے روک رکھا ہوا ہے۔ لیکن اس نے یہ فیصلہ کیا ہوا ہے کہ وہ اپنے پتی سے اختتام ضرور لے گی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ آشا جتنی حسین تھی اتنی ہی پرکشش بھی..... اس کا پتی بھی کیسا احمق تھا کہ اتنی حسین عورت کو چھوڑ کر کسی اور لڑکی کا دیوانہ بن گیا تھا۔ اس نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ اپنا دکھ اور یہ باتیں اس نے اپنی کسی سہیلی کو بھی نہیں بتایا۔ صرف مجھے بتایا ہے۔ اس نے دل کی ساری بھڑاس نکال لی تھی اور کہا تھا کہ اس کا جی ہلکا ہو گیا ہے۔

اس نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر اس کے پتی نے اس کی موجودگی کے باوجود اس حرافہ سے

اس نے نیند اڑا دی تھی۔ میں نے ہولے سے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر دبا یا۔ وہ کچھ اور سٹ گئی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف فراز سے نظریں ہٹا کر دیکھا۔ اس کا سر میرے شانے پر تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ چپکے چپکے مسکرا رہے تھے اور وہ بھی انتہائی دعوت دے رہے تھے۔

ان بند آنکھوں میں خواب تھے یا میری انگلیوں کے لمس کی لذت کا احساس..... میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی اس طرف متوجہ نہ تھا۔ میں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اس کے چہرے پر جھپک گیا۔ اس نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ جیسے وہ چاہتی تھی کہ میں پیش قدمی کروں۔

اس وقت مجھے آشا یاد آ گئی۔ وہ مجھے دہلی کے ہوائی اڈے پر ملی تھی۔ دمشق جا رہی تھی۔ میں لاؤنج میں بیٹھا کوئلہ ڈرنک پی رہا تھا اور پرکاش کے بارے میں سوچ رہا تھا جو مجھے گھر پر نہ پا کر ڈھونڈ رہا ہوگا اور اپنی می سے نہ جانے کیا کیا سوال کر رہا ہوگا۔ میں اپنی سوچ میں غرق تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی میرے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو آشا کھڑی ہوئی تھی۔

”کیا آپ دمشق جا رہے ہیں.....“ اس نے تقری آواز میں پوچھا۔

”جی ہاں.....“ میں نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔ ”اور آپ.....“

”میں بھی وہی جا رہی ہوں.....“ اس نے ساڑی کا سینے اور شانے پر درست کرتے ہوئے

جواب دیا۔ ”تشریف رکھیے..... میں آپ کے لیے کچھ منگواؤں..... آپ کیا پینا پسند کریں گی۔“

”جی نہیں شکریہ۔“ وہ بولی۔ ”میں کچھ دیر پہلے ہی کافی پی چکی ہوں۔“

اتنے میں مسافروں کو لینے بس آ گئی۔ ہم دونوں بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ آشا مجھ سے پہلے ہی نکل گئی اور بس میں جا بیٹھی۔ میں اطمینان سے چلتا

تعلقات رکھے تو پھر وہ طلاق لے کر واپس آ جائے گی۔ اس کے لیے قدر دانوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ بہت سے اس کے دیوانے ہیں اور اس کا ہاتھ تھامنے تیار ہیں۔۔۔۔۔ اس نے یہ بات غلط نہیں کہی تھی۔ وہ واقعی حسن کی رانی تھی۔ ایسی لڑکیاں لاکھوں میں ایک ہوتی ہیں۔

اس کی رام کھانسنے کے تھوڑی دیر بعد وہ سو گئی۔ میں کتاب پڑھنے لگا۔ نیند کی حالت میں اس کا سر ڈھلک کر میرے کندھے سے آگیا۔ ساڑی کا پلو بھی شانے سے پھسل کر اس کی گود میں بکھر گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے سانسوں کا زبردیہ پچکولے کھارہا تھا۔ وہ توبہ شکن ہو گئی تھی۔ ہوئی تھی کیا بلکہ تھی۔۔۔۔۔ اس کے ہونٹ ایسے لگ رہے تھے جیسے ابھی مسکرائیں گے۔ وہ مسکراہٹ کیسی ہوتی ہے جو ہونٹوں پر رک جاتی ہے۔۔۔۔۔ سارا چہرہ کھلا ہوا گلاب ہو جاتی ہے۔ میں بت بنا بیٹھا رہا۔ اگر ذرا بھی جنبش کرنا تو بند آنکھوں کے حسین خواب بکھر جاتے اور فراق کے نظارے محروم ہو جاتا۔ ایک مرد ہونے کے ناتے میں یہ غلطی کیسے کر سکتا تھا۔

مقطع کے اڈے پر جہاز کا تو اس کے دھچکے سے پامیلا کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ ذرا سا مسکرائی۔ کسمسا کر مجھ سے اور قریب ہو گئی۔ جیسے انگور کی تیل اپنے سہارے سے پھٹ جاتی ہے۔

دشمن کے ہوائی اڈے پر آشی کی آنکھ بھی ایسے دھچکے سے کھلی تھی اور وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی تھی۔ اس نے ساڑی کا پلو سینے اور شانے پر پھیلانے میں عجلت نہیں کی اور نہ ہی اس کے چہرے پر شرمساری سی تھی کہ میں اسے بے جاابی کی حالت میں نہ جانے کب سے دیکھ رہا ہوں۔ اس نے اپنے بال درست کیے۔ ”کیا ہم پہنچ گئے؟“ اس نے پوچھا تھا۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ ہم دشمن پہنچ گئے ہیں۔“ میں نے

جواب دیا تھا۔

اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔۔۔۔۔ اگر اس کی جگہ کوئی ایسی عورت جس کے شوہر نے ہر جاتی پن نہیں کیا ہوتا تو اس کے چہرے پر صبح کا نور پھیل جاتا۔ وہاں جیسے اس کا کوئی دہاں منتظر ہوگا۔ کوئی خوشیوں کی مالا لیے اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ جانے کتنے ہی دن اور کتنی ہی راتیں ایک دوسرے سے ملنے کے ارمان میں کائے ہوں گے۔ کس کس جہنم سے خط لکھے ہوں گے۔۔۔۔۔ فون پر باتیں کی ہوں گی۔۔۔۔۔ کیسی کیسی شکایتیں ہوئی ہوں گی۔۔۔۔۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی۔

تاہم نجمہ نے اپنا انگلی بیگ کھولا۔ اس میں لگے چھوٹے سے شیشے میں دیکھ کر اپنے بالوں کو سنوارا۔ چہرے پر ہلکا سا پاؤڈر لگایا اور ہونٹوں پر لپ اسٹک کی ہلکی سی تہہ بھائی۔

ایئر پورٹ پر اس کا ہتی اسے لینے نہیں آیا تھا۔ اس نے نیلی فون بوتھ سے اپنے ہتی کا فلیٹ کا نمبر ملایا۔ ادھر کسی عورت نے ریسیور اٹھا کر کہا تھا۔ ”سری ناتھ فون تو انیڈین کرنے دو۔۔۔۔۔ کس کو نہ کرو۔۔۔۔۔“

اتنا سنتے ہی آشانے ریسیور رکھ دیا۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ میں چوں کہ قریب کھڑا تھا اس لیے میں نے بھی اس عورت کی آواز سن لی تھی۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔ ”آپ کہاں ٹھہریں گے۔۔۔۔۔ کسی دوست کے ہاں۔۔۔۔۔“

”میں یہاں سے سیدھا ہوٹل جا رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا تھا۔ ”مجھے یہاں دو دن کچھ کام ہے۔ اب آپ کا پروگرام۔۔۔۔۔“

”میں ہوٹل میں رہ کر یکسوئی سے کچھ سوچنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ میں کوئی جذباتی عورت نہیں ہوں۔ حقیقت پسند ہوں۔۔۔۔۔ میرے پاس جو پیسہ ہے وہ سری ناتھ کا ہے۔۔۔۔۔ میں بھی آپ کے ساتھ ہوٹل چلوں گی۔“

تیسری منزل پر ہم دونوں کے کمرے آئے سامنے تھے۔ ہم دونوں نے رات نو بجے ڈنر لیا اور

کی اور نہ تم مجھے..... ایثار ہمیں معاف کرے اور ہم دونوں بھی ایک دوسرے کو..... اور ہم دونوں ایک دوسرے کو بھول جائیں یہ اس افزائش کا بہترین عمل ہے۔“

پھر اس کے بعد آسانے مجھے کبھی فون نہیں کیا..... لیکن میں نہ تو ابھی تک اسے بھول سکا اور نہ اس کے ساتھ گزرا وقت..... شاید اس لیے کہ کبھی ایسا سراپا بدن اور چہرہ کبھی میری زندگی میں نہیں آیا۔ ”تم اپنے متعلق بتاؤ.....“ میں نے پامیلا کے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے کہا۔

کچھ دیر تک وہ خاموش رہی۔ اس کے بعد بولی تو ایسا جیسے اس کی آواز بہت دور سے آرہی ہو..... ویران اور کھوکھلی تھی۔ ”چند گھنٹے کے اس سفر میں تم کیا جانے چاہتے ہو.....“ کبھی بچپن ہی ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو جائیں گے..... تم کبھی بھول کر بھی مجھے یاد نہ کرو گے..... پھر ان باتوں کو پوچھ کر کیا لیٹا ہے۔ جس کے بعد ہم اپنا دامن جھٹک لیں۔“

بات دلی کو لگتی تھی میں خاموش ہو گیا..... پھر سوچا کہ اس کی نئی زندگی سے کیا واسطہ..... اب وہ بھی چپ چاپ باہر اندر میرے کو کھور رہی تھی۔ نہ وہ کچھ بول رہی تھی اور نہ میں..... ہم دونوں کے درمیان گہرا سکوت طاری تھا۔

”کیا ناراض ہو گئے ہو.....“ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”میرا بوائے فرینڈ امریکہ میں رہتا ہے۔ وہ بھی یوں ہی ذرا ذرا سی بات نادانستہ ہو جایا کرتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ہنس دی۔ ”چند مہینوں کے بعد وہ لوٹ آئے گا۔ اس کے بعد ہماری شادی ہو جائے گی۔“

کیا وہ سچ سچ اس سے شادی کرنے آجائے گا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اتنی دور سے وہ اس معمولی خدوخال کی لڑکی سے شادی کرنے..... وہ نمکین اور غیر معمولی پرکشش بدن کی ہوئی تو کیا ہوا۔ شاید آ بھی جائے عورت اور پھر عورت کے پرکشش

اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ رات بارہ بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا دروازے پر آٹا شب خوابی کے لباس میں تھی۔ وہ اندر آ گئی۔ پھر صبح ہی کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں گئی..... دورا میں اور دن وہ مجھ پر بڑی فیاض سے مہربان ہو کر اپنے پتی سے انتقام لیتی رہی۔ پھر وہ ہوش سے سیدھے اپنے پتی کے گھر گئی۔ میں ایئر پورٹ روانہ ہو گیا۔ اس نے میرے دن فون کر کے بتایا۔

”جب میں نے اپنے پتی کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ رکھا تو وہ کھل گیا۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ بیڈروم میں سری تاتھ اور نیا غلاطت کے راول میں دھسے ہوئے تھے..... مجھے دیکھ کر دونوں کے احسان خطا ہو گئے۔ میں نے اسے کہا تم فوراً نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ..... میں نے اپنے پتی سے کہا کہ..... میں پانیا..... اس نے وجہ دیا کہ اب کبھی وہ بتا کے ساتھ تعلقات نہیں رکھے گا۔ میں نے حالات سے اس لیے بھجوتا کر لیا کہ سری تاتھ کا باپ دولت مند ہے۔ اس نے مجھ سے رواجی سے قل کہا تھا کہ میں تمہیں تیس لاکھ روپے اس شرط پر دوں گا کہ تم میرے بیٹے کو معاف کر دو۔“ اور پھر جب میں نے فون اپنے سر کو ان کے بیٹے کی حرکت کے بارے میں بتایا تو وہ بولے..... جائداد اور دولت تمہارے نام لکھ دوں گا تا کہ پھر وہ کسی اور عورت کے پاس نہ جا سکے..... میں نے تمہارے ساتھ جو وقت گزارا اور تمہیں ہر طرح سے جو خوش کیا اس پر میں اس لیے نادم نہیں ہوں کہ میں نے اپنے پتی سے انتقام لیا۔ مجھے ایک عورت اور پتی کے ناتے ایسا نہیں کرنا تھا..... لیکن کیا کروں..... انتقام کے اندھے جنون نے میرے اندر نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکا دی..... مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ میں نے تمہیں میلا کر دیا۔ جب کہ تم شادی شدہ اور بچوں کے باپ ہو..... میرے حسن، جوان، شباب اور بدن کے ظلم کے اسیر ہو گئے۔ میں تمہیں دوش نہیں دوں

بدن میں..... بڑی کشش ہوتی ہے۔ عورت کا سارا حسن اس کے جسم ہی میں تو ہوتا ہے..... لیکن تم میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑالو..... اپنے بدن کی گرمی میرے جسم سے دور کرلو۔ اپنی نظروں کو میرے چہرے اور سراپا ہٹالو..... اپنی مسکراہٹ اپنے بوائے فرینڈ کے لیے مخصوص کرلو۔

بیرقابت کی آواز سنی جانے دل کے کس گوشے سے گونجی تھی۔

لیکن جب ایئر ہوسٹس نے اعلان کیا کہ عن قریب ہی ہم ممبئی کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں تو پامیلا کے ہاتھوں کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ بارہ بجے رات کو ہم ممبئی پہنچے۔ جب ہم کسٹم سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ پامیلا کو لینے کوئی نہیں آیا ہے۔

”صبح ہوتے ہی میں تمہیں ٹیکسی میں بٹھا دوں گا۔ اس وقت تمہارا ٹیکسی میں اکیلی جانا مناسب نہیں ہے۔ چوں کہ میری فلائٹ جو ہے وہ سہ پہر کی ہے۔ لہذا میں صبح تک تمہیں کمپنی دے سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ رات ایئر پورٹ کی عمارت میں گزارنے کے بعد خیال آیا کہ کیوں نہ اسے رات کسی ہوٹل کے کمرے میں گزارنے کی دعوت دوں..... شاید مان جائے۔ پھر خیال آیا کہ میں شادی شدہ اور بچوں کے باپ ہوں..... سوچا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شادی شدہ مرد گھر سے باہر عورت کی طلب زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ شادی شدہ مرد ایسے ہوتے ہیں..... اور پھر ایسی لڑکیاں جو اکیلی سفر کرتی ہیں وہ آزاد خیال کی ہوتی ہیں اور انہیں مرد سہمی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

جب میں نے اسے رات ہوٹل میں گزارنے کی تجویز تو بہت خوش ہو گئی۔ جیسے اس کی احساس محرومی ختم ہو گئی ہو۔ ہم ہوٹل آ گئے۔ ہم صبح تک نہیں سوئے۔ ظاہر ہے سونے کے لیے تو کمرہ نہیں لیا تھا۔ ہم نے دل کا ہر ارمان پورا کیا۔ اس نے کسی بات

سے انکار نہیں کیا۔ صبح ناشتے کے بعد میں نے اس سے کہا کہ اب وہ چلی جائے۔ گھر والے اس کے منتظر ہوں گے۔

”گھر والے.....“ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ ”میرے آنے کی کسی کو اطلاع نہیں ہے۔ یوں میرا کوئی انتظار نہیں کر رہا ہوگا۔ تمہاری سہ پہر کی فلائٹ ہے۔ لہذا اس وقت تک مجھے جدانہ کرو۔“

میں نے رواجی سے گل اسے ٹیکسی میں بٹھایا۔ اس کا چہرہ متغیر سا تھا۔ اس کی مسکراہٹ آنکھوں میں بھی بجی سی تھی۔

آشارات گزار کر بہت خوش تھی۔ لیکن یہ یکا یک اداس ہو گئی تھی۔ یہ کیا کاراز ہے۔

جب میں نے اسے الوداع کہنے کے لیے ٹیکسی میں جھانکا تو اس نے کہا۔ ”یہ میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا۔ میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے..... تم بہت اچھے ہو..... جو قوت گزرا کبھی نہیں بھولوں گی۔ تم یاد آتے رہو گے۔“ کچھ ایسا ہی دیپ نے بھی کہا تھا۔

دیپ ہوا کا ایک جھونکا..... ایک خوشبو اور میک جو میری زندگی میں چند دن کے لیے رچ بس گئی تھی اور پھر ایک دم چدا ہو گئی میں ایک تقریب میں اس سے ملا تھا۔ موسیقی ہوا میں میرا ہی تھی۔ وزیر سفیر اور شہر کے معززین ترین لوگ اور حسین اور جوان عورتیں نیم بے حجابی کی سی حالت میں شریک تھیں۔ وزیر سفیر براق لباس میں مشروبات لیے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ کہیں کہیں مترنم قہقہے..... مصنوعی اور سچی مسکراہٹیں ایک دوسرے پر اچھالی جا رہی تھیں۔ ایسے ماحول میں میں نے اسے اکیلے ایک کونے کی میز پیٹھے دیکھا۔ سامنے شربت کا گلاس تھا۔ نظریں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔

”مجھے جمال کہتے ہیں۔“ میں نے اس کے قریب پہنچ کر انا تعارف کرایا۔

وہ مجھے دیکھ کر اس طرح سے چونک گئی جیسے میں کسی اور دنیا کا باشندہ ہوں۔ اس کا یہ انداز عجیب

## ہزل

### مرزا عاصی اختر

آپ کے دولت کدے سے کہا کے بار آئی گیا  
 ”عمر بھر کی بے قراری کو قرار آئی گیا“  
 فیل ہونے پر تو وہ جوتے لگاتے ابا جان  
 شکر ہے مالک ترا ہم کو بخار آئی گیا  
 شیر خاں صاحب کسی کو بھی نہیں دیتے ادھار  
 نوک پر ٹی ٹی کی لے کر میں ادھار آئی گیا  
 دفتر بجلی جو پہنچے کہہ اٹھا کنسرن یہ  
 مال پانی دینے کو آخر شکار آئی گیا  
 میٹھ کے سر بید بازی کرتے کرتے رک گئے  
 دل کچھ اس صورت سے تڑپاں کو پیار آئی گیا  
 ہار پہنائے کوئی عاصی کو بے حد شوق تھا  
 عقد سوئم کا گلے میں اس کے ہار آئی گیا

اس کے ساتھ ہم ایک دوسرے سے کچھ نہ کہہ کر بھی  
 ہم نے یہ طے کر لیا تھا کہ اپنے حدود سے بھی تجاوز  
 نہیں کریں گے۔

”وہ تم میرے یوں ایک دم قریب کیسے  
 آئیں گے.....“ ایک دن میں نے باتوں باتوں میں  
 پوچھا۔

”بس یوں ہی..... پہلی بار جب تم مجھ سے  
 ملے تھے دل نے کہا تھا کہ جیسے تم بہت اچھے ہو۔“ اس  
 نے جواب دیا۔

دیب نے ایک ہی بار کہا تھا کہ۔ ”کچھ جذبے  
 ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی نام نہیں ہوتا ہے۔“  
 لیکن اس نے یہی نہیں کہا تھا کہ وہ بے نام  
 جذبے بھی بڑے قاتل ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ میں

سارگا۔

”آپ کو تہادیکھا تو سوچا کہ کہنی دوں۔“ میں

نے کہا۔

”شکریہ.....“ اس نے کھٹک دار آواز میں کہا۔

”مجھے دیپ کہتے ہیں۔“

”صرف دیپ.....“

پھر ایک بار وہی چبھتی ہوئی نظریں وہی کھٹکتی  
 ہوئی ہلکی سی ہنسی۔ ”مختصر نام اچھے ہوتے ہیں۔ جمال  
 صاحب! اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہوں کہ میں مس  
 ہوں یا مسز..... میں شادی شدہ ہوں۔“

میں جھنجھپ سا گیا۔ میں کچھ دیر اس سے باتیں  
 کرتا رہا اور اس کے بعد دوسروں کی طرف بڑھ گیا۔  
 جب پارٹی ختم ہو گئی تو دیپ میں مسز رحمان  
 کے ساتھ جانے لگی تو جاتے جاتے اس کی نظر مجھ پر  
 پڑی۔ ایک ہلکی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رینک  
 گئی۔ اس نے سر کو ہولے سے خم کیا اور چلی گئی۔

”لج“ ڈنر اور تقریبات میرے فرائض میں شامل  
 تھے۔ ان تقریبات میں بہت سارے لوگوں سے  
 ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ یار کس کس کو رکھا جائے۔  
 دیپ بھی میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔ لیکن چند  
 دنوں بعد اس کا فون آیا یہ میں دیپ بول رہی ہوں۔  
 عجیب لڑکی ہے..... کیا اس کا کوئی بھی نہیں  
 ہے۔ ٹیلی فون پر ملاقات کی خواہش کا اظہار..... وہ  
 بھی بغیر کسی تمہید کے..... عجیب عورت ہے دیپ  
 بھی۔

”کہاں ملوں.....“ غیر ارادی طور پر میرے  
 منہ سے نکل گیا۔

”شکوفہ..... شام کے ٹھیک چھ بجے۔“

اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ وہ  
 ہر دوسرے تیسرے دن ہم دونوں ایک دوسرے ملنے  
 لگے۔ اس کی باتوں میں نشہ تھا۔ اداؤں میں نشہ تھا۔  
 خوب صورتی میں نشہ تھا۔ میرے اور اس کے درمیان  
 ایک اچھوتا رشتہ جنم لے رہا تھا۔ ہم دونوں ایک  
 دوسرے سے ملنے کے لیے بے تاب رہتے تھے لیکن

براستی ان نظروں سے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوں  
مگر..... میں کھڑکی سے باہر نظریں جمائے پادلوں  
کے سفید سفید ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا جو فضا میں تیر رہے  
تھے۔ صبح کے ابھرتے ہوئے سورج کی کنواری کمریوں  
ان پر بکھری ہوئی ایسی لگ رہی تھیں جیسے سفید دوپٹے  
پر تار کشی کی گئی ہو۔

مجھے رافعہ کا خیال آ گیا۔ کتنی بے چینی سے وہ  
میری منتظر ہوگی۔ اسی طرح جیسے پہلے شب کی دہکن  
ہاتھ کو کھٹنے پر ٹپکے..... آنکھیں موندنے ہوئوں پر  
دکھ مسکراہٹ بکھیرے..... دھڑکتے دل کے ساتھ  
کسی قدموں کے چاپ کے منتظر ہو۔

یا اللہ..... یہ رشتہ کیسا ہوتا ہے..... جتنا پرانا ہوتا  
جاتا ہے۔ اتنا ہی ٹکھرتا جاتا ہے۔

جہاز اتر گیا..... بچے مجھے دیکھتے ہی مجھ سے  
لپٹ گئے۔ رافعہ آگے نہیں آئیں۔ وہ ہم سے چند  
قدم دور کھڑی مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ وہ سرخ  
جوڑا تو نہیں تھا۔ ہاتھوں میں مہندی بھی نہیں تھی اور نہ  
ہاتھ پر بھرم..... لیکن نگاہوں کے تارے اب بھی  
جھل جھل بھل کر رہے تھے۔ ہونٹوں پر وہی  
مسکراہٹ تھی۔ مجھ سے نظریں ملیں، مسکراہٹ اور  
شوخی ہو گئی۔ اب تو ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں  
آنکھیں ڈال کر مسکرا بھی نہیں سکتے تھے۔ کیوں کہ  
بچے دل کا چور پکڑ لیتے ہیں۔

وقت بکولے کی طرح اڑ گیا۔

میرا جہاز پھر آسمان کی وسعتوں میں ہے۔ لیکن  
اب میرے تصور میں صرف نم آنکھیں ہیں۔ لرزتے  
ہوئے ہونٹ ہیں اور اس چہرے میں بھی ان سب کو  
چھوڑ کر جا رہا ہوں جہاں نئے لوگ ہوں گے۔ نئی  
صورتیں ہوں گی۔ نیا ماحول ہوگا۔

میں پھر اداس اور اکیلا ہوں۔ بس ان یادوں  
کے سائے ہیں اور ان کے ہی تلے جینا بھی ہے۔

.....

نے محسوس کیا کہ وہ احساسات پر چھائی چھائی جا رہی  
ہے۔ دماغ ہر لمحہ اسی کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔  
اس کا بھی یہی حال تھا۔ آگ دونوں طرف لگی ہوئی  
تھی۔ کوئی دن ایسا نہ گزرتا تھا ہم مل نہ لیں اور ٹیلی  
فون پر بات نہ کر لیں۔

دہلی کی بعض شاہیں بڑی سحر انگیز ہوتی ہیں اور  
اتنی پیاری ہوتی ہیں کہ آدی بے چین ہو جاتا ہے۔ وہ  
بھی ایک ایسی ہی شام تھی۔ ہم دونوں لودھی گارڈن  
میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ کچھ بادل کے ٹکڑے گھر  
آئے تھے۔ ہلکی ہلکی متوالی ہوا چل رہی تھی۔ ماحول  
بڑا خواب ناک تھا۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے۔  
دیب کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ یکا یک مجھے جانے  
کیا ہوا کہ میں نے بے خودی میں اسے اپنے سے  
قریب کر لیا۔ وہ بھی ٹوٹی شاخ کی طرح مجھ سے  
آگئی۔ دونوں کی سانس تیز اور گرم تھی۔ اس نے سر  
اٹھا کر میری طرف یوں دیکھا کہ سر کٹا ہوا وقت رک  
گیا۔ ان نظروں نہ جانے کیا بات تھی مجھے نہیں  
معلوم..... یکا یک میرے ہونٹ جھٹکے اور اس کے  
ہونٹ بڑھے۔ پھر میرے ہونٹ مٹھاس سے بندھ  
گئے۔

پھر ہم دونوں ہڑبڑا کے الگ ہو گئے۔ اس کی  
نگاہیں جھک گئیں اور میری نگاہیں ادھر ادھر بکھنے  
لگیں۔

دوسرے دن میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ چنچے اسی  
ایک لفافہ لے آیا۔ پرچے پر وہ ایک شعر اور مختصر تحریر  
تھی۔

چھپ کے آتی ہے ہزاروں پردوں میں  
آرزو پھر بھی بے لباس رہی  
میں تمہیں کھوتا نہیں چاہتی تھی لیکن جس حد کا ہم  
نے تعین کیا تھا وہ ختم ہوئی۔ دونوں مجرم ہیں۔ اس  
لیے دونوں سزا کے حق دار اب ہم کبھی نہیں ملیں گے۔  
اس کے بعد دیب پھر بھی نہیں ملی اور نہ نظر آئی۔

ہوائی جہاز پادلوں کو چیرتا ہوا بنگلہ کی طرف  
بڑھ رہا تھا۔ ہوائی اڈے پر میری بیوی اور بچے